مکتبہ جامعہ دہلی

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیارشدہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۶۳ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انہوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے ان خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خرید کرنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ

لکھنؤ

تعلیم بالغاں

اس وقت خاص بالغوں کے لئے اردو کی درسیات کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے۔ بچوں کی کتابیں بڑی عمر کے لوگوں کے لئے نہ دلچسپ ہوتی ہیں نہ موزوں۔ اس لئے ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بالغ مبتدیوں کے لئے رسائل کا یہ سلسلہ ترتیب دے رہا ہے اور تقریباً دو سو رسائل کا خاکہ تیار کیا گیا ہے جو بالغوں کے پورے نصاب تعلیم پر حاوی ہوگا۔ رسائل سلسلہ تعلیم و ترقی کی کتابت، ضخامت اور مضامین میں مدارج کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔

ان رسائل کا اصل منشا یہ ہے کہ اردو پڑھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے اور کتب بینی کا شوق پیدا ہو تاکہ آیندہ کتب خانہ تعلیم و ترقی کے ذریعہ بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ خود بخود جاری رہے اور پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد آدمی پھر ان پڑھ نہ بن جائے۔

حسب ذیل رسائل اس سلسلہ میں شائع ہو چکے ہیں یا زیر طبع ہیں۔ ان کا سائز ۲۰×۱۶ ہے۔ ہر رسالہ کم و بیش ۱۶ صفحات کا ہے۔

۱۔ **نماز** ۔ یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور مسائل جو نماز سے متعلق ہیں بتائے گئے ہیں۔ ۱۶ صفحات قیمت ار

۲ و ۳۔ **حکایتیں مکمل** ۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی پیارے اور سادے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ جو اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بہت اچھی ہیں قیمت ۲ر

۴۔ **حبیب خدا** ۔ آں حضرت کی سیرت پاک بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ار

۵۔ **نظمیں** ۔ یہ مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ پہلی نظم ”حمد“ دوسری ”دعا“ تیسری ”نعت“ چوتھی ”ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام“ پانچویں ”جو کرنا ہو ابھی کرلو“ اور چھٹی ”جاگو اور جگاؤ“ قیمت ار

۶۔ **میونسپلٹی** ۔ اس میں بالغوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ قیمت ار

۷۔ **صدیق اکبر** ۔ رسول خدا کے سب سے پہلے جانشین حضرت ابوبکر صدیق کے حالات زندگی۔ قیمت ار

۸۔ **خط وکتابت** ۔ آسان عبارت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کیسے خط لکھا جائے اور کیسے خط کا جواب دیا جائے۔ قیمت ار

زیر طبع کتابیں

ضلع کا انتظام ⟵ قیمت ار

قومی گیت ⟵ ” ار

غزلیں ⟵ ” ار

ہمارا ہندوستان ⟵ ” ار

عمر فاروق ⟵ ” ار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

ادارۂ ادبیات اردو

کے ماہنامہ

سب رس

کی خصوصی اشاعت

اردو نمبر

رسالہ "سب رس" ہر سال کے آغاز پر ایک خاص نمبر نہایت آب و تاب کے شائع کرتا ہے چنانچہ گذشتہ سال دکن نمبر شائع کیا تھا جو علمی ادبی اور تاریخی لحاظ سے آپ اپنی نظیر تھا۔ اس کی تصویریں بھی بہت قدیم اور کم یاب تھیں۔ یہ رسالہ نہ صرف علمی معلومات کا ذخیرہ تھا بلکہ قدیم ترین تصاویر کا ایک مرقع بھی تھا۔

اسی طرح جنوری سنہ ۳۹ء کا "اردو نمبر" خاص اہتمام اور سیکڑوں روپیوں کے مصارف سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں صرف اردو سے متعلق بلند پایہ مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ تمام ہندوستان کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور ماہرین اردو کے بلند پایہ تحقیقی مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں اس کے علاوہ شعراء اور انشا پردازوں کی تصویریں بھی کثیر تعداد میں فراہم کرکے شائع کی گئی ہیں۔

موجودہ فضا میں جب کہ اردو ہندی کا جھگڑا بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اردو [illegible] کے ہر بہی خواہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ باوجود کاغذ کی گرانی کے اس کی قیمت صرف دو روپیہ رکھی گئی ہے۔ ادب اردو کا ذوق رکھنے والے حضرات اسکی خریداری میں عجلت فرمائیں۔

اگر "سب رس" کی خریداری قبول کر لی گئی تو یہ خاص نمبر بلا قیمت دیا جائے گا جس کے علاوہ سال میں اور گیارہ رسالے روانہ کئے جائیں گے۔ قیمت فی پرچہ دو روپیہ، سالانہ چندہ چار روپیہ، محصول ڈاک ۸ر

دفتر "سب رس" رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد (دکن)

۱۶۱۲۱۸

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن صاحب ہاشمی ایم-اے

چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر	جنوری سنہ ۱۹۴۰ء	جلد ۴۳ - نمبر ۷

فہرستِ مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع پریس دہلی

اگر آپ

ہندوستان کی بہترین اُردو کتابوں کا مطالعہ کرنا
چاہتے ہوں تو اُردو اکاڈمی کے ممبر ہو جائیے۔ اور
کتابیں مفت پڑھئے۔ قواعد وضوابط ذیل کے پتہ سے
طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دھلی

۱۹۳۹ء میں یورپ پر کیا گذری

(پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن)

ستمبر کی پہلی تاریخ کو جرمنی اور پولینڈ اور اس کے تین روز بعد جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ جانے سے ستمبر تک کے واقعات پر ایک پردہ سا پڑ گیا ہے، لیکن اب جو ہمیں واقعات سلسلہ وار بیان کرنا نہیں ہے بلکہ پورے پر ایک مجموعی نظر ڈالنا اور اگلے پچھلے کا رشتہ جوڑنا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنگ کا چھڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یورپ کی سیاست کو اس منزل سے گذرنا تھا۔ جو لوگ دور اندیش تھے وہ اس جنگ کی پیشین گوئی اس وقت سے کر رہے تھے جب کہ ہر ہٹلر نے اپنی تصنیف "میری جدو جہد" شائع کی اور جرمن سیاست کی بے قراری کا مشاہدہ کیا جا چکا تھا۔ جو دور اندیش نہیں تھے انھوں نے آخر وقت تک جرمن سیاست کا رنگ نہیں پہچانا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

پچھلے سال ستمبر میں مسٹر چیمبرلین ہر ہٹلر کو مہذب سیاست کے آداب سکھانے کے لئے دو مرتبہ جرمنی گئے۔ جیسے کوئی بزرگ ایک بدتمیز لڑکے کو نصیحت کرنے کے لئے اس کے پاس جاتا ہے۔ لیکن نصیحت کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، بدتمیز لڑکے نے اپنی ضد پوری کی اور مسٹر چیمبرلین کسی بہتر موقع کی امید دل میں رکھ کر واپس چلے آئے۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے وزیر خارجہ لارڈ ہیلی فیکس کو لے کر بہت اہتمام اور تھوڑے سے اطمینان کے ساتھ وہ سینور مسولینی کو نصیحت کرنے گئے، مگر ان کے پہنچنے سے پہلے اور اُن کی واپسی کے بعد سینور مسولینی نے ایسی تقریریں کیں جن سے ظاہر ہو گیا کہ ملاقات بالکل رسمی ہو گی اور اس کا اٹلی کی سیاست پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ فروری سے جرمنی کے اخباروں نے چکوسلوواکیا کی زخمی اور تڑپتی ہوئی

ریاست کے بارے میں اس انداز سے لکھنا شروع کیا جس سے معلوم ہوگیا کہ ہر ہٹلر اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، اور ۱۶ مارچ کو جرمنی کا اس ریاست پر قبضہ بھی ہوگیا شیر شکار کو نکلا تھا۔ گیدڑ بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ جرمنی نے چکوسلوواکیا کے دھڑ کو ہڑپ کیا تو دم اور پائے پولینڈ اور ہنگری اڑا لے گئے۔ اسی ہلڑ میں اٹلی نے البانیہ پر حملہ کر دیا اور اُسے دبوچ کر بیٹھ گیا (۷ اپریل)

پچھلے سال ستمبر میں میونچ کی کانفرنس میں ہر ہٹلر نے وعدہ کیا تھا کہ انھیں اُن کا حق مل گیا تو پھر وہ چکوسلوواکیا کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ ان کی عہد شکنی سے مسٹر چیمبرلین کو بہت صدمہ ہوا، اور اگرچہ وہ ایسے نیک ہیں کہ جرمنی اور اٹلی کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی خواہش ان کے دل سے نہیں نکلی تھی، انھوں نے سوچا کہ برطانیہ کو پیش قدمی کرکے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کو قابو میں کرنا چاہیے۔ چنانچہ مارچ، اپریل اور مئی میں انھوں نے برطانیہ کو پولینڈ، رومانیہ یونان اور ترکی کی سلامتی کا ذمہ دار بنایا، اور ترکی سے ۱۲ مئی کو ایسا معاہدہ بھی کرلیا کہ وہ تجارت اور سیاست میں روس اور جرمنی کا دستِ نگر نہ رہے۔ وسط جون میں انھوں نے بڑی ہمت کرکے روس سے بھی گفتگو چھیڑی۔ اس خیال سے کہ اب تو ضرور ہر ہٹلر کو یقین ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت ہوشیار ہوگئی ہے اور اس کی مخالفت خالی نصیحت نہیں بلکہ سیاسی مقابلے کی شکل اختیار کرے گی۔ ہر ہٹلر نے الزام لگانے اور بدنام کرنے کو ایک فن بنا دیا ہے، اور انھیں برطانوی سیاست کی ان کارروائیوں نے الزام لگانے کا پورا موقع دیا۔ انھوں نے فوراً اعلان کیا کہ برطانیہ انھیں گھیرنے کی فکر کر رہا ہے، انھیں ایک خوں خوار درندہ ٹھہرا کر چاہتا ہے کٹہرے میں بند کردے۔ وہ پولینڈ سے ڈائنزگ کے معاملے میں جھگڑ گئے، اور ۲۸ اپریل کو ایک طرف تو اس معاہدے کو منسوخ قرار دے دیا جو انھوں نے برطانیہ سے بحری قوت کا توازن قائم کرنے کے لئے کیا تھا اور دوسری طرف اس معاہدے کو ختم کر دیا جو ۱۹۳۴ء میں پولینڈ اور جرمنی کے درمیان ہوا تھا۔ پھر

یہ دکھانے کے لئے کہ جس طرح جرمنی اور اٹلی کے درمیان مسٹر چیمبرلین خیرخواہ بن کر کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کرسکے ویسے ہی اب وہ مخالف بن کر کوئی رخنہ اندازی نہ کرسکیں گے۔ ہرہٹلر نے ۲۲ مئی کو مسولینی سے باضابطہ معاہدہ کرلیا۔ ظاہر میں تو یہ معاہدہ صرف گہری دوستی قائم رکھنے کا عہد وپیمان ہے۔ لیکن اس کی چند خفیہ دفعات بھی ضرور ہوں گی۔ یعنی جرمنی اور اٹلی نے اپنا اپنا پروگرام طے کرلیا ہوگا، تاکہ دونوں بغیر کسی غلط فہمی کے اپنے خاص محاذ پر آگے بڑھ سکیں اور اپنے ارادے پورے کرسکیں۔ معاہدے سے چار دن پہلے، یعنی ۱۸ مئی کو جنرل فرینکو میڈرڈ میں داخل ہوچکے تھے، اور جرمنی اور اٹلی کی مدد سے ہسپانیہ کی سوشلسٹ حکومت کا خاتمہ کردیا تھا۔ اٹلی اور جرمنی کا معاہدہ اس کا دعوی تھا کہ آیندہ بھی اُن کا اتحادِ عمل قائم رہے گا اور اسی طرح کامیاب ہوگا۔

اس کا صحیح اور مناسب جواب تو یہ تھا کہ برطانیہ روس سے معاہدہ کرکے اس کا انتظام کرے کہ جن ملکوں کی سلامتی کا اس نے ذمہ لیا تھا ان کی وہ واقعی حفاظت کرسکے۔ لیکن روس جس طرح کا ہمہ گیر معاہدہ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے انگریز تیار نہیں تھے، گفتگو نے طول کھینچا اور اس درمیان میں ہرہٹلر نے پولینڈ پر اتنے شدید الزام لگادیئے تھے کہ اس کو سزا دینا اُن کا اخلاقی اور سیاسی فرض ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی برطانیہ کو غصہ نہیں آیا اور ہرہٹلر نے اس کے ضبط اور تحمل کو دیکھ کر روس کی وہ تمام شرطیں منظور کرلیں جن پر برطانیہ سے حجت ہورہی تھی۔ کوئی چوبیس گھنٹے کے اندر روس اور جرمنی میں معاہدہ ہوگیا، برطانیہ کے نمائندے روس سے اس طرح نکلے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کوئی ڈرا دھمکا کر بھگا رہا ہے، اور پولینڈ کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ ۲۴ر اگست کو روس اور جرمنی کا معاہدہ ہوا، ۲۵ر اگست کو برطانیہ اور پولینڈ کا معاہدہ۔ یہ سب جانتے تھے کہ برطانیہ پولینڈ کو کسی طرف سے مدد نہیں پہنچا سکتا، ۲۵ر اگست کے معاہدے کا نتیجہ صرف یہ ہوسکتا تھا کہ جرمنی دانت پیس کر پولینڈ پر حملہ کرے اور اسے مار کر ہی چھوڑے۔

پولینڈ مردوں کی برائی نہ کرنا ایک اچھا اُصول ہے جس پر عمل کرنا تہذیب میں شامل ہوگیا ہے لیکن ہم کو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا اور عبرت بھی حاصل کرنا چاہیئے اور پولینڈ کی مثال ایسی ہے کہ جن کا ذکر کئے بغیر سیاست کا سبق ادھورا رہ جاتا ہے۔

پولینڈ کا اٹھارویں صدی میں روس، جرمنی اور آسٹریا کے درمیان تین دفعہ بٹوارہ ہوا، لیکن یہ قوم ایسی تھی کہ مصیبت کو سر پر سوار دیکھ کر اُسے ہوش نہ آیا۔ گدھوں اور چیلوں کو منڈلاتے دیکھ کر اُسے خیال نہ ہوا کہ یہ مردار کھانے والے پرند کس اُمید میں ہیں۔ جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ کی ریاست نئے سرے سے قائم کی گئی، اور باوجودیکہ اسے دشمن ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے اس نے اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کی۔ ۱۹۳۴ء میں جرمنی اس قدر کمزور تھا کہ اُسے پولینڈ سے دوستانہ معاہدہ کئے بغیر بن نہ پڑا، لیکن پولینڈ نے جرمنی کی بڑھتی طاقت دیکھ کر اپنی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ اپنے جانی دشمن کو اپنا خیر خواہ سمجھتا رہا۔ ایسی قوم دشمن کا میدان میں بھی کیا مقابلہ کرتی۔ لڑائی میں سپاہیوں نے جواں مردی سے جان دی اور سپہ سالاروں اور مدبروں نے بھاگ کر لندن اور پیرس میں پولینڈ کی 'آزاد' حکومت قائم کی۔

جرمنی کی سیاست ہر ہٹلر اپنی سیاست کے تمام مقاصد اپنی تصنیف "میری جد و جہد" میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن برطانیہ کیا، ساری دنیا کے سیاسی لیڈر کتابیں بہت کم پڑھتے ہیں اور ان کے دل سے یہ خیال نہیں نکل سکتا کہ کتابیں وہی لوگ لکھتے ہیں جو اور کوئی لائق نہیں ہوتے۔ ہر ہٹلر کی سیاسی کارگذاری سے سب واقف ہیں ان کی تقریریں غور سے سنتے یا پڑھتے ہیں، مگر اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا کہ تقریر کسی خاص معاملے کے متعلق اور ایک وقتی چیز ہوتی ہے اور "میری جد و جہد" میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب ہر ہٹلر نے صلح نامہ ورسائی کی مخالفت شروع کی تو برطانیہ نے اُن سے مصلحت آمیز ہمدردی برتی۔ انھیں جرمنی کی فوجی طاقت بڑھا لینے دی، آسٹریا کو ملحق کر لینے دیا۔ چیکوسلوواکیا کے جرمن علاقے دلوا دئے۔ اور میونخ کانفرنس میں ہر ہٹلر نے کہا کہ اب

وہ اور زمین کی ہوس نہ کریں گے تو اُن کے قول پر اعتبار کیا۔ اسی وجہ سے جب ہٹلر نے چکوسلوواکیا
کے چک علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ساتھ اپنی سیاست کے ایک اور زیادہ وسیع مقصد
کا اعلان کیا تو سب کو ان کی بے باکی پر حیرت ہوئی اور اُن کی وعدہ خلافی پر غصہ آیا
لیکن ہر ہٹلر نے موقع کو مناسب دیکھ کر کوئی نئی بات نہیں کہی تھی وہ اپنے اصل سیاسی
مقصد کو میری جد و جہد میں وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں، اور اُن کا اصل منشار اسی مقصد کو حاصل
کرنا ہے۔ اب تک جو تماشا انھوں نے دکھایا ہے وہ اس بڑے تماشے کی تمہید تھی۔

چکوسلوواکیا پر قبضہ کرنے کے بعد ہر ہٹلر نے دعوے کیا کہ جرمنی کو
(LEBERSRAUM) چاہئے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں "رہنے کے لئے جگہ"
لیکن اس میں بڑی لوچ ہے ("یہ سمٹے تو دل عاشق، پھیلے تو زمانہ") ہے، اس سے مراد غریب
کا جھونپڑا بھی ہو سکتا ہے اور امیر کا محل بھی، قوم کا آزاد اور خوش حال ہونا بھی اور اس کا
دنیا پر حکومت کرنا بھی۔ ہر ہٹلر کی نظر میں جرمنی کی آزادی اور خوش حالی نہیں ہے بلکہ دنیا پر
اس کی حکومت، کیوں کہ وہ دوسرے سلسلے میں اس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ آرین یا
نورڈک نسل جس کا سب سے خالص نمونہ جرمن قوم ہے۔ دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا
کی گئی ہے۔ یہ ہر ہٹلر کی خاص عنایت یا شاید وقت کی مصلحت ہے کہ وہ اپنی قوم کے لئے "رہنے
بھر کی جگہ" یا "ہاتھ پانوں پھیلانے کی جگہ" مانگتے ہیں۔ دنیا کی حکومت نہیں مانگتے۔ مگر وہ
بڑے ڈھیٹ ہیں، انھیں کامیابی ہوتی رہی تو وہ اُسے بھی مانگ بیٹھیں گے۔

دیکھنے میں یہ اُن کا مطالبہ صریحی زیادتی ہے۔ مگر ہر ہٹلر کی منطق ہی نرالی ہے وہ پوچھتے
ہیں کہ برطانیہ اور فرانس کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ یورپ کی ہر قوم کے طرز عمل کو
جانچیں اور جسے مناسب سمجھیں قصوروار ٹھہرائیں۔ کس نے انھیں پنچ بنایا ہے کہ وہ ہر معاملے
میں دخل دیں اور جس قوم کے حوصلے کو چاہیں یہ کہہ کر دبا دیں کہ یہ آئین سیاست اور اخلاق
یعنی ان کی اپنی مصلحت کے خلاف ہے۔ جرمنی بہرحال ان کے سامنے جواب دینے یا اپنی

صفائی پیش کرنے پر مجبور نہیں۔ اس کی سیاست اس کے اپنے اختیار کی چیز ہے، اور جب تک برطانیہ اور فرانس یہ ثابت نہ کر دیں کہ جرمنی انھیں کوئی نقصان پہنچا رہا ہے انھیں روک ٹوک کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہر ہٹلر کو یقین ہے کہ چکوسلوواکیا اور پولینڈ پر جرمنی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ اور فرانس نے کوئی نقصان نہیں اُٹھایا، اگر انھوں نے ان دونوں ملکوں کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی کی ترقی روکی جائے۔ جرمنی سے توقع کرنا بالکل غلط ہے کہ اگر دوسرے اسے زنجیروں میں جکڑیں تب بھی وہ زنجیروں کو توڑنے کی کوشش نہ کرے گا۔

اب تک ہر ہٹلر اپنے تمام منصوبے پورے کر چکے ہیں۔ اب آگے ان کی سیاست برطانیہ اور فرانس کے رویے پر منحصر ہوگی۔ وہ ہر موقع پر برطانیہ اور فرانس کو یقین دلاتے رہے ہیں کہ جرمنی کو اُن سے کوئی عداوت نہیں، اور اس کے لئے وہ یہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے فرانس اور جرمنی کی موجودہ سرحد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی سرحد مان لیا ہے اور اس کے آگے وہ کبھی نہ بڑھیں گے۔ آخر اگست میں جنگ چھڑنے سے پہلے انھوں نے فرانس کے وزیر اعظم موسیو دلادئے کو پھر اس کا یقین دلایا تھا لیکن ہر ہٹلر چاہتے ہیں کہ انھوں نے یورپ کی جو تقسیم سوچی ہے اسے فرانس اور برطانیہ دونوں تسلیم کرلیں اور یہ تجویز سیاست اور اخلاق کے مانے ہوئے اصولوں کے اس قدر خلاف ہے کہ برطانیہ اور فرانس کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ہر ہٹلر اب کہتے ہیں کہ اچھا، نہ سہی۔ آپ میری بات ماننے سے انکار کرتے رہیے۔ میں نے جو کچھ سوچا ہے وہ میں کرتا رہوں گا۔

ہر ہٹلر نے جو کچھ سوچا ہے وہ ان کی اگست اور ستمبر کی تقریروں سے اور اس معاہدے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے جو انھوں نے روس سے کیا ہے۔ انھوں نے یورپ کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک بحر روم کا حلقہ ہے، کہ جس میں وہ اٹلی کو سب سے بڑا حصہ دار مانتے ہیں، دوسرا شمال مغربی یورپ کہ جس میں وہ برطانیہ اور فرانس

-

کو ہر طرح کا اختیار دیتے ہیں۔ تیسرا حصہ وسطی یورپ ہے، جس پر کہ جرمنی کے سوا کسی کا حق نہیں، چوتھا جنوب مشرقی یورپ۔ اس میں سے وہ بحر ایڈریاٹک کا مشرقی ساحل یعنی یوگوسلاویا، مقدونیا اور یونان وہ اٹلی کو دینا چاہتے ہیں اور رومانیہ کا شمالی حصہ، یعنی بس آرابیہ، وہ روس کو دے دیں گے۔ باقی سب پر جرمنی کی عمل داری ہونا چاہئے۔ پولینڈ کو تقسیم کرنے کا ارادہ شاید اسی وقت کر لیا گیا تھا جب روس سے معاہدہ ہوا، اور اسی وقت یہ بھی طے کر لیا گیا کہ روس اگر لتھوئنیا، لیتویا، استونیا اور فن لینڈ کو فوجی معاہدے کرنے پر مجبور کرے تو جرمن کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر کو پولینڈ، روس اور جرمنی کے درمیان تقسیم ہو گیا، اور ۱۰ اکتوبر تک لتھوئنیا، لیتویا اور استونیا نے روس سے اس کے حسب منشا معاہدے کر لئے۔ صرف فن لینڈ سے سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس سے اب لڑائی ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر نے اس محاذ پر اپنا مقصد حاصل کر لیا تو پھر وہ برطانیہ اور فرانس سے مخاطب ہوئے اور ۶ اور ۱۰ اکتوبر کی تقریروں میں اپنے خاص انداز سے انھیں سمجھانا چاہا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب لڑائی جاری رکھنا فضول کی ضد کرنا ہے۔ لیکن برطانیہ کو ان کی تقریر میں ندامت، افسوس اور بے باک سیاست سے توبہ کرنے کا ارادہ کہیں نظر نہ آیا، اور جنگ بدستور جاری رہی۔

برطانیہ کی سیاست دوسری طرف برطانیہ کے مطالبے بھی ایسے ہیں جنھیں ہر بھلا آدمی حق بجانب ضرور کہے گا۔ مگر سیاست کی موجودہ فضا میں اُن کا پورا کرنا مشکل ہے۔ برطانیہ آزاد جمہوری حکومت کا مجاہد ہے۔ لیکن جرمن قوم اس طرح کی حکومت نہیں چاہتی اور برطانیہ کے لئے اس کی کوشش کرنا بے کار ہے کہ جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ برطانیہ نے ہر ہٹلر پر یہ الزام لگایا ہے، جو کہ حقیقت میں بالکل صحیح ہے کہ وہ جھوٹے وعدے کر کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ الزام ہے کہ انھوں نے دو آزاد ریاستوں کا خون کیا

ہے۔ یہ الزام بھی کون کہے گا کہ ثابت نہیں۔ لیکن ایسے جرمنوں کو سزا دینا بھی دشوار ہے۔ ہرہٹلر سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سچ بولیں اور اگر وہ سچ بولنے کا ارادہ کرلیں تو ان کے اور ساری دنیا کے لئے ہوگا بھی بہت اچھا، مگر اس کا وہ کسی کو یقین کیسے دلائیں گے کہ وہ سچ بول رہے ہیں۔ چکوسلوواکیا اُن سے چھینا جا سکتا ہے، آسٹریا اور سڈیٹن علاقے بہرحال ان کے قبضے میں رہیں گے اور اس قبضے کی وجہ سے چکوسلوواکیا ایسا بے بس ہوجاتا ہے کہ اُسے اگل دینے کے بعد ہرہٹلر جب چاہیں اُسے پھر نگل جائیں گے اور برطانیہ اور فرانس کچھ نہ کر پائیں گے۔ پولینڈ کو دوبارہ زندہ کرنا اور بھی مشکل ہے، کیونکہ آدھے پولینڈ پر روس کا قبضہ ہے اور اس حصے کی آبادی نسل کے اعتبار سے اکثر آئینی اور روسی ہے۔ یعنی اس معیار کے مطابق جو پریسیڈنٹ ولسن نے جنگ عظیم کے بعد مقرر کیا تھا اس علاقے پر پولینڈ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ رہا جرمنی کا حصہ سو اسے واپس نہ کرنے کے لئے یہ عذر رہے گا کہ روس نے اپنا حصہ نہیں چھوڑا تو وہ اپنا کیوں چھوڑے۔ پولینڈ کی خاطر جرمنی سے لڑائی ہورہی ہے، روس کی دشمنی بھی مول لے لینا عقلمندی کی بات نہیں اور برطانیہ نے اپنے نیک ارادوں کے باوجود اب تک روس کو تنبیہ نہیں کی ہے۔

پہلی ستمبر سے اس وقت تک برطانیہ اور جرمنی کی جنگ ہورہی ہے لیکن جسے لڑائی کہتے ہیں وہ ہوئی ہی نہیں۔ ریڈیو پر مقابلے ہوتے ہیں، کبھی غلطی سے ہوائی جہازوں کی ڈبھیڑ ہوجاتی ہے۔ برطانیہ جرمنی کی، جرمنی برطانیہ کی تجارت بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ دونوں فریقوں کو نقصان اتنا کم ہورہا ہے کہ اس صورت میں جنگ برسوں جاری رہ سکتی ہے اگر عام آبادی ہوائی حملوں کے مستقل خوف اور جنگ کی ضمنی تکلیفوں کو برداشت کرتی رہے۔ فرانس کی ماژی نو لائن اور جرمنی کی زیگفریڈ لائن دونوں اس قدر مضبوط ہیں کہ انھیں توڑ کر نکل جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۱ نومبر کو جرمنی نے ہالینڈ کی سرحد پر بہت سے ہوائی جہاز اور حملے کے لئے

اور تمام سامان جمع کیا تھا۔ اُمید اس کی تھی کہ ہالینڈ پر دھاوا کیا گیا تب بھی بلجیم غیر جانب دار رہے گا۔ مگر یہ اُمید بے بنیاد ثابت ہوئی اور ہالینڈ پر حملہ کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ اس کے سوا مغربی محاذ پر جنگ کی نوعیت بدلنے کی اور کوئی صورت نہیں۔

اصل میں اس محاذ پر نہ جنگ کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے نہ سیاست کا کوئی انقلاب جو کچھ ہوگا مشرقی یورپ میں ہوگا۔

روس کی سیاست ادھر ہر چیز کا دار مدار روس کی سیاست پر ہے۔ ستالن نے جرمنی جیسے دین و ایمان کے دشمن سے دوستی اور باہمی امداد کا معاہدہ کر لیا ہے، برسوں سرمایہ داری اور ملوکیت پر لعنت بھیجنے کے بعد سرمایہ داری کی سب سے خوں خوار شکل یعنی فاشزم سے بغل گیر ہوا ہے اور فن لینڈ کو تباہ کر کے وہی سب کچھ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جس کی وجہ سے سرمایہ داری حکومت ناقابل برداشت مانی جاتی تھی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ روس کی سیاست کہاں پر دم لے گی، فن لینڈ پر قبضہ کر کے مطمئن ہو جائے گی یا سویڈن پر بھی حملہ کرے گی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ جرمنی کو روس کے ارادوں کا پتہ تھا یا نہیں اور ہر ہٹلر سمجھتے تھے کہ آدھے پولینڈ اور بحر بالٹک کے مشرقی ساحل پر مسلط ہو جانے کے بعد روس بیٹھ رہے گا یا اُن سے طے ہو گیا تھا کہ وہ فن لینڈ اور پھر سویڈن پر بھی قبضہ کرے گا۔ بہر حال اس کی ذمہ داری تو ہر ہٹلر پر ہے کہ انھوں نے روس کو گوشہ نشینی کا مسلک چھوڑنے پر آمادہ کیا اور اب جو وہ دنیا میں پہنچ گیا ہے تو دیکھنا ہے کہ اس کی ہوس کتنا زور باندھتی ہے۔

پھر بھی ہر ہٹلر روس کی ہوس سے اس قدر خائف نہ ہوں گے جتنا کہ اخباروں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے وہ روسیوں کو اپنی قوم کے مقابلے میں نکمے سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ روس کی صنعتی ترقی قریب قریب انتہا کو پہنچ چکی ہے، اور اب بھی یہ حال ہے کہ جرمن مشیر اور مشینوں کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ روس نے جتنی زیادہ ہوس کی اتنا ہی وہ کمزور ہو جائے گا، اور اس کی ہوس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ دنیا کے سرمایہ دار ملک، برطانیہ

جاپان، امریکہ، فرانس سب اس کی مخالفت پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر روس نے زیادہ ہوس نہ کی تب بھی ہر ہٹلر کی کوئی تدبیر الٹ نہیں جاتی۔ وہ جنگ کو بدستور جاری رکھیں گے اور روس اور اٹلی کو مال غنیمت میں شریک کرکے جنوب مشرقی یورپ کو تقسیم کرلیں گے۔

سیاست کا نیا انقلاب شاید ۱۲ دسمبر کو جنیوا سے یہ خبر آئی تھی کہ بہت سے جرمن نامہ نگار خوب صورت خوب صورت عورتوں کو بطور سکریٹری ساتھ لے کر لیگ کے اجلاس کا تماشا دیکھنے آئے اور اسی سلسلے میں انھوں نے نہایت بے تکے طریقے پر یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ اور فرانس جرمنی سے ان شرطوں پر صلح کرلیں کہ جرمنی چکوسلوواکیا کے خالص چیک اور سلوواک علاقوں کو آزاد کردے، اور ڈانزگ اور پولینڈ کے اس حصے کے سوا جو "بر آمدہ" کہلاتا ہے باقی ملک کو جو اس کے قبضے میں آیا ہے چھوڑ دے، اور اس میں ایک آزاد پول ریاست قائم کردی جائے۔ برطانیہ اور فرانس نے بظاہر اس تجویز کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اور جب وہ خود ہر ہٹلر کی بات پر اعتبار نہیں کرتے تو چند مسخرے نامہ نگاروں کی تجویزوں کو کیوں سنتے۔ لیکن یہ تجویز بذاتِ خود ایسی معقول ہے، اور روس کی تو خیز ملوکیت نے کچھ ایسی صورت پیدا کردی ہے کہ برطانیہ اور فرانس ان شرطوں پر صلح کرلیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر برطانیہ اور فرانس نے واقعی صلح کرلی تو پھر ہر ہٹلر کو روس سے لڑائی چھیڑنے میں کچھ دیر نہ لگے گی، اور تب پھر کیا ہے، جرمن قوم کے حوصلے ہوں گے اور ترقی کے لئے ایک وسیع میدان۔

اٹلی کی سیاست جب سے جنگ شروع ہوئی ہے سینور مسولینی اس طرح سے خاموش ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اُن کا مزاج ہی بدل گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس دوران میں بیمار ہوئے بعض کہتے ہیں کہ اُن کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور وہ انھیں کا توڑ کرنے میں مصروف ہیں۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اٹلی کا کسی یورپی جنگ میں شریک ہونے کا ارادہ نہیں، اور فی الحال ہر ہٹلر نے اپنی مصلحت سے سینور مسولینی کو غیر جانب دار رہنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ اٹلی، برطانیہ اور فرانس کی مصروفیتوں اور مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنی تجارت

کو ڑھا رہا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہت سا مال جو شمال کے بحری راستوں سے
برطانوی بلوکیڈ کے سبب جرمنی نہیں پہنچ سکتا وہ ادھر سے جانا ہوگا۔
لیکن اب جو صورت پیدا ہونے والی ہے وہ کچھ ایسی ہوگی کہ سینور مسولینی اس
وقت کی طرح اطمینان سے نہ بیٹھ سکیں گے۔ ہٹلر نے روس سے اشتراک عمل قائم رکھ کر
جنوب مشرقی یورپ کی نئی تقسیم کی تو یوگوسلاویا اٹلی کو پیش کیا جائے گا۔ اگر اٹلی نے تحفہ
قبول نہ کیا تو یہ ملک جرمنی کے قبضے میں چلا جائے گا۔ اٹلی والے اس پر پریشان ہیں کہ
جنوبی ٹیرول میں اُن کی سرحد جرمنی سے مل جاتی ہے، اور وہ یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکیں گے۔
کہ بحر ایڈریاٹک کا سارا مشرقی ساحل جرمنی کے قبضے میں پہنچ جائے۔ سینور مسولینی کو تحفہ
قبول ہی کرنا ہوگا۔ اور برطانیہ اور فرانس کو کسی نہ کسی طرح اس پر آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ انھیں
یوگوسلاویہ پر حملہ کرنے کے باوجود غیر جانب دار مانتے رہیں۔ اس میں وہ کامیاب ہوں
گے یا نہ ہوں گے یہ بالکل اُن کے سلیقے پر منحصر ہے۔

ترکی کی سیاست ترکی نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا بھی اس موقع پر امتحان ہوگا۔
ترکوں کو روس سے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جرمنی کی بات انھوں نے نہیں مانی اور ہٹلر اُن سے
بہت خفا ہیں لیکن ترکوں کو اس کا ڈر نہیں ہے کہ جرمنی اُن کے ملک کو بھی فتح کرے گا۔ ترکوں
کے لئے خطرہ اس کا ہے کہ جرمنی کے بھروسے پر اٹلی مشرقی بحر روم میں قدم بڑھائے اور
ترکی کو اس طرح گھیرے کہ وہ اٹلی کی سیاست کا بالکل پابند ہو جائے اور اٹلی کی منظوری کے بغیر
دنیا میں کسی سے دوستانہ یا کاروباری تعلقات قائم نہ کر سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ترکوں کو مجبور
دیکھ کر اٹلی اناطولیہ کے مغربی ساحل پر قبضہ کرنا چاہے، اگرچہ اٹلی کی ہمتِ مردانہ ایسی مہم کو
بائیں ہاتھ کا کھیل نہ سمجھ سکے گی۔

موجودہ بین الاقوامی سیاست
فن لینڈ
لتھونیا
منظور، منظور
نازی
کہو بھئی اس طرف گھیرنے
پر کوئی اسپیچ دی ؟
بلقان
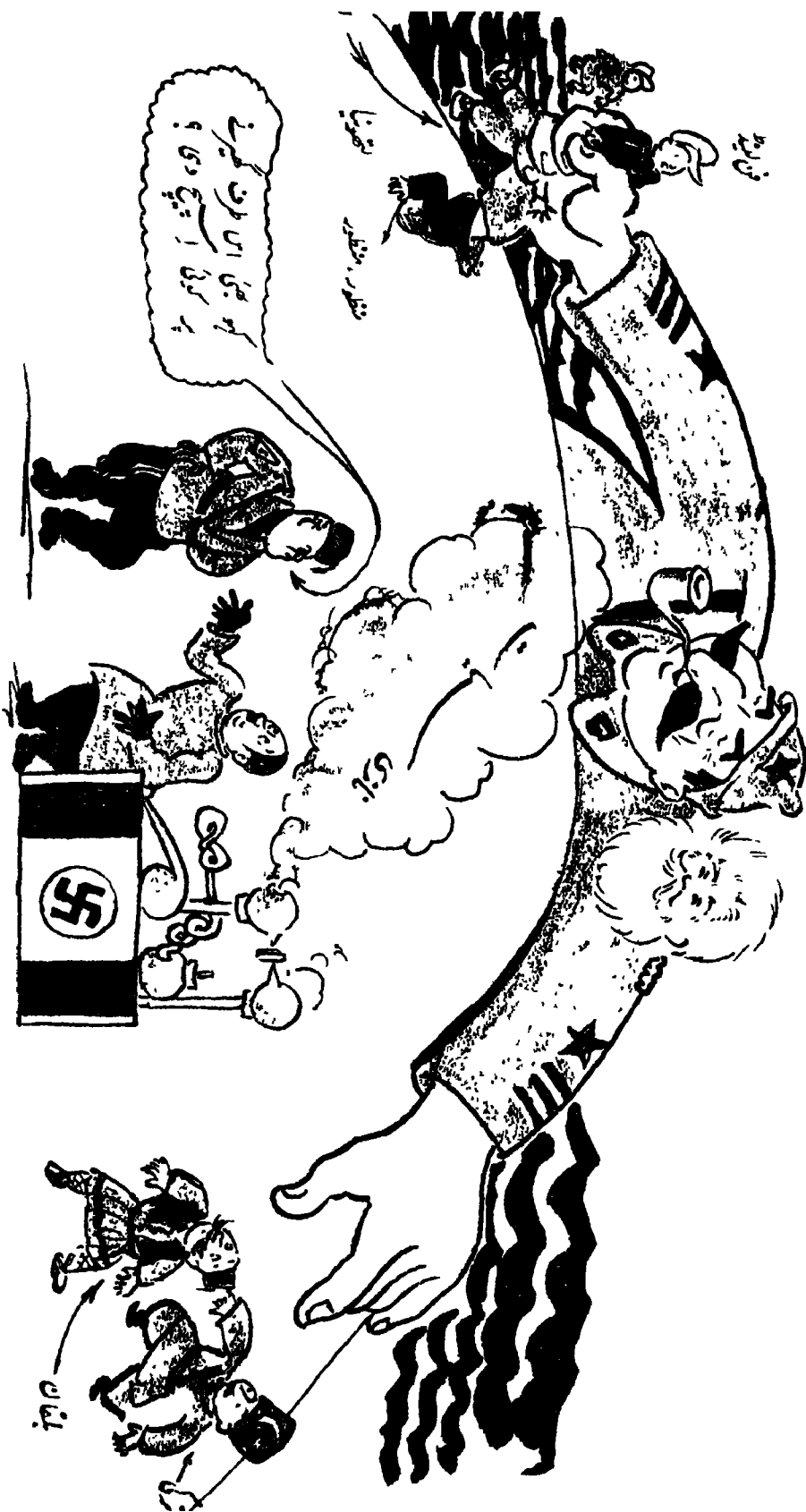
مسلمانانِ چین

خواجہ معین الدین صاحب بی اے (عثمانیہ)

اسلام اور چین اسلام سے قبل ایام جہالت میں عرب تاجر خشکی کے راستے سے وسط ایشیا تک آتے تھے اور بحری راستے سے جزائر ملایا و جزائر شرق الہند سے گذر کر چین کے جنوبی بندرگاہوں سے تجارت کیا کرتے تھے اور اس زمانے میں عرب تاجر بین الاقوامی تجارت کے گویا ٹھیکے دار تھے۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے اور اسلامی تعلیمات عرب میں پھیل گئیں اور جب تمام عربی قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے تو یہ مسلمان عرب تاجر مال و اسباب کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی وسط ایشیا میں لائے اور جب اسلام عرب سے بڑھ کر تمام ایشیا و شمالی افریقہ میں پھیل گیا تو خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلامی فتوحات کا سیلاب وسط ایشیا تک پھیل گیا۔ ۶۳۸ء میں شاہ ایران یزدگرد مسلمانوں سے شکست کھا کر مرے فرار ہوگیا اور شاہنشاہ چین ٹانگ سے مدد طلب کی اور ۶۵۱ء میں عرب حملہ آوروں کے خلاف خسرو نے شاہنشاہ چین سے پھر دوبارہ مدد طلب کی تھی۔ خلفائے بنی اُمیّہ کے زمانے میں حضرت قطیبہ نے افغانستان سے بڑھ کر بخارا، سمرقند، فرغانہ اور کاشغر کو فتح کر لیا۔ یہ علاقے آج کل سویٹ روس کے قبضے میں ہیں۔ جب وسط ایشیا پر قطیبہ کا قبضہ ہوگیا تو انھوں نے ٹنگ دربار میں اپنا وفد روانہ کیا۔ جب مسلم قاصد شاہنشاہ چین ٹینشنگ کے دربار میں پہنچا اور جب اُس سے شاہنشاہ کو سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ صرف خدا کو سجدہ کرتا ہے اور حکمران کو نہیں۔ ۷۵۵-۷۶۰ء میں شاہنشاہ سیوٹینگ نے اپنے باغی سرداروں کے خلاف خلیفہ ابوجعفر سے فوجی امداد طلب کی تھی اور

عربی افواج نے چینی جرنلوں کو جنھوں نے بغاوت کی تھی شکست دے کر ٹینگ دارالسلطنت کو پھر فتح کر لیا اور آن لیوشان کی باغی افواج کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا اس طرح عربوں کی دھاک چینی سپہ سالاروں پر بیٹھ گئی آن عرب افواج کی تعداد چار ہزار تھی وہ چین ہی میں آباد ہوگئی اور مقامی عورتوں سے شادیاں کرلیں اور صوبہ شنسی میں بس گئے۔ لاکھوں چینی انھیں عرب جنگ جو بہادروں کی اولاد ہیں۔ جنوبی چینی بندرگاہوں میں بہت سے عرب آباد ہوگئے تھے۔ اُن کی کوٹھیاں قائم تھیں۔ ابتدا ہی سے مسلمان نے اپنے جداگانہ ملّت کو اور سماجی و مذہبی خصوصیات کو برقرار رکھا۔

خاندانِ سنگ کے دورِ حکومت میں (۹۶۰ء تا ۱۲۸۰ء) مسلمانوں کی تعداد چین میں بڑھنے لگی۔ بیرونی مسلمان بھی چینی عورتوں سے شادی کیا کرتے تھے اور چین ہی میں رہا کرتے تھے۔ وہ عموماً تجارت کے سلسلے میں یا سیر و سیاحت کے لئے آجایا کرتے تھے نینن کی ایک تاریخی دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰۷۰ء میں سوفیر دس ہزار فوج کے ساتھ بخارا سے آکر سینین میں آباد ہوگیا تھا۔ موجودہ ینین کے مسلمان انھیں مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ خاندانِ سنگ کے بعد منگول خاندان چین میں برسرِ اقتدار ہوا اور اُن کی حکومت (۱۲۸۰ء تا ۱۳۶۸ء) تک رہی۔ اُن کے دورِ حکومت میں مسلمان سپاہی، مہم جو، علماء مبلغ اور تاجر کثیر تعداد میں آکر چین میں آباد ہونے لگے۔ منگول سلاطین نے مسلمانوں کو اعلیٰ خدمات عطا کیں۔ اُن کو ہر طرح کے حقوق اور مراعات دیے اور کنفیوشینزم کی طرح اسلام کی بھی ترقی کرنے کے لئے ماحول کو صاف کیا۔ سرکاری جانب سے اسلام کو خالص و سچا مذہب تسلیم کیا گیا اور ابھی تک اسلام کا سرکاری نام "شنگ شن شیو" ہے۔ اسی زمانے میں ایرانی بخاری، ترک اوگر اور دوسرے مسلمان قبائل چین میں آکر آباد ہوتے گیے اور عربی نسل کے مسلمانوں سے گھل مل گئے اور مسلمانوں نے اپنے ملّت و سیاسی و مذہبی وحدت کو اس خوبی سے استوار کیا تھا کہ جب منگس بادشاہ چین پر حکمراں رہے اور کنفوشش

مذہب کے مقابلے میں اسلام کو دبا یا گیا اور مسلمانوں پر بندشیں عائد کر دی گئیں تھیں۔ تو اسلام نہ چین سے غائب ہو گیا اور نہ مسلمان ختم ہو گئے۔ بلکہ اسلام نے منازل ارتقا کو طے کر ہی لیا۔ اس کے برعکس عیسائی جماعتیں ختم ہو گئیں۔ اس قدیم دور کی مساجد آج کل بھی جاری ہیں۔ منگ خاندان کے بعد مانچو خاندان برسر اقتدار آیا اور اس نے سنہ ۱۶۴۴ء تا سنہ ۱۹۱۱ء تک حکومت کی۔ اسلامی علم و ادب میں ترقی ہونے لگی اور اسی دور میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت عمل میں آئی۔

خاندانِ مانچو کے دورِ حکومت ہی میں مسلم بغاوت کا آغاز ہوا جو صوبہ کانسو میں ہوئی۔ مسلم افواج نے گورنر کو قتل کر دیا اور چار اہم شہروں پر قبضہ کر لیا پانچویں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مگر بعد میں ایک کثیر چینی فوج نے انھیں منتشر کر دیا اور جنرل تشنسی نے بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر جنگ عظیم سے قبل تک شمالی مغربی سرحدوں پر ہمیشہ مسلمانوں نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں جس کی وجہ سے شمال مغرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے بغاوتوں کا سب سے بڑا سبب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مسلمان آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بعض اوقات حکومت کے خلاف ان کو سماجی و مذہبی شکایات ہوا کرتی تھیں یا کبھی ناجائز ظلم و زیادتی کے خلاف وہ بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ یا اکثر اوقات طاقت ور مسلم سردار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان بغاوتوں کا ہمیشہ یہ نتیجہ نکلا کہ غیر مسلم چینی حکومت ان کو سخت بندشوں میں جکڑ دیا کرتی تھی۔ مزید تہدیدات عائد کر دئے جاتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مغربی محاذ پر مسلمان حکومت سے جنگ کرتے تھے تو مشرقی چین میں مسلمان پرامن زندگی بسر کیا کرتے تھے۔

مسلمانانِ چین کی سیاسی و معاشی حالت

سنہ ۱۹۱۱ء میں جنرل سن یاٹ سن نے شاہی کا خاتمہ کر دیا اور ایک زبردست انقلاب کے بعد چین میں جمہوریت قائم کی مسلمانوں میں بھی احساس خودی بیدار ہوا اور وہ بھی اپنے جداگانہ سیاسی وحدت کو برقرار رکھے رہے

دستور کی رو سے انھیں چین کی پانچ جماعتوں میں تسلیم کر لیا گیا۔ مسلمانوں کو ان پانچ نسلوں میں سے ایک مان لیا گیا جن پر چینی جمہوریت کی بنیاد ہے اور جمہوریہ چین کے پانچ رنگی جھنڈے میں سفید نشان مسلمانان چین کی سیاسی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی نسلی خصوصیات کا خیال پیدا ہوگیا اور سیاسی بیداری کے ساتھ قومیت کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا مسلمانوں کو چین میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ شہری حقوق حاصل ہیں اور معاشی طور پر وہ مرفع الحال ہیں۔ مسلمان تاجر اپنی ایمان داری، خوش معاملگی اور وسیع اخلاق کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کو تجارت میں خاص مہارت حاصل ہے۔ وہ زیادہ تر چار اُون اور چمڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ نہایت دلیری کے ساتھ خطرناک مقامات کو چلے جاتے ہیں جہاں دوسرے جانے سے ڈرتے ہیں۔ اپنی غیر معمولی دلیری، وسیع ذرائع اور حمل و نقل کی کثرت کی وجہ سے مسلمان شمالی علاقہ دریائے زرد میں تجارت پر حاوی ہیں

دریائے زرد کے شمالی علاقوں میں پولوٹش کا علاقہ تجارتی مرکز تھا۔ وہ جاپانی قبضہ میں ہے مگر وہاں کی تمام تر تجارت مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ مسلمان تجارت پر بندشیں یا کھلا مقابلہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ شمالی چین میں تمام تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے جو جاپانی تجارتی کاروان مسلمانوں کے علاقوں میں جاتے ہیں ان پر مسلمان قبضہ کر لیتے ہیں شمالی چین سے لے کر تبت تک مسلمان بستیاں آباد ہیں وہ جاپانی تجارتی کاروانوں پر اپنا قبضہ کر لیتے ہیں۔ جاپان کی تبت سے تجارت بند ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کی تمام چین میں ہوٹلیں اور رسٹورنٹس قائم ہیں۔

جہاں تک زراعت کا تعلق ہے مسلمان دیگر چینیوں سے کمتر ہیں علاقہ کانسو ہشتہ و نینن میں وہ کثرت سے آباد ہیں حالانکہ زراعت میں وہ چینیوں سے کم ہیں مگر جہاں تک گا اور مویشی چرانے کا تعلق ہے مسلمان اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ شہد نکالنا۔ مسکا بنانا پنیر تیار کرنا تمام تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمان مذہب کے بڑے سخت پابند

وہ مساجد کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ شمالی مغربی چین میں ایک مرتبہ نماز کے وقت مسجد کے سامنے سے سور ے جانے کی وجہ سے مسلمانوں نے فساد مچادیا اور اتنا زبردست کشت و خون ہوا کہ اب کوئی مسجد کی بے حرمتی کا خیال تک نہیں کرسکتا اسی طرح دورانِ جنگ میں کئی سو جاپانیوں نے صوبۂ شان ٹنگ میں سور کاٹ کر کھانے کی کوشش کی مسلمانوں نے مسجد کی قربت کی وجہ سے ان کو روکا مگر وہ نہ مانے جس کی بنا پر جاپانیوں اور چینی مسلمانوں میں جھڑپ ہوئی اور سینکڑوں جاپانی مارے گئے۔ مسلمانانِ چین ملک کی صنعت و حرفت میں بھی کافی حصہ رکھتے ہیں۔ وہ ریلوے ورک شاپ، کانوں میں اور دیگر فیکٹریوں میں ملازم ہیں اور فنی مہارت رکھتے ہیں مسلمانوں نے شمالی چین میں حمام خانے تجارتی اصول پر قائم کیے ہیں اور چینی و جاپانی ان صاف حمام خانوں میں آکر نہاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس تجارت سے بہت فائدہ ہے۔

جمہوریتِ چین کے قیام کے بعد سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بھی داخل ہوگئے اور بعض مسلمان عہدہ دار تو خاصی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں۔ صوبہ داری نظم و نسق میں اُن کا کافی حصہ ہے۔ منگولین اور تبتی امور مملکت میں مسلمان عہدہ دار بہت حاوی ہیں عدالت العالیہ میں بعض قابل مسلمان جج کے فرائض انجام دے رہے ہیں صوبہ جات ننگ شیا، سنگھائی اور سنگ کیانگ میں اکثر اوقات مسلمان گورنر رہ چکے ہیں اور بعض صوبہ جات میں اب بھی ہیں۔

بحرحال چین میں مسلمان بہ حیثیت سپاہی کے نمایاں اہمیت و عظمت کے حامل ہیں تاریخ چین اور موجودہ جنگ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانانِ چین نے نہایت بہادری سے مادر وطن کی خدمت کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ جاپانی و روسی بھی اس کے معترف ہیں۔ ادگار اسنو اخبار "چین پر سرخ تارہ" میں لکھتے ہیں کہ اشتمالی ایجنٹوں نے شمال مغربی چین کے مسلمانوں کو اپنے طرف کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا اور

روسی حکومت اُن کو حسب ذیل مراعات تک دینے پر آمادہ ہوگئی تھی تاکہ مسلمانوں کی تائید حاصل کرے :-

(۱) مسلمانوں کو ہر طرح کی مالی معاشی امداد دی جائے گی ۔

(۲) ان سے سر ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

(۳) اسلامی علاقوں میں مسلمانوں کی صوبہ جاتی خود اختیاری حکومت قائم کرنے میں روس مدد دے گا۔

(۴) قرضے معاف کردیئے جائیں گے ۔

(۵) اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کی جائے گی ۔

(۶) ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل رہے گی ۔

(۷) مخالف جاپان اسلامی فوج کی جدید آلات حرب سے مسلح تشکیل کی جائے گی۔

(۸) تمام مسلمانان چین کو متحد کرنے میں روسی امداد دی جائے گی ۔ منگولیا ہن کیانگ اور سوئیٹ روس کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے گا

یہ ایسے خوش کن عہد تھے جو لبرل جاپانیوں کی جانب سے بھی نہیں کیے جا سکتے تھے ۔ ۱۹۳۷ء تک سرخ عہدے دار فخریہ کہتے تھے کہ انھوں نے ان وعدوں پر مسلمانان چین کی ہمدردی حاصل کرلی ہے ۔ مگر جب بیرون منگولیا میں روسی افواج نے اسلامی علاقوں میں نقل و حرکت کی تو مسلمان مسلح جماعتوں نے اُن کو مار بھگایا۔ عیسائی مشنری مسلمانوں کے جو حالات بیان کرتے ہیں ان کے سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان شمالی چین کی فوجی قوت کی دھاک ایک جانب جاپانیوں دوسری جانب روسیوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور دونوں طاقت ور ہمسایہ دول مسلمانوں کو اپنے طرف کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر مسلمان ان ہمسایہ طاقت ور قوتوں سے مقابلے میں مرکزی حکومت چین کے طرف دا ہیں اور ہمیشہ ان ممالک کے خلاف چین کا ساتھ دیتے رہتے ہیں۔ مسلمان محض وعا

پرضمیر فروشی نہیں کرتے ان کے پیش نظر اُن کی قومی آزادی ہے وہ اس کی بقا اور تحفظ کی خاطر ہر قوت سے متصادم ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جاپانی اقدام کو شمالی مغربی چین میں مسلمانوں ہی نے روکا اور جاپانی پیش قدمی مغرب کی طرف رک گئی۔ اس لیے جاپان نے مشرقی وجنوبی چین کی طرف پورا زور ڈال دیا۔ مگر مسلمانوں کی چونکھا جنگ سے جاپانی افواج کی سرعت رفتار کم ہوگئی اور جنگ میں طوالت وسکوت پیدا ہوگیا اور اب بہت ممکن ہو چینیوں اور مسلمانوں کے غیر معمولی جوش شجاعت کے مقابلے میں جاپان کچھ حیلے بہانے کرکے چین سے صلح کرلے۔ ایک سوال بین الاقوامی اہمیت حاصل کرتا جارہا تھا وہ یہ کہ آیا شمالی مغربی چین میں مسلمانانِ چین کیا جاپان موافق حکومت قائم ہونے دیں گے اور کیا وہ جاپان سے تعاون عمل کریں گے؟ اس کا جواب آون لسٹمود نے نفی میں دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ قدیم دور میں مسلمانوں پر طاقت ور سردار حکومت کیا کرتے تھے اور وہ مرکز گیر نہ ہوا کرتے تھے۔ اور اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر مرکزی حکومت چین سے علیحدہ آزاد مملکت بنانا چاہتے تھے اسی لئے بغاوتیں وغیرہ کیا کرتے تھے مگر موجودہ دور میں اُن سرداروں کا اثر جاتا رہا ہے اب قومی بیداری اور سیاسی شعور اور ذہنی وسعت کے پھیلنے و پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمانانِ چین عام چینیوں کے ساتھ عمومی رجحانات رکھتے ہیں اور آج کل جاپانی اقدام کے خلاف دیگر چینی افراد مملکت سے تعاون کر رہے ہیں اور جنگ آزادی میں حصّہ لے رہے ہیں۔ دفاع وطن میں ہر طرح کی قربانی کر رہے ہیں۔ قومیت و آزادی کا احساس پوری قوم میں سرایت کرگیا ہے مسلمانوں کی پوری تائید مرکزی حکومت چین کو حاصل ہے اور مسلمانانِ چین کبھی موافق جاپان یا موافق روس ہو نہیں سکتے۔ وہ آزادی اور عمومیت کے دل دادہ ہیں۔

اکثر یورپی و امریکن سیاح جو چین جاتے ہیں ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانانِ چین نے کس طرح مذہبی تمدنی و تاریخی روایات کو برقرار رکھا مسلمان

بارہ سو سال سے چین میں آباد ہیں اور ہمیشہ اپنے مذہب، کلچر و ثقافت اور تہذیب و تمدن تاریخی روایات کو قائم رکھا۔ اُن کا ملی اتحاد نہایت مستحکم ہے اگر کوئی مسلمان دنیا کے کسی حصّے سے بھی چین چلا جائے تو وہ یہی محسوس کرے گا کہ چینی مسلمانوں کے درمیان وہ گویا اپنے ہی وطن میں ہے۔ چین جیسے ملک میں جہاں بدھ مت اپنے اصلی روپ میں باقی نہ رہا۔ جہاں عیسائیت اور صیہونیت کئی سال قبل ختم ہو گئے۔ اسلام کا اس طرح زندہ رہنا اور مسلمانوں کا اسلامی روایات و تعلیمات کو برقرار رکھنا خود اسلام کا ایک معجزہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان صوبہ جات شنسی، کانسو، ننگ شیا اور شنک کیانگ میں کثرت سے آباد ہیں، اکثر اُن پر چینی قومی حکومتوں نے بھی ظلم و ستم کیا ہے۔ اُن کے جداگانہ مذہبی و تمدنی وحدت کو مٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر مسلمانوں نے بزور شمشیر ان کی حفاظت کی چینی حکومت سے مسلسل کشمکش اور جد و جہد کرنے سے ان میں قوت انانیت بڑھ گئی ہے اور اب وہ کسی سختی یا دباؤ کو معمولی سمجھتے ہیں

وسط ایشیا میں بھی روسی علاقوں میں اشتمالی حکومت نے مسلمانوں پر فلک شگن مظالم ڈھائے۔ مگر چونکہ چین و وسط ایشیا میں مسلمان ہمیشہ روسی و چینی حکومتوں کے دباؤ میں رہے ہیں اور ہمیشہ تصادم ہوتا رہا ہے اسلئے انھوں نے اتنی تکالیف برداشت کی ہیں کہ اب انھیں اس کا احساس باقی نہیں رہا "مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں" اور یہ بالکل نفسیاتی کیفیت ہے۔ مسلمان چونکہ غیر معمولی بہادر، جوشیلے اور ہر طرح کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور ہمیشہ اسلام کی مدافعت کی خاطر طویل و خونریز جنگوں میں اپنی جانوں کو قربان کیا ہے اس لئے اب بھی اسلام و مسلمان زندہ ہیں۔ اور ترقی کرتے جا رہے ہیں بعض چینی مسلم لیڈر فخریہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی مدافعت کے لئے کبھی باہر سے مالی یا فوجی امداد حاصل نہیں کی۔ ہمارے پاس گو بہت زیادہ دولت یا علم نہیں ہے مگر ہم سب متحد ہیں اور آڑے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی مدبر کمانڈنٹ ڈی الون جس نے ایک مشن کی قیادت کی تھی اور جو کئی سال چین میں رہ چکا ہے۔ چینی مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے ہیں۔ کوئی غریب مسلمان بغیر مدد کے نہیں رہتا۔ ہر مسلمان ہر صورت سے اپنے بھائی مسلمان کی مدد کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اسلامی سماج میں اتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ غیر مسلم چینی اسلام میں داخل ہوتے ہی جاتے ہیں۔"

مسلمانوں کو اپنی قومی تنظیم کا خاص خیال ہے اور وہ مذہب کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ مسٹر فنڈلے اینڈریو جنھوں نے جنگِ عظیم کے دوران میں مسلمانانِ چین میں زندگی بسر کی تھی لکھتے ہیں کہ مسلمان چین مذہب اسلام کے ایسے ہی سختی سے پابند ہیں جیسے عرب میں وہابی۔ شمال مغربی چین کے زیادہ تر مسلمان عربی و ایرانی نسل ہیں اور اکثر ترکی و منگول نسل سے بھی ہیں لیکن وہ نسل اور جغرافیے کا لحاظ نہیں کرتے وہاں اسلامی مساوات کارفرما ہے۔ مسلمانان چین حنفی مذہب کے پیرو ہیں۔ ان کے تین گروہ ہیں۔ ایک طبقہ قدیم جو حنفی المذہب ہے اور جن کی اکثریت ہے دوسرا گروہ نیا طبقہ ہے جو وہابیت سے متاثر ہے اور اسلام کی ترقی کا ممد و معاون ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں اسلام کو قرن اول کا مذہب بنا دیں۔ تیسرا گروہ طبقہ جدید ہے یہ ستر سال سے قائم ہوا ہے۔ کسی شخص نے آج سے ستر سال قبل مسیح موعود مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا جانشین ہوا مگر وہ قید کر دیا گیا تھا۔ بعض لوگ طبقہ جدیدہ کے اس مسیح موعود چینی کے پیرو ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر یہ طبقہ واریت فروعی چیز ہے اور مسلمانانِ چین بہ حیثیت جداگانہ ملت کے سب متحد و منظم ہیں۔

مسلمانانِ چین قرآن عربی زبان ہی میں پڑھتے ہیں ابھی تک اس کا چینی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا اور وہ اس کو گناہ خیال کرتے ہیں۔ مذہبی تعلیم عام ہے۔ اگر کوئی قابل بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے عربی پڑھنا لازمی ہے۔ عربی، ترکی زبانیں عموماً پڑھے لکھے لوگ اچھی طرح

بولتے ہیں۔ چینی مسلمان حج بھی کرتے ہیں اور حاجی کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ مسلمانانِ چین نے اسلامی ثقافت و لٹریچر کو عام کرنے اور تبلیغ کرنے کے لئے ایک ادارہ بیجنگ میں قائم کیا ہو "عام اسلامی تحریکِ ترقی" کے نام سے موسوم ہے اور جس کا صدر وانگ مہوجاز ہے جس نے ترکی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ "اسلامی تحریک ترقی" کا تعلق صرف مذہب و تمدن سے ہے اور سیاسیات سے تعلق نہیں۔ یہ ادارہ تمام چین میں اسلامی تعلیمات کے تراجم، مدارس اور تقاریر کے ذریعے اشاعت کرتا ہے اس کی ہر شاخ بڑے شہروں، صوبوں اور ضلعوں تک میں ہے۔ الغرض تحریک ترقی کا پورے ملک میں چرچا ہے اور تبلیغ اشاعت اسلام میں وہ سرگرم عمل ہے۔

مسلمانانِ چین دیگر مسلمانان عالم سے بالکل غیر متعلق یا علیحدہ نہیں۔ وہ عالم اسلام سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر سربرآوردہ مسلمانوں کو ترکی حکومت نے شاندار اسلامی خدمات کے صلے میں تمغے عطا کئے تھے ان کی آؤ بھگت کی گئی تھی اور وہ ہر سال حج کرنے مکہ شریف جاتے ہیں اور مشرقِ قریب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ مصری و ترکی و عربی استاد چین میں مساجد و مدارس میں دینی تعلیم کے لئے مامور ہیں۔ غیر چینی مسلمانوں سے چینی مسلمان بہ حیثیت مہمان کے بڑی مہربانی سے پیش آتے ہیں ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں اور چینی مسلم نوجوان اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ ازہر (مصر) میں شرکت کرتے ہیں۔

حکومت چین مسلمانوں کی اسلامی تحریک ترقی کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی ہر طرح سے مدد کرتی ہے۔ اس کی کوششوں کی وجہ سے مسلمانوں کو تبت اور منگولیا کے نظم و نسق میں کافی نمائندگی دی گئی ہے۔ حکومت مسلمانوں کی تعلیم کا خاص بندوبست کرتی ہے کانسٹرانا ایجنٹ بھی مسلمانوں میں خفیہ پروپگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمان روس کی تائید میں ہو جائیں مگر وہ ناکام ہی رہتے ہیں جاپانی ایجنٹ بھی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان اس کا ساتھ دیں مگر کامیابی

نہیں ہوتی۔ مسلمانانِ چین من حیثیت القوم مرکزی حکومت چین کے ساتھ ہیں۔

مسلمانان چین کی اہمیت اور موجودہ حیثیت | مسلمانان چین کے متعلق آج کل عجیب عجیب طرح کا پروپگنڈا کیا جا رہا ہے۔ جاپانی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ پانچ کرور مسلمانان چین سویٹ روس کے سرخ خطرے کا مغربی شمالی ایشیا میں سدباب کرنے کے لیے جاپانی کے ساتھ ہیں اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ چینی مسلمان جاپان کی قائم کردہ پیکنگ گورنمنٹ کے حامی ہیں اور جاپان سے تعاون عمل کرنا چاہتے ہیں اس کے برعکس روسی ایجنٹ اس بات کا پروپگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانان چین متحدہ طور پر جاپانی افواج کا مقابلہ کر رہے ہیں اور بیرون منگولیا کے بعض مقامات پر بہادر و مسلح مسلمانوں نے جاپانی افواج کو پسپا کر دیا اور مادرِ وطن کی حفاظت اور اپنے قومی تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانی کر رہے ہیں اور وہ روس کے مداح ہیں کیونکہ سویٹ روس مسلمانوں کو جدید آلات سے مسلح کر رہی ہے اور اُن کو سامانِ خورد و نوش وغیرہ فراہم کرتی ہے اگر روسیوں کا یہی خوش کن طرزِ عمل رہا تو تمام اسلامیانِ چین روس کے ساتھ تعاون عمل کریں گے؛

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ جاپان و روس کے متضاد بیانات و پروپگنڈے حقائق و صداقت پر مبنی نہیں اور حکومتِ چین کے سرکاری اعلان میں جو یہ خبر شائع ہوئی کہ پانچ کرور مسلمانانِ چین متحدہ طور پر مرکزی حکومت کے حامی ہیں بالکل صحیح خیال کرتے ہیں۔ چین کی معلومات عامہ کمیٹی نے ہانکو سے یہ خبر شائع کی تھی کہ مسلمانان چین متحدہ طور پر مرکزی حکومتِ چین کے ساتھ ہیں۔ ہانکو کی جامع مسجد میں تمام سلطنتِ چین کے مسلم نمایندے شریک ہوئے تھے اور مسلم جنرل پائی ٹسنگ سی جو جنرل اسٹاف کے رکن بھی ہیں۔ دورانِ تقریر میں مسلمان نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانان چین کو ہر طرح کی قربانی کرنے اور آزادی وطن و حق و انصاف کی خاطر جنگ کرنے پر آمادہ ہو جانا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانان چین کئی نسلوں سے چین میں آباد ہیں اُن کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اگر مادرِ وطن جارحانہ اقدام کا شکار

ہو تو مدافعت میں اُن کو سینہ سپر ہوجانا چاہیئے۔ مذہب و وطن کی حفاظت میں انھیں دشمنی سے جہاد کرنا چاہیئے۔ چین میں مسلمان زیادہ تر صوبہ ننگ سیا، کانسو، شنگھائی اور سن کیانگ میں آباد ہیں۔ حکومتِ چین کے مخالفین کی جانب سے پروپگنڈا کیا جاتا ہے کہ مسلم قائد جنرل ما ہنگ مرکزی حکومتِ چین اور جنرل شیانگ کینک سے ناراض ہے۔ اور مسلمانوں کی الگ ریاست بنانا چاہتا ہے۔ مگر یہ افواہ غلط ہے۔ حکومت چین کے سرکاری محکمہ معلومات عامہ نے اس کی تردید کی اور اعلان کیا کہ مسلمانانِ چین جو زیادہ تر شمال و مغرب میں آباد ہیں مرکزی حکومتِ چین کے وفادار ہیں اور جاپانی افواج کا بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ شمالی مغربی چین میں جاپان، روس و چین کی سرحدیں ملتی ہیں اور وہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں۔ جاپان و روس ہمیشہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مسلمان ان کی مدد کریں اور یہ واقعہ ہے کہ جب سے جاپان نے چین پر جارحانہ اقدام کیا ہے اس وقت سے روس چین کی جدید آلاتِ حرب سے مدد کر رہا ہو اور سب سے پہلے ان چینی مسلمانوں کو جو بڑے بہادر اور جنگجو ہیں روسی حکومت نے جدید آلاتِ حرب سے مسلح کر دیا ہے لیکن اُن کی تمام تر تائید چین کی مرکزی حکومت کے ساتھ ہے اور روس سے محض خوش گوار ہمسایانہ تعلقات ہیں جب ٹینٹسن کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا اور جاپانی حکام اس علاقے میں برطانوی مراعات کا خاتمہ کئے دے رہے تھے۔ برطانوی قوم کے افراد کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ جاپانی صحافت انگریزوں کے خلاف پروپگنڈا کر رہی تھی اس وقت شمالی مغربی چین پر جاپانی افواج نے یورش کی مگر وہاں کے باشندے مسلم تھے فوراً اس حملے کو پسپا کر دیا گیا اور جاپان کو محسوس ہوا کہ اگر مسلمان جدید آلات حرب سے اسی طرح روس کی مدد سے مسلح رہیں گے تو وہ اس طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کی دل جوئی اطمینان دہی کی حکمتِ عملی اختیار کی اور مسلمانوں کی وہاں آزاد ریاست قائم کرنے

پروپگنڈا کیا مگر ناکامی ہوئی۔ اسی موقع پر مسٹر چیمبرلین نے ایک مرتبہ دوران تقریر کہا تھا کہ جاپان ٹینٹسن میں انگریزوں کو ذلیل کر رہا ہے مگر وہ بہادر و مسلح مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک ہی حملے کی پسپائی سے جاپانی افواج بدحواس ہوگئیں۔ مسلمانان چین جدید آلات سے مسلح ہوکر جاپانیوں کے حق میں خطرۂ عظیم بنے ہوئے ہیں، اور روس بھی ان کی قوت کا احساس کرتے ہوئے دوستانہ تعلقات برقرار کئے ہوئے ہے۔ مسلمانان چین مرکزی حکومت کے حامی ہیں اور جب سے انھوں نے جنرل ما وغیرہ کی قیادت میں جاپانی افواج کا مقابلہ شروع کیا ہے تو اس وقت سے جاپانی کا میابی جو سرعت سے جاری تھی رک گئی اور جنگ طول کھینچتی جارہی ہے اور یہ لوائت چین کے حق میں مفید ہی ہوگی۔ مسلمانان چین زیادہ سے زیادہ منظم ہوتے جارہے ہیں۔ جاپان کے خلاف مسلمانوں میں جذبۂ نفرت پھیل گیا ہے۔ جاپان چینی مسلمانوں کا دوست بننا چاہتا ہے تاکہ ان کی تائید حاصل کرکے پورے چین پر قبضہ جمالیا جائے۔ قیصر جرمنی نے بھی سلطنت برطانیہ کو توڑنے کے لیے مسلمانوں کے دوست ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح جاپان بھی مسلمانوں کی دوستی کا دم بھر کے چینی حکومت کو خاتمہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مسلمانان چین کی سیاسی جمعیت موجودہ دور میں بہت منظم ہوگئی ہے ایک جانب جاپان دوسرے جانب روس ان کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مسلمانان چین مرکزی حکومت کے وفادار ہیں اور جاپان کے میدان جنگ میں چھکے چھڑا دے رہے ہیں۔ مسلمانان چین پہلے سے زیادہ طاقتور ہیں اور اس کا ثبوت ہمیں شمال مغربی مسلم صوبوں میں جاپان کی شکست سے ملتا ہے۔

جاپان اور اسلام جاپان نے مسلمانان چین کو خوش کرنے اور ان کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلامی ممالک اور مسلمانوں سے خوش گوار تعلقات پیدا کرنا شروع کئے اور ۱۹۳۵ء میں شہر کوب میں ایک خوب صورت مسجد بنائی اور سرکاری طور پر اسلام

کو بہ حیثیت مذہب کے تسلیم کیا گیا۔ مسلمانانِ جاپان کو بھی خصوصی مراعات دیئے گئے۔ شہزادہ
یمن سیف الاسلام نے ٹوکیو میں ایک جدید مسجد کا افتتاح کیا اور جاپانی حکومت نے اسلام کی
دوستی کا دم بھرنا شروع کیا۔ ٹوکیو مسجد کے افتتاح کے موقع پر عالم اسلام سے مہمان بلوائے
گئے تھے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی گئی تاکہ عالم اسلام کی دوستی حاصل کی جائے۔ جاپانی وزیر
خارجہ ہیروٹا نے ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم مسلمانوں سے تعلقات
استوار کر رہے ہیں۔ ایران کے سفیر کو بدلنے کا یہ مقصد ہے ہمارے جاپانی طلبار اسلام سے
گہرے تعلقات رکھتے ہیں" شمالی مغربی چین سے مسلمانوں کو جن کی فوجی و جغرافی اہمیت بہت
زیادہ ہے روس کے خلاف اور جاپان سے موافق کرنے کی ہر طرح کوشش کی جا رہی ہے

جاپانی حکومت نے یہ کوشش کی تھی کہ شمالی مغربی چین میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت
ہے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت بنالی جائے اور وہ چین کی مرکزی حکومت سے آزاد ہو اس
لیے جاپانی حکومت نے مصر کے شاہی خاندان کے بعض افراد سے گفت و شنید کی تھی
تاکہ کسی شاہی خاندان کے فرد کو شمالی چین کا بادشاہ بنایا جائے۔ مگر اس میں ناکامی ہوئی۔

جنگ چین و جاپان کے دوران میں بعض وفادار سربرآوردہ چینی لیڈروں نے چین
کی جنگ آزادی میں عالم اسلام کی اخلاقی تائید حاصل کرنے کے لیے اسلامی ممالک کا سفر کیا
ترکی ایران و مصر میں چینی مسلم وفد کا خیر مقدم کیا گیا اور جاپانی اقدام کی مسلمانانِ عالم نے
مذمت کی۔ چینی وفد عالم اسلام سے چینی مسلمانوں کا مذہبی اور تمدنی تعلق بھی قائم کرنا چاہتا تھا
اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانانِ چین عالم اسلام
کے ساتھ اخلاقی و اسلامی رشتے میں منسلک ہو گئے گو مذہبی طور پر سب منسلک ہی
ہیں مگر اب تعلقات خوش گوار و مستحکم ہو گئے ہیں ترکی حکومت نے استنبول میں جاپانی خفیہ
کانفرنس کی مذمت کی اور جاپانی پروپگنڈا ایجنٹوں کو ترکی سے نکال دیا۔ جب ترکی حکومت
کو معلوم ہوا کہ جاپان ایشیا میں مسلمانوں کو متحد کر کے مخالف روسی جتھا بنانا چاہتا ہے

ترکی نے اس کی مخالفت کی اور مسلمان جاپانی ریشہ دوانیوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہے۔

جاپان نے وسط ایشیا میں تمام مسلمانوں کو متحد کرکے ایک وفاقی سلطنت قائم کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر چینی مسلمانوں نے اس سے تعاون نہیں کیا۔ جاپان ہر طرح سے مسلمانوں کو اپنی طرف کرنا چاہتا ہے مگر مسلمان جاپانی جارحانہ اقدام کے خلاف چین کی آزادی اور تحفظ کی خاطر جاپان سے لڑ رہے ہیں۔ چینی مسلم وفد جس نے تمام عالم اسلام اور ہندوستان کا دورہ کیا اپنے بیانات میں اعلان کیا ہے کہ مسلمانان چین کے خلاف عالم اسلام میں جاپان یہ غلط پروپگنڈا کر رہا ہے کہ چینی مسلمانوں کی تائید جاپان کو حاصل ہے بلکہ اس کے برعکس مسلمان جاپان کی ترقی میں سد راہ ہو رہے ہیں۔ مادر وطن کی آزادی و مدافعت میں مسلمان جاپان کے خلاف ہر معرکے میں کافی حصہ لے رہے ہیں۔ مسلم چینی وفد نے اس بات کا یقین دلایا کہ جنگ آزادی میں مسلمانان چین ہمیشہ مرکزی حکومت چین کا ساتھ دیں گے اور اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ عالم اسلام و ہندوستان کے چین سے مذہبی، تمدنی تعلقات قائم کئے جائیں تاکہ مسلمانانِ عالم و ہند کی تائید جنگ آزادی میں چین و چینی مسلمانوں کو حاصل رہے۔ مسلمانان چین کی فوجی قوت سے جاپان مرعوب ہے۔ جاپان چین پر غالب ہونے کی فکر میں ہے لیکن چینی اور مسلمان اُن کے حوصلوں کو پست کر رہے ہیں۔

حملہ اشیار کے لئے جاپانی ہر طرح کوشش کر رہے ہیں مگر شمالی چین اور وسط ایشیا کے مسلمان ان کے خواب کو شرمندہ عمل ہونے نہیں دیتے۔ مسلمانانِ وسط ایشیا ہی جاپان کے فتوحات کے سیلاب کو روکے ہوئے ہیں۔ انھوں نے روس و جاپان کے درمیان توازن قوتِ برقرار رکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانانِ چین جن کے تعلقات عالم اسلام سے خوش گوار ہیں اُن کا مستقبل بہت ہی شان دار ہے۔ حکومت جاپان موجودہ چین و جاپان کی جنگ کی سست رفتار سے مطمئن نہیں ہے۔ جنگ کی طوالت

کے باعث چین کی دفاعی قوت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور جاپان پر معاشی بار پڑرہا
ہے جب سے جنگ یورپ کا آغاز ہوا ہے جاپانی حکومت نے اپنی حکمت عملی بدل دی جرمنی
نے سوویٹ روس سے معاہدۂ عدم اقدام کرکے مخالفِ اشتمالیت معاہدہ کی خلاف ورزی
کی اور جاپانی و جرمن تعلقات کا خاتمہ ہوگیا جاپانی کابینہ میں تبدیلی ہوئی اور جاپان نے عمومی
دول سے دوستانہ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی اس لئے اب برطانیہ و فرانس و امریکہ
کے جائز معاشی مفادات کا چین میں احترام کیا جارہا ہے اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ
عمومی دول مداخلت کرکے چین و جاپان کی جنگ کا خاتمہ کردیں۔ اور مشرق اقصےٰ میں امن قائم
ہوجائے جاپان شمالی چین میں "نئی تنظیم" قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ عمومی دول کے مفادات
کا احترام کرنے پر آمادہ ہے۔ مسلمانانِ چین کی بھی دل جوئی کی جارہی ہے۔ روس کی
شاہنشاہی پالیسی سے جاپان و چین کو خطرہ محسوس ہورہا ہے دیکھئے اب اونٹ کس کل بیٹھتا
ہے۔

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس دلچسپ مضمون کو ضرور پڑھیں۔ مدیر)

(جناب ایم۔ ایم جوہر صاحب میرٹھی)

لینن کی موت کے بعد سوویٹ یونین میں کئی پارٹیاں بن گئیں تھیں ان میں سے دو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہیں ایک پارٹی کے لیڈر سٹیلن ہیں اور دوسری کے ٹروٹسکی۔ اول الذکر سوویٹ یونین کے رہبر ہیں اور موخرالذکر آج کل میکسیکو میں جلاوطن ہیں۔ ان دونوں لیڈروں کے اختلاف نے خانگی تنازعہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ سوویٹ یونین میں سیاسی مقدمے اور سیاسی لیڈروں کا قتل اور جلاوطنی اسی خانگی جھگڑے کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں موسکو میں سوویٹ حکومت نے پاتا کو اور ریڈک وغیرہ کے خلاف مقدمہ چلایا تھا جس میں تمام مجرمین نے مختلف الفاظ میں اقرارِ جرم کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اُن سے جرائم کی تمام ذمہ داری ٹروٹسکی پر ہے جو روسی حکومت کے خلاف تمام سازشوں کا روحِ رواں ہے۔ اس مقدمے کے دورانِ سماعت میں ریڈک وغیرہ نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ وہ ٹروٹسکی کے بہکانے میں آگئے تھے۔ جس کی انھوں نے حکومت سے معافی مانگی تھی۔ جب یہ بیانات دنیا کے سامنے آئے تو امریکہ میں ٹروٹسکی کی صفائی یا عذرداری کی خاطر ایک کمیٹی بنی اور اس نے چاہا کہ ٹروٹسکی کے بیانات بھی لیے جائیں تاکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دنیا کے سامنے آجائے چنانچہ امریکن کمیٹی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے میکسیکو جاکر ٹروٹسکی کے بیانات قلم بند کئے۔ یہ بیانات سوال وجواب کی شکل میں چھ سو صفحے پر مشتمل ہیں ہم ان بیانات کے صرف وہ حصص پیش کررہے ہیں جو تاریخی اور سیاسی اعتبار سے عام دلچسپی کا باعث ہوں گے اس سے پیشتر کہ ٹروٹسکی کا بیان شائع کیا جائے یہ عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گولڈمین ٹروٹسکی کے وکیل ہیں اور اُس سے بیان دلوارہے ہیں۔ فنزلی کمیشن کے پیروکار ہیں اور جرح کررہے ہیں۔ باقی حضرات کمیشن کے ممبر ہیں اور ٹروٹسکی سے سوال کررہے ہیں۔

فیزنی:- مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ کمیونسٹ پارٹی کب ترتیب دی گئی اور اس کے ممبر ہونے کی کیا شرطیں تھیں؟

ٹروٹسکی:- کمیونسٹ پارٹی ۱۹۰۳ء میں بنی لیکن پارٹی کے نام سے پہلا اعلان ۱۹۰۵ء میں نکلا تھا۔ پارٹی کا پروگرام لمبا چوڑا نہ تھا اور جو شخص پارٹی کے پروگرام پر عمل کرنے اور احکام ماننے پر راضی ہو جاتا تھا وہی پارٹی کا ممبر شمار ہونے لگتا تھا۔ لیکن چونکہ پارٹی کا کام کرنے میں ایثار اور قربانی کرنی پڑتی تھی اور ہر قسم کے خطرے سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اس لئے ایسے لوگ جن کے کوئی مفاد مدنظر ہوتا تھا ممبر نہیں بنتے تھے جو سچے دل سے ہمارے مقصد سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اور اپنی ذمہ داری کو سمجھنے والے اور آڑے وقت میں میدان چھوڑنے والے نہ ہوتے تھے کیونکہ ہماری پارٹی غیر قانونی تھی اور ہم کسی ایک خاص جگہ اجلاس نہیں کرسکتے تھے اس لئے پارٹی میں باقاعدگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں پارٹی کا باقاعدہ اجلاس ہوا۔ اس وقت پارٹی کے شاید تین لاکھ ممبر تھے اکتوبر کے انقلاب کے بعد چونکہ تمامتر ہمارے ہاتھ میں طاقت آگئی تھی اس لئے اس زمانے میں ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ لیکن ان نئے ممبروں کا یہ حال تھا کہ پارٹی کی شکست ہوتے دیکھی تو ممبری بھی ختم کردی اگر فتح ہوتی دیکھی تو ممبر بن گئے۔ ۱۹۱۹ء میں لینن نے اس پارٹی کا نام کمیونسٹ پارٹی رکھا۔ اس نام کے بہت سے ممبر مخالف تھے اور سوشل ڈیمو کریٹ پارٹی نام رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن لینن نے کہا "جس طرح میلی قمیص کو بدلنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح پارٹی کا نام بدلنا بھی ضروری ہے"۔ سوشل ڈیمو کریٹ پارٹی نے دوران جنگ میں بہت کمزوری دکھائی تھی اس وجہ سے اس نام کے ساتھ کمزوری اور شکست کے تخیلات وابستہ ہو گئے تھے۔ پارٹی کا نام بدلتے ہی ایک نیا آسمان دکھائی دینے لگا۔ ہمیں طاقت حاصل ہوتے ہی بہت سے خود غرض اونچے طبقے کے لوگ ہماری پارٹی کے ممبر ہونے لگے۔ اب ہمیں یہ ڈر ہوا کہ یہ لوگ ہماری پارٹی کا نظام اور اخلاق نہ بگاڑ دیں۔

اس لئے ہم نے اُن کے ممبر بنانے کا یہ قاعدہ بنا دیا کہ جب تک اونچے طبقے کے لوگوں کا ماضی معلوم نہ ہو اور کوئی معتبر پارٹی ممبر اُن کی ذمہ داری نہ لے اس وقت تک اُن کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔ لیکن مزدور کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہماری پارٹی مزدوروں کی سرپرست تھی

ہماری پارٹی کی تین کمیٹیاں تھیں:۔

(۱) **مرکزی کمیٹی**:۔ یہ سب سے اہم ادارہ تھا۔ سب اہم اور مختلف فیہ مسائل اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور اس کا فیصلہ ناطق ہوتا تھا۔ اس کا صدر لینن تھا۔

(۲) **سیاسی کمیٹی**:۔ تمام بیرونی اور سیاسی معاملات اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اس ادارے میں اگر کسی معاملے پر اختلافِ رائے ہوتا تھا تو وہ مرکزی کمیٹی کے روبرو پیش ہوتا تھا۔ میں بھی اس کمیٹی کا ایک ممبر تھا۔

(۳) **انتظامیہ کمیٹی**:۔ پارٹی کے متعلق جتنے بھی انتظامی معاملات ہوتے تھے ان کی دیکھ بھال یہ کمیٹی کرتی تھی اور سیاسی کمیٹی کے ماتحت تھی۔ اس کا صدر اسٹیلن تھا۔

سیاسی اور انتظامیہ کمیٹیوں کے ممبروں کو مرکزی کمیٹی منتخب کرتی تھی۔ یہ تینوں کمیٹیاں پارٹی کی 'حاکم جماعتیں' تھیں۔

اب سوویٹ یونین کو لیجئے اس کے بنیادی ادارے سوویٹ کہلاتے تھے ان کے انتخابات میں سوائے سرمایہ داروں یا اخلاقی طور پر گرے ہوئے یا ان لوگوں کے جو دوسروں کی محنت سے خود فائدہ اُٹھاتے تھے سب کو رائے دینے کا حق تھا۔ جو لوگ سوویٹ کے ممبر منتخب ہوجاتے تھے وہ اپنے نمائندے کانگرس میں بھیجتے تھے۔ کانگرس ایک مجلس عاملہ منتخب کرتی تھی جس میں تقریباً ۱۵۰ ممبر ہوتے تھے مجلس عاملہ کابینہ انتخاب کرتی تھی جس کے ممبر کیسار کہلاتے تھے۔ کیسار حکومت کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

فینرلی:۔ مسٹر ٹروٹسکی اب آپ یہ بتائیں کہ کمیونسٹ پارٹی اور کیسار میں کیا تعلق تھا۔ کیا یہ ایک دوسرے پر اثر ڈال سکتے تھے؟

ٹروٹسکی: ۔ تمام کیسار ہماری پارٹی کے ممبر ہوتے تھے ۔ عوام چونکہ کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد رکھتے تھے اس لئے وہ ہمیں ہی منتخب کرتے تھے ۔ جو اہم ملکی مسئلہ ہوتا تھا وہ پہلے پارٹی کی سیاسی کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا ۔ اگر وہاں فیصلہ نہ ہوتا تھا تو سیاسی کمیٹی لینن (جو مرکزی کمیٹی کا صدر تھا) کے سامنے پیش کرتی تھی ۔ لینن مرکزی کمیٹی کا اجلاس بلاتا تھا ۔ اور جو کچھ اجلاس میں فیصلہ ہو جاتا تھا وہی ناطق ہوتا تھا اور سوویٹ یونین میں اسی پر عمل درآمد ہوتا تھا کیسار پارٹی کا حکم مانتے تھے ۔

فینرٹی ۔ آپ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیسار کمیونسٹ پارٹی کے احکام بجا لاتے تھے حالانکہ ان کو سوویٹ کی نمایندگی کرنی چاہیئے تھی ۔ سوویٹ میں سب مزدور خواہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوں یا نہ ہوں رائے دے سکتے تھے اس لئے سوویٹ بہ نسبت کمیونسٹ پارٹی کے اداروں کے جمہوریت کا زیادہ عنصر لئے ہوئے ہوتے تھے ۔ اس کا صاف یہ مطلب ہے کہ آپ کے زمانے میں زیادہ جمہوری ادارے کم جمہوری اداروں کے محکوم ہوتے تھے ۔ میرے خیال میں جب سے سوویٹ یونین کی بنیاد رکھی گئی ہے اس وقت سے سوویٹ یونین کبھی بھی جمہوری نظام نہیں ہوا اور اب اسٹیلن پر یہ الزام لگانا کہ وہ جمہوریت پسند نہیں ہے درست معلوم نہیں ہوتا ۔

ٹروٹسکی: ۔ میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں ۔ واقعہ یہ ہے چونکہ روس میں ہماری پارٹی نے عوام کو آزادی دلوائی تھی اور غریب کی مدد کی تھی اس لئے سوویٹ کے انتخاب میں عوام ہماری پارٹی ہی کے ممبر منتخب کرتے تھے ۔ ہمیں منتخب کرنے سے پہلے رائے دہندگان کو یہ علم ہوتا تھا کہ ہم ہر ملکی معاملہ اپنی پارٹی کے حکم کے بموجب حل کریں گے اس لئے عوام جب ہمیں منتخب کرتے تھے تو در اصل ہمیں یہ ہدایت کرتے تھے کہ ہم اپنی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا حکم مانیں ۔ یہ درست ہے کہ عوام ہماری پارٹی کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے تھے دخل دینا صرف پارٹی کے ممبران کا حق تھا لیکن عوام یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر ان کو ہماری پارٹی کے مقاصد سے اتفاق نہ ہوتا یا ان کو ہمارا پروگرام غلط معلوم ہوتا تو وہ دوسری پارٹی کے ممبر منتخب کر سکتے تھے ظاہر تھا کہ دوسری پارٹی کے ممبر کمیونسٹ پارٹی کے قید و بند سے آزاد ہوتے

لیکن جب عوام ہماری ہی پارٹی کے ممبروں کو منتخب کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کو بھی پسند کرتے تھے کہ ہم مرکزی کمیٹی کے احکام مانیں۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں منتخب کرکے وہ مرکزی کمیٹی میں اعتماد کا ووٹ پاس کرتے تھے۔ ہماری کمیونسٹ پارٹی جمہوریت پسند تھی اس معنی میں نہیں کہ ہر شخص اس کا ممبر ہو سکتا تھا بلکہ اس معنی میں کہ پارٹی کا ہر ممبر آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کر سکتا تھا اور پارٹی کا لیڈر بن سکتا تھا۔ لیکن اسٹیلن کے زمانے میں نہ پارٹی میں جمہوریت ہے نہ سوویٹ یونین میں جمہوریت ہے اور نہ ٹریڈ یونین میں جمہوریت ہے

فینرٹی :۔ کیا ہمیں آپ یہ بتائیں گے کہ پرولتاریوں کی آمریت سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

ٹروٹسکی :۔ پرولتاریوں کی آمریت کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام لوگوں کے ہاتھ سے جو دوسروں کی محنت پر جیتے ہیں ملک کی باگ ڈور نکل کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خود محنت کرتے ہیں۔ صرف انقلابی پرولتاری جماعت اور ان عوام کو جو اس جماعت کے حامی ہیں یہ حق حاصل ہے کہ ملک کی تقدیر کا فیصلہ کریں۔

فینرٹی :۔ سوویٹ یونین میں پرولتاریوں کی آمریت تھی یا پرولتاریوں کے لئے آمریت تھی ؟

ٹروٹسکی :۔ یہ تعلق کا سوال ہے اگر پرولتاریوں کا کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد ہے اور پارٹی کے انتخابات آزادی سے ہوتے ہیں تو "کی" اور "کے لئے" میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ ساری جماعت تو کسی صورت سے بھی حکومت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ ہمیشہ کسی جماعت کے چند نمائندے ہی حکومت میں حصہ لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ نمائندے آزاد انتخاب کا نتیجہ ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ساری جماعت حکومت کر رہی ہے۔ اس کو آپ ڈکٹیٹر شپ کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں بھی جمہوریت کا بہت بڑا عنصر موجود ہے لیکن اسٹیلن کے دور حکومت میں یہ بھی غائب ہو گیا۔ اب سوویٹ یونین میں حکومتی طبقہ رہ گیا ہے۔ جو کسی کے روبرو جواب دہ نہیں ہے وہ شبستہ پرولتاریوں کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے مفاد کی پرواہ کر رہا ہے۔ میرے لئے کسی حکومت کو جانچنے کا یہ معیار ہے کہ وہ حکومت عوام کی ادبی اور اخلاقی حالت کس توجہ

ملک سدھارتی ہو۔ یہ نہیں ہے کہ حکومت نے کاغذ پر کیا آئین و قوانین بنا رکھے ہیں۔ آئین و قوانین بھی اپنی جگہ ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن میرا ترقی کا معیار عوام کی ترقی ہے۔

ڈیوی :۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سویٹ یونین میں اقتصادی جماعتیں نمودار ہو گئی ہیں؟

ٹروٹسکی :۔ ذاتیں کہیئے۔ ذاتیں نمودار ہو گئی ہیں۔

فیرلی ٹی :۔ سوشلسٹ نظام میں طریق پیداوار حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کو چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت ماہرین فن رکھے اور اُن سے کام کرائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ماہرین فن کی کچھ عرصے بعد ایک ذات بن جاتی ہے۔ ہر سوشلسٹ ملک میں ذاتوں کا بن جانا ناگزیر ہے آپ کے نزدیک کیا یہ تحلیل درست نہیں ہے؟

ٹروٹسکی :۔ ذاتوں کا بہت کچھ انحصار ملک کی عام حالت پر ہے۔ اگر عوام پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ ہیں تو ماہرین فن کی ذات اتنی طاقتور نہیں ہو سکتی کہ عوام پر حکومت کرے۔ ایک متمدن ملک کے عوام و خواص کی دماغی، اخلاقی اور اقتصادی ترقی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایسے ملک میں ماہرین عوام کے ماں باپ نہیں بن سکتے۔ لیکن سویٹ یونین میں ذات کا پیدا وار ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ روس ایک غیر متمدن ملک تھا جس کی تاریکی ہمیں ترکے میں ملی تھی۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ چوبیس گھنٹے میں صدیوں کی تاریکی دور کر دیتے۔ اگر روس ترقی یافتہ ملک ہوتا تو وہاں ذاتوں کا پیدا ہونا ممکن ہی نہ ہوتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک میں جہاں بھی سوشلزم جاری ہو وہاں ذاتوں کا نمودار ہونا بھی لازمی ہے۔ ترقی یافتہ ملک میں یہ ضروری نہیں کہ وہاں روس کی سی ذاتیں پیدا ہوں اگر ایک میز پر کھانے والے کم ہوں اور کھانا زیادہ ہو تو اس میز پر آمریت کی کیا ضرورت ہوگی اس میز پر بدعنوانی کا کوئی احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن جس میز پر کھانا کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں اس پر ہر ایک بھوکے کی یہ کوشش ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ کھانا اٹھائے۔ اس میز پر آمریت کا ہونا ضروری ہے۔ ذاتوں کے نمودار ہونے کا انحصار ملک کی اقتصادی حالت پر ہے۔ ایک غریب پس ماندہ سوشلسٹ ملک میں ابتدا ً ذاتوں کا پیدا ہو جانا ایک تاریخی ضرورت

ہے۔ ان ذاتوں سے مفر نہیں ہو سکتا یہ ترکہ میں ملتی ہے۔ اگر جرمنی اور روس میں بیک وقت سوشلسٹ انقلاب ہو جاتا تو جرمنی میں ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے ذاتیں نہ مٹتیں اور اس امر کا اثر روس پر یہ ہوتا کہ وہاں کی ذاتیں بہت جلد فنا ہو جاتیں۔ اسٹیلن ذاتوں کی زندگی کم کرنے کی بجائے ان کی زندگی بڑھا رہا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ حکومتی طبقے کو سوائے خانہ جنگی کے دوسری تحریک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ عوام یا پارٹی کی رائے کا حکومتی طبقے پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔"

فینرلیؒ:۔ آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ اجتماعی تشدد سے سیاسی طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔

ٹروٹسکی:۔ میں ایک مثال دے کر اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ جب روس میں اکتوبر کا انقلاب ہوا اس وقت خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرا لیکن کچھ ہی دن بعد جنرل کرسینیٹو نے بغاوت کی۔ ہم نے اس کو قید کر دیا لیکن غلطی یہ کی کہ چند دن بعد چھوڑ دیا اس نے جنوبی روس میں سفید روسیوں کی ایک فوج بنالی اور ہزاروں لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کو جو ہم سے ہمدردی رکھتے تھے قتل کر دیا۔ اس قتل و غارت میں فرانس کی سرمایہ دار جماعت اور انگلستان کے ایجنٹوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جب ہم نے یہ دیکھا کہ دوسری حکومتیں بھی باغیوں کی مدد کر رہی ہیں اور ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں تو گولی کا جواب گولی سے دیا۔ روس میں جو کشت و خون ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری سرمایہ دار ملکوں پر ہے۔ اگر کوئی مجھ پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے تو اپنی جان بچانا میرا فرض ہے اگر اس کوشش میں حملہ آور کو قتل کرنا پڑے تو مجھے قتل کرنے میں دریغ نہیں ہوگا۔ غریب عوام کو امیر حملہ آوروں سے بچانے میں جو کشت و خون ہماری پارٹی کو کرنا پڑا اس کی تمام ذمہ داری میں لینے کو تیار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر یورپ کے اور ممالک میں بھی انقلاب ہو جاتا تو روس میں کشت و خون کی نوبت نہ آتی۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے اجتماعی تشدد کی ضرورت نہیں۔

فینرلیؒ:۔ اس بیان سے آپ کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی حفاظت کے

لئے تشدد استعمال کرے لہذا اگر اسٹیلن تشدد کرتا ہے تو وہ حق بجانب ہے۔

ٹراٹسکی :۔ گردوپیش کے حالات و واقعات سے علیحدہ کرکے کسی حق کے جواز و غیر جواز کا سوال اٹھانا درست نہیں حکومت کے ہر حق کو حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ آج کل سویٹ یونین میں اجتماعی تشدد ہو رہا ہے اور حکومت آئے دن مقدمے چلا رہی ہے اور عوام و خواص کو گولی کا نشانہ بنا رہی ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ سوشلزم سویٹ یونین سے مفقود ہوتا جا رہا ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ سویٹ یونین میں چوری بہت عام ہے کسی ملک میں زیادہ چوری ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہاں کی اقتصادی اور ذہنی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ بجائے اس کے کہ سویٹ یونین کی حکومت ملک کی اقتصادی حالت درست کرے چور کو سزا دیتی ہے ایک سوشلسٹ ملک میں چوری کا ہونا اور حکومت کا چور کو سزا دینا اس امر کا بہت ہی زبردست ثبوت ہے کہ وہاں سوشلسٹ نظام ختم ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سویٹ یونین میں یہ قانون تھا کہ بارہ برس کا بچہ بھی اگر چوری کرے تو اس کو سولی دے دی جائے اور لطف یہ ہے کہ اسی سال اسٹیلن نے یہ اعلان کیا کہ اب سویٹ یونین میں مکمل سوشلزم ہو گیا ہے۔ کیا سوشلزم اس اقتصادی اور اخلاقی حالت کا نام ہے کہ عوام چوری ڈاکہ کر کے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ان سب برائیوں کی وجہ حکومتی طبقہ ہے یہ طریق پیداوار کو اس طرح چلا رہا ہے کہ طریق پیداوار کے سب فوائد حکومتی طبقے کو ہی حاصل ہیں۔ عوام بہت کم مستفید ہوتے ہیں۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ اگر روس اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک ہوتا تو یہ صورتیں پیش نہ آتیں۔ کیوں کہ ترقی یافتہ ہونے کی صورت میں دو تین ماہ ہی میں ملکی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تقریباً تین سال تک خانہ جنگی رہی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک کی تمام طاقت کو فوجی اصول پر ایک مرکز پر لانا پڑا اور جب ایک مدت تک طاقت ہاتھوں میں رہتی ہے تو اس کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے دور میں حکومتی طبقہ تھا ہی نہیں۔ [illegible] موجود تھے لیکن جرائم کا ہونا اس حکومت کی

نہیں بناتا۔ جس طرح بے رحمی کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے۔ لیکن ہر انسان قاتل نہیں ہوتا۔
بے رحمی کا بڑھ جانا اس کو قاتل بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جراثیم کا ہونا حکومت کو استبدادی
نہیں بناتا میں ہیگل کے کمیت اور کیفیت کے نظریے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ استبدادیت
کے جراثیم ہم میں بھی موجود تھے۔ لیکن ہم استبدادیت پسند نہیں تھے ہماری کوشش یہ تھی
کہ جتنی جلدی ممکن ہو عوام کے ہاتھ میں طاقت دے دیں۔ لیکن کچھ عرصے میں سویٹ یونین
میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں کہ جن لوگوں نے انقلاب کیا تھا اور جو انقلاب کے زمانے کے لیڈر
تھے وہ یا جلاوطن یا قتل کر دیے گئے اور ان کی جگہ رجعت پسند اور استبدادیت پسند لوگ
آگئے۔ اب اسٹیلن اس حکومتی طبقے کا کھلونا بن گیا ہے۔ اسٹیلن نے اپنے قیام اور استحکام کے
لئے حکومتی طبقے کو طاقت ور بنایا۔ لیکن اب وہ طبقہ اتنی طاقت پکڑ گیا ہے کہ اگر اسٹیلن اس
کو دبانا بھی چاہے تو نہیں دبا سکتا البتہ اگر حکومتی طبقہ اسٹیلن کو ہٹانا چاہے تو ہٹا سکتا ہے
اب اسٹیلن اس طبقے کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن گیا ہے۔ روس کی خفیہ پولیس کا سرغنہ یگوڈا تھا
اسی نے یہ سب جعلی مقدمے ترتیب دئے تھے۔ لیکن اب وہ خود دو ماہ سے جیل میں ہے
اب اسٹیلن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ اپنی طاقت کی پیاس بجھانے کے لئے
حکومتی طبقے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے۔ ہم نے باغی سرمایہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا
تھا۔ اسٹیلن کمیونسٹ کا شکار کر رہا ہے۔

لافیلیٹ:۔ سویٹ یونین فسطائی طاقتوں سے گھرا ہوا ہے بہت ممکن ہے کہ حکومتی طبقہ اس لئے
اپنے ہاتھ میں طاقت رکھنا چاہتا ہو کہ اس کو فسطائی طاقتوں کی طرف سے خطرہ ہے۔

ٹروٹسکی:۔ میرا یہ خیال نہیں ہے فسطائی طاقتیں سویٹ یونین کے اندرونی حالات کیسے بدل
سکتی ہیں۔ اگر سویٹ یونین فسطائی طاقتوں سے گھرا ہوا ہے تو فوج کو طاقت ور بنانا
چاہیئے نہ کہ خفیہ پولیس قائم کرنا چاہیئے۔ خفیہ پولیس ہٹلر کے خلاف نہیں ہے وہ تو
سویٹ یونین کے اندرونی دشمنوں کے خلاف ہے اور وہ دشمن باغی سرمایہ دار نہیں ہیں

بلکہ انقلاب پسند کمیونسٹ مزدور ہیں روس کی خفیہ پولیس اس امر کا بین ثبوت ہے۔ کہ حکومتی طبقہ فسطائی طاقتوں سے ڈر کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لے رہا ہے بلکہ اس کو طاقت کی ہوس ہو گئی ہے۔

ڈیوی :۔ کیا آپ یہ بتائیں گے کہ ایک ملک میں سوشلزم کے قیام کا مسئلہ ایسا مختلف فیہ مسئلہ کیوں بن گیا؟"

ٹراٹسکی :۔ صرف ایک ہی ملک میں سوشلزم کے قیام کے مسئلے کو ماننا ہماری نظر میں بین الاقوامی انقلاب اور سوشلزم کی تردید ہے۔ ہمارے لئے بین الاقوامی سوشلزم کوئی خیالی محض اور ناقابل عمل اصول نہیں ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے اگر صرف ایک ملک میں سوشلزم کا اصول مان لیا گیا تو مختلف ملکوں کے مزدوروں میں ہمدردی اور اتحاد عمل ختم ہو جاتا ہے اور سوشلزم کا یہ مقصد کہ تمام دنیا ایک رشتے میں منسلک ہو جائے مفقود ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ملک میں سوشلزم کا قیام اور بین الاقوامی انقلاب کا اصول ساتھ ساتھ ترقی نہیں کر سکتے۔ میرا مطلب مثال سے صاف ہو جائے گا۔ سویٹ یونین میں انقلاب قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوا کہ فرانس سے اتحاد قائم کیا جائے۔ فرانس سرمایہ دار ملک ہے جہاں سرمایہ دار اور مزدور جماعت کے مفاد قدرتی طور پر ٹکراتے ہیں جب سویٹ یونین فرانس کا دوست ہو گیا تو سویٹ اس پر مجبور ہوا کہ فرانس کی سرمایہ دار جماعت کے مفاد کا خیال رکھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ فرانس کی مزدور جماعت کے خلاف ہونا پڑا۔ مزدور جماعت کی مخالفت کا یہ نتیجہ نکلا کہ سویٹ یونین اور فرانس کی مزدور جماعت کے تعلقات ختم ہو گئے۔ جب اسپین میں انقلاب ہوا تو سویٹ یونین فرانس سے اتحاد کی وجہ سے اس پر مجبور ہوا کہ اسپین کی کمیونسٹ جماعت کی مدد نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف ملکوں کے کمیونسٹ آڑے وقت میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے تو ان میں ہمدردی اور اتحاد عمل کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر مزدور جماعت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے لگی اسی لئے کمیونسٹ انٹرنیشنل

ردہ ہوگئی ہے۔ مختلف ملکوں کے مزدور تو الگ الگ ہوگئے لیکن سرمایہ داروں کا بین الاقوامی اتحاد اور مضبوط ہوگیا ہے۔ اسٹیلن نے یہ نظریہ پیش کرکے کہ سوشلزم صرف ایک ملک میں زندہ رہ سکتا ہے سوشلزم کی روح فنا کردی۔ ۱۹۲۴ء میں اسٹیلن خود ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کے خلاف تھا اس نظریے کی تردید میں اسٹیلن نے اپریل ۱۹۲۴ء میں خود ایک رسالہ لکھا تھا جس کی جلد میرے پاس موجود ہے۔ ہم ملکی ترقی کے خلاف نہیں تھے ہم کہتے تھے کہ سویٹ یونین میں اقتصادی ترقی بڑی شد و مد کے ساتھ ہونا چاہیے لیکن ہمیں اپنا بین الاقوامی فرض بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ کمنترن کا کام یہی ہے کہ وہ دنیا کی مزدور جماعت کی رہنمائی کرے۔ اگر صرف ایک ملک میں سوشلزم کا نظریہ درست مان لیا جائے تو کمنترن کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تمام انقلابی لیڈر جنھوں نے کمنترن کی بنیاد ڈالی ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کے خلاف تھے۔

ڈیوی: مسٹر ٹروٹسکی آپ پہلے کہہ چکے ہیں کہ بولشویک پارٹی کے ممبر کو پارٹی کے اصول اور اس کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی تھی کیا آپ بتائیں گے کہ وہ اصول اور پابندیاں کیا تھیں؟

ٹروٹسکی: پارٹی کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ اس میں بحث و مباحثہ کی پوری آزادی تھی اور پارٹی کے احکام کی پوری پابندی ہوتی تھی۔ میں اس کو ذرا اور تفصیل سے بیان کروں گا۔ مجھے اکثر مرکزی کمیٹی کی تجاویز کی مخالفت کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اگر وہ تجویز پاس بھی ہو جاتی تھی تب بھی جب کبھی اس کا ذکر آیا میں نے برابر اس کی مخالفت کی لیکن میں نے کبھی عملی طور پر مرکزی کمیٹی کے فیصلوں کی مخالفت نہیں کی اور میں اسی کو پارٹی کے احکام کی پابندی سمجھتا ہوں۔

ڈیوی: آپ نے ذکر کیا تھا کہ چین کے معاملے میں پارٹی کے فیصلے کے خلاف آپ نے ایک ٹائپ شدہ پرچہ نکالا تھا کیا اس عمل سے پارٹی کے احکام کی نافرمانی نہیں ہوئی۔

ٹروٹسکی: جب اسٹیلن کی حکومت نے ہمارے مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا تو گویا اس نے

پارٹی کا ایک بنیادی اصول توڑ دیا۔ ہمارا یہ رویّہ کہ ہم نے پرچے بانٹے اس بنیادی اصول کی عملی حمایت تھی کہ ہر ایک ممبر کو اظہار خیال کا حق حاصل ہے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل حکومت کی چنگیزیت کے خلاف عملی احتجاج تھا۔ ہم نے پارٹی کی پابندیوں کے خلاف کچھ نہیں کیا بلکہ پہلے ہمارے مخالفوں نے پارٹی کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی تب ہم نے احتجاج کیا۔

فینرٹی:۔ لیکن اعتراض و اختلاف کا حق اس وقت تک ہی رہتا ہے جب تک کہ مرکزی کمیٹی کسی امر کا فیصلہ کرے۔ جب ایک مرتبہ فیصلہ ہو گیا تو ممبروں کو حق نہیں رہتا کہ اس فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ یہ بغاوت کی شکل ہے۔[1]

ٹروٹسکی:۔ مرکزی کمیٹی کے فیصلے کے باوجود ممبروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہیں کیونکہ مرکزی کمیٹی کے اوپر بھی ایک حاکم موجود ہے یعنی پارٹی کانگرس۔ پارٹی کے ہر ایک ممبر کو یہ حق ہے کہ اپنے خیالات کی تلقین کرے تاکہ پارٹی کے جو عام ممبر ہیں اُن کو اپنی طرف کر سکے اور مرکزی کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کرا سکے لیکن جب تک کہ وہ فیصلے کو مسترد نہ کرا سکے اس وقت تک اس کو فیصلے کی پابندی کرنی لازمی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اکتوبر کے انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے اپنی پارٹی کے لئے چند نعرے مقرر کئے تھے وہ یہ ہیں:۔

(۱) لینن کی وصیت پوری کرو

(۲) دائیں جماعت کا نیا اقتصادی پروگرام کے حامیوں کا۔ کولک اور حکومتی طبقہ کی مخالفت کرو۔

(۳) مزدوروں کی اصلی جمہوریت قائم کرو۔

(۴) لینن کی پارٹی میں اتحاد رکھو

(۵) لینن کی مرکزی کمیٹی کی مدد کرو وغیرہ

حکومتی طبقے نے ان جھنڈوں کو چھین لیا جن پر یہ نعرے نسب تھے اور جو لوگ جھنڈے

[1] ناظرین بوتس والا معاملہ پیش نظر رکھیں۔

سے بہت تھے اُن کو گرفتار کر لیا۔ ہم نے یہ جو کچھ کیا ہمیں اس کا حق تھا۔ آزاد اظہار خیال تو
پارٹی کا بنیادی اصول تھا۔ پارٹی کا کوئی قانون ممبر سے آزاد اظہار خیال کا حق نہیں چھین سکتا۔
اگر پارٹی آزاد اظہار خیال کے خلاف قانون بناتی ہے تو ہر ممبر کا فرض ہے کہ اس قانون کی عدول
حکمی کرے کیونکہ ایسا قانون پارٹی کے بنیادی اصول کو توڑتا ہے

ڈیوی: ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کے اختلاف سے اسٹالن نے یہ خیال کیا ہو کہ پیشتر اس کے کہ اختلاف
بڑھ کر کوئی ناخوش گوار شکل اختیار کرے اس کو پہلے ہی دبا دینا چاہیئے۔

ٹروٹسکی: ۔ اگرچہ ہماری پارٹی میں شروع ہی سے آمنی باقاعدگی تھی لیکن لینن نے ہمیشہ اس پر زور
دیا کہ کسی چیز کی روح اس کی ہیئت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور اگر روح کی تازگی کو برقرار
رکھنے میں ہیئت کچھ بگڑ بھی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ خیالات کا آزادی سے اظہار کرنا
پارٹی کی باضابطگی قائم رکھنے سے زیادہ اہم ہے۔ اگر خیالات کے اظہار کرنے میں پارٹی کی
باضابطگی توانی بھی پڑے تو توڑ دینی چاہیے۔ ۱۹۱۷ء میں بولشیوک پارٹی نے روس حکومت
کے خلاف بغاوت کی۔ زینو ویو اور کیمنٹو جو ہماری پارٹی کے اہم ممبر تھے بغاوت کے
مخالف تھے۔ اس وقت ہمارے لئے بغاوت کرنے اور نہ کرنے کا مسئلہ بہت اہم تھا
ان دونوں کی مخالفت سے لینن بہت گرم ہو گیا اور زینو ویو اور کیمنٹو کو غدار کہنے لگا اور
اس پر زور دینے لگا کہ ان کو پارٹی سے نکال دینا چاہیے۔ لیکن ہم نے اس کی مخالفت کی
اور ان کو نہیں نکلنے دیا۔ دو دن بعد لینن نے اس کا خود اس کا اعتراف کیا کہ ان کا نکالنا
غلطی ہوتا۔ ہم مخالفوں کو حکومت میں حصہ لینے دیتے تھے۔ روس میں شروع ہی میں تین
پارٹیاں ہو گئیں تھیں۔ منیشوک۔ سوشل انقلابی جماعت اور بالشیوک۔ بالشیوک
پارٹی نے عوام کو اپنا ہم خیال بنا لیا لیکن اس پر بھی ہم نے دوسری پارٹیوں کو حکومتی اداروں
سے نہیں نکالا البتہ جب منیشوک اور سوشل انقلابی جماعتیں ہمارے مخالفوں کی طرف ہو کر
ہم سے لڑیں۔ تب ہم نے ان پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہمارا ان جماعتوں کے خلاف ہاتھ اُٹھانا کسی

سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ فوجی ضرورت تھی۔ سویٹ یونین کے پہلے ملکی نظام میں کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی۔ جس کی رو سے ملک میں ایک سے زیادہ پارٹیاں ہونا منع ہو پہلے چار پارٹیاں ہوتی تھیں اور انارکسٹ بھی ایک پارٹی تھی۔ لیکن نیا قانون ایک سے زیادہ پارٹیوں کو حکومت میں حصہ لینے سے قانوناً روکتا ہے۔ اس کے برخلاف جولائی ۱۹۱۸ء میں ہماری کابینہ میں پانچ یا چھ جماعتوں کے ممبر شریک تھے۔ جب سوشل انقلابی ممبروں نے بغاوت کی اور کشت و خون پر اتر آئے اس وقت ہم نے اُن کا مقابلہ کیا لیکن یہ واضح رہے کہ ہم نے ان کو کابینہ سے نہیں نکالا۔ انھوں نے خود استعفےٰ دیے۔ آخر تک اُن کی پارٹی کا ایک اخبار نکلتا رہا اور ان کو اظہار خیال کا پورا موقع دے دیا گیا۔ ہم اُن سے اختلاف رائے پر نہیں لڑتے بلکہ جب انھوں نے بغاوت کی تو ہم نے طاقت استعمال کی۔

ڈیوی:۔ آج کل کی سیاسی بین الاقوامی حالت کے مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

ٹروٹسکی:۔ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ اسپین میں جو کچھ ہو رہا ہے فرانس کی جو سیاسی حالت ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے جو کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ یہ آپ کے خیال کی تائید نہیں کرتیں۔ اگر انسانیت کو بچانا ہے اور انسان کو دوبارہ وحشی بننے سے روکنا ہے تو سوشلسٹ انقلاب کرنا ضروری ہے۔

ڈیوی:۔ کیا آپ کے خیال میں مختلف ملکوں کے مزدور اس قدر بیدار ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے معاملات حالات کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں۔

ٹروٹسکی:۔ میرا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہ کر پرولتاری خود بخود اتنے بیدار نہیں ہو سکتے کہ اپنے معاملات کو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اس کے لئے ان میں تبلیغ کی بہت ضرورت ہے۔ تبلیغ کے لئے خاموش فضا کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انفرادی کشت و خون اور دہشت پھیلانے والی کارروائیوں کے خلاف ہوں کیوں کہ اُن سے ملک

کی فضا میں اس قدر انتشار اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے کہ تبلیغی کام نہیں ہو سکتا۔ ہر آدمی
کشت و خون کے قصے سننے سنانے میں لگ جاتا ہے اور چونکہ وہ عوام کی دلچسپی کی چیز ہوتے
ہیں۔ اس لئے عوام دوسری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ سرمایہ داری کے لئے یہ
ضروری ہے کہ وہ مزدوروں کو ایک جگہ جمع کرے اور ان کو نچوڑے۔ ایک جگہ اجتماع کا ضروری
نتیجہ یہ ہے کہ مزدوروں میں طاقت کا احساس پیدا ہو اور بغاوت پر آمادہ ہوں۔ لیکن مشکل
یہ ہے کہ کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مزدوروں کو معقول قسم کے
لیڈر نہیں ملتے اس لئے وہ ہمیشہ شکست کھاتے ہیں۔

ڈیوی:۔ مسٹر ٹراٹسکی آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی ادارہ خواہ وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل
ہی کیوں نہ ہو جب کسی دوسرے ملک کے انقلاب میں حصہ لے گا تو وہاں کے عوام اس
بیرونی امداد کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔

ٹراٹسکی:۔ میرا یہ خیال نہیں ہے۔ مختلف ملکوں کی مزدور سبھائیں ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتی
ہیں اور اس بیرونی امداد کو کبھی شبہ کی نظر نہیں دیکھا جاتا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ اگر بیرونی
امداد مشروط طریق پر اپنے مفاد کے لئے دی جائے تو وہ ضرور دوسرے ملک میں مخالفت
پیدا کرے گی اور عوام اس پر شبہ کرنے پر حق بجانب ہوں گے لیکن اگر دوستی اور
خلوص سے کام ہو اور عوام کو یہ یقین ہو جائے کہ بیرونی امداد سے ان کا اپنا ہی فائدہ ہے
نہ کسی غیر ملک کا تو عوام امداد کو شبہ کی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ جب ہڑتال بڑے پیمانے
پر ہو جاتی ہے تو وہی انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ڈیوی:۔ آپ کا یہ نظریہ ہے کہ اقتصادی حالات انقلاب پیدا کرتے ہیں تو کیا دنیا کی اقتصادی
حالت ایسی ہو گئی ہے کہ انقلاب ہونا ضروری ہے۔

ٹراٹسکی:۔ میرا خیال ہے کہ مدت سے دنیا کی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ انقلاب کا امکان ہر وقت
موجود ہے۔ یہ کیفیت ۱۹۱۳ء سے ہے۔ جنگ عظیم اس بات کا ثبوت تھی کہ سرمایہ داری

بغیر کشت و خون اور غارت گری کے نہیں حل سکتی اگر دنیا کے پرولتاریوں نے ۱۹۱۸ء میں
انقلاب کر دیا ہوتا تو دنیا جنگ عظیم کی ہولناکی سے بچ جاتی۔ لیکن چونکہ مزدور جماعت میں بیدار طبقہ
جو انقلاب کی رہنمائی کرے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس لئے انقلاب ہونا دوبھر ہو گیا ہے۔

فیلسرلی:۔ فرض کیجئے کہ تمام ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب ہو بھی جائے تو کیا کوئی ایسا پروگرام موجود
ہے جس کے مطابق دنیا کی اقتصادی حالت درست کی جا سکے۔ اور ریاستوں کے باہمی
اقتصادی تعلقات کو قائم کیا جا سکے۔

ٹروٹسکی:۔ سوویٹ یونین میں تو یہ ہو ہی گیا ہے کہ مقابلے کی بجائے اب اقتصادی پروگرام طریق پیداوار
کو چلاتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ باوجود حکومتی طبقے کی ناتجربہ کاری اور کوتاہ نظری کے
طریق پیداوار ایک پروگرام سے چلانا زیادہ سود مند ہے۔ آپس کے مقابلے سے سماجی ترقی
اتنی تیزی سے نہیں ہوتی جتنی کہ پروگرام سے ہوتی ہے۔ پروگرام اگر ایک ملک میں ہو سکتا ہے
تو دوسرے ممالک میں بھی ہو سکتا ہے۔ اگر سب ملکوں کے رہنما سر جوڑ کر بیٹھ جائیں تو ریاستوں
کے باہمی اقتصادی تعلقات کا مسئلہ بھی بہت جلدی اور آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

اسٹول برگ:۔ مسٹر ٹروٹسکی آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے کہ کسی ملک کی کمیونسٹ پارٹی خود مختار
ہونی چاہیئے یا کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ماتحت ہونی چاہیئے؟

ٹروٹسکی:۔ اس سوال کے جواب کا انحصار اس پر ہے کہ خود مختاری سے مراد مکمل خود مختاری ہے
تو کمیونسٹ انٹرنیشنل ایک بے معنی چیز رہ جاتی ہے اور اگر ماتحتی سے مراد یہ ہے کہ کنٹرن
دوسرے ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے ہر معاملے میں دخل دے۔ اور پارٹی کنٹرن کے اشاروں
پر چلے تو دوسرے ملک کی کمیونسٹ پارٹی میں کوئی بیدار مغز انسان شریک ہی نہیں ہوگا
اور بغیر بیدار مغز لوگوں کی شرکت کے پارٹی مقامی حالات کو کس طرح سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے
میرا خیال ہے کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو نہ مکمل طریق پر خود مختار ہونا چاہیئے
اور نہ ہر معاملے میں ماتحت ہونا چاہیئے ان کی حالت درمیانی ہونی چاہیئے۔ اصولی باتوں میں

کمیٹرن کی ماتحتی اور مقامی معاملات میں خودمختاری۔

اسٹولن برگ:- آپ نے اپنی کتاب The Revolution Betrayed میں یہ لکھا ہے کہ سوویٹ یونین میں ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جس کو آپ نے ذات کے نام سے موسوم کیا ہے۔ آپ ذات اور جماعت میں کیا فرق کرتے ہیں؟

ٹروٹسکی:- ابھی تک سوویٹ یونین میں ملکیت کی شکل اشتراکی ہے۔ اگرچہ اشتراکی طریق پیداوار سے جو ترقی ہو رہی ہے۔ اس کا فائدہ صرف حکومتی طبقے کو پہنچ رہا ہے۔ اس حکومتی طبقے کو میں ذات کہتا ہوں لیکن اگر کچھ عرصے بعد اشتراکی ملکیت کو بدل کر انفرادی ملکیت کردی گئی دوسرے الفاظ میں سماجی انقلاب کر دیا جائے اور باپ کا ترکہ بیٹے کو ملنے لگے تو وہ ذات نہ رہے گی۔ بلکہ جماعت ہو جائے گی۔

اسٹولن برگ:- آپ کے خیال کے بموجب اقتصادی نظام جدلیات سے پیدا ہوتا ہے۔ آج سرمایہ دار جماعت اپنی مخالف مزدور جماعت پیدا کررہی ہے۔ اب ان دونوں کی لڑائی سے ایک تیسری چیز یعنی سوشلزم پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن جب سوشلزم پھیل جائے گا اور سماج میں جماعتیں مفقود ہو جائیں گی تو اس وقت آپ کا جدلیات کا نظریہ کس طرح کام کرے گا۔

ٹروٹسکی:- سوشلسٹ نظام میں جدلیات۔ فنونِ لطیفہ۔ فلسفہ اور سائنس میں کام کرے گی۔ اس دور میں نہ ابتدائی تفریق ہوگی اور نہ جماعتی جھگڑے بلکہ علمی اختلاف اور جدوجہد ہوگی انسانیت ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی ہوگی۔ جہاں جدلیات اقتصادی اور مادی میدان سے بلند ہو کر علمی میدان میں کام کرے گی۔

نیلوی:- مسٹر ٹروٹسکی۔ آپ نے اپنی کتاب The Revolution Betrayed میں لکھا ہے جب سوویٹ یونین میں سرمایہ داروں سے کام کرانے کی کوشش کی گئی تو سوویٹ جمہوریت کی طاقت منتشر ہونے لگی۔ سوویٹ جمہوریت اُن سے کام لینے پر مجبور تھی کیونکہ اسی جماعت کے

لوگ اقتصادی۔ علمی اور سائنس کے معاملات سمجھتے تھے۔ طریق پیداوار کا چلانا وہی لوگ جانتے تھے۔ وہی انجینیر اور پروفیسر تھے۔ غرض سماجی زندگی کے سب مورچوں پر وہی قابض تھے اور وہی اس کی نگہداشت کر سکتے تھے۔ جب ابتدا میں مجبوراً ان لوگوں کی مدد لینی پڑی تو وہ ایک ذات بن گئی اور ایک علیحدہ طبقہ پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا" تو کیا ایک غیر ترقی یافتہ ملک ہی میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک ترقی یافتہ ملک میں بھی انقلاب ہوتا تو وہاں بھی یہی صورت پیدا ہوتی۔

ٹروٹسکی:۔ اس کا بہت کچھ انحصار ملک کی اقتصادی اور اخلاقی حالت پر ہے۔ اگر عام طور پر یقین ہو جائے کہ ہر روز نہ صرف کھانا مل جائے گا بلکہ تعلیم کے مواقع اور اظہار خیال کی آزادی بھی ہو گی تو کوئی تعلیم یافتہ آدمی یہ نہ کرے گا کہ دو روٹیاں کھلائے اور دو روٹیاں دبا رکھے ترقی یافتہ ملک میں مزدوروں کو بھی اچھی غذا ملتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اور سہولتوں کی موجودگی میں ہر ایک آدمی خواہ وہ مزدور سے کتنا ہی زیادہ پڑھا لکھا کیوں نہ ہو۔ مزدور کا کھانا کھانے پر راضی ہو جائے گا اور ذاتیں نہیں بنیں گی۔ لیکن سویٹ یونین میں مزدور کا معیار اتنا گرا ہوا تھا کہ کسی طرح بھی مختلف طبقے کے لوگوں کے مختلف معیاروں کو ایک سطح پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ سویٹ چونکہ غیر ترقی یافتہ ملک تھا اس لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ پڑھے لکھے اور کاریگر لوگوں کو اناڑی مزدور کی محنت کے معاوضے سے زیادہ معاوضہ دیا جائے۔ لیکن ایک ترقی یافتہ ملک میں مزدور اور دوسرے طبقوں کے معیار میں اتنا نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ اگر قدرے ہوتا بھی ہے تو اس کو آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے اور ذاتوں کو بہت جلد ختم کیا جا سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

اسکول ماسٹر

عبدالغفور صاحب ایم۔ اے مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ولایت کی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر تعلیمات ایک مرتبہ فرانس گیا اور وہاں اس نے ایک فرانسیسی اُستاد کو سبق پڑھاتے دیکھا۔ سبق کیا تھا۔ استاد نے اپنی زندگی کے تاثرات کو چند لمحات کے قلیل عرصے میں مقطر کر دیا تھا۔ پروفیسر مذکور سبق سنتے رہے جب ختم ہوا تو اُستاد اُن کے پاس آیا۔ تھکا ہارا۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہوا پروفیسر نے پوچھا کہو سبق کیسا رہا۔ فرانسیسی اُستاد بولا۔ میں نے ان بچوں کو زندگی عطا کر دی ہے اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا۔ کیوں نہیں! انھوں نے مجھے ایک نئی زندگی اس کے بدلے میں دے دی ہے۔

چیخوف کے اس افسانے میں ہیرو ایک ایسا اُستاد ہے جس نے سچ مچ اپنی زندگی بچوں کو دے دی ہے۔ موت کا خوفناک سایہ اس پر دم بدم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس کی تاریکیوں میں بھی اسکول ماسٹر اس شمع کو نہیں بھولتا ہے جس نے اس کی زندگی میں جوش عمل اور نیک نیتی کی کرنیں دوڑائیں اور اس قدر قربانی۔ اس قدر ایثار کا بدلہ۔ پانچ سو روبل نہیں اس کا اصلی اور صحیح صلہ وہ نذر عقیدت ہے جو سماج ایک اچھے استاد کی خدمت میں پیش کر سکتی ہے وہ صلہ جو اسلامی اور ہندو نظام تعلیم کے ماتحت استاد اور گرو کو نصیب ہوا جنھوں نے اپنی خدمت کا صلہ کسی اقتصادی ترازو سے نہیں کیا بلکہ سماجی اور خلاقی اقتدار کی کسوٹی پر پرکھا ہندوستان میں ہمیں سیدھے سادے بردنی کے قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے جو افسرانہ، سرمایہ دارانہ منبر سے اُتر کر اُستاد کے کام کو انسانی نقطۂ نگاہ سے جانچیں۔ جو اپنی سادگی، اپنے خلوص سے تصنع اور بناوٹ کے بندو قیود کو توڑ ڈالیں اور انسپکٹر صاحبان بھی (مجھے تو انسپکٹر کا نام لیتے ہی خفیہ پولیس یا جیل کے انسپکٹر یاد آتے ہیں) حکومت کا کاغذی نقاب اپنے چہرے پر سے نوچ کر پھینک دیں اور میکانکی اور محض

دفتری آرائش اور کارگذاری کی بجائے انسانی ہمدردی اور دلی گرمجوشی پر ایمان سے ہم تو خدا جانے کتنے دور افتادہ۔ گمنام گوشوں میں کام کرنے والے اُستادوں کے دل میں اپنے کام کی سچی محبت اور اُن کی بے کیف زندگی میں جائز افتخار کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ (مترجم)

ماسٹر صاحب سالانہ ڈنر کے تیار ہو رہے تھے۔ ہر سال امتحان کے بعد مدرسے کی انتظامیہ انجمن کی طرف سے ابتدائی مدارس کے انسپکٹر کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی جاتی تھی جس میں کارخانے کے منیجر مزدوروں کے جمع دار، انجنیئر وغیرہ سبھی لوگ مدعو ہوتے تھے اگرچہ تھی تو یہ سرکاری دعوت۔ پھر بھی اس میں خوب خوب لطف رہتا تھا۔ کھانا ختم ہونے کے گھنٹوں بعد لوگ میز پر بیٹھے رہتے تھے کچھ عرصے کے لئے وہ اپنے رسمی امتیازات کو بھول جاتے تھے محض نام کی بجائے وہ کام کی یاد تازہ کرتے۔ ساتھ ساتھ کھاتے بھی جاتے تھے۔ اتنا کھاتے تھے کہ پیٹ میں گنجائش نہ رہتی۔ شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ گپ بازی اس قدر جوش و خروش سے ہوتی تھی کہ بعض کے گلے بیٹھ جاتے تھے۔ برخاستگی کہیں دیر رات گئے ہوتی اس وقت اُن کے نعرے۔ لڑکھڑاتے ہوئے گیتوں اور وداعی بوسوں کے چٹخاروں سے کارخانے کی آبادی میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ماسٹر صاحب بیچارے اس قسم کے ۱۳ ڈنر کھا چکے تھے کیونکہ انھیں اس جگہ ملازم ہوئے ۱۴ سال گذر چکے تھے۔ اب وہ چودھویں ڈنر کی تیاری میں مصروف تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کی چال ڈھال پوشاک میں ضیافتی شان پیدا ہو جائے۔ بڑھاپا اور ناطاقتی، ایک گھنٹہ مکمل سیاہ سوٹ کی صفائی میں لگ گیا اور اتنا ہی وقت آئینے کے سامنے لگ گیا۔ وہ ایک بانکی قمیص پہننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر کم بخت بٹن ہیں کہ اپنے سنئے کاجوں میں گھستے ہی نہیں اسی کوشش میں ماسٹر صاحب نے اپنی بیوی کو ہزاروں شکائتیں گلے، شکوے اور طعنے سنا دیئے۔

اِدھر بیوی بیچاری ہے کہ گھنٹوں سے اُن کی صدقے ہو رہی ہے۔ غریب دوڑتی بھاگتی پریشان ہو رہی ہے اور آخر میں تو خود ماسٹر صاحب بھی تھک کر بے دم ہو گئے۔ اور جب باورچی خانے سے اُن

کے چمکیلے بوٹ لائے گئے تو اُن میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ انھیں پاؤں پر چڑھا سکیں آخر ہانپتے کانپتے لیٹ گئے اور پانی کا ایک گلاس منگوایا

بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "اللہ رحم کرے۔ کتنی کمزوری ہو گئی ہے۔ تمھیں آج ڈنر کے لئے ہرگز نہ جانا چاہیئے۔"

ماسٹر صاحب غصّے میں بھنا کر بولے "جناب اپنی نصیحت اپنے پاس ہی رکھیں۔

کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کا مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کی اصل وجہ پچھلا امتحان تھا۔ ویسے تو امتحان خوب ہو گیا۔ اوپر کی جماعت کے سب طلبا کو سندیں مل گئیں۔ بعض نے انعام بھی حاصل کئے۔ کارخانے کے منیجر اور سرکاری حکام سبھی نتائج سے بے حد مطمئن ہوئے لیکن ماسٹر صاحب؟ ماسٹر صاحب کے دل سے ابھی تک اس کی تلخی نہیں گئی تھی۔ انھیں اس امتحان کے بعض تاریک لمحات اب تک نہیں بھولے تھے۔ بابکین (ایک لڑکے کا نام) نے عمر بھر کبھی املا میں غلطی نہ کی تھی۔ اور اس مرتبہ اس کے تین الفاظ غلط نکلے! اور سرجی ییف تو اتنا گھبرا گیا کہ پندرہ اور سترہ کی ضرب نہ بتا سکا۔ اس مرتبہ انسپکٹر بھی ایک ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ اس نے املا کے لئے بہت مشکل جز و چنا۔ اور لیاپونوف کو لکھانے کے لئے کہا۔ لیاپونوف نے (جو ایک نزدیک کے مدرسے کا معلّم تھا) حقِ دوستی ادا نہ کیا۔ لکھاتے وقت بعض الفاظ کھا ہی گیا۔ تلفظ میں گڑبڑ الگ کر دی۔

ماسٹر صاحب نے بیوی کی امداد سے بوٹ پہن لئے آخری مرتبہ آئینے میں جھانکا اور چھڑی لے کر ڈنر کے لئے چل دیے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کارخانے کے منیجر کے مکان کے عین سامنے جہاں ڈنر کی تیاری کی گئی تھی انھیں شدید کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور کم بخت کھانسی نے اتنے جھٹکے دیئے کہ سر سے ٹوپی گر گئی۔ ہاتھ سے چھڑی نکل گئی۔ اور جب اُن کی کھانسی کی آواز سُن کر انسپکٹر اور دوسرے اُستاد دوڑتے ہوئے باہر نکلے تو ماسٹر صاحب نچلی سیڑھی پر بیٹھے تھے پسینے میں شرابور۔

انسپکٹر نے حیرانی سے پوچھا "سیسوییف فیوڈر کیدیچ! اخاہ! تم ہو؟ تم آ ہی گئے!

"بھلا میں کیوں نہ آتا؟"

"بھئی بہتر تو یہی تھا تم گھر پہ آرام کرتے۔ آج تمھاری طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔"

"میں تو کل کی طرح اچھا خاصا بھلا چنگا ہوں۔ ہاں اگر آپ کو میری موجودگی پسند نہ ہو تو البتہ میں واپس جا سکتا ہوں۔"

"ارے بھئی یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم تو بُرا مان گئے۔ آؤ اندر آجاؤ۔ یہ سب تقریب تمھارے اعزاز میں تو کی ہی گئی ہے اور بھلا تمھارے متعلق یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟ تم کو یہاں دیکھ کر تو مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔"

اندر تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ کھانے کے بڑے کمرے میں نئے وارنش کی بُو۔ پھولوں کی مہک جھلملیوں میں سے دوپہر کی گرم روشنی نے اچھا خاصا جھٹپٹے کا سا عالم پیدا کر دیا تھا۔ ویسے تو اس کمرے میں سبھی چیزیں دلچسپ تھیں مگر سب سے دلچسپ چیز میزبان تھا۔ ایک چھوٹا سا خوش طبع جرمن۔ چھوٹا سا گول توندا در چھوٹی چھوٹی محبت آمیز آنکھیں۔ اس کا نام برَونی تھا۔ وہ کھانے کی میز کے اردگرد اسس پھرتی سے لپک رہا تھا گویا تمام گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ کبھی شراب کے پیالوں کو بھرتا تھا۔ کبھی قابوں کو پُر کرتا اور کبھی میز پر دوسری چیزیں چنتا تھا۔ ہر طریقے سے مہمانوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کسی کے شانوں کو تھپکی دیتا۔ کسی کی نگاہ میں نگاہ ڈال کر ہنستا اور کبھی فرط مسرت سے بار بار ہاتھ ملتا تھا۔

میزبان:۔ (سیسو ولیف کو دیکھ کر) "اخاہ آج میں یہاں کسے دیکھ رہا ہوں؟ فیوڈر۔ تم کہاں؟ مجھے کتنی خوشی ہے کہ تم بیماری کے باوجود بھی آگئے۔ حضرات میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں فیوڈر آپہنچے۔"

اساتذہ کا پہلے ہی میز پر جمگھٹا لگ چکا تھا اور کھانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر سیسو ولیف کی پیشانی پر بل آگیا۔ اخاہ ان لوگوں نے میرا انتظار کئے بغیر کھانا شروع کیسے کر دیا؟ اتنے میں اس کی نگاہ لیاپونوف پر پڑی۔ جس نے امتحان میں املار لکھوایا تھا

ماسٹر کسی دوسری بات کے بغیر سیدھا اُس کے پاس پہنچا۔ اور ذرا گرما کے بولا۔

"واہ جناب آپ نے اچھا دوستی کا حق ادا کیا (تمتاکر) بھلا کسی شریف آدمی نے اس طریقے پر بھی کبھی املا لکھایا ہے؟"

لیاپونوف کے چہرے پر ناراضگی کی جھلک آگئی "ارے بھئی خدا کا واسطہ۔ اسے مدت ہو گئی اب تو بخشو۔ تم نے تو ناک میں دم کر دیا۔ کیا یہ بے وقت کا راگ الاپتے ہی رہو گے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہ الاپوں؟ میرے پابکین نے عمر بھر کوئی غلطی نہ کی تھی۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں تمہارا مقصد یہی تھا کہ میرے شاگرد فیل ہو جائیں اور تمہارے اسکول کا نتیجہ مقابلتاً اچھا رہے۔ میں تو تم لوگوں کے رگ و ریشے سے واقف ہوں۔"

لیاپونف غرّا کر بولا:۔ "ارے تو خواہ مخواہ لڑائی کیوں مول لے رہے ہو؟ جب دیکھو سر ہی پر چڑھے آتے ہو۔"

اتنے میں انسپکٹر صاحب نے مداخلت کی "حضرات۔ آپ ایک معمولی سی بات پر اس قدر کیوں گرم ہو رہے ہیں؟ تین غلطیاں ہوئیں یا ایک۔ یہ بھی کوئی اہم معاملہ ہے؟"

"ہاں جناب اہم کیوں نہیں؟ پابکین نے اب تک کبھی غلطی نہیں کی۔"

لیاپونوف غصے سے ناک بھوں چڑھا کر بولا۔ "اجی یہ حضرت اس بات کو بھلا کب چھوڑیں گے۔ یہ اپنی بیماری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور سبھی کا ناک میں دم کر رہے ہیں۔ آج سے میں تو ان کی بیماری کا لحاظ کروں گا بھی نہیں۔"

"میری بیماری گئی جہنم میں" سیسوالیف بولا۔ "تمہیں اس سے کیا غرض۔ جو ہے۔ یہی یک رہا ہے۔ بیماری! بیماری! بیماری! گویا میں جناب کی ہمدردی کا خواستگار رہوں؟ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کے دماغ میں میری بیماری کا خیال کیسے گھس گیا۔ مانا کہ میں امتحان سے پہلے بیمار تھا مگر اب تو میں بالکل تندرست ہوں محض کچھ کمزوری باقی رہ گئی ہے۔"

اتنے میں پادری نکولائی بولا "الحمدللہ۔ خدا نے آپ کو صحت نصیب کی تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے تھا اس کے برعکس آپ اور بھی چڑچڑے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔"

سیسوییف اک تڑپ سے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "رہنے بھی دو۔ تم سب سے بڑھ کر نکمے۔ بچوں کو سوالات ہمیشہ سیدھے سادے سلجھی ہوئی زبان میں کرنا چاہئیں۔ اور تم اُن سے پہیلیاں بجھوا رہے تھے۔ یہ بھی کوئی امتحان لینے کا ڈھنگ ہے؟"

آخرکار سب مل جل کر ماسٹر صاحب کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

کھانے کے بعد جام صحت شروع ہوئے۔ کرسیاں ذرا پیچھے ہٹا دی گئیں۔ چہروں پر تبسم کی روشنی جھلکنے لگی اور جام جام سے ٹکرا کر کھنا کھن کی صدا دینے لگے۔

سب سے پہلے کارخانے دار کا جام صحت پیا گیا۔ پھر بربروفی نے انسپکٹر کا جام صحت تجویز کیا آخر میں سیسوییف کی باری تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ پہلے تو وہ کھانسا۔ اپنے کھانسنے کی آواز خود ہی سُن کر اس میں ایک خود اعتمادی کا احساس پیدا ہوگیا۔ پھر اس نے تقریر شروع کردی "حضرات مجھے تقریر کرنا تو آتی نہیں۔ نہ میں اس موقعہ پر تقریر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پچھلے دو سال کے عرصے میں میرے خلاف بہت سی سازشیں۔ کئی ایک خفیہ حملے۔ بہت سی پوشیدہ رپورٹیں ہوتی رہیں (اپنے لہجے میں ایک معنی خیز دباؤ ڈال کر) میں اپنے ان دشمنوں کو جانتا ہوں جنھوں نے میرے خلاف اطلاعیں پہنچائیں۔ مگر میں کسی کا نام نہ لوں گا۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ کسی صاحب کی ایسی باتیں سُن کر بھوک ماری جائے۔ لیکن پھر بھی ان سب مخالفتوں کے باوجود میرا اسکول صوبے بھر میں سب سے اول رہا ہے۔ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے بلکہ مادی لحاظ سے بھی.... - - - - -

ہر جگہ اساتذہ کو دو سو سے تین سو روبل تک تنخواہ ملتی ہے۔ مگر مجھے پانچ سو مل رہے ہیں۔ میرے مدرسے کی دوسری دفعہ مرمت کرائی گئی ہے اور کارخانے کے خرچ پر اس میں سامانِ فرنیچر مہیا کیا گیا ہے اور اس سال تو دیواروں پر نیا کاغذ بھی چڑھا دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب سہولتوں کے لئے ہمیں کارخانے دار کا شکرگذار نہیں ہونا چاہیے وہ تو غیر ملک میں رہتے ہیں اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُن کے کارخانے میں کتنا کامیاب مدرسہ چل رہا ہے۔ اس مدرسے کی کامیابی کا سہرا بربروفی کے سر ہے جو باوجود جرمن نژاد اور پروٹسٹنٹ ہونے کے دل سے روسی ہے۔

سیسو ییف اپنی تقریر کافی لمبی کھینچ گئے۔ کبھی سانس لینے کے لئے رک جاتے تھے اور کہیں کہیں
لاغت بھی فرمانے لگتے تھے۔ تقریر بدمزہ اور قدرے بدمذاقی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ اس نے کئی
رتبہ اپنے دشمنوں کا ذکر کیا۔ اُن پر فقرے کسے۔ اکثر کہی ہوئی باتوں کو دوہرایا۔ آخر کار وہ بالکل تھک
یا اور پسینے میں شرابور۔ اب اُس نے جھٹکے دار لہجے میں بولنا شروع کیا۔ اتنی مدھم آواز سے گویا
پنے آپ کو ہی سنا رہا ہے اور آخر میں اپنی تقریر کچھ عجب بے ربط انداز میں ختم کر دی۔

میں برونی کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔ جو یہاں موجود ہے۔ ہمارے درمیان ۔۔۔ ۔۔
ام طور پر ...... آپ سمجھ گئے نا ...... ؟

جب وہ تقریر ختم کر چکا تو سب نے ہلکی سی آہ بھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ٹھنڈا
نی چھڑک کر فضا کو صاف کر دیا ہے۔ محض برونی کو کسی بدمزگی کا احساس نہیں تھا۔ اس کے گول
ول چہرے پر ایک قدرتی تبسم کھل رہا تھا۔ اس کی حساس آنکھیں اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی
ھیں۔

وہ سیسو ییف سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا: "شکریہ، شکریہ" یہ کہہ کر اس نے اپنا بایاں
ھ اپنے دل پر رکھ لیا "مجھے اس بات سے کس قدر مسرت ہوئی کہ تم نے مجھے جان لیا ہے۔ میں
ہرے دلی جذبات سے تمہاری بہبودی کا متمنی ہوں۔"

"مجھے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ آپ نے میرے متعلق بہت مبالغے سے کام لیا۔ میرے گرامی
ر دوست اسکول کی یہ حالت محض تمہاری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو اسے دوسرے
کولوں سے کون تمیز کر سکتا۔ تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ جرمن چکنی چپڑی باتیں لگا رہا ہے یا آپ کی تعریف
ہا ہے۔ نہیں فیوڈر۔ ہرگز نہیں۔ میں تو سیدھا سادھا آدمی ہوں۔ مجھے تعریفی تقریروں سے کیا
ب۔ اگر ہم تمہیں پانچ سو روبل دیتے ہیں تو اس لئے کہ ہم تمہاری صحیح قدر کرتے ہیں۔ حضرات کیا یہ
ت نہیں ہے؟ ہم کسی اور اُستاد کو اتنی تنخواہ ہرگز نہ دیں گے۔ سچ پوچھئے تو ایک اچھا
ول کارخانے کے لئے قابل فخر چیز ہے۔"

اس پر انسپکٹر صاحب بولے :- "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کا اسکول حقیقتاً ایک غیر معمولی ادارہ ہے اور یہ کوئی خوشامد نہیں۔ میں نے تو عمر بھر میں کوئی ایسا اسکول نہیں دیکھا۔ جب میں امتحان لے رہا تھا تو میرا دل ان بچوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ کس قدر ذہین بچے ! کتنا کچھ جانتے ہیں اور پھر جواب کس پھرتی اور ہشیاری سے دیتے ہیں۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ ان بچوں میں ایک عجیب آزادانہ انداز ہے۔ نہ کوئی جھجک۔ نہ اپنے پر بے اعتمادی۔

"فیوڈور۔ اصل تو یہ ہے کہ تمہارے شاگرد تم سے محبت کرتے ہیں۔ مدرسی کا جذبہ تمہارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ تم ایک پیدائشی استاد ہو۔ تم میں سبھی خوبیاں موجود ہیں قدرتی طور پر تدریس سے محبت۔ تجربہ اور کام کے لئے ایک والہانہ الفت اتنی کم زور صحت کے ساتھ کس قدر جوش عمل ! کتنی سمجھ ! کتنا استقلال ! تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم میں کس قدر خود اعتمادی ہے ؟ انتظامیہ انجمن کے کسی رکن نے کیا خوب کہا ہے کہ تم اپنے کام کے لئے شاعر ہو.......

حقیقت یہ ہے کہ تم ایک شاعر ہو ، ایک اُستاد شاعر" انسپکٹر کی اس بات پر ایسا معلوم ہوا گویا کسی سیلاب کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو۔ حاضرین نے بہ یک زبان سیسوییف کی حیرت انگیز قابلیت کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ سچے جوشیلے جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا اور تعریفی الفاظ کی رَو ان پر خار دار دلوں سے بہ نکلی جس سے محتاط اور شکی طبیعتیں بچ کر نکلتی ہیں۔ سیسوییف کی تقریر، اس کا ناقابل برداشت لہجہ، اس کی بدنما صورت سب بھول گئے۔ ہر شخص آزادی سے گفتگو کرنے لگا۔ شرمیلے۔ خاموش نوجوان استاد بھی ۔ مفلسی کے مارے، پاؤں کے نیچے کچلے ہوئے نوجوان ! جو انسپکٹر سے کبھی حضور اور جناب کے بغیر خطاب نہیں کرتے۔ وہ بھی کھل گئے۔ کم از کم یہ چیز ناقابلِ انکار تھی کہ اپنے حلقے میں سیسوییف خاص اہمیت رکھتا تھا۔

ماسٹر صاحب پچھلے چودہ سال سے ایسی کامیاب تقریبوں اور تفریحی جلسوں کے عادی ہو گئے تھے اور وہ اپنے معترفین کی باتوں کو مخصوص شان استغنا سے سنتے رہے۔ اصل میں تو برونی تھا جو سب تعریفی جملے شہد کے گھونٹ کی طرح پی رہا تھا۔ وہ ہر لفظ کے لئے لپکتا تھا اس کا گول گپے کا

ہرہ پھیل کر ایک درخشاں تبسم بن جاتا تھا۔ وہ فرطِ انبساط سے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا اور ماسٹر صاحب کی
ان میں تعریفی کلمات سُن کر اس کا چہرہ انکساری سے یوں سُرخ ہو جاتا تھا گویا یہ سب اسی کی شان
ں کہا جا رہا ہے۔ "شاباش! شاباش! بالکل ٹھیک! بس تم نے میرا مطلب خوب سمجھا! بہت نفیس"
ں قسم کے جملے اس کی زبان سے پے در پے نکل رہے تھے۔ آخرکار وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا
ب دم اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تیز آواز میں پکارا "حضرات مجھے آپ سے کچھ اور
ض کرنا ہے۔ ہُش ہُش۔ خاموش! آپ سب کی طرف سے ایک ہی جواب دے سکتا ہوں۔ کارخانے
منتظمین فیوڈر لوکوچ کا احسان بھلا نہیں سکتے۔"

اس جملے پر سب خاموش ہو گئے۔ سیستوییف نے اپنی نگاہیں جرمن کے سرخ چہرے پر
ادیں۔ برڈنی نے اپنی آواز کو ذرا دھیما کیا اور اپنی تقریر جاری رکھی "ہمیں اُن کی خدمات کے
تراف کا طریقہ معلوم ہے۔ آپ کے تفریحی کلمات کے جواب میں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں
.... فیوڈر لوکوچ کے خاندان کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا اور اس مقصد کے
ۂ مہینہ ہوا ایک معقول رقم بنک میں جمع کرا دی گئی ہے۔"

سیستوییف نے استفسارانہ لہجے میں پہلے منیجر کی طرف اور پھر اپنے شرکائے کار کی طرف
یکھا۔ اس کی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے خاندان کا اتنا خیال کیوں رکھا جا رہا ہے کیا اُسے خود
ئی صلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد معاً سب کے چہروں کو، سب کی غیر متحرک آنکھوں کو دیکھا
س پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں اس ہمدردی، اس جذبۂ ترحم کی جھلک نہ تھی جس کی تاب وہ
سکتا تھا۔ بلکہ اس کے سوا کچھ اور چیز تھی۔ اک بے حد نازک سا احساس جو بہ یک وقت بے حد
ونا اور ایک خوفناک حقیقت تھی جس کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں کپکپی چھوٹ گئی اور اس کی روح
ں خاموش مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کسی نوری جذبے کی تحریک سے
ے تحت اچھل پڑا اور اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ایک آدھ منٹ تو وہ ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ اس
یک خوف زدہ انداز میں اپنی نگاہیں اپنے سامنے جما دیں گویا وہ موت کا انتظار کر رہا ہے

پھر زیادہ تاب نہ لا سکا اور بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ہیں، ہیں! ہوش سنبھالو۔ پانی لاؤ لو تھوڑا سا پانی پیو۔"

اس قسم کے ٹوٹے ہوئے جملے وہ اردگرد سنتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں سکون ہو گیا لیکن حاضرین میں پہلے جیسی شگفتگی نہ آسکی۔ ڈنر ایک غم گین خاموشی میں ختم ہوا اور وقت سے بہت پہلے لوگ منتشر ہو گئے۔

جب سیسو یف گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے آئینے میں جھانکا پھر اپنے سُتے ہوئے چہرے اور پچکے ہوئے گال اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ کہنے لگا "بھلا وہاں تیسورنے کا کیا موقع تھا آج میرے چہرے پر کل کی نسبت زیادہ سرخی ہے۔ مجھے درحقیقت کئی خون کی شکایت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معدے کی خرابی کی وجہ سے کھانسی بھی ہے" ان الفاظ سے ایک گونہ اُسے تسلی ہو گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ کپڑے اتارنا شروع کئے اپنے نئے سیاہ سوٹ کے برش کرنے میں کافی وقت لگا۔ پھر اس نے اُسے تہ کر کے احتیاط سے رکھ لیا۔

اس کے بعد وہ میز کے قریب گیا۔ یہاں بچوں کی مشق کی کاپیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بانکین کی کاپی اُٹھالی اور بیٹھ کر بچے کی خوب صورت تحریر کو دیکھنے لگا۔ اور ایک مدت تک اُسے ہی دیکھتا رہا۔

جب وہ کاپیاں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا اس کی بیوی سے چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ ایسے مریض کو جس کی زندگی ایک ہفتے سے زیادہ باقی نہ رہ گئی ہو ہرگز ہرگز ڈنر کے لئے باہر جانے کی اجازت نہ دینا چاہیے۔

(چیخوف)

ملک الشعرا ذوق

(۲) غزلیات

ظرافت[۵] و تفریح اس عہد کی خاص چیز ہے اور ذوق اکثر مسکراتے ہوئے پائے جاتے ہیں لیکن بیشتر واعظ و ناصح پر۔ اس کے علاوہ ان کی ظرافت گہری یا پرمعنی یا طنزیہ نہیں محض تفریحی ہوتی ہے اور کبھی ضلع جگت یا رعایت لفظی سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ذوق نہ لاابالی بے فکر بذلہ سنج مصاحب تھے نہ زندگی اور اس کے علائق پر سوچ کر ہنسنے والے مفکر۔ لیکن طبیعت میں شگفتگی تھی اور قلم میں جوش اس لئے اکثر شعروں میں اور بیشتر مجلسوں میں ہنس لیا کرتے تھے۔

---

۵ ذوق زیبا ہی جو ہو ریش سفید شیخ پر — وسمہ آب بنگ سے بیدھی مئے گل رنگ سے

ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا — ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لئے ارمغاں۔ مغاں کیلئے

اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک — ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

اب ذوق بس نہ آپ کو صوفی بنائیے — معلوم ہے حقیقت ہو حق جناب کی

چاہئے زر ان بتان سیم تن کے واسطے — یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

شور قلقل پہ کیوں ہے خنجر زر — کیا کسی آشنا سے لڑائی ہے

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن ہے — ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

ہم ان کی چال سے پہچان لیں گے ان کو جتنے میں — ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار — ہے یہ بھی اس کے اک شجر مکر و فن کی شاخ

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکئے — مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوان صبح

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب — اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

لے ذوق کچھ نہ پایا شب وصل کا مزہ — یا آج صبح ہم نہیں یا طائران صبح

ہوئے انسان ہم درد محبت کے لئے پیدا — فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا — وہ کہیں تم کو کیا ہوا ہم کہیں تم کو کیا ہوا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا — دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

ترا مکاں تو ہے کیا لامکاں میں کوٹھے پہ — امید وصل میں ہم بام عرش پہ چڑھ کر

عام طرز ذوقؔ کی شاعری کا ایک طرح کی گرمی ہے۔ چستی ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی لیکن اُن کی گرمیٔ کلام چستی ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ادنیٰ درجے کی نہ تھی بلکہ ایسی کہ جس لفظ یا محاورے کو یہ باندھ دیتے بڑے بڑے شاعر عاجز ہو جاتے اور اب بھی کسی کو ہمت نہیں جو اُن کے مقابلے میں ان الفاظ یا تراکیب کو اُن سے بہتر باندھے جو انھوں نے باندھی ہیں۔ رنگ اُن کی شاعری کا مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع اور شاہ نصیر کا ڈھنگ تھا۔ معروف کے شعر بنانے میں ولیؔ اور دردؔ کا کچھ رنگ آیا۔ ظفرؔ کی اُستادی میں جراَت، انشاؔ و مصحفیؔ کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اُن کی غزل کا عام رنگ نصیرؔ و ناسخؔ کا ہے یعنی لکھنوی نہ کہ دہلوی۔ عام پہچان ذوقؔ کی غزل کی یہ ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی محاورہ، کہاوت یا روزانہ کا تجربہ ضرور باندھتے ہیں۔

ذوقؔ کی شاعری کی آج کل بہت برائیاں کی جاتی ہیں اور واقعی وہ صحیح ہیں یعنی یہ کہ انھوں نے نظیرؔ کی طرح خارجی شاعری کی۔ نہ دردؔ کی طرح صوفیانہ، نہ غالبؔ کی طرح حکیمانہ، نہ میرؔ کی طرح عاشقانہ یعنی یہ کہ صداقت اُن کے یہاں سرے سے مفقود ہے مگر اس امر میں وہ اپنے ماحول سے مجبور تھے۔ مذاقِ شعری اور نظریہ شاعری اس زمانے میں یہی تھا کہ الفاظ اور اُن کی ترکیب میں غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ مضمون و خیال کو محدود اور بندشِ الفاظ کو لامحدود سمجھا جائے۔ اور اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذوقؔ کو یہ قدرت تمام و کمال حاصل تھی اور اسی بنا پر جو وہ ملک الشعراء بنائے گئے تو اُن کا انتخاب حق بجانب تھا۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا ذوقؔ کی شاعری محض بے کار ہے؟ یہ صحیح کہ وہ طبیعتاً شاعر نہ تھے۔ محض زبان کے ماہر تھے۔ نہ اُن کے یہاں روحانی واردات کے نقشے ملتے ہیں نہ قلبی کیفیات نہ فطرتِ انسانی کا مطالعہ یہ بھی صحیح کہ اُن کو آج کل کے معیار یا کسی معیار سے شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان کی زبان کی خدمات سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا اُردو جو اُن کے زمانے تک بہت وقعت سے نہ دیکھی جاتی تھی اور قلیل عمر کی ہوتے ہوئے ناپختہ اور غیر مربوط تھی۔ اُن کی شاعری اور لفظی تراکیب کی بندش میں آکر مستحکم اور پختہ ہو گئی۔ ہر زبان کی تشکیل میں اس قسم کے مجاہد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ذوقؔ کی شاعری کو کسی طور پر بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بحیثیت شاعر کے نہ مانے جائیں نہ سہی لیکن اگر انھیں محض

قواعد داں ہی سمجھ لیا جائے جس نے زبان کو محفوظ اور مربوط بنانے کے لئے اپنے قواعد اپنے محاورے اپنی صنعتیں منظوم کر دی ہیں۔ تب بھی ذوقؔ کی خدمتِ زبان بہت سے شاعروں کی خدمت ادب پر فوقیت لے جائے گی۔ اُن کے کلام سے زبان کی ارتقا کی اچھی خاصی تاریخ بنائی جا سکتی ہے اور اس لئے کسی ماہر لسانیات کے لئے اُن کا دیوان نادر تحفہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندی اور فارسی کا امتزاج جو عرصے سے کش مکش میں تھا۔ ذوقؔ کے کلام میں پختہ ہو کر اُردو ہو گیا ہے۔ اور یہی اُردو آگے چل کر داغ میں منجھ گئی ہے۔

کیا ذوقؔ شاعر ہو سکتے تھے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض اشعار اُن کے دیوان میں خیالات و جذبات کے اعتبار سے بہت اچھے[۵] ملتے ہیں اور جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر ہو سکتے تھے لیکن شاہ نصیر

---

۵ آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ — پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبے سے اُٹھانا تو ہے آساں — پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا
جب کیا عشق کے دریائے تلاطم اے ذوقؔ — تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا
معنی رنگ خموشی سے جو دل ہو آگاہ — برگ گل میں لب اظہار نظر آتا ہے
اُلفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تو جائے — یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے
پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے — ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے
مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے — نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے — نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ — تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے
ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی — ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی
پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے — حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
آلودۂ اظہار نہ ہو رازِ محبت — دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں نہ کہوں ہے
اے شمع تری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے
تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو — یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے
نہیں وہ رہے ہم سے تم تھے جو پہلے — زمانے کو تو کچھ تغیر نہیں ہے
ق وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے — وہی آسمان اور وہی زمیں ہے
نہ کی آہ سو زخم دل پر اُٹھائے — تجھے آفریں ذوقؔ صد آفریں ہے
چپکے چپکے غم کا کھانا ہم سے کوئی سیکھ جائے — جی ہی جی میں تلملانا ہم سے کوئی سیکھ جائے

کی شاگردی اور ان کے مقابلے نے نیز دیوانِ ناسخ و گوشہ نشینی و بادشاہ اور معروف کی اصلاح و فرمائشات نے انھیں تباہ کر دیا۔ لیکن ان چند اچھے اشعار کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اچھے شاعر ہوتے اس

بقیہ صفحہ ۵۹ بیان دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

امید ہو گئی ہمسایہ حدِ خانۂ یاس
بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لئے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

خوب وفا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس بچپن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

مرتے ہیں تیرے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری جس کے جواب میں

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اے دل وہ سترِ غمزۂ پنہاں نہ عیاں کر
آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا۔ کودنا
ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا، اچھلنا کودنا

آنا تو خفا آنا جانا تو خفا جانا
آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

جلکے اک بار نہ پھرتا تھا جہاں ان مجھ کو
بے قراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا بہ رنگ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

اس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بقدم دل ہوتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جا کر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

تمہارا مجھ کو پاس آبرو تھا
وگرنہ اشک تھم جاتے ابھی سے

ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو چپ ہو گئے
پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھا ہوا

چند غزلیں جو ان کے مذاق کو ظاہر کرتی ہیں۔

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں کو
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے
خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

لئے کہ اتنا سوز و گداز تو فرد و بشر کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اچھے شاعر کی روح کو سراپا گداز ہونا چاہئے
اس لئے اُن کے اچھے اشعار کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مستثنیات ہیں ان کے اپنے اصلی رنگ
سے الگ اور محض اتفاقات جو بیشتر کثرتِ مشق و کمالِ استادی سے یوں رواں خوب صورت اور
عمدہ نکل آئے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا سچ مچ ان کے دل سے نکلے ہیں۔

کہاوتوں، مثلوں کی طرح اُن کے کلام سے اُن کے زمانے کے عقائد و مختلف رسوم[۱۵] کا پتہ بھی چل سکتا

بقیہ صفحہ

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا — گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
آیا ہے دم آنکھوں میں مری حسرتِ دیدار — پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا
آتا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت — پھر دیکھئے آنا بھی ہے دم یا نہیں آتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا — نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا — اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے — الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا — کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں — فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے — مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کہ گرمِ سوزِ دل ہیں تھم گئے و لا ابرِ جگر — تھم جوشِ گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے — اف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
چھیڑتا ہے کس لئے تیرا تصور رات دن — تو تو ہے پردہ نشیں پھر کیوں نظر آجائے ہے
نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانبِ در دیکھے ہے جب کہ ہوش آجائے ہے

قطعہ

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب قہر ڈال رکھا تھا اندھیرا — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — امڈ آتے تھے سینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے

ہے اور ساتھ چند ایسے واقعات[لہ] بھی جو اُن کی زندگی میں خاص وقعت رکھتے ہیں یا وہ نئے نئے
اختراعات ایجادات یا علمی انکشافات جن کا اثر انگریزوں کی آمد کے بدولت لوگوں کے ذہنوں

بقیہ صفحہ

کہاں میں اور کہاں یہ سب اگر تھے — مرے جانب سے تیرے دل میں کینے
سواس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — بھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گا ہے اور گا ہے بٹھایا — مجھے بے تابی دبے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی سے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز کے اور مدینے

لہ ۶۱

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سے بیزار کیا — تین دن جا لے اگر تعویذ میری گور کا
وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد آئی — مرے مرقد پہ جلا اس نے اگر دو شاں باندھا
زلف کی مجھی سے دل مڑتا نہیں — بھوت بھاگے نہ وگرنہ مارے سے
واہ وا شور محبت خوب ہی چھڑکا کہ نمک — استخواں میرا ہما کس کس مزے سے کھائے ہے
ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
وہاں گیسو کا تیرے مارا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

لہ

نہ ہو بے وقر ترک سجدۂ ابلیس سے آدم — عدو کی سرکشی سے ذوق کب رتبہ ہو کم میرا — معترضیں کو جو
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا — میر یوں پر جو
ذوق تنہے ترک وطن میں صاف نقص ابر دیکھ — یکتا پھرتا ہے گہر ہو کر سمندر سے جدا — دکن سے بلا
ان دنوں گرچہ دکن میں ہی بڑی قدر سخن — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر — جانے پر
اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک — لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

چلا تھا۔ ان کے علاوہ ان کی ذاتی سیرت بھی اُن کے بیشتر اشعار سے جھلکتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۶۲ احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں } بارہ ٹوپیوں والے
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل — میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں } واقعے پر

یا اکثر ایسی غزلیں جن میں شاہ نصیر پر چوٹیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں — کہ جیسے جائے لڈی کشتی دُخانی میں
خدا دے دوربینی اور اس چشم تصور کو — کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دوربیں نکلے
خواہ پھرتا ہے فلک اور خواہ پھرتی ہے زمیں — پر ہمارے واسطے یاں منزل راحت نہیں
اس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو — لکھا ایائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو
نہیں کچھ بھی میں وہ فرنگی نژاد — ماہ ہے منزل ہوائی میں
دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں — اب نہ کچھ دین ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

دل فقیر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے — دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا
ملے اکسیر گر اس کشت دخوں سے میں نہ لوں ہرگز — مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا
اے ذوق کس کو چشم حقارت سے دیکھیے — سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر — ہے ذوق برابر انھیں کم اور زیادہ
ہفتاد و دو طریق حسد کے عدو سے ہیں — اپنا یہ ہے طریق کہ باہر حسد سے ہیں
نہیں ہے قانع کو خواہش زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر — جہاں میں مانند کیمیاگر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے
زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بہ شعاری سے — کہ میں نے ان کے منہ میں خاک بھر دی خاکساری سے

گنگا

جناب فرساد صاحب میرٹھی

برف کے محل سے نکلی روح دوڑاتی ہوئی ذوقِ پیدائی کو ہر ذرّے کے چونکاتی ہوئی
اک جہانِ رنگ و بو کو وجد میں لاتی ہوئی آرسی ہر جلوۂ قدرت کو دکھلاتی ہوئی

کیا کسی کی آرزو میں ہے رواں دیوانہ وار
وادی و صحرا سے چھیٹی چیر ڈالا کوہسار

صبح جب اٹکھیلیاں کرتی ہے بادِ خاوری ہے خرامِ ناز اس کا ایک سحرِ سامری
مضطرب کرتی ہے تجھ کو اس کی طرزِ دلبری تیرے ہر قطرے کو تڑپاتی ہے اسکی ساحری

اس کی ہر لغزش سے تیرا شیشۂ دل چور ہے
نور کی موجوں میں تو ڈوبی ہوئی اک حور ہے

ایک آوارہ و سرگرداں شعاعِ آفتاب جس کا جسمِ آتشیں مانندِ حسنِ بے نقاب
مست موجوں نے پلادی اسکو کچھ ایسی شراب تیری سطحِ مرمریں پر ناچتی ہے بے حجاب

تیرا سینہ ہر شعاعِ حسن کا گہوارہ ہے
شاہدِ فطرت کی نیرنگی کا اک نظارہ ہے

اے محبِّ ملک اے سرمایۂ ہندوستاں آبیاری سے تری سرسبز تھا یہ بوستاں
تیری وادی کے ترنم ریز رشیوں کی زباں گا رہی تھی عظمتِ ہندوستاں کی داستاں

تیری موجوں سے پلا تہذیبِ ہندی کا شجر
تیری شفقت اور محبت سے ہوا تھا بارور

لیکن اب تیرے کنارے وہ شجر نادیدہ ہے — ہے فلک فرسا تو زیرِ زمیں پوشیدہ ہے
چشمِ ہندی گلشنِ مغرب کی اب گرویدہ ہے — اس کی سحر آرائیوں سے چشمِ دل خوابیدہ ہے

تیرے سینے میں نہاں ہے اس کا رازِ زندگی
چھیڑ دے پھر محفلِ ہندی میں سازِ زندگی

ایک اشکِ گرم نکلا دیدۂ پُر آب سے — اور لگا کہنے کہ کیا تو چونک اٹھا خواب سے
اپنے دل کو آشنا کر سوز کے آداب سے — نغمۂ دل دوز پیدا کر اسی مضراب سے

سعیِ پیہم سے رُبابِ زندگی پُرجوش ہے
آرزوئے تازہ سے دل حشر در آغوش ہے

پھر قتیلِ آرزو بن پھر شہیدِ جستجو — فکرِ باطل سے نکل گرویدۂ جامِ سبو
فلسفے کی دلقِ بوسیدہ نہ رکھ پھر رفو — پھر دلِ محروم کو دے دعوتِ لاتقنطو

کاروانِ آرزو کو پھر بنا وقفِ رحیل
حاصلِ کشتِ عمل کیا ہے خرامِ موجِ نیل

گرمیِ ہنگامہ تک ہے بزمِ ہستی کا قیام — گردشِ پیہم نہیں تو ہیچ ہیں مینا و جام
ہے کشاکش ہی پہ قائم سارے عالم کا نظام — ہے تگاپوئے رواں دم دہر کا واحد پیام

تیری ہستی سعیِ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں
ہے یہی رازِ بقا، رازِ بقا کچھ بھی نہیں

زندگی غنچہ و گل کیا ہے؟ اک ذوقِ نمو — زندگی حسن و الفت کیا ہے؟ جوشِ آرزو
زندگی عشق و وفا کیا ہے؟ سعیِ جستجو — زندگی دین و ایماں کیا ہے؟ جذبِ لاتقنطو

[illegible]
[illegible]

غزل

(میرزا ثاقب لکھنوی)

حقیقت اگر اپنی تو جانتا ہے
تو بیشک خدا کو بھی پہچانتا ہے

کمالِ ہنر کو وہ پہچانتا ہے
جو اُس فن کا ہر جزو و کُل جانتا ہے

سا اٹھاتا ہے دل ذلتیں ذلتوں پر
مگر میرا کہنا نہیں مانتا ہے

ادھر سر نگوں میں اُدھر میرا قاتل
پئے قتل دامن کو گردانتا ہے

وہ جویائے عزت نہ ہو تو کرے کیا
جو دنیا کی رفتار پہچانتا ہے

طریقِ نیاز اور طرزِ تغافل
یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے

ستمگر مری چپ پہ راضی ہے ورنہ
گلہ کیجئے تو بُرا مانتا ہے

مشیت وہاں ہے بعنوانِ دیگر
یہاں اور کچھ دل میں تو ٹھانتا ہے

صفائی کہاں خاکدانِ جہاں میں
وہ سب کرکرا ہے جسے چھانتا ہے

بری ہوں میں لوثِ گنہ سے مگر دل
مجھے اپنے کردار میں سانتا ہے

سِرِ اتحاد اور رنگِ دوروئی
منافق ہی ممکن اسے مانتا ہے

غنیمت ہے ثاقب کا دم لکھنؤ میں
وہ جو کچھ بُرا یا بھلا جانتا ہے

غزل

(از رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم اے الہ آباد یونیورسٹی (شعبۂ انگریزی)

اب تو میں ہوں اور بھری دنیا کی ہیں تنہائیاں
یاد تھیں مجھکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

تو نے سمجھا ہی نہیں ہے حسن کا رازِ نشاط
تو نے دیکھی ہی نہیں ہیں عشق کی رعنائیاں

جلوۂ لیلیٰ ہوا ہے دل یا غبارِ قیس ہو
حسن بھی پرچھائیاں ہے عشق بھی پرچھائیاں

اب تو غم سی غم۔ خوشی سی بھی خوشی ہوتی نہیں
اے خیالِ یار یہ کیا ہیں نشاط آرائیاں

بے نیازِ قرب و دوری اور گرم جستجو
یہ سکونِ عاشقی یہ بادہ پیمائیاں

سر بسر شورِ بہاراں خوفِ دامِ رنگ و بو
حسن کی پسپائیاں! رسوائیاں! انگڑائیاں!

لے اڑی ہے اک جہاں کو مسکرانے کی ادا
کیا نشاطِ حسن کی بھی ہیں جنوں افزائیاں!

حسن کی کوئی جھلک رکھتی نہیں اپنا جواب
عالمِ کثرت کی بھی دیکھے کوئی یکتائیاں

درد جو دنیا کے دل میں تھے دبے اٹھنے لگے
دھیمے دھیمے چل رہی ہیں عشق کی پروائیاں

بے حجابانہ تری جلوے ہیں۔ لیکن عشق کو
کیوں حریمِ حسن میں آنے لگیں انگڑائیاں

شوخیاں یہ کب حجابِ رنگ و بو میں تھیں فراقؔ
رنگ لائیں رفتہ رفتہ حسن کی رسوائیاں

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

حیات و کلیاتِ اسمٰعیل

اردو ادب کے قدیم و جدید مذاہب میں فورٹ ولیم کالج حدّ فاصل قائم کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کو مشرقی ادب کی "تاریکی" میں رکھ کر جدید مغربی ادب کی "روشنی" سے محروم کرنے ہی کی نیت ہی سے سہی، مگر واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے اس کالج کو قائم کرکے ہندوستان اور بالخصوص اردو ادب میں ایک انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہی وہ پہلا مرحلہ تھا جہاں سے شروع ہو کے اردو ادب نے منزل بہ منزل موجودہ فضا میں قدم رکھا ہے۔

اردو ادب کی خوش قسمتی کہیے کہ اس سفر میں سرسید جیسا قافلہ سالار مل گیا جسے زمانے کے تجربوں نے راہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کی سیاسی معاشرتی اور دینی ہی اصلاح نہیں کی، بلکہ اُن کی زبان اور ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ کسے خبر تھی کہ اُردو شعر و ادب جمالیات کے خرابے سے نکل کر زندگی کے کیف و کم کی ترجمانی کرے گا۔ مگر اسی مسیحا نفس اور اس کے حواریوں کا فیض تھا کہ اس مردے میں پھر سے جان آگئی

مگر نظم میں طرحِ نو کا سہرا غالب کے اور اُن کے ہم عصر حضرت ذوق کے تلامذہ رشید حالی اور آزاد کے سر رہا۔ ان بزرگوں کے ایثار و خلوص ...... ہاں ایثار ہی کہئے کہ اپنے یگانۂ روزگار اساتذہ کے مقبول و مرغوب انداز کو چھوڑ کر ایک بالکل مختلف رنگ اختیار کیا۔ .. نے شعرِ اردو کی کایا پلٹ کردی۔

انقلاب کے اسی دور میں ہمیں ایک اور ایثار پیشہ شاعر نظر آتا ہے اسمٰعیل۔ بظاہر گمنام مگر بباطن شعرِ اُردو کا سچا خادم۔ زیرِ نظر کتاب اسی کے کلام کے مجموعے کا نقشِ ثانی

ت جسے مولانا محمد اسلم سیفی صاحب نے از سر نو ترتیب دیا ہے۔
مولوی اسمٰعیل گمنام تھے اور گمنام ہی رہتے اس لئے کہ اول تو انھیں کوئی سرسید نہیں ملا اور دوسرے انھیں تصوف نے شہرت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مگر صوبہ متحدہ کے ابتدائی اور مڈل مدارس میں اُن کی ریڈروں نے انھیں روشناس کرایا۔ مولانا معاش کے سلسلے میں صوبہ متحدہ کے محکمۂ تعلیمات میں کلرک رہے تھے۔ اس لئے تعلیم سے ذوق پیدا ہونا فطری امر تھا۔ پھر ادب میں صلاحیت خداداد تھی۔ اس لئے حکومت کے ایما سے انھوں نے ابتدائی مدارس کے لئے ریڈریں تالیف کیں جو اس قدر مقبول ہوئیں کہ اُن کو بدلنے کا خیال اس وقت تک نہیں پیدا ہوا جب تک ملکی حالات میں نمایاں تبدیلی نہیں ہو گئی۔ غالباً یہی محرکات تھے جنھوں نے مولانا کو بچوں کے لئے نصیحت آموز نظمیں لکھنے کی طرف مائل کیا اور اُن کی شاعری کا یہی پہلو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس لئے کہ اُن سے پہلے شاعری میں سادگی حقیقت نگاری روانی کا آغاز تو ضرور ہو چکا تھا مگر بچوں کے لئے اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس ضرورت کو مولوی اسمٰعیل ہی نے پورا کیا
مولانا اسمٰعیل نے بچوں کے علاوہ حالی اور آزاد کے رنگ میں اور نظمیں بھی کہیں۔ مثلاً مثنوی جریدۂ عبرت۔ فوائے زمستان وغیرہ مگر بقول سیرت نگار انھیں اور اُن کی نظموں کو وہ مواقع نہیں ملے جو حالی اور آزاد کی کامیابی اور شہرت کا راز تھے۔ مثنوی جریدۂ عبرت مولانا نے مسلمانوں کے تمدن کی زوال پذیری سے متاثر ہو کر لکھی تھی، حالی کے "مدوجزر اسلام" سے ٹکر کھاتی ہے اور غالباً اُن کے سارے کلام کا حاصل ہے مگر اسے "دل کی فریاد" جیسی شہرت بھی تو حاصل نہیں ہوئی
کلیات کے اس نقش ثانی کے ساتھ مولانا کی سیرۃ بھی شامل کر دی گئی ہے سیرۃ نگار نے مولانا کی مکمل اور مفصل سوانح عمری پیش کی ہے اور سیرت نگاری کی ذمہ داریوں کا خیال رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں جوش عقیدت بہت زیادہ ہو گیا ہے اور چند ایسے واقعات

قلم بند کیے گئے ہیں جو مولانا کی سیرت سے غیر متعلق ہیں۔ مثلاً مولانا کے احباب کا شجرہ اُن کے پیر طریقت کے مکمل حالات وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا کے احباب کی صحبت اور ان کے مرشد کی شخصیت نے ان کی سیرۃ پر بہت کچھ اثر کیا مگر صرف اس بات سے مولانا کی سیرت میں اُن بزرگوں کی سیرت کا شمول صحیح نہیں ثابت ہوتا۔

اسی طرح مولانا کی علمی و ادبی حیثیت کے سلسلے میں بھی بعض موقعوں پر قلم کو لغزش ہوئی ہے۔ مثلاً مولانا نے نجم الاخبار کے دیر کی عدم موجودگی میں اس کی چند اشاعتوں کو ترتیب دیا تھا اور مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا۔ سیرت نگار نے اس واقعے کو مولانا کی صحافیانہ صلاحیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے حالانکہ دو ایک اشاعتوں کی ترتیب سے کسی فرد کا صحافی ہونا لازم نہیں آتا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی سیرت مکمل اور جامع ہے اس لئے یہ لغزشیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں

کتاب حیات اور کلیات اسمٰعیل دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حیات بڑے سائز کے ۵۲ ا صفحات اور کلیات ۶ ۱ ۴ صفحات پر محیط ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ اور جلد مضبوط اور خوب صورت ہے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ، سے چار روپئے میں مل سکتی ہے (ب، ع، ف)

نادر خطوط غالب :-

غالب مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط اکثر حضرات کے پاس محفوظ ہیں اور اُن میں اکثر ملک کے ادبی رسائل میں گاہے گاہے چھپ بھی جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ایسے ہی ستائیس خطوط کا ہے جنھیں سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ آپ کے جد امجد جناب کرامت ہمدانی مرحوم کے پاس غالب کے جتنے خطوط آئے تھے انھیں اُن کے صاحب زادے سید شاہ علی حسین عالی ہمدانی نے صاف کرا کے کتابی صورت میں مرتب کر لیا تھا اور تاریخی نام نادر خطوط غالب" رکھا تھا۔ یہ خطوط چند مجبوریوں کی وجہ

سے چھپ نہ سکے۔ اب رسا صاحب نے ان میں سے ستائیس خطوط منتخب کرکے کتاب کی شکل میں شائع کر دیے ہیں۔ جن میں ۲۳ خط کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ تین خط عصفیت بلگرامی کے نام ہیں اور ایک خط صوفی منیری بہاری کے نام۔

پہلے خط کے متعلق جو کرامت ہمدانی مرحوم کے نام ہے۔ رسا صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اُردو زبان میں پہلا خط ہے جو غالب نے لکھا۔ اس کی دلیل میں وہ غالب کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

"شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمھیں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوط کا لکھنا آج سے متروک ہے . . . ."

اس جملے سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو بھی اُردو میں غالب نے خط نہیں لکھا۔ ممکن ہے کہ شاہ کرامت صاحب کو جتنے خطوط پہلے لکھے گئے ہوں ان میں یہ پہلا خط اُردو میں لکھا گیا ہو۔ ہمارے اس شبہہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رسا صاحب کا دعویٰ غلط ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اس امر کی تحقیق ہونا چاہیے اور اس میں وہ باذوق حضرات کافی مدد کر سکتے ہیں جن کے پاس غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اب تک موجود ہیں۔ یہاں اگر ہم اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی اور مسعود حسن صاحب ادیب سے درخواست کریں تو بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے پاس جو خطوط ہیں ان کی روشنی میں وہ اگر اس مسئلے پر کچھ لکھیں تو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ جناب غلام رسول صاحب مہر۔ جناب اکرام صاحب۔ مالک رام صاحب اور عرشی صاحب رام پوری کے لئے بھی اس میں کچھ کم دلچسپی نہیں ہے۔ ان سے بھی امید ہے کہ وہ خامہ فرسائی فرمائیں گے۔

آخر میں رسا صاحب سے ایک بات کہنی ہے وہ یہ کہ اگر وہ تاریخی نام کی رعایت نہ فرماتے اور بجائے ۲۷ خطوط کے تمام خطوط ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دیتے تو اُردو ادب ایک بڑی دولت سے مالا مال ہو جاتا۔

ایسے گراں قیمت شہ پاروں میں انتخاب کرنا ادبی بخل ہے ۔ یہ مجموعہ کا شانۂ ادب گھسیاری
منڈی لکھنؤ سے آٹھ آنے میں مل سکتا ہے (ص ۔ ا ۔ ص)

فوسٹ :-

مترجمہ شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی ۔ ساقی بک ڈپو ۔ دہلی ۔ قیمت عہ
مشہور جرمن شاعر اور مفکر گوئٹے کے ڈرامے فاوسٹ کا ترجمہ تو پہلے سے اردو میں
موجود ہے لیکن شاہد احمد صاحب نے اسے فلم کے لیے لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ اس نئی صورت
میں پیش کرنے کی وجہ سے انھیں رنگ آمیزیاں کرنا پڑی ہیں اور کافی تصرف بھی کرنا پڑا ہے
مناظر کی ترتیب بدل دی گئی ہے ۔ بعض مناظر اصل ڈرامے کے چھوڑ دیے گئے ہیں یا بعض
بڑھائے ہیں ۔ لیکن خاکہ وہی گوئٹے کا ہے ۔ البتہ اس ردّو بدل سے قصّے کی دلچسپی میں
اضافہ ہوگیا ہے ۔ گوئٹے کے فاوسٹ کو سمجھنے کے لئے یہ ایک بہترین تعارف کا کام دیتی ہے
جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے شاہد احمد صاحب بہت کامیاب رہے ہیں ۔ عبارت صاف
سلیس، رواں اور شگفتہ ہے ۔

سات ستارے :-

ناشر سید وصی اشرف دہلوی ۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی ۔ قیمت عہ
سات افسانہ نگاروں نے ایک ہی پلاٹ پر افسانے لکھے ہیں ۔ افسانے کا پلاٹ
[illegible] ایک عورت [illegible] کرنے لگتے ہیں ۔ ایک دوسرے
سے [illegible] دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ۔ پھر ایک عورت سے اس مرد کا واسطہ
[illegible] اور [illegible] ہو جاتی ہے ۔ شادی ہو جاتی ہے ۔ اور سابقہ خط کتابت ختم ہو جاتی
ہے [illegible] مصروف رہنے لگتا ہے ۔ پھر کچھ [illegible] پیدا ہو جاتی ہے

اور آدمی ناخوش ہوکر پھر پہلی خط کتابت کا سلسلہ قائم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اتفاقیہ واقعے سے یہ بھید کھلتا ہے کہ میاں بیوی ہی ایک دوسرے کو خط لکھ رہے ہیں۔" جب حقیقت کا انکشاف ہوجاتا ہے تو کیا گذری ہوئی بہاریں پھر لوٹ آتی ہیں۔ یا حقیقت خواب کو برباد کردیتی ہے ان سوالات کا جواب ہر افسانہ نگار نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق دیا ہے۔ اور افسانہ نگاری میں یہ ایک انوکھی اور دلچسپ چیز ہے۔ بہتر تھا کہ صادق الخیری صاحب کا افسانہ انکشافِ حقیقت بھی جو اسی پلاٹ پر ہے اس میں شامل کرلیا جاتا۔

فرہنگِ عامرہ :-

از عبداللہ خاں خویشگی۔ فیروز منزل متصل جامع مسجد، خورجہ (یوپی)، قیمت عـ۸ـہ

عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی یہ لغت عبداللہ خاں صاحب نے نہایت کاوش سے اور بہت اچھی تیار کی ہے۔ مولف نے اس میں دو باتوں کا خاص التزام رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ عربی فارسی کے بہت سے الفاظ کا املا ایک ہی ہوتا ہے لیکن اعراب میں اختلاف ہونے کی وجہ سے اس کے معنی میں بڑا تغیر ہوجاتا ہے۔ مولف نے تمام الفاظ پر اعراب دے دئے ہیں تاکہ تلفظ میں غلطی نہ ہونے پائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض الفاظ پر کے چہروں پر اتنے پردے پڑے ہوتے ہیں کہ باوجود صحیح املا ہونے کے ان کا صحیح تلفظ نہیں ہوسکتا۔ مولف نے اس دقت کو آسان کرنے کے لئے اس لفظ کے سامنے اس کا براہِ راست تلفظ درج کردیا ہے مثلاً لفظ آبائی کو اس کے سامنے قوسین میں اس طرح لکھ دیا ہے آ ، بَا ، اِی تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح تمام لفظ لکھے ہیں۔ یہ طریقہ دراصل انگریزی ہے لیکن اردو یا فارسی لغات میں ہندوستان میں ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

الفاظ کی واحد، جمع بھی دی گئی ہے نیز کثیر الاستعمال فارسی مصادر کے نیز ان مضارع

کے سماعی اور قیاسی مشتقات بھی درج کردیے گئے ہیں۔ زمانہ حاضرہ کے نئے معربات اور مفرسلت بھی شامل کئے گئے ہیں۔ تقریباً چالیس ہزار الفاظ ہیں۔ جن کا اعراب کے ساتھ صحیح چھپ جانا بھی ایک کارنامہ ہے۔

گذشتہ میں لغات کی تدوین اکثر تجارتی امور کی بنا پر ہوتی رہی۔ اس کو ایک فن نہیں بنایا گیا یعنی اس کی تدوین میں تہذیب اور تجدید سے کبھی کام نہیں لیا گیا۔ اس لئے عبد اللہ خاں صاحب کی یہ کاوش اور بھی قابل داد اور لائق ستائش ہے۔ اردو دانوں کے لئے بھی یہ لغت بہت مفید ہے۔ کیوں کہ اردو میں کافی الفاظ عربی، فارسی اور ترکی کے شامل ہیں۔

لالہ رُخ :-

مترجمہ ل، احمد اکبر آبادی۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت ۱۲؎

طامس مور کی مشہور مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ جناب لطیف الدین احمد صاحب کا یہ ترجمہ بہت عرصہ ہوا نگار میں چھپا تھا اور اس کا پہلا سادہ اڈیشن بھی نگار بک ڈپو سے نکلا تھا۔ موجودہ اڈیشن مصور اڈیشن ہے۔ ناشرین نے خاصی تعداد میں تصویریں پیش کی ہیں۔ سرورق کی تصویر خاص کر خوب ہے۔ مور کی یہ مثنوی اتنی زیادہ کامیاب اور مشہور ہو چکی ہے کہ مور کا نام لینے سے لالہ رُخ اور لالہ رُخ کے نام پر مور کا خیال فوراً آجاتا ہے۔ مختصر پلاٹ یہ ہے کہ بخارا کا فرماں روا اورنگ زیب کا مہمان ہوتا ہے۔ قیام کے دوران میں اس کے ولی عہد اور دہلی کی شہزادی لالہ رُخ کی نسبت قرار پا جاتی ہے اور یہ بھی طے پاتا ہے کہ شادی کی رسم کشمیر کی وادی میں عمل پذیر ہو۔ شاہ بخارا نے جو خدام اور کنیزیں عروس کی معیت کے لئے روانہ کیں ان میں ایک کشمیری مغنی فرامرز بھی تھا۔ جو ہر منزل پر لالہ رُخ کو کہانیاں گا گا کر سنایا کرتا تھا۔ لالہ رُخ اس نوجوان کی

بے حد مانوس ہوگئی۔ بعد میں وہی اس کا شوہر نکلتا ہے۔

ادب عالیہ کا ترجمہ کرنا واقعی مشکل ہوا کرتا ہے۔ اگر مترجم میں پاکیزہ ذوق، ادب اور لطیف شاعرانہ دل و دماغ نہ ہو تو اس مرحلے سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ لطیف صاحب واقعی اس ترجمے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ موثر کی ر ومانی اور پرکیف طرز اسلوب کے ساتھ حتی الامکان پرواز کی ہے۔

تاریخ اسلام (حصہ اول) :-

شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ۔ قیمت ستے،

انجمن دارالمصنفین اعظم گڈھ نے تاریخ اسلام کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو تقریبًا دس بارہ جلدوں میں ختم ہوگا۔ یہ پہلی جلد پیش نظر ہے۔ اور عہد رسالت و خلافت راشدہ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ غلط مشتبہ۔ مختلف فیہ اور قابل تحقیق واقعات پر بحث و تنقید کے بجائے مولف نے محض واقعات دے دیئے ہیں اور ان کی تشریح قاری کی ذہنیت پر چھوڑ دی ہے۔ یہ سلسلہ بہت مفید ہے۔ خدا کرے بخیر انجام پائے۔

حیات کیا ہے :-

از محشر عابدی صاحب۔ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی۔ قیمت عہ

اُردو میں سائنس کی کتابوں کی بیحد کمی ہے۔ محشر عابدی صاحب نے مختلف کتابوں اور رسالوں سے مواد اخذ کر کے حیات اور اس کی ابتدا و ارتقا کو آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے بہت سی رنگین اور سادہ تصویریں بھی سمجھانے کی خاطر دے دی گئی ہیں۔ طلبار حیوانیات کو اس کتاب سے بہت مدد ملے گی۔

امید ہے کہ عابدی صاحب آئندہ بھی ایسی مفید کتابوں سے اردو کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

حکایات رومی (حصہ اول)

مترجمہ لبیب صاحب۔ انجمن ترقی اردو۔ قیمت ۹ر

مولانا روم کی مثنوی میں بہت سی حکائتیں اخلاقی مسائل کو سمجھانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ عام اردو دان طبقہ نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا تھا نہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ انجمن ترقی اردو نے نظام شاہ صاحب لبیبؔ سے اس کا ترجمہ کرایا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ترجمہ تو اچھا کیا ہے لیکن دکنی اور دہلی کے پرانے محاورے رکھ دیئے ہیں جو شمالی ہند کے پڑھنے والوں کی سمجھ میں مشکل سے آتے ہیں بعض جگہ نظر ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ تاہم ترجمہ بحیثیت مجموعی اچھا ہے اور کتاب بہت مفید

اخوان الصفا:۔

مترجمہ مولوی اکرام علی مرحوم۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ قیمت مجلد ۱۴ر غیر مجلد ۸ر

اخوان الصفا کے صحیح ترجمہ کی اردو میں بہت ضرورت تھی۔ پیش نظر ترجمہ مولوی اکرام علی صاحب نے ۱۸۱۰ء میں ولیم ٹیلر صاحب کے ایمار سے کیا تھا زبان اس کی حالانکہ پرانی ہے لیکن مطالب صاف و صحیح ہو جاتے ہیں۔

اخوان الصفا کے مصنفین کے متعلق مختلف روایات رہی ہیں۔ لیکن اتنا مسلم ہے کہ ایک جماعت بصرہ میں تھی (جس میں ابو سلمان ابوالحسن ابو احمد وغیرہ نام بتائے جاتے ہیں) جو آخر دور عباسیہ میں مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنے کے لئے مختلف مضامین گمنام طور پر لکھا کرتی تھی۔ آج کل یہ مضامین عربی ادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

منجملہ اکاون رسالوں کے یہ رسالہ انسانوں اور حیوانوں کے مناظرہ پر ہے
رسالہ کا مقصود یہ ہے کہ حقایق و معارف حیوانوں کی زبان سے ادا کئے جائیں تاکہ
"غافلوں کو اس کے دیکھنے سے کمالات حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہووے" انجمن
ترقی اردو نے اس ترجمہ کو اردو میں پیش کر کے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔

ارمغان باز :۔

ایک ۳۲ صفحہ کا چھوٹا سا مجموعہ کلام تراب علی خاں صاحب باز حیدرآبادی
چھپوایا ہے۔ بندش الفاظ و محاورہ کی طرف طبیعت زیادہ موزوں ہے۔ اکثر محاور۔
خالص حیدرآبادی ہیں۔ طرز قدیم ہے۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تراب علی خاں صاحب
تخلص بدل دیں کیونکہ سنجیدہ مضامین کے ساتھ یہ زیب نہیں دیتا۔ "لیلیٰ کا منظوم خط"
اس سنجیدہ مجموعہ میں نہیں پھبتا۔ "سرسری نظر" کی ضرورت نہیں۔
مجموعہ پر قیمت درج نہیں۔ کاشانہ باز، بازار گھانسی میاں۔ حیدرآباد سے مل سکتا۔

کیوں اور کیسے :۔

از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی اے۔ ضخامت ۱۰۲ صفحے سائز چھوٹا کتابت وطباعت
اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ :۔ نظامی پریس بدایوں۔
اس کتاب میں بہت سے عنوانات پر سوال قائم کر کے اُن کے جواب دئے گئے
ہیں طرز بیان بہت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ اس قسم کی ایک کتاب لاہور سے بھی شائع
ہو چکی ہے لیکن یہ اس سے زیادہ کارآمد ہے۔ بچوں کے علاوہ معمولی استعداد کے لوگ
بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ قیمت ۱۲ر ذرا زیادہ ہے۔

رسالہ جات

عالمگیر :-

حسب عادت عالمگیر کا سالنامہ اس سال بھی بہت خوبصورت شائع ہوا ہے اور اسکے مضامین بھی اچھے تحقیقی اور مفید ہیں۔ قیمت غالباً عہ رہے۔

طبیہ کالج میگزین علی گڑھ :-

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے طب کے متعلق یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین طلبار کے لئے بہت مفید ہیں۔ "فلسفہ طب" خصوصیت سے عام قارئین کے لئے بھی دلچسپ ہے

ہندوستان میں السی کی تجارت :-

السی کی تجارت کے متعلق یہ رسالہ گورنمنٹ آف انڈیا سے موصول ہوا ہے۔ ہندوستان میں سب جگہ اس کی تجارت کے بارے میں جو جانچ پڑتال کی گئی تھی اس کے نتیجے اس رپورٹ میں دیئے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو اس کی تجارت سے تعلق ہو اُن کو نیز اسکولوں زراعتی کالجوں اور گاؤں سدھار والے محکموں کو اس رپورٹ سے بہت مدد ملے گی۔ ہر گورنمنٹ کی مطبوعات فروخت کرنے والے کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔ قیمت ۱ھر

رسید کتب :-

ترک اور جنگ عظیم	عبدالرب صاحب وکیل الہ آباد
متاع حق	امیر احمد صاحب وکیل۔ بجنور
شہزادی نیلوفر	عصمت بک ڈپو دہلی
وداع راشد	"

سندھیا کمپنی حجاج کی خدمت کے لئے آج بھی تیار ہے
مگر حکومت اُسے موقع نہیں دیتی

حکومتِ ہند کا یہ بیان غلط ہے کہ سندھیا کو شرح کرایہ میں اضافہ پر اصرار تھا

برطانوی جہاز راں کمپنی کی اجارہ داری قایم رکھنے کیلئے حالاتِ جنگ کا عذر لنگ

حج ٹریفک کی تقسیم میں صرف جہازوں کی تعداد نہیں بلکہ انکی رفتار اور کارناموں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے

حکومتِ ہند کے سرکاری اعلان کا سندھیا کے صدر کا مسکت جواب

بمبئی ۱۵ر نومبر۔ سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی کے صدر نے مندرجہ ذیل بیان اخبارات کو دیا ہے جیسا یہ

۱ حج ٹریفک کی تقسیم کی حمایت میں حکومت ہند نے جو کمیونک شائع کیا ہے اس پر تنقید کی ہے۔

۲ حکومت ہند نے اپنے اس کمیونک میں جو اس نے حال ہی میں شائع کیا ہے لکھا ہے کہ اس نے حج ٹریفک میں مداخلت اس وجہ سے کی تاکہ حالاتِ جنگ میں جہازوں کا استعمال انتہائی اقتصادی طریقہ پر کرے اور اسی بنا پر اس نے حاجیوں کے جہازوں کی روانگی کا تعین کر دیا ہے اور اس تجارت کا غالب حصہ غیر ملکی کمپنی کو دیکر صرف ۲۵ فیصدی کا معمولی اور بہت ہی کم حصہ ہندوستان کی قومی کمپنی کو دیا ہے۔ درحقیقت اس فیصلہ میں حکومت کی متذکرہ بالا خواہش کارفرما نہیں ہے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ حاجیوں کی لائن میں کام کرنے والی برطانوی جہاز راں کمپنی مغل لائن کی اجارہ داری کو قایم رکھا جائے اور ہندوستان کی بحری تجارت میں برطانوی اثر و تسلط کو قایم رکھے۔

حکومت کا دعوی ہے کہ اسے جہازوں کی ایک محدود تعداد فراہم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی "حاجیوں کو لانے لیجانے کا کام کرنیوالے دس جہاز ہیں اور یہ دسوں جہاز اس مقصد کیلئے حاصل ہو سکتے تھے اس تجارت میں سوا ایک جہاز بھی نہیں نکالا گیا حکومت کا خود یہ بیان ہے کہ دونوں کمپنیوں میں حج ٹریفک کی تقسیم کرتے وقت انھوں نے ان جہازوں میں حاجیوں کے لیجانے کی جگہ ہے اس کا لحاظ رکھا ہے ان دسوں جہازوں سے ہر ایک صرف دو بار بھی اگر سفر کرے تو تیئیس ہزار

سے زیادہ حاجی لیجا سکتے ہیں جو گیارہ ہزار کی تعداد کا دوگنا ہے جو بالعموم پچھلے چند سالوں میں حج کو جانے والوں کی تعداد رہی ہے۔
ایسی حالت میں اس بنا پر کہ جو جگہ حاصل ہو سکتی ہے اس کے بہترین اقتصادی استعمال کے خیال سے اس ٹریفک میں حکومت
کی مداخلت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب کی موسم میں کافی دیر ہو چکی ہے اور جتنے حاجیوں کے جانے کی توقع ہے اسے دیکھتے ہوئے
اس سال ان دس جہازوں میں سے شاید چار ہی جہاز اس کام کے لئے کافی ہو جاتے۔ اگر حکومت ہند کی یہ خواہش تھی
کہ جہازوں کا اقتصادی استعمال کیا جا سکے تو اس کے لئے یہ ضروری ممکن تھا کہ جتنے جہازوں کی ضرورت ہوتی اتنے جہاز
طلب کرتی اور حج سروس کے لئے انہیں تیار رکھتی۔ مگر اس طرح پر اس کاروبار میں مداخلت کرنا اور جنگی حالات اور جہازوں
کے اقتصادی استعمال کے پردے میں اس تجارت کا غالب حصہ غیر ملکی کمپنی کو دیدینا صرف ہندوستانی کمپنی کے ساتھ ناانصافی
کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ ہندوستانی جہازراں کمپنی کا قدم پیچھے ہٹ جائے گا اور جو ہندوستان کی بحری
تجارت کے معاملہ میں ہندوستان کی قومی جہازرانی کے مستقبل کو بھی خطرے میں ڈال دیگا۔

تقسیم کی غلط بنیاد

حکومت ہند کہتی ہے کہ حج ٹریفک کی تقسیم اس نے اس بنیاد پر کی ہے کہ جہازوں میں کتنے حاجی جا سکتے ہیں
اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا ہے کہ جو تقسیم کی گئی ہے وہ تھوڑی سی سندھیا کے حق میں ہے۔ اگر اتنی سی بھی بات ہوتی تو
ہم اس پر خوش ہوتے۔ مگر کیا حکومت ہند نے اس تجارت میں چلنے والے جہازوں کی رفتار اور ان کے کارنامہ
کو بھی اس سلسلہ میں ملحوظ رکھا ہے؟ مغل لائن کے جہازات اوسطاً ۱۳۳۳ حاجی فی جہاز لے جا سکتے ہیں۔ مگر پچھلے سال
میں وہ صرف ۷۰۰ حاجی اوسطاً لیجا سکے۔ برخلاف اس کے سندھیا کے جہازوں کا اوسط ۹۶۰ حاجی فی جہاز
ہے اور گذشتہ سال وہ اوسطاً فی جہاز ۹۴۰ حاجی لیجا سکے۔ صرف دو جہاز چلا کر سندھیا کمپنی کل حاجیوں پر
۴۲ فیصدی لیجا سکی۔ اس سال اس نے قبل ہی تین جہاز چلانے کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر سندھیا کے جہازوں
کی رفتار اور پچھلے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے کہیں زیادہ حصہ لیجاتی جتنا اسے حکومت نے ناانصافی کر کے
دینا چاہا ہے۔ سندھیا کے جہازوں کی رفتار اور ان کا پچھلا ریکارڈ اگر سامنے رکھا جاتا تو حکومت کو اس سے
کہیں زیادہ حصہ سندھیا کو دینا پڑتا۔ جتنا کہ اسے اب دیا گیا ہے۔ لیکن اگر حکومت نے ہندوستان کی بحری
تجارت میں قومی جہازرانی کو فروغ دینے کے متعلق جو وعدے کئے ہیں وہ اگر پورے کرنے ہوں تو ہم

میرے خیال اور علم میں ہر ہندوستانی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ سندھیا کمپنی کو اس تجارت میں ۵۰ فیصدی کا جو قلیل حصہ حکومت نے دیا ہے اس سے کہیں زیادہ حصہ اسے ملنا چاہیئے تھا۔

حکومت ہند جب یہ کہتی ہے کہ وہ سندھیا کمپنی کی تجاویز منظور نہ کر سکی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حاجیوں کا کرایہ کراچی سے دو طرفہ ۲۱۵ روپیہ حالات جنگ کی وجہ سے کر دیا جائے۔ حالانکہ مغل لائن تمام حاجیوں کو گذشتہ موسم زیادہ سے زیادہ کرایہ پر یعنی کراچی سے دو طرفہ ۱۶۰ روپیہ لیجانے پر تیار تھی۔ جو صرف حکومت ہند سندھیا کمپنی کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتی رہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حکومت ہند نے خود ہی جب یہ دریافت کیا کہ اقتصادی شرح کرایہ حالات جنگ میں کیا ہونا چاہیئے تو سندھیا کمپنی نے نمائندے نے یہ کہا کہ جہازرانی کے اخراجات میں اضافہ اور جنگی خطرے کے بیمہ میں زیادتی وغیرہ کے پیش نظر اقتصادی طور پر کمپنیوں کے لئے مناسب کرایہ ہوگا کہ گذشتہ سال کے زاید کرایہ پر ۲۰ فیصدی کا اضافہ کیا جائے۔ سندھیا کمپنی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اگر یہ نرخ مقرر نہ کیا گیا تو وہ حاجیوں کے لے جانے کے لئے اپنے جہازات کھڑے نہیں کرے گی یا حاجیوں کو نہیں لے جائے گی۔ مزید برآں حال ہی میں مغل لائن خود بھی یہ کہہ چکی ہے کہ بحالات موجودہ جہازوں کو چلانے کے خرچ میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ سے تمام لائنوں میں کرایہ بڑھ گیا ہے لیکن آئندہ حج کے جم اکبر ہونے کی توقع سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ گذشتہ موسم کے کرایہ میں اضافہ نہ کریں"۔

اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ ہر کوئی یہ سمجھتی مغل لائن نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جہازوں کے چلانے کے اخراجات میں جنگ ہونے کی بنا پر اضافہ جائز ہوگا۔ مگر مغل لائن ان خاص اسباب کی بنا پر جو مشہور و معروف ہیں اقتصادی شرح کرایہ سے کم کرایہ پر حاجیوں کو لیجا رہی ہے۔ گذشتہ سال تک بھی ۱۶۰ روپیہ کے مقررہ نرخ سے کم نرخ خود مغل لائن کی بھی لائن میں اقتصادی حیثیت سے منافع بخش نہ تھا اور جب کبھی کسی نئی سہولت کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو برطانوی کمپنیوں کی طرف سے یہ جواب ملتا تھا کہ اس صورت میں کرایہ بڑھانے کی ضرورت ہوگی ایسی حالت میں ہندوستان کی قومی کمپنی پر اعتراض کیوں کیا جائے۔ دراصل اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ اقتصادی حیثیت سے کونسی شرح کرایہ موجودہ جنگی حالات

یں مناسب ہو سکتی ہے۔ اگر حکومت حجاج کے فائدے کے خیال سے جہاز رانی میں مداخلت کرتی ہے تو پھر
اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس بات کو بھی دیکھیں کہ کون سا نرخ اقتصادی لحاظ سے مناسب ہوگا۔

باوجودیکہ جنگ کی وجہ سے جہازوں کے چلانے کے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے پھر مغل لائن
کا اس بات پر رضامند ہونا کہ وہ اس موسم میں بھی حاجیوں کو اسی نرخ پر لیجائیگی جو کہ گذشتہ سالوں میں
زیادہ سے زیادہ نرخ رہا ہے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کمپنی کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس ریٹ وار
کو جو اس نے اس تجارت میں ہندوستان کی قومی کمپنی کے قدم رکھتے ہی شروع کی ہے جاری رکھے۔

میں اتنا اور کہوں گا کہ سندھیا کمپنی کے جہازات کی روانگی ملتوی کرنے کے فیصلے میں اقتصادی شرح
کرایہ کے بحث کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پار سال حکومت کی مداخلت نے جو ۱۱۵ روپیہ کی
شرح کرایہ طے پائی تھی وہ بھی غیر اقتصادی تھی لیکن اس کے باوجود سندھیا کمپنی نے اپنے
جہازات کی روانگی بند نہیں کی بلکہ اپنے جہاز اس نے بندرگاہوں میں کھڑے رکھے اور حاجیوں کو
برابر لیجاتی رہی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ حاجیوں کی خدمت کرے۔ میں حاجیوں کو اس بات کا یقین
دلاتا ہوں کہ سندھیا کمپنی اس بات کے لئے تیار اور رضامند تھی اور اب بھی تیار اور رضامند
ہے کہ حکومت نے جو شرح کرایہ مقرر کیا ہے اس پر حاجیوں کو جدہ لیجائے۔ باوجودیکہ بلاشک شبہ
وہ شرح اقتصادی نہیں ہے۔ لیکن سندھیا صرف اتنا چاہتی ہے کہ حج ٹریفک کی موجودہ تقسیم پر
حکومت نظر ثانی یا اس موسم حج کے لئے کوئی دوسرا ایسا منصفانہ فیصلہ کرے جس سے
ہندوستان کی قومی جہاز رانی کی پوزیشن پر اس وقت یا مستقبل میں کوئی برا اثر نہ پڑے۔
سندھیا کا مقصد یہ ہے کہ حتی الامکان حاجیوں کی خدمت کرے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اس
خدمت کے لئے اس موسم میں بے بس پاتی ہے کیونکہ حکومت کا غیر منصفانہ فیصلہ قومی
جہاز رانی کے حق میں نقصان رساں ہے اور جو ہندوستان کی بحری تجارت میں ہندوستان
کے مفاد پر ضرب کاری ہے۔

دی مغل لائن لمیٹیڈ بمبئی قائم شدہ ۱۸۷۷ء

زیارت کعبہ کے لئے گذشتہ ساٹھ سال کو حاجیوں کو لیجانے والا اولین اور خصوصی جہاز

زائرین کعبہ کیلئے مژدہ

حکومت ہند نے حاجیوں کے سفر حجاز کیلئے انتظام کردیا ہے اور اب آپ اپنی حج کی دیرینہ اور پاکیزہ آرزو کو پورا کرسکتے ہیں "مغل لائن" زائرین حج کے لئے ہر قسم کی سہولت فراہم کرتا ہے۔

روانگی کی تاریخیں

ایس، ایس "خسرو" ۳۴۴۰۴ ٹن۔ بمبئی سے ۱۰ دسمبر ۳۹ء کو چلیگا اور کراچی سے ۱۲ دسمبر ۳۹ء کو

ایس، ایس "اسلامی" ۹۷۰۵۵ ٹن۔ بمبئی سے ۱۰ دسمبر کو چلے گا اور کراچی سے ۱۲ دسمبر ۳۹ء کو

مشروط روانگی

ایس، ایس "رضوانی" ۵۴۴۰ ٹن بمبئی سے ۲ جنوری ۴۰ء کو چلے گا اور کراچی سے ۵ جنوری ۴۰ء کو

بشرط ضرورت آخر میعاد تک خاص جہازات بھی روانہ کئے جاسکیں گے۔

کرایہ واپسی! جس میں کھانا، صفائی کے اخراجات اور بیماری کے دنوں میں علاج معالجے کی فیس شامل ہے۔

	بمبئی تا جدہ	کراچی تا جدہ
درجہ اول	۶۲۱ روپیہ	۵۹۱ روپیہ
درجہ دوم	۴۴۶ روپیہ	۴۲۲ روپیہ
ڈک (چھت)	۱۶۳ روپیہ	۱۶۷ روپیہ

حاجیوں کو لے جانے والے جہازات اور ان کی روانگی نیز کرایہ وغیرہ کے متعلق تفصیلی معلومات کیلئے مندرجہ ذیل پتوں پر خط و کتابت کیجئے۔

میسرز ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹیڈ بمبئی

میسرز گرے میکنزی اینڈ کمپنی لمیٹیڈ کراچی

میسرز ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹیڈ کراچی

ہفتہ وار

حمایت اسلام میں

مسائل حاضرہ پر عالمانہ بحث ہوتی ہے

تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور قومی ضروریات پر ہر ہفتہ مفید ترین مضامین شائع کئے جاتے ہیں

معلومات عامہ

کے زیر عنوان بڑی محنت اور عرق ریزی سے بے حد دلچسپ مضامین جمع کئے جاتے ہیں۔

دنیا کی ہفت روزہ ڈائری میں

عالم اسلام، ہندوستان اور دنیا بھر کے اہم ترین واقعات کو دلکش انداز میں خلاصہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے

نئے انتظام کے ماتحت "حمایت اسلام" کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ اس کی جدید خوبیوں کی وجہ سے اسے چار چاند لگ گئے ہیں۔ نمونے کا پرچہ مفت مطالعہ کریں۔ آپ کو خود بخود ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

سالانہ چندہ صرف تین روپے پیشگی

ممالک غیر سے چار روپے آٹھ آنے

المشتہر: مینیجر حمایت اسلام برانڈرتھ روڈ لاہور

مطبوعات امیریہ دار التصنیف و تالیفات لکھنؤ

دیوان ثاقب:۔ یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیں قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں، حجم پانچسو پچاس صفحات۔ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ہے (علاوہ محصول ڈاک)

انیس اخلاق:۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سنو رباعیاں مختصر مقدمے کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و تالیف نے مرتب کی ہے اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع:۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہجائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لیے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں قیمت ۲ر علاوہ محصولڈاک

مفتاح البیان:۔ حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین ابوالبیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروی مولفہ جواہر البیان وغیرہ

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید کتاب

قیمت ہر حصہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

شمالی ہندوستان کا مشہور ہفتہ وار اخبار

دورِ جدید لاہور

جو گذشتہ دس سال سے نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اپنی ذمہ دارانہ روش پر متانت طرزِ تحریر اور بلند اخلاق کے لئے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

معاصرین کرام کی آراء

لاہور کے ہفتہ وار اخباروں میں "دورِ جدید" ممتاز حیثیت رکھتا ہے مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور مفید ہے۔ (معارف)

اس میں ایک ہفتہ وار اخبار کی تمام خصوصیات موجود ہیں، ایڈیٹر صاحب پرچے کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں (جامعہ)

ترتیب شگفتہ مقالات پُر فکر پیرائے میں صحت و ریاضت مضامین معلومات کا اچھا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ (النجم)

اس کی خبروں کا انتخاب پنجاب کے ہفتہ وار اخباروں میں سب سے بہتر ہوتا ہے۔ (ہمدرد)

نہایت قابلیت سے ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو مختلف اخباروں سے بے نیاز کرتا ہے (مصباح)

لاہور سے آجکل جس قدر اخبارات شایع ہوتے ہیں۔ روزانہ چھوڑ کر ہفتہ وار اخباروں میں "دورِ جدید" خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ (ندیم)

"دورِ جدید" اردو کا بہترین ہفتہ وار اخبار ہے۔ (دلچسپ)

نوٹوں میں معقولیت اور کسی پر اعتراض کرتے وقت نہایت شرافت کو مدِ نظر رکھتا ہے (پیغامِ صلح)

بڑی محنت سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ عام مروجہ بیسیوں اور مفید معلومات سے اس کا کوئی نمبر خالی نہیں ہوتا۔

سالانہ قیمت چار روپیہ (للعہ) — فی پرچہ ۱ر

مینیجر "دورِ جدید" اندرون شیرانوالہ دروازہ لاہور

فرصت کے اوقات ہنسی خوشی گذارنے کے لئے

زندگی کو خوش گوار بنانے اور تفکرات کو دور کرنے کے لئے

ہندوستان کے مشہور مزاح نگار

حضرت شوکت تھانوی

کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار

سرپنچ لکھنؤ

کی خریداری فرمائیے۔ چندہ سالانہ ہے۔ ایک پرچہ پڑھ کر آپ ہمیشہ خریدار رہیں گے۔

ملنے کا پتہ

سرپنچ جنرلس لکھنؤ

باپ کا سوال بچّے سے

تعلیم یافتہ باپ نے بچے سے سوال کیا (۱) زمین کو کس طرح تولا جاسکتا ہے۔ (۲) بادل میں سے پانی ایک ساتھ کیوں نہیں گرتا (۳) بلی کی آنکھیں رات میں کیوں چمکتی ہیں؟ تو اس نے کہا کہ باتیں تو مجھے کسی نے بھی نہیں بتائیں تب باپ نے اس کو رسالہ

معلومات

پڑھنے کے واسطے دیا جس سے اس کو اس طریقہ کی ہزاروں نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کے علاوہ اسمیں قصے کہانیاں اور کھیل بھی بہت اچھے اچھے تھے جن کو پڑھ کر بچہ بہت خوش ہوا۔

مینیجر رسالہ "معلومات" اسلامیہ اسکول اٹاوہ

کو خط لکھ کر مانتی قیمت پر اس رسالہ کو حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کیجئے۔

تنویر بمبئی

اس کا تمام تر انتظام خواتین کے ہاتھوں میں ہے اور ہندوستانی عورتوں کا پہلا پرچہ ہے جو مکمل
ی وطن کو فرض اولین قرار دیتا ہے۔ جو مشترکہ قومیت کا علمبردار ہے، جو محبت اور انسانیت کا پرچار
علم و ادب شعر و سخن کا رنگین مرقع ہے، عزم و حوصلہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس کا نعرہ ہے کہ طاقت حاصل
و ہر اس چیز کو پاش پاش کر ڈالو جو انسانیت، سچائی، محنت اور ترقی میں سد راہ ہو۔
۸۰ صفحات، خوبصورت اور رنگین سرورق، باتصویر، معیاری مضامین، انقلابی افسانے اور
فشاں نوٹ، سحر آفریں غزلیں، زندگی بخش نظمیں، سب کچھ آپ کو اس میں ملیں گی۔ قیمت فی پرچہ ۴ر
چندہ ۲ روپے مع محصول ڈاک

منیجر "تنویر" تھرڈ سائکل اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے
کہ
دختران اسلام کی دینی تعلیم و اسلامی تربیت کے لئے

کوئی زنانہ ماہوار مجلہ

مسلمہ

سے بہتر شائع نہیں ہوا۔ مضامین مفید و سلیس، کاغذ نفیس، لکھائی چھپائی قابل دید اور چندہ سالانہ
و ڈاک صرف عہ ر بیرون ہند سے تین شلنگ

ملنے کا پتہ

مینیجر "مسلمہ" شہر جالندھر (پنجاب)

روزنامہ جدّت مرادآباد

جدت ہندوستان کا بہترین سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے

اس کی خریداری کیلئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال، آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپیلیں شائع کی ہیں۔

جدت دلکش نظموں، بہترین جنگی تبصروں، بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ، اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔

جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور ۳ شش ماہی اور ۱۲/ سہ ماہی مقرر کی ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرا لیں۔ ایجنٹ صاحبان کو ۲۰ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے اس لیے مشتہرین کے لیے بہت منفعت بخش ہے۔

منیجر اخبار "جدت" مرادآباد پرنس روڈ

اخبار رہنما مرادآباد

اخبار رہنما، مرادآباد کا بہترین و مشہور ہفتہ وار اخبار ہے جو ۲۲ سال سے کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے علاوہ تازہ ملکی و غیر ملکی اہم واقعات و خبروں کے اندراج اور اس پر تنقید و تبصرہ کے علمی ادبی، اخلاقی، اصلاحی تمدنی، طبی، تجارتی، صنعتی، حرفتی دلچسپ قابل دید مضامین و افسانے اور ملک کے مشہور شعراء و اساتذہ کے دلکش روح پرور کلام کا رہنما بہترین مجموعہ ہوتا ہے۔

قیمت سالانہ للعہ

شش ماہی عہ

المشتہر

منیجر اخبار رہنما شہر مرادآباد (صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ)

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۳ نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ صر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

اگر آپ

ہندوستان کی بہترین اردو کتابوں کا مطالعہ کرنا
چاہتے ہوں تو اُردو اکاڈمی کے ممبر ہو جائیے۔ اور
کتابیں مفت پڑھئے۔ قواعد وضوابط ذیل کے پتہ سے
طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

بقیہ چارم

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(۲)

(اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس دلچسپ مضمون کو ضرور پڑھیں۔ "مدیر")

(جناب ایم۔ایم جوہر صاحب میرٹھی)

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ سوویٹ یونین کی بابت بحیثیت ایک (ٹروٹسکی کا وکیل) ریاست اور ایک اقتصادی نظام کے آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹروٹسکی:۔ وہاں پرولتاریوں نے پرولتاری آمریت قائم کی ہے۔ اس آمریت کا منشاء یہ ہے کہ اقتصادی اعتبار سے اشتراکی ملکیت کو زندہ رکھے سیاسی اعتبار سے وہ جمہوریت ہو حالانکہ کمیونسٹ پارٹی کا جہاں تک دوسری پارٹیوں سے تعلق ہے اس کی حیثیت ڈکٹیٹر کی ہے لیکن خود پارٹی میں جمہوریت کے اصول کارفرما ہیں، روس کے غیر ترقی یافتہ ہونے، غیر ممالک سے تعلق نہ ہونے اور دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی شکست نے اسٹیلن کو یہ موقع دیا کہ وہ ایک حکومتی طبقہ بنالے۔ اسٹیلن کے آج کل دو کام ہیں ایک تو سرمایہ دار جماعت اور سرمایہ دار ملکوں کے حملوں سے اشتراکیت کو بچانا دوسرے اس اشتراکی ملکیت سے جو فائدہ ہے وہ کل حکومتی طبقے کو پہنچانا۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسٹیلن اور اس کی حکومت کو سرمایہ دارانہ جماعت کے حملوں سے بچائیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ اشتراکی ملکیت کو حکومتی طبقے کے حملوں سے بچائیں۔

گولڈمین:۔ کیا سوویٹ یونین ابھی تک مزدور طبقے کی حکومت ہے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ ایک بگڑی ہوئی مزدور حکومت ہے ایک گری ہوئی مزدور حکومت۔

گولڈمین:۔ اس کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟

ٹروٹسکی:۔ وہاں ایک بگڑا ہوا اجتماعی طریق پیداوار رائج ہے۔

گولڈمین:۔ کیا وہ درمیانی حالت ہے یعنی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی طریق پیداوار کے مابین کوئی طریق پیداوار ہے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ سوویٹ یونین میں طریق پیداوار کا سرمایہ دارانہ اور اشتراکی طریق کے مابین ہونا لازمی تھا لیکن آج وہ سرمایہ داری سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے حالانکہ اب بھی وہاں کے اقتصادی حالات میں یہ قابلیت موجود ہے کہ بغیر سماجی انقلاب کے ان کو اشتراکی رنگ دیا جاسکتا ہے۔

گولڈمین:۔ آپ اسٹیلن کی حکومت اور سوویٹ یونین میں جو تفریق کرتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

ٹروٹسکی:۔ سوویٹ یونین کا سماجی نظام اکتوبر کے انقلاب کا ماحصل ہے لیکن اسٹیلن کی حکومت سوویٹ یونین کے لئے ایسی ہی ہے جیسے انسان کے لئے کوڑھ کی بیماری۔ اس لئے میں سوویٹ یونین کو دشمنوں کے حملوں سے بچاؤں گا اور اس بیماری کو دفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ بعض دوست اور بہت سی کمیونسٹ پارٹیاں مجھ سے اس بات پر ناراض ہیں کہ میں سوویٹ یونین کی مخالفت کیوں نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ میرے دوست غلطی پر ہیں۔ سوویٹ یونین کو اکتوبر کے انقلاب نے پیدا کیا اور وہ ہماری تمام عمر کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ وہاں ابھی تک اشتراکی ملکیت موجود ہے۔ سوویٹ یونین کو تباہ کرنا سخت غلطی ہوگی۔ ہماری مخالفت تو اسٹیلن کی حکومت سے ہے اس کو بدلنا ہمارا فرض ہے۔

گولڈمین:۔ عام خیال یہ ہے کہ موجودہ سیاسی حالات میں اسٹیلن کی مخالفت کرنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سوویٹ یونین کے دشمنوں کو اس کے خلاف جرأت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا اس کی بابت کیا خیال ہے۔

ٹروٹسکی:۔ ہر رجعت پسند حکومت ترقی یافتہ اور انقلاب پسند جماعت کے سامنے یہی حجت

پیش کرتی ہے ۱۹۲۶ء سے لگاکر آج تک اسٹیلن، مولوٹف وغیرہ ہر موقعہ پر یہ کہتے رہے ہیں
کہ مخالفت کو سختی سے روکنا چاہیئے کیونکہ لڑائی کا خطرہ سر پر کھڑا ہے۔ ہر چنگیزی حکومت لڑائی
کے خطرہ کا بہانہ کر کے معترض جماعت کا گلہ گھونٹنا چاہتی ہے میں یہ کہتا تھا کہ اگر لڑائی ہونے والی
بھی ہے تو بھی ہمیں آزادی سے اعتراض کرنے کا موقع ہونا چاہیئے اور ایک تقریر میں میں نے
کلیمنشو کا حوالہ دیا تھا کہ دوران جنگ میں فرانس جیسی سرمایہ دار حکومت نے بھی کلیمنشو کی
مخالف تقریروں پر بندش نہیں لگائی۔ جنگ عظیم کے تیسرے سال وہ برسرپیکار حکومتوں
کے خلاف تقریریں کرتا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے فرانس کی پارلیمنٹ کو اپنا ہم خیال بنالیا
اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور جنگ میں فتح پائی۔ میرا اس بیان سے یہ مطلب ہے
کہ آزاد تحریر اور تقریر کی دوران جنگ میں بھی ضرورت ہوتی ہے اگر سرمایہ دار حکومتوں کے
لئے یہ آزادی ضروری ہے تو ایک پرولتارین حکومت کے لئے تو از حد ضروری ہے۔ سرمایہ دار
حکومت کا ڈرنا تو قرین قیاس ہے کہ مخالف تقریریں شاید عوام کو بھڑکا دیں کیونکہ ان کی
لڑائی عوام کی بہبودی کے لئے نہیں ہوتی ان کی لڑائی تو سرمایہ دار جماعت کے قیام کے
لئے ہوتی ہے لیکن ہمارے خلاف یہ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ ہماری لڑائی عوام کے لئے
ہوتی ہے۔ ہمیں عوام کا مفاد مدنظر ہوتا ہے۔ ہم خود کسی سے لڑنے نہیں جاتے۔ ہماری لڑائی
تو مدافعانہ ہوتی ہے۔ پھر ہمیں اعتراض سے کیا خوف ہوسکتا ہے۔ روسی حکومت خطرہ کا
بہانہ کر کے انقلابی جماعت کا گلہ گھونٹنا چاہتی ہے۔

فینرٹی:۔ یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ جنگ میں فرانس، انگلستان اور روس ایک طرف
(کمیشن کا وکیل) ہوں اور جرمنی، جاپان دوسری طرف اس وقت آپ کا کیا رویہ ہوگا؟

ٹروٹسکی:۔ یہ کافی پیچیدہ سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ جنگ میں سوویٹ کی دوست
سرمایہ دار سلطنتیں اس کو اس پر مجبور کریں گی کہ وہ سماجی نظام میں بہت سی تبدیلیاں کرے
جو موجودہ نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کے بہت ہی قریب لے جائیں گی میرا خیال ہے کہ جنگ

کے ختم ہونے پر سوویٹ یونین میں بجائے سوشلسٹ سوویٹ حکومت کے سرمایہ دارانہ سوویٹ حکومت ہوگی۔ سرمایہ دار حکومتیں ساز باز کر کے یونین کو اس پر مجبور کریں گی کہ وہ اپنا نظام بدل دے میں نہیں سمجھتا کہ جنگ کے بعد بھی سرمایہ دار حکومتیں سوویٹ کی دوست رہیں گی۔ میں انگلستان اور فرانس کی مدد نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ سوویٹ اور فرانس کے اتحاد کی شکل میں بھی فرانس کی پرولتاری جماعت کو وہاں کی سرمایہ دار جماعت کے خلاف رکھنا چاہیئے تاکہ فرانس کی سرمایہ دار جماعت سوویٹ یونین کو سرمایہ داری کی طرف نہ کھینچ سکے۔ میں سوویٹ یونین کی جانب سے لڑوں گا اور حکومتی طبقہ کے خلاف آواز بلند کرتا رہوں گا۔ میں معمولی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑوں گا اور جب فتح ہوتی ہوگی اس وقت فوج سے کہوں گا کہ ہم کو اس حکومتی طبقہ کو ختم کر دینا چاہیئے اگر میں روس میں ہوں تو فوج میں بھرتی ہو کر لڑوں گا۔

اسٹول برگ:۔ فرض کیجئے کہ روس۔ فرانس متحد ہو کر جرمنی و جاپان سے لڑیں۔ اس صورت (کمیشن کا ممبر) میں اگر آپ فرانس میں ہوں تو کیا کریں اور جرمنی یا جاپان میں ہوں تو کیا کریں؟

ٹروٹسکی:۔ میں فرانس میں یہ کوشش کروں گا کہ انقلاب ہو جائے اور پرولتاری جماعت فرانس پر قبضہ کرلے اس کے لئے میں تبلیغ کروں گا۔ اگر میں جرمنی یا جاپان میں ہوں تو اس امر کی کوشش کروں گا کہ فوج میں اور سامان حرب بنانے کے کارخانوں میں بدنظمی پھیلے ان میں ایسی خرابی پیدا کروں کہ کام ہونا بند ہو جائے۔ وہاں میں تبلیغی نہیں بلکہ فوجی طریق کار اختیار کروں گا کیونکہ وہاں فوری بدنظمی کی ضرورت ہوگی۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کو یہ اعتبار نہیں کہ فرانس اور انگلستان سوویٹ یونین کے دوست ہو سکتے ہیں اور اس کا تحفظ کریں گے؟

ٹروٹسکی:۔ فرانس اور انگلستان کی حکومتیں میری دوست نہیں ہو سکتیں وہ سوویٹ یونین کے حکومتی طبقہ کی۔ دوست ہو سکتی ہیں میرے دوست تو تمام ملکوں کے کام کرنے والے

مزدور ہیں میں انھیں کی دوستی پر اعتبار کرتا ہوں۔ میری سیاست یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب ہو میری سیاست سیاسی سمجھوتوں تک محدود نہیں۔ مجھے سوویٹ یونین کے دوستوں سے کچھ امید نہیں وہ ایک دوسرے سے دعا کرسکتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں دس مزدور ہوں گے اور واقعات کی حقیقت کو سمجھیں گے ان کا اتحاد راسخ ہوگا۔ وہ سو مزدوروں کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اور سو مزدور ہزار سپاہیوں کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اس طرح ایک ایسی برادری پیدا ہو جائے گی جس میں آپس میں غداری کا امکان نہ ہوگا۔

ریہل:۔ سوویٹ یونین سرمایہ دار سلطنتوں کے نرغے میں اس درجہ پھنس سکتا ہے کہ آپ اسٹیلن کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں ایسی حالت میں آپ کیا کریں گے؟

ٹروٹسکی:۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو اصلاحات میں اُلجھے رہتے ہیں میں جوٓلے کے خلاف ہوں (جوٓلے فرانس کی مزدور سبھا کا لیڈر ہے) وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ لیکن اگر فسطائیوں نے جوٓلے پر حملہ کیا تو میں اس کی طرف سے لڑوں گا۔ میرا رویہ اسٹیلن کے ساتھ بھی یہی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ دوران انقلاب میں کرنسکی نے مجھے جرمن جاسوس ہونے کے الزام میں جیل کردی تھی۔ جنرل کورنیلف نے کرنسکی کی حکومت پر حملہ کر دیا اور کرنسکی کے لئے حالات اتنے گرم ہوگئے کہ اس کو مجھے آزاد کرنا پڑا۔ میں جیل سے سیدھا تحفظ کمیٹی کے اجلاس میں پہنچا اور کرنسکی کے نمایندوں کے ساتھ تعاون کیا۔ اصولی معاملات میں ذاتیات اور جذبات کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طریق کار سے عوام کا بھلا ہوتا ہے۔

گولڈمین:۔ تو کیا اگر سرمایہ دار حکومتیں سوویٹ یونین پر حملہ کریں گی تو آپ یونین کی طرف سے لڑیں گے؟

ٹروٹسکی:۔ یقیناً

ڈیوی (صدر کمیشن):۔ فرض کیجئے کہ انگلستان اور فرانس کی مدد سے سوویٹ یونین جرمنی اور جاپان کو شکست

دیدے تو کیا اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ سوویٹ یونین سرمایہ دار ملک ہو جائے گا؟

ٹروٹسکی:۔ یقیناً۔ اور فرانس فیسسٹ ہو جائے گا کیونکہ آج کل میں یہ دیکھتا ہوں کہ فرانس فیسزم کی طرف بہت جھکا ہوا ہے۔

لافیلیٹی (ڈمبرکمیشن):۔ اگر ہٹلر اور سوویٹ میں سمجھوتا ہو جائے تو آپ کا کیا رویہ رہے گا؟

ٹروٹسکی امکان اس کا بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یونین میں کچھ عرصہ ہوا چند سر برآوردہ اصحاب کا یہ خیال تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہٹلر سے دوستی کر لینی چاہئے کیونکہ ہٹلر نہ صرف سوویٹ یونین کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ بلکہ حکومتی طبقہ کے لئے بھی ہے ۱۹۳۳ء میں اسٹیلن نے کہا تھا "ہم نے ہٹلر کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے" میں نے اسٹیلن کے اس رویہ پر اعتراض کئے لیکن اسٹیلن نے صاف صاف اعلان کر دیا "ہم نے ہٹلر کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی اور ہم اس سے اسی خلوص و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں جس طرح 'ویمر جرمنی' کے ساتھ رہتے تھے" ۱۹۳۴ء کے وسط میں اسٹیلن کی یہ خواہش تھی کہ جرمنی سے بنی رہے۔ میں اسوسٹیا اخبار سے ایک اقتباس سناتا ہوں "سوویٹ ہی وہ واحد حکومت ہے جس نے جرمنی کی مخالفت نہیں کی خواہ وہاں کی حکومت کسی طرز خیال کی کیوں نہ رہی ہو" جب ہٹلر نے اس اشارے کو ٹھکرا دیا اس وقت اسٹیلن نے فرانس کا رُخ کیا۔ جب اسٹیلن جرمنی سے دوستی کرنا چاہتا تھا تو مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں فرانس کا دوست ہوں۔ جب فرانس سے دوستی ہوئی تو یہ ہوا کہ میں ہٹلر کا دوست ہوں۔ گویا آئے دن میرے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنے دوست بدلتا رہوں پراودا اخبار کبھی یہ لکھتا ہے کہ میں لارڈ بیور برک کا دوست ہوں کبھی چرچل کا۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کے خیال میں عنقریب سوویٹ یونین کے شکست ہونے کا احتمال ہے؟

ٹروٹسکی:۔ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب سرمایہ دار ملکوں میں جنگ عظیم ہوگی اگر اس کے

اثر سے مختلف ملکوں میں انقلاب نہ ہو گئے تو سوویٹ یونین کی شکست لازمی ہے میرا
یہ خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اس درجہ بوسیدہ ہو گیا ہے کہ اس کا قلع قمع ہونا تاریخی ضرورت
ہے انقلاب ہو کر رہے گا۔ لیکن بہ فرض محال جنگ ختم ہو گئی اور سرمایہ دار ملکوں میں انقلاب
نہ ہوا تب سوویٹ یونین کی خیر نہیں۔

بلیس:۔ آپ کا اسپین کی لڑائی کی بابت کیا خیال ہے وہاں پرولتاریوں کو کس طرح فتح ہو سکتی ہے؟

ٹروٹسکی (امریکن کمیشن) اسپین میں اس طرح فتح ہو سکتی ہے کہ کسان طبقہ سے یہ کہا جائے کہ زمین تمہاری ہے اور کارخانہ کے مزدور طبقہ سے یہ کہا جائے کہ کارخانے تمھارے ہیں لیکن اسٹیلن
فرانس کی سرمایہ دار جماعت کی دوستی کی وجہ سے دبا ہوا ہے وہ ایسا نہیں کہہ سکتا۔ اسٹیلن
اسپین میں انفرادی ملکیت کی حمایت کر رہا ہے۔ اسپین کا کسان سیاسی تقریروں کو نہیں سمجھتا
اگر اس کو زمین نہ ملی تو اس کی بلا سے اسپین کا مالک فرنکو بنا ہے یا کابالیرو۔ روس میں انقلاب
کی کامیابی ہماری فوجی قابلیت اور طاقت کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس لئے ہوئی کہ ہم
نے کسان سے یہ کہا کہ زمین تمہاری (اس پر وہ) ہے کسان جو ہمارے مخالفوں سے جا ملے تھے ہم سے
آملے جب لاکھوں کسان ہماری طرف ہو گئے تو ہماری فتح ہو گئی۔ اسٹیلن، اسپین میں یہ
کہتا ہے "فتح ہو نے دو پھر ملکی نظام کی بابت سوچیں گے اس وقت جنگ ہے ہمارا کام
لڑنا ہے۔ اصلاحات کا سوال اس وقت پیدا ہو گا جب ہم فتح پالیں گے[1]" جب اسپین
کا کسان یہ باتیں سنتا ہے تو بے توجہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے" یہ میری جنگ نہیں ہے۔ یہ
جنرلوں کی جنگ ہے۔ مجھے اس میں حصہ لینے سے کیا فائدہ۔ ان کو لڑنے دو" اسپین کے
کسان کا یہ خیال ہے اور درست ہے۔ میں کسان کے ساتھ ہوں مجھے یقین ہے کہ
اسٹیلن کی سیاست اسپین کو تباہ کر کے رہیگی چین میں اسٹیلن نے اپنی حماقتوں کی وجہ سے
انقلاب کھو یا۔ جرمنی میں بھی یہی ہوا اور اب فرانس اور اسپین میں اس کی تیاری ہے نہیں
اب تک صرف ایک فتح ہوئی ہے اور وہ سوویٹ یونین کا اکتوبر کا انقلاب ہے جو اسٹیلن

[1] کانگریس بھی یہی کہتی ہے پہلے انگریز پر فتح پالینے دو پھر ملکی نظام کی بابت سوچیں گے۔

کے سیاسی نظریوں کے مطابق عمل کرنے سے نہیں ہوا بلکہ ہم انقلاب اس طرح کر سکے کہ ہم نے اسٹیلن کے موجودہ سیاسی نظریوں کے بالکل خلاف کیا تھا۔

اسٹول برک (ممبر کمیشن) اگر آپ اسپین میں ہوتے تو کس سے مل کر کام کرتے؟

ٹروٹسکی:۔ ظاہر ہے کہ میں بائیں پارٹی کی طرف ہو کر فرنکو سے لڑتا۔ لیکن اسپین کی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرتا کیونکہ وہ انفرادی ملکیت کی حامی ہے۔ روس میں بھی ایسا ہوا تھا۔ ہم کرنسکی کی حکومت میں شامل نہیں ہوئے۔ میں اسپین میں کابالیرو کی مدد کروں گا لیکن کمیونسٹ پارٹی کو یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ اس کی حکومت میں حصہ لیں بلکہ ایسے موقع کی تلاش میں رہیں کہ وہ مزدوروں کی حکومت قائم کر سکیں جو اشتراکی ملکیت قائم کرے۔ کسی دوسری جماعت کی حکومت میں شریک ہو جانے سے عوام کی نگاہ میں کمیونسٹ پارٹی کا دوسری پارٹی سے صحیح فرق ختم ہو جاتا ہے اور انفرادیت غائب ہو جاتی ہے۔ عوام اس کو اسی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جس نظر سے عمر رسیدہ لوگ بچوں کو دیکھتے ہیں۔ اشتراکی پارٹی جو مفید کام کرتی ہے وہ سب حکومتی پارٹی کی محنت کا نتیجہ خیال کیا جانے لگتا ہے۔ جس سے عوام کی نگاہ میں حکومتی پارٹی کا وقار بہت بڑھ جاتا ہے جس کو وقت ضرورت حکومتی پارٹی اشتراکی پارٹی کے خلاف استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتی اور اشتراکی جماعت کو ذرا سا بہانہ نکال کر کچل ڈالتی ہے۔ میں اشتراکی جماعت کے کسی دوسری جماعت کی حکومت میں حصہ لینے کے سخت خلاف ہوں[1]۔

بیلس:۔ کیا آزانا کی حکومت کی ناکامی کی یہی وجہ نہیں ہوئی کہ دوسری پارٹیاں اس کی حکومت میں شریک نہیں ہوئیں؟

ٹروٹسکی:۔ آزانا کی حکومت اس وجہ سے ناکام ہوئی کہ وہ آدھا بلکہ ایک تہائی انقلاب کرنا چاہتی تھی۔ جب تک مکمل انقلاب کی دل میں نہ ٹھان لی ہو اس وقت تک انقلاب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آدھا یا تہائی انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی کوشش ہمیشہ ناکامیاب

[1] ہندوستانی اشتراکیوں کے لئے یہ کافی غور طلب مسئلہ ہے کہ ان کی کانگرس اور کانگرسی حکومتوں میں شرکت مفید ہو کہ

ہوتی ہے۔ عوام پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لیڈروں پر سے اعتقاد جاتا رہتا ہے اور عوام ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب لیڈر مکمل انقلاب کرنے نکلتے ہیں تب بھی عوام اپنے تلخ تجربوں کی بنا پر ان کی طرف سے لاپرواہ رہتے ہیں[1]۔ جب مکمل انقلاب ہوجاتا ہے تو وہ صرف سیاسی انقلاب نہیں رہتا

بیلیس:۔ جس پالیسی پر آپ کاربند ہونا چاہتے ہیں اس سے تو فرنکو ہی کو کامیابی ہوگی۔

ٹروٹسکی:۔ فرنکو کی فتح ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ کمنٹرن کی پالیسی بہت ہی لچر ہے۔ اسپین کے پرولتاری چھ سال میں چھ مرتبہ فتح حاصل کرسکتے تھے۔ انھوں نے بہت دلیری۔ قوت عمل اور سمجھداری کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے لیڈر ناکارہ تھے انقلاب اگرچہ پرولتاریوں کے بل پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ لیڈر کی دانشمندی پر ہوتا ہے۔ انقلابی دور میں سمجھدار لیڈر کا ہونا بہت ضروری ہے اور اسپین میں وہ لیڈر مفقود ہے۔ اسپین کے پرولتاریوں کو جو فتح نہیں ہورہی اس کی ساری ذمہ داری کمیونسٹ انٹرنیشنل پر ہے یہ سرمایہ دار کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور سرمایہ داروں کی حکومت میں حصہ لینے کا مشورہ دے رہی ہے نہ صرف یہی بلکہ انفرادی ملکیت کی حامی ہے۔ کیبلرو خود انفرادی ملکیت کا پجاری ہوگیا ہے۔ جب عوام فرنکو اور کیبلرو دونوں کو انفرادی ملکیت کی پوجا کرتے دیکھتے ہیں تو وہ ان میں کچھ فرق نہیں کرتے ان کی بلا سے کوئی برسر اقتدار آجائے ان کے نزدیک کیبلرو اور فرنکو دونوں برابر ہیں اور دونوں دشمن ہیں۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ کیبلرو کو میدان جنگ میں فتح ممکن نہیں؟

ٹروٹسکی:۔ میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اگر کیبلرو کو فتح بھی ہوگئی تو بھی یہ ممکن ہے کہ اسپین میں اشتراکی نظام قائم نہ کیا جائے اور اسپین فسطائی ہوجائے۔

بیلیس:۔ مسٹر ٹروٹسکی میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کس طرح اسپین کی مدد کرسکتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ آپ کی پالیسی سے فرنکو ہی کو فتح ہوگی۔

[1] ہندوستان میں بھی انقلاب نہ ہونے کی یہی وجہ ہے کہ بیدار طبقہ انقلاب کرنا چاہتا ہے۔

ٹروٹسکی: میں نے اپنے خیالات کا خلاصہ آپ کو بتا دیا ہے وہ یہ کہ کیبلرو کے دشمن سے خوب جان توڑ کر لڑو لیکن صرف بندوق سے لڑنا ہی کافی نہیں ہے یہ ضروری کہ اپنے خیال کی تبلیغ بھی کی جائے۔ میں معمولی کسان کے دوش بدوش لڑوں گا لیکن کسان سیاست نہیں سمجھتا۔ مجھے اس کو واقعات سمجھانا چاہئیں۔ مجھے یہ کہنا چاہئے" یہ درست کرتے ہو کہ تم فرنکو سے لڑتے ہو تم کو نسطایوں کو ضرور تباہ کرنا چاہئے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ تم کو اسپین میں بھی ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہئے جس میں فرنکو کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ ہمیں وہ سماجی نظام تباہ کر دینا چاہئے جو فرنکو پیدا کرتا ہے یعنی سرمایہ داری کو تباہ کر دینا چاہئے" یہ خیال میرے سب خیالات کی جان ہے۔ اب آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

بیلس: یہ کیا بات ہوئی کہ آپ فرنکو کے خلاف لڑیں گے لیکن کیبلرو کی حکومت میں حصہ نہیں لیں گے؟

ٹروٹسکی: اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔ روس میں ہم نے کرنسکی کی گورنمنٹ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہم اس کے دشمن کورنیلو کے خلاف خوب لڑے روس میں بہترین سپاہی اور ملاح ہم بولشیوک ہی تھے کورنیلو نے جب بغاوت کی تو کرنسکی مجبور ہوا کہ بالٹک کے بیڑے کے ملاحوں سے مدد مانگے کہ وہ اس کی حکومت کو بچائیں۔ میں اس زمانہ میں قید تھا۔ جب کرنسکی ملاحوں سے ملنے گیا تو انھوں نے کرنسکی کو حراست میں لے لیا اور میرے پاس یہ دریافت کرنے کو وفد بھیجا کہ کرنسکی کی مدد کریں یا اس کو گرفتار کرلیں۔ یہ تاریخی واقعہ ہے میں نے وفد سے کہا کہ آج کرنسکی کو حراست میں رکھو کل گرفتار کرنا۔

گولڈمین: مسٹر ٹروٹسکی عام طور پر یہ خیال ہے کہ آپ سوویٹ یونین کی شکست چاہتے ہیں سوویٹ یونین کی شکست سے کیا سوشلزم کو دھکا نہ لگے گا؟

ٹروٹسکی: سوویٹ یونین کی شکست سوشلزم کے لئے بہت بڑی شکست ہوگی میں نے اپنے رسالہ "سوویٹ یونین کا تحفظ" میں لکھا تھا کہ ہم سوویٹ یونین کی کامیابی چاہتے ہیں۔ ہم اپنے اعمال سے اس کا ثبوت دیتے رہیں گے اور تحفظ کے معاملہ میں ہم کسی سے دوسرے نمبر پر نہیں ہیں۔

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی جب آپ اور لینن برسرِاقتدار تھے تو بیرونی ممالک سے کن اصولوں پر تعلقات رکھے جاتے تھے؟

ٹروٹسکی:۔ ہم روسی انقلاب کو انقلاب عالم کا ایک جز سمجھتے تھے ہم روسی انقلاب کو ہر شکست سے بچانا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکات میں روسی انقلاب کی حیات و قیام مضمر ہے۔ ہماری کبھی یہ کوشش نہیں تھی کہ دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکات سے خود کچھ فائدہ اٹھائیں یا اُن کو آلہ کار بنائیں کیونکہ اپنے ملکی مفاد کو دوسرے ممالک کے مفاد پر ترجیح دینے سے دوسرے ممالک کی انقلابی تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لینن کی زندگی کے آخری سال میں رینوولیف نے یہ غلطی کرنی چاہی تھی کہ دوسرے ممالک کے انقلابی لیڈروں کو اپنے دباؤ سے بدل دے۔ لینن نے رینوولف کو اس رویہ کے متعلق لکھا تھا "اس طریق کار سے ایسے لوگوں کے لیڈر ہو جانے کا خطرہ ہے جن کی کمر میں نہ بوتا ہوگا اور نہ دماغ میں گودا۔ ہمیں کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں جن میں نہ قوت ارادہ ہو نہ دماغ اور نہ قوت عمل"۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کل حکومتی طبقہ نے یہی طریق اختیار کر لیا ہے کہ اپنے پٹھوؤں کو دوسرے ملکوں کی انقلابی تحریکات کا لیڈر مقرر کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نااہل لوگ لیڈر بن گئے ہیں۔

گولڈمین:۔ آپ کے خیال میں اسٹیلن نے بیرونی سیاست میں کیا تبدیلی کر دی ہے؟

ٹروٹسکی:۔ آج کل اسٹیلن نے ایک نئے نظریئے کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ جو خود ان کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ صرف ایک ملک میں سوشلسٹ طریق پیداوار رائج کیا جاسکتا ہے۔ نظریہ بظاہر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کی انقلابی تحریکات کا باہمی تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ مزدور جماعتیں اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے لگتی ہیں اور ایک عالمگیر انقلاب کے تخیل کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اب سوویٹ یونین میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ دنیا میں کچھ ہی کیوں نہ ہو روس میں سوشلزم جاری رہے گا۔

ہم اپنی آنکھوں سے اسپین۔ جرمنی۔ اٹلی۔ اسٹریا میں فسطائیت پھیلتی دیکھ رہے ہیں لیکن روسی حکومتی طبقہ یہی کہہ رہا ہے کہ سوویٹ یونین میں سوشلزم ترقی کر رہا ہے۔ ہم مارکسٹ یہ نہیں سمجھتے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ فسطائیت جو رجعت پسندی کی ایک شکل ہے۔ اس کا اثر روس پر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور دراصل ہو رہا ہے اگر دنیا میں رجعت پسندی کا زور اسی طرح بڑھتا رہا تو سوویٹ یونین میں سوشلزم کے دن ختم ہو گئے۔

گولڈمین:۔ کیا آپ نے کبھی یہ کیا تھا کہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں بولشیوک فوج بھیج کر انقلاب کرنا چاہیئے۔

ٹروٹسکی:۔ یہ ممکن ہے کہ ایک ملک میں دو جماعتیں ہوں ایک فسطائی اور دوسری اشتراکی۔ دونوں جماعتیں حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی ہوں۔ اشتراکی جماعت مجھ سے مدد مانگے ایسی صورت میں میں ضرور مدد دوں گا۔ جس طرح ہڑتال کی صورت میں دوسرے ممالک کی مزدور جماعتوں کو چاہیئے کہ ہڑتالیوں کی مدد کریں، اسی طرح مختلف ممالک کی اشتراکی جماعتوں کو چاہیئے کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں۔ لیکن اگر کسی ملک میں مزدور جماعت ہی نہ ہو یا اگر ہو بھی تو انقلاب نہ چاہتی ہو۔ وہاں یونین کی فوج لے جا کر انقلاب کرنا دیوانگی ہو گی وہاں انقلاب ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہو گیا تو قائم نہیں رہ سکتا۔

گولڈمین:۔ کیا یونین سرمایہ دار ملکوں کے درمیان رہ کر اشتراکی رہ سکتا ہے؟

ٹروٹسکی:۔ میرے خیال میں سوویٹ یونین کی جو آج کل حالت ہے وہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ سرمایہ دار ممالک کی حالت برابر بدل رہی ہے یا تو وہ اشتراکیت کی طرف آرہے ہیں یا فسطائیت کی طرف جا رہے ہیں دونوں حالتوں میں یونین کے تعلقات ان ممالک سے بدلتے رہیں گے۔ لیکن سرمایہ دار ممالک آج کل بہت طاقتور ہیں ان ممالک کی طاقت اشتراکیت کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ سوویٹ یونین میں اشتراکی طریق پیداوار کا دارو مدار اس امر پر ہے کہ دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی انقلابی تحریک کس منزل میں ہے۔

دوسرے ممالک میں پرولتاریوں کی تحریک زور پر ہوئی تب وہاں کی حکومتوں کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ سوویٹ یونین پر آنکھ اُٹھا کر دیکھیں ورنہ یونین کے خلاف سرمایہ دار ملکوں کے متحد ہونے کا خطرہ ہے جو اشتراکیت کو ختم کر دیں گے اس نظریہ کی بنا پر مجھے لوگ مایوس انسان سمجھنے لگے ہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اشتراکیت تمام عالم کے مزدوروں کا سوال ہے۔ اگر میں سوویٹ یونین کا مستقبل روشن نہیں دیکھتا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمام عالم کے مزدوروں سے مایوس ہوں مجھے امید ہے کہ دنیا کے مزدور بین الاقوامی اشتراکیت کی بنیاد ڈالیں گے۔ اس وقت دنیا کی حالت کچھ ایسی ہے کہ انسانیت اور سرمایہ میں تضاد واقع ہو گیا ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام جاری رہا تو انسانیت ختم ہو جائے گی لیکن مجھے دنیا کے انسانوں سے یہ امید ہے کہ وہ از سر نو دنیا کو وحشی بننے سے روک دیں گے اور دنیا کی مزدور جماعت نئی تہذیب و تمدن کی بنا ڈالے گی۔ میں انقلاب روس کو انقلاب عالم کی ایک کڑی سمجھتا ہوں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہمیں سوویٹ یونین کو اشتراکی رکھنا ہے تو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ دوسرے ممالک بھی اشتراکی ہو جائیں اس کام کے لئے تبلیغ ضروری ہے اور تبلیغ کے لئے جنگ مضر ہوتی ہے۔ کسی ملک میں بیرونی ملک کی فوج سے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنا دوسرے ملک کی رجعت پسند طبقہ کی مدد کرنا ہے سرمایہ دار فوراً ملک اور قوم کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں اور عوام اس جذبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور سرمایہ دار طبقے کی مدد پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسپین میں بغیر روسی فوج بھیجے انقلاب ہو گیا لیکن کیا ہم نے وہاں فتح پا لی؟ جرمنی میں کئی انقلاب ہوئے جب ہٹلر پر قبضہ ہوا اس وقت بھی جرمنی میں انقلابی حالات موجود تھے۔ ہٹلر کی کامیابی سے قبل جرمنی میں اشتراکی انقلاب پیدا کرنے کے لئے بہت اچھی فضا تھی تو کیا ہم وہاں انقلاب پیدا کر سکے؟ ملکوں میں بغیر بیرونی فوج کی مدد کے انقلابی حالات تو پیدا ہو جاتے ہیں لیکن انقلابی پارٹی اور انقلابی لیڈر پیدا نہیں ہوتے جن کا ملک پر اثر ہو۔ ہمیں ایسی پارٹی اور لیڈر پیدا کرنے

کی ضرورت ہے جن کا تخیل اشتراکی ہو اور جن کا عوام پر اثر ہو اس کے لئے وقت درکار ہے اور بغیر ان کی موجودگی کے انقلاب کرنے کی کوشش مہمل ہے۔ یورپ میں اگر پرولتاریوں کی طاقت نہ بڑھی اور جنگ عظیم ہوگئی تو تہذیب کا خاتمہ ہے۔ انسانیت امریکہ کا ترکہ ہو جائے گی اور یورپ میں تاریکی ہوگی۔ جب اسٹیلن نے جرمنی سے اتحاد کی کوشش شروع کی تو میں نے کہا تھا "تم ایک زبردست رنگل پال رہے ہو" انقلاب کے زمانہ میں رنگل ہماری مخالف فوجوں کا افسر اعلیٰ تھا۔ چنانچہ ہٹلر کی حیثیت اب رنگل کی سی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں مضمون لکھے کہ ہٹلر کی دوستی سوویٹ یونین کو راس نہیں آسکتی۔ ان سب واقعات کے باوجود مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں ہٹلر کا گرگا ہوں۔ اصل واقعہ سوویٹ یونین کے اخبار اسوستیا کے اقتباس سے واضح ہو جائے گا کہ میں ہٹلر کا دوست ہوں یا اسٹیلن۔ اسوستیا ۴ مارچ ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں لکھتا ہے "سوویٹ روس ہی وہ واحد حکومت ہے جس کو جرمنی سے کوئی بیر نہیں ہے اور نہ اس کو جرمنی کے نظام حکومت پر کسی اعتراض کی ضرورت ہے"۔ اسٹیلن نے یہ بھی کہا کہ "ہم نے جرمن تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی"۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی بھی ایسی لچر نکلی کہ انھوں نے بلا لڑے ساری طاقت ہٹلر کے ہاتھ میں جانے دی میں نے اس پر کہا تھا کہ یہ ہماری تاریخ میں کمیونسٹ پارٹی کی دنیا کی مزدور جماعت کے خلاف سب سے بڑی غداری ہے۔ کیونسٹ انٹرنیشنل نے میری اس صاف گوئی کو جرم سمجھا۔ میں نے جرمن شکست کا کنتترن کو ذمہ دار ٹھیرایا۔ جرمن کمیونسٹ لیڈروں نے یہ غضب کیا کہ جب عمل کا وقت آیا اور خطرے سے دوچار ہونے کا احتمال پیدا ہوا تو پاسپورٹ لے کر دوسرے ممالک کو چل دیئے اور دشمن کے لئے میدان خالی چھوڑ گئے۔ کیمونسٹ پارٹی اور کنترن نے میرے جواب میں یہ کہا "خوب ہوا ہٹلر برسر اقتدار آ گیا یہ تو کچھ دن کا مہمان ہی دوبارہ انقلاب ہوگا اور ہمارا ہی دور دورہ ہو جائے گا"۔ اس وقت میں نے یہ پیشینگوئی کی تھی کہ جرمنی میں کمیونسٹ کو معمولی شکست نہیں ہوئی ہے اس کا اثر بہت مدت تک رہے گا۔

گولڈمین:۔ کیا آپ اس کے موافق ہیں کہ سوویٹ یونین سرمایہ دار ملکوں سے سمجھوتا کرلے؟

ٹروٹسکی:۔ اگر سوویٹ یونین کے تحفظ کے لئے سرمایہ دار ملکوں سے سمجھوتا کرنے پڑے تو کیا مضائقہ ہے لیکن وہ سمجھوتا اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ سرمایہ دار ملک کی مزدور جماعت کے مفاد کو اس سے کوئی ضرر نہ پہنچے ایسی کوئی شکل نہ ہونی چاہیئے کہ سرمایہ دار ملک کی کمیونسٹ پارٹی ملک کی حکومت میں حصہ لینے اور تعاون کرنے پر مجبور ہو جائے۔ سوویٹ یونین فرانس سے سمجھوتا کرسکتا ہے لیکن اس کو فرانس کی کمیونسٹ جماعت کو اس پر مجبور نہ کرنا چاہیئے کہ فرانس کا فوجی بجٹ پاس کرانے میں حکومت فرانس کی مدد کرے۔

گولڈمین:۔ پارٹی سے نکالتے وقت آپ پر کیا الزام لگائے گئے تھے؟

ٹروٹسکی:۔ مجھ پر طرح طرح کے الزام تھے۔ مثلاً جب حکومتی طبقے نے بائیں پارٹی کے مضامین نشر کرنے سے انکار کر دیا تو پارٹی کے کسی نوجوان نے ان کو چھاپا مجھے معلوم نہیں کہ کب، کس طرح اور کہاں، لیکن حکومتی طبقے نے یہ الزام لگایا کہ ہم نے رنگل (مخالف فوج کا چیف کمانڈر تھا) کی فوج کے کسی افسر کی مدد سے مضامین چھپوائے ہیں۔ بعد میں تحقیق پر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ روسی خفیہ پولیس کے ایک ایجنٹ نے ہماری پارٹی کے نوجوان کی مدد کر کے یہ سب کام کرایا تھا اور خفیہ پولیس میں ملازم ہونے سے قبل وہ رنگل کی فوج کا افسر تھا۔

گولڈمین:۔ کیا آپ کے اور حکومتی طبقے کے اصولی اختلافات بھی تھے؟

ٹروٹسکی:۔ جی ہاں۔ ہم استبدادیت کے خلاف تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سوویٹوں اور ٹریڈ یونینوں میں سب جگہ ایک حکومتی طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے آپ کو عوام کا خادم نہیں بلکہ مخدوم خیال کرتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ عوام اس کے لئے ہیں وہ عوام کے لئے نہیں بائیں جماعت ان طبقوں کے سخت خلاف تھی اور اس کی یہ کوشش تھی کہ حکومتی طبقوں نے اپنے مفاد کے لئے خاص حقوق کی جو رسم نکال لی تھی اس کو ختم کر دے اور خاص حقوق سے حکومتی طبقہ کو جو فوائد ہو رہے تھے ان کو عام کر دیا جائے۔ دوسرا اہم اختلاف یہ تھا کہ ہمارا انقلابی تخیل بین الاقوامی تھا اور حکومتی طبقے کا ملکی اور قومی تھا۔ ان کی داخلی اور خارجی پالیسی بھی اسی تخیل کے ماتحت تھی

جب اصول ہی مختلف تھے تو ان اصولوں کے ماتحت جو عمل ہوتا تھا اس میں حکومتی طبقہ اور ہماری پارٹی میں جزوی اختلاف پیدا ہو جانا لازمی تھا ان اختلافات کی بنا پر مجھے ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔

گولڈمین:۔ جب آپ سے سوویٹ یونین کی رعایا ہونے کا حق چھینا گیا اس وقت آپ نے کیا کیا؟

ٹروٹسکی:۔ میں نے مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو ایک خط لکھا جس میں میں نے اُنھیں یہ مشورہ دیا کہ اسٹیلن کو جنرل سکرٹری کے عہدے سے الگ کر دیں اور یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ لینن نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو "صحیفہ" کے نام سے مشہور ہے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا۔ لینن اور میں اس معاملے میں ہم خیال تھے لینن میری قوت فیصلہ پر بہت اعتبار رکھتا تھا ایک مرتبہ جب اسٹیلن وغیرہ نے باقاعدہ طور پر میری فوجی تدبیروں کی مخالفت شروع کی تو لینن نے مجھے پوری تختی کا ایک کاغذ دیا جس کے آخر میں یہ جملہ لال روشنائی سے لکھا ہوا تھا۔

"ساتھیو! مجھے ہر اعتبار سے ٹروٹسکی کے احکامات کے درست ہونے کا اتنا زیادہ یقین ہے کہ بلا کسی تردید کے خوف کے میں ٹروٹسکی کے ہر حکم کی تائید کرتا ہوں۔"

اس جملے کے نیچے لینن کے دستخط تھے۔ باقی کاغذ اس لئے کورا چھوڑ دیا گیا تھا کہ میں جو احکام چاہوں اس پر لکھ لوں۔

روہل:۔ حکومتی طبقے کے پیدا ہونے اور سوویٹ یونین پر مسلّط ہو جانے کا خطرہ تو بہت پہلے دکھائی (ممبر کمیشن) دینے لگا ہوگا۔ ہونے والے واقعات اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ کیا اس خطرے کے متعلق مرکزی کمیٹی یا کمنٹرن کے اجلاس میں کبھی ذکر آیا؟

ٹروٹسکی:۔ مرکزی کمیٹی میں اس خطرے کی بابت بہت بحث و مباحثہ رہا۔ لینن اور میرے درمیان بھی اس مسئلہ پر متعدد بار گفتگو آئی۔ لینن نے دوران گفتگو میں بارہا اس کا ذکر کیا کہ روس کی

اقتصادی اور تمدنی پستی کہیں مستقل حکومتی طبقہ نہ پیدا کر دے اور سوویٹ یونین کہیں نپولین کی حکومت نہ بن جائے۔ اس خطرے کی پیش بندی کے لئے لینن نے ایک ادارہ کنٹرول کمیشن جاری کیا۔ یہ معمولی مزدوروں کے ہاتھ میں تھا اس کا یہ مقصد تھا کہ مزدور حکومتی طبقہ پر آنکھ رکھیں اور اس کو یہ محسوس کراتے رہیں کہ اس کی زندگی مستعار ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد کنٹرول کمیشن خود حکومتی طبقے کے اثر میں آگیا اور حکومتی طبقہ پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گیا اس ناکامیابی نے لینن کو یقین دلا دیا کہ جب تک روس کی تاریکی دور نہ ہو گی اس وقت تک حکومتی طبقے کے سر کچلنے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ عام اقتصادی اور تمدنی تاریکی ایک دن میں رفع نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ شکست کھا کر بیٹھ رہے۔ اگر ہمارے انقلاب کے ساتھ ساتھ جرمنی میں بھی انقلاب ہو جاتا تو سوویٹ یونین استبدادیت سے بچ جاتا۔

روہل:۔ آپ نے لینن کے زمانے میں حکومتی طبقے کا استیصال کرنے میں کیا حصہ لیا؟

ٹروٹسکی:۔ خانہ جنگی کے زمانے میں یہ ضروری تھا کہ کل طاقت کو ایک مرکز پہ لایا جائے تاکہ عمل میں ایک نتیجہ خیز تیزی پیدا ہو اس وقتی ضرورت کی بنا پر طاقت اگرچہ چند ہاتھوں میں آگئی تھی اور میرے ہاتھ میں فوج تھی لیکن میدان جنگ میں بھی میں نے فوج کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ سپاہی مختلف فوجی مسائل پہ بحث و مباحثہ کر سکتے تھے۔ میں خود معمولی معمولی سپاہیوں سے فوجی مسائل پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا اور ان سے رائے لیا کرتا تھا۔ خانہ جنگی ختم ہونے پر ہمیں بڑی امیدیں تھیں کہ سوویٹ یونین میں جمہوریت قائم ہو جائے گی لیکن دو رکاوٹیں پیدا ہو گئیں پہلی روس کی ہر شعبہ زندگی میں تاریکی اور پستی جس نے حکومتی طبقہ پیدا کیا دوسری حکومتی طبقہ کی خودسری اور اپنے قیام کے لئے جدوجہد۔ عام تاریکی نے حکومتی طبقہ پیدا کیا۔ حکومتی طبقہ نے اپنے مفاد کے لئے جمہوریت کے قیام میں روڑے اٹکائے۔ حکومتی طبقے نے یونین میں اپنی جگہ بنالی اب ہماری پارٹی اور حکومتی طبقے میں ایک طرح کی جماعتی لڑائی

شروع ہوگئی۔ یہ مخالفت کی ابتدا تھی کچھ عرصے تک حکومتی طبقے کے استیصال کا مسئلہ مرکزی کمیٹی میں زیر بحث رہا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہماری اور حکومتی طبقے کی مخالفت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اختلافات منظر عام پر آ گئے یہاں سے مخالفت دوسری منزل میں داخل ہوتی ہے اسی زمانہ میں لینن اور میں دونوں بیمار ہو گئے اور اسٹیلن۔ زینوویف اور کیمونیف رہ گئے۔ انتظامیہ کمیٹی ہی میں جس کا سکرٹری اسٹیلن تھا مرکزی کمیٹی اور سیاسی کمیٹی کا کام ہونے لگا کچھ عرصے میں ان تینوں نے کام سنبھال لیا اور یہ "مثلث" کہلانے لگے۔ جب لینن دوسری مرتبہ بیمار ہوا جس بیماری سے وہ پھر نہ اٹھا تو حکومتی طبقے نے "مثلث" کی سرکردگی میں اور بھی سر اٹھایا۔ اسی زمانہ میں ان تینوں نے انگریزی زبان میں میرے خلاف ایک رسالہ لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تینوں ہی سوویٹ یونین کے بانی مبانی ہیں اور میں ہمیشہ عضو معطل رہا ہوں۔ جیسا میرے بیان سے ظاہر ہو گیا ہوگا "مثلث" لینن کی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا لیکن لینن کی موجودگی میں وہ بہت محتاط تھے۔ باوجود اس کے کہ "مثلث" خفیہ کارروائی کرتا تھا لینن کو سب علم تھا اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک سب کمیشن بٹھاؤ تاکہ یونین کو حکومتی طبقے سے نجات دلائی جائے میں نے جواب دیا حکومت تو درکنار خود پارٹی کے اداروں میں حکومتی طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ تمہارا مطلب منتظمہ کمیٹی اور مرکزی کنٹرول کمیشن سے ہے۔ اچھا چند روز بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے یہ لینن کی اور میری آخری گفتگو تھی۔ جب لینن دوسری مرتبہ بیمار ہوا اور سب کو یہ دکھائی دینے لگا کہ اب یہ کیا بچے گا تو یہ تینوں علانیہ کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ کے لئے سازشیں کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ آئینی طریق پر "مثلث" کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن عملی طریق پر وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر بن گئے۔

گولڈمین: مسٹر ٹروٹسکی اب یہ بتائیے کہ کچھ عرصے بعد "مثلث" کا کیا حشر ہوا؟

ٹروٹسکی: کچھ عرصے بعد زینوویف اور کیمونیف مجھ سے آملے انھوں نے مجھے یہ راز بتایا کہ "مثلث"

کا یہ معاہدہ تھا کہ آپس میں اتفاق رکھیں گے اور تینوں ٹروٹسکی کی مخالفت کریں گے۔

گولڈمین:۔ آپ کا اور زینوویف اور کیمونیف کا اتحاد کب تک رہا اور کیوں ختم ہوا؟

ٹروٹسکی:۔ میرا اور ان کا اتحاد قریب دو سال رہ کر ۱۹۲۷ء میں ختم ہو گیا علیحدگی کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم نے حکومتی طبقے کی مخالفت شروع کی تو اس پر اور عوام پر جو ردعمل ہوا اس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ حکومتی طبقہ اب تشدّد پر اتر آیا اور ہمارے لئے دو صورتیں رہ گئیں ایک مخالفت ترک کرنا اور معافی مانگنا۔ دوسری پارٹی سے اخراج۔ زینوویف کی رائے تھی کہ پارٹی سے کسی شکل میں علیحدگی درست نہیں۔ میں یہ کہتا تھا کہ اصول پر اڑنا چاہیئے اور اگر اخراج ہوتا ہے تو اس کو لبیک کہنا چاہیئے۔ زینوویف اور اس کے ہم خیال لوگوں نے حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا لیکن اس پر بھی وہ چھ ماہ تک پارٹی سے خارج رہے دوبارہ معافی مانگنے پر ان کو پارٹی میں داخل کر لیا گیا۔ اس اختلاف کے بعد زینوویف اور کیمونیف سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی دوران گفتگو میں انھوں نے کہا کہ وہ پھر سیاسی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں میں نے جواب دیا کہ تم تو سیاسی نقطہ نگاہ سے مر چکے ہو جس نے سر تسلیم خم کر دیا اس کی سیاسی موت ہو گئی۔

گولڈمین:۔ آپ کے اور اسٹیلن کے درمیان جو کشیدگی ہوئی اس کو اختصار سے بیان کیجئے۔

ٹروٹسکی:۔ لینن جب دوسری مرتبہ بیمار ہوا اس وقت تک اسٹیلن کو یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خود ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے بین الاقوامی انقلاب اور مستقل انقلاب کے نظریوں کی مخالفت شروع کی اور حکومتی طبقے نے اس مخالفت کا خیر مقدم کیا اُس وقت اسٹیلن کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ اسٹیلن نے ایک ملک میں انقلاب' کا نظریہ پیش کر کے حکومتی طبقے کی دل کی سی بات کہدی۔ شاید وہ حکومتی طبقے کا طرز خیال تاڑ گیا تھا ہر طرف سے اس کی تائید ہونے لگی۔ حکومتی طبقہ نے کہا ہم برسر اقتدار ہیں اور اسٹیلن کے نظریئے کی تائید کرتے ہیں اب اسٹیلن کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ ملک میں ایک طاقت

ہے اور حکومتی طبقے نے اسٹیلن کی سرکردگی میں اپنے مفاد کا تانا بانا بنانا شروع کر دیا۔ بولشیوک کے جتنے بھی اصول تھے اُن کو ٹروٹسکی کے اصول بتا کر جھٹلا دیا۔ بولشیوک پروگرام کو بھی کہدیا کہ یہ ٹروٹسکی کا پروگرام ہے حکومتی طبقے نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے ملکوں کے مصنفوں کو رشوت دینی شروع کر دی جو اکثر ان کی بیویوں کو قیمتی تحائف کی شکل میں دی جاتی تھی اور دنیا میں اپنا پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا جب یہ ہوتے دیکھا تو میں نے حکومت کے کاروبار میں ایمان داری سے کام کرنے پر زور دیا ۱۹۲۶ء میں مخالفت بہت بڑھ گئی اب ہم نے چاہا کہ حکومتی طبقے سے کچھ سمجھوتہ کرلیں اور آئینی طریق پر لڑائی جاری رکھیں اس وقت چین میں انقلاب شروع ہو گیا تھا اور اسٹیلن نے وہی غلطیاں کرنی شروع کر دیں تھیں جو آج کل اسپین میں کی جارہی ہیں ۱۹۲۷ء میں جب مرکزی کمیٹی نے بغیر مجھے اطلاع کئے حالانکہ میں سیاسی کمیٹی کا ممبر تھا ایک تار چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو کسان تحریک روکنے کے لئے بھیجدیا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ اسٹیلن نے چنگ کیائشک کے ساتھ بھی ویسا ہی اتحاد کرلیا تھا جیسا اس نے فرانس کے ساتھ کیا تھا چنگ کیائشک کی فوج کے افسر بڑے زمینداروں کے طبقے سے تھے۔ چینی غریب کسان کی انقلابی تحریک چینی زمیندار طبقے کے لئے مضر تھی اس لئے تحریک روک دی گئی۔ چین میں وہی ہوا جو آج کل اسپین میں ہو رہا ہے۔ اسٹیلن اس خوف سے کہ فرانس کا سرمایہ دار طبقہ ناراض نہ ہو جائے اسپین کے غریب کسان کی مدد نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح چنگ کیائشک کی دوستی پر چینی غریب کسان کو قربان کر دیا۔ چین کے معاملہ پر اسٹیلن اور ہم میں بہت ترشی پیدا ہو گئی اور ہم یہ سمجھ گئے کہ ہمارے اور اسٹیلن کے خیالات میں بہت بڑا اختلاف ہے جو بحث و مباحثہ سے نہیں جا سکتا اور یہ سب جزوی اختلافات اصولی اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

ترکی کی حربی اور سیاسی اہمیت

ترکی بحیرۂ روم میں ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ در-
یال اور باسفورس کی آبنائے کا مالک ہے اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ
بحیرہ اسود کی کنجی ہے۔ بغداد ریلوے کا ایک بڑا علاقہ، جو ہندوستان کا
کی کا راستہ ہے، اناطولیہ کے خطّے میں واقع ہوا ہے، خود بحیرۂ روم کی
استوں میں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ سمرنا اور دوسرے بندرگاہ تو اس
ے قبضے میں ہیں ہی، ان کے علاوہ اسکندرونہ کی خوبصورت بندرگاہ بھی اسی
کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اس کی عسکری تنظیم ابھی نئے طریقوں پر ہوئی ہے اور
۱۹۲۲ء کی مہم کی کامیابی کی یاد اس کے دلوں میں تازہ ہے۔ ان حقائق کے
ِش نظر ترکی کی حکمتِ عملی ان تمام ریاستوں کے لئے جو بحیرۂ اسود کے ساحل پر واقع
ں، باعث تعلق و دلچسپی ہے اور مشرقی بحیرۂ روم میں جن ریاستوں کے مفاد
ابستہ ہیں، ان کے لئے نہایت اہم۔ ان حقائق کے جواز میں یہ امر پیش
ا جا سکتا ہے کہ زمانۂ دراز سے لے کر آج تک قسطنطنیہ پر قبضہ و تصرف کے
ئے مسلسل جنگوں اور سیاسی چالوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

ہمارے لئے مفید ہوگا اگر ہم ان حالات اور ذرائع کا مختصر طور پر جائزہ
یں جنھوں نے ترکی کو ـــــ وہی ترکی جسے جنگ عظیم میں شکست دے کر اتحادیوں
نے بے دست و پا کر دیا تھا ـــــ موجودہ درجے پر پہنچایا اور آج سیاسی
ور حربی نقطۂ نظر سے اس کی غیر معمولی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ بالخصوص
ن بحری راستوں کے تعلق سے جو درِ دانیال، بحر مارمورا اور باسفورس یا

آبناؤں کے نام سے موسوم ہیں

۲۔ مانٹرو کانفرنس تک آبناؤں پر قبضہ

۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کے معاہدۂ سیورے کی رو سے جسکی تصدیق کی کبھی نوبت نہیں آئی، ان آبناؤں سے ہو کر جہازرانی ایک بین الاقوامی کمیشن کے زیر نگرانی تھی۔ یہ کمیشن اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی تصنیف تھی اور یہی لوگ ان آبناؤں پر قبضہ رکھنے کے لئے مقررہ علاقوں میں مسلح فوجیں رکھنے کے مجاز تھے۔ مشرقی تھریس یونان کو ملا تھا اور اس طرح یونان بھی آبناؤں کے تصرف میں اتحادیوں کا شریک تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی فتوحات، اناطولیہ سے یونانیوں کا اخراج، اور سویٹ یونین سے ترکوں کا سمجھوتہ، ایسے اسباب تھے جن کی بدولت معاہدہ سیورے تشنۂ تکمیل رہا۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں صلح مدائن کے ساتھ ساتھ آبناؤں سے اتحادیوں کا متحدہ اقتدار ختم ہو گیا اور معاہدۂ سیورے کو بدلنے کے لئے لوزان میں گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ لوزان میں آبناؤں کے سلسلے میں ایک نیا سمجھوتہ ہوا اور اسے بھی معاہدۂ صلح میں شامل کرلیا گیا (۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء) اس معاہدہ کی دفعات گو ترکی کے موافق تھیں مگر تاہم پورے درد انیال، مارمورا اور باسفورس کے علاقے کو غیر عسکری علاقہ قرار دیا گیا گو ترکی ایک مسلح میگزین اور ایک توپ خانہ اور استامبول میں بحری اڈا قائم کرنے کا مجاز ٹھہرایا گیا تھا۔ اس علاقے سے تمام اقوام کو امن کے زمانے میں اور جنگ کے زمانے میں بھی بشرطیکہ ترکی فریق جنگ نہ ہو، گذرنے کی اجازت تھی، البتہ جنگ کے زمانے میں ترکی کے فریق جنگ ہونے کی صورت میں صرف غیر جانب دار اقوام کو یہ حق حاصل تھا۔ اس معاہدے کی دفعات کی مناسب تعمیل کی نگرانی کے لئے جو بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا گیا تھا،

ترکی کو اس کا صدر بنایا گیا اور سٹریٹ کا معاہدہ نے اپنی طرف سے غیر فوجی علاقے کے تحفظ کی ضمانتیں کیں۔

معاہدے کی شرائط نے مغربی ریاستوں نے جو آبنایوں میں مکمل آزادی کی طالب تھیں اور بحیرۂ اسود کی ریاستوں میں جو اپنے اہم مفادات کے پیش نظر خصوصی حقوق چاہتی تھیں، ایک آپس کے سمجھوتے پر اصرار کیا تھا جسے ترکی نے منظور کر لیا۔ مگر روس کا اس سے اطمینان نہیں ہوا اور روسی نمائندے ایم۔ شیشرن نے اختلافی نوٹ کے ساتھ اپنے دستخط کیے۔ اصل میں وہ اپنے گذشتہ تلخ تجربات کی بنا پر اندر آنے والے جہازوں پر کافی زیادہ پابندیاں عاید کئے جانے کا طالب تھا۔ چنانچہ مانٹرو کانفرنس میں آخر ساحلی ریاستوں کے خصوصی حقوق تسلیم کر لئے گئے۔ ڈاکٹر ٹوائن بی کا قول ہے کہ (ملاحظہ ہو Survey ۱۹۲۶۔ صفحات ۹۸ - ۹۹) روم کی بحری کانفرنس منعقدہ فروری سنہ ۱۹۲۴ عیسوی کی ناکامی کا باعث سوویٹ نمائندے کی روش تھی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ جب تک بحیرۂ اسود اور بحیرۂ بالٹک ساحلی ریاستوں کے علاوہ باقی دوسری تمام ریاستوں کے لئے بند نہ کر دیے جائیں، اس وقت تک اسے برطانیہ کے مجوزہ وزن سے چوگنے وزن کے جہازوں کی تعمیر کا حق ملنا چاہئے

۳۔ دوسری مختلف ریاستوں سے معاہدے

سوویٹ یونین اور ترکی کے درمیان گہرے تعاونی تعلقات سے روس کا وہ زخم مندمل ہو گیا جو اسے لوزان کی شکست سے پہنچا تھا اور اس کی تصدیق سنہ ۱۹۲۵ء کے باہمی معاہدے سے ہو گئی اور جس کی جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں پھر توسیع کی گئی۔ اسی اثنا میں ترکی نے برطانیہ سے بھی موصل کے معاملے میں جو

باہمی اختلافات تھے ان کو ختم کر کے صفائی کر لی، ان کے علاوہ اس نے اٹلی سے بھی مئی ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا جو ڈوڈیکنیز کے جزیرہ پر قابض تھا اور اناطولیہ میں اپنے اثرات بڑھا رہا تھا، اور اس کی ان حرکتوں سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر فروری ۱۹۳۰ء میں فرانس سے دوستی ہوئی جس نے شام کے مندوب میں اسکندرونہ کی بندرگاہ کو بھی ہضم کر لیا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اپنے حال کے دشمن یونان سے دوستی پیدا کی۔ صلحنامۂ بلقان کا اصل محرک بھی ترکی ہی تھا، جس کا وہ ایک فریق تھا اور زمانے کے اقتضاء سے اب اس کا لیڈر بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۰ء کے بعد سے ترکی اس کوشش میں رہا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سرحد کے مسائل اور دوسرے اہم امور کا تصفیہ کر کے اپنے پرانے ایرانی اور عربی پڑوسیوں سے ازسر نو تعلقات قائم کر لے ایران اور عراق سے سرحدی مسائل کو حل کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں جنیوا میں ایک غیر جارحانہ اتحاد ثلاثہ کے لئے گفت و شنید شروع ہوئی۔ اس گفت و شنید میں افغانستان نے بھی بعد کو شرکت کی۔ اس اتحاد کی ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کے میثاقِ سعد آباد کے ذریعہ ازسر نو تصدیق ہوئی اور یہ اتحاد مضبوط ہو گیا۔ جس کی رو سے عراق، ایران، اور افغانستان سے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس طرح مشرق وسطیٰ میں ترکی کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس نے اندرونی ذرائع نقل و حمل کو فروغ دے کر اور اسلحہ بندی پر کافی رقم صرف کر کے اپنی دفاعی حیثیت بھی خوب مضبوط و مستحکم کر لی۔

۱۹۳۲ء میں جب ترکی مجلس اقوام کا رکن ہوا، تو ہمسایہ ریاستوں اور مغربی ریاستوں سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اسلحہ بندی کے انسداد کے لئے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، اس میں اس نے ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو سب سے پہلے آبنائے ل کی

ازسرنو قلعہ بندی کے مسئلہ کو پیش کیا۔ ۱۹۳۳ء میں ترکی نے مختلف قسم کے حالات سے خطرے کا احساس کیا بالخصوص اسے مسولینی کی ۱۸ مارچ ۳۴ء کی تقریر سے خطرہ پیدا ہوا جس میں اس نے کہا تھا کہ اٹلی کے تاریخی مفادات و مقاصد ایشیا اور افریقہ سے وابستہ ہیں۔ حالانکہ اس پیش بندی کی بعد کو مسولینی نے یہ کہہ کر تردید کر دی کہ میرا روئے سخن ترکی کی طرف نہیں ہے جسے میں ایک یورپی ریاست سمجھتا ہوں۔ ۳۵ء میں متعدد مواقع پر بالخصوص ۱۷ اپریل ۳۵ء کو جمعیۃ الاقوام کی مجلس عاملہ اور ۳۵ء اور ۳۶ء کی جمعیت کی مجلس عام کے جلسوں میں ترکی نے اعلان کئے کہ آبنایوں کے نظام عمل میں اس کے تحفظ کے لئے نظر ثانی ناگزیر ہے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے دو واقعات نے حبش پر اٹلی کا غاصبانہ اقدام خاص طور پر اور رائن لینڈ پر جرمنی کا ازسرنو قبضہ، جو معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی مغربی ریاستوں کو ترکی کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو حکومت ترکی نے ۱۹۲۳ء کے آبنایوں کے معاہدے کے فریقین، یوگوسلاویہ اور جمعیت اقوام کو یاد دہانی کے خطوط لکھے اور درخواست کی کہ ترکی کے دفاع کے لئے اب آبنایوں کے نظام عمل میں نظر ثانی ناگزیر ہو گئی ہے۔ اس کے لئے ازسرنو گفت و شنید کا آغاز کیا جائے۔ ترکی کی یہ درخواست بڑی خوشی سے سُنی گئی اس لئے کہ اس زمانے میں دوسری ریاستیں بے کھٹکے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کر رہی تھیں۔ صرف اٹلی نے مانترو کانفرنس کی شرکت کرنے سے جو مجوزہ نظر ثانی کے لئے ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد کی گئی تھی، انکار کیا۔ ۵ جولائی ۳۶ء کو اٹلی نے لکھا کہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں انگلستان اور بحیرۂ روم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرف سے آپس کی بحری ضمانتوں کا جو سمجھوتہ ہوا تھا جب تک وہ برسر عمل ہے، اٹلی مانترو کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکتا۔

۴۔ آبنائیوں کے متعلق مانٹرو کا معاہدہ

مانٹرو کانفرنس میں جو ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوئی تھی برطانیہ اور روس کے نقطہ نظر کے حامیوں کے درمیان کسی قدر اختلاف رائے تھا۔ برطانیہ کی رائے یہ تھی کہ ادلے بدلے کے اصول کے مطابق آبنائیوں کا دروازہ اگر بند کیا جائے تو تمام اقوام کے جہازوں کے لئے اور اگر کھولا جائے تو تمام اقوام کے لئے۔ اس کے برعکس روس کا مطالبہ یہ تھا کہ چونکہ روس بحیرہ اسود کی سب سے بڑی ریاست ہے اور اس کے مفادات بحیرہ اسود سے سب سے زیادہ وابستہ ہیں اس لئے اسے خصوصی حقوق ملنے چاہئیں۔

معاہدے کے فیصلے کسی قدر پیچیدہ ہیں۔ ان کے ماتحت بہت سے قاعدے بنائے گئے ہیں جو آبنائیوں سے جنگی اور تجارتی جہازوں کے گذارنے کے متعلق ہیں، کہ جب امن کا زمانہ ہو تو کیا صورت ہوگی، لڑائی کا زمانہ ہو اور ترکی فریق جنگ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ سب سے اہم فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ترکی آبنائیوں کے علاقوں میں فوج رکھ سکتا ہے اور جو دستخط ہو جانے کے دن یعنی ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء سے عمل پذیر ہوگا۔ یہ فیصلہ معاہدے کی دستاویز میں تمہید کے طور پر شامل ہے۔ دفعہ ۲۴ کے ماتحت بین الاقوامی کمیشن کے اختیارات جو لوزان کے معاہدے کے ماتحت قائم کیا گیا تھا، ترکی کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ اگر ترکی فریق جنگ ہو، یا وہ خیال کرے کہ جنگ میں اس کا شریک ہونا یقینی حد تک اغلب ہے تو وہ آبنائیوں کو جنگی جہازوں کے لئے بند کر سکتا ہے یا اگر مناسب خیال کرے تو ان کو گذر جانے دے (دفعات ۲۰ اور ۲۱) اگر وہ غیر جانب دار رہے تو بھی جنگ میں شامل ہونے والی ریاستوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ سوائے چند مخصوص حالات کے ممنوع ہوگا۔

روس کا نقطۂ نظر ایک حد تک ایک قاعدہ بنا کر مان لیا گیا جس کی رو سے بحیرۂ اسود کی ریاستوں کے بڑے جہازوں کو گذر جانے کی اجازت دی گئی۔ لہذا سوائے اس امر کے کہ حکومت ترکی کسی کو واضح طور پر خود دعوت دے، زمانہ جنگ میں ساحلی ریاستوں کے علاوہ کسی دوسری ریاست کے بڑے بڑے جہازوں کو بحیرۂ اسود میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی مگر سوویٹ روس کے جنگی جہازوں کو بحیرۂ روم میں نکل جانے یا بحر اوقیانوس یا بحیرۂ بالٹک میں منتقل ہو جانے کی اجازت ہوگی اس کے برعکس بھی یعنی بحیرۂ اسود میں داخل ہونے کی اجازت بھی ہو گی۔ اس استثناء کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویٹ کے بحری تحفظ میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمانۂ جنگ یا جنگ کے امکانی زمانے میں ترکی سے دوستی پیدا کرنے کا سوال حکمت عملی کا ایک نہایت اہم جزو ہو گیا۔ اس معاہدے کی مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

تجارتی جہاز:۔ امن اور جنگ دونوں زمانوں میں تجارتی جہازوں کی جہازرانی اور عبور کرنے کی آزادی کی از سر نو تصدیق کی گئی، حالانکہ جنگ کے زمانوں میں چند خاص شرائط کی تکمیل لازمی کر دی گئی اور اگر ترکی فریق جنگ ہو تو دشمن کے جہازوں کو آبناؤں سے گذرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

جنگی جہاز:۔ جنگی جہازوں کے مجموعی وزن (۱۵۰۰۰ ٹن) اور تعداد (۹) پر شدید قسم کی پابندیاں عاید کی گئیں جو آبناؤں سے گذر رہے ہوں گے۔ اور جن کے گذرنے کی پیشگی اطلاع دے دی گئی ہوگی۔ امن کے زمانے میں ہلکے جہازوں، چھوٹی اور ضمنی کشتیوں کے گذرنے پر عملی طور پر کوئی پابندی نہیں ہوگی سوا اس کے کہ وہ دن کے وقت سفر کریں اور اپنے ساتھ جو فضائی اسلحے رکھتے ہوں، ان کا استعمال نہ کریں۔ اوپر کی سطور میں جن

اقوام کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے جہازوں کے مجموعی وزن کا تعین بھاری جہازوں کی عبوری کی اجازت نہیں دیتا، مگر دفعہ ۱۱ کی رو سے بحیرۂ اسود کی ریاستوں کے اس قسم کے جہازوں کو گزرنے کی اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ وہ ایک ایک کرکے گذریں اور دو سے زیادہ تباہ کن جہازوں کی معیت و حفاظت میں نہ ہوں۔ اس کے علاوہ صرف بحیرۂ اسود کی ریاستوں کو یہ حق ہوگا کہ ان کی آبدوز کشتیاں جو کسی بیرونی ملک کی فرمائش میں جا رہی ہوں یا بیرونی جہاز ساز کارخانوں میں مرمت کے لئے جا رہی ہوں، آبنایوں سے گذر سکیں، بشرطیکہ وہ دن کے وقت سفر کریں اور پانی کے اندر ہو کر نہ چلیں۔ مزید براں یہ معاہدہ بحیرۂ اسود کے علاوہ دوسرے اجنبی جہازوں کے وزن پر خواہ وہ مجموعی ہو یا انفرادی سخت پابندیاں عاید کرتا ہے جو کسی بھی وقت سے بحیرۂ اسود میں رہ گئے ہوں (اور یہ بھی معاہدے کی رعائتی دفعہ کی رو سے ہوگا کہ اگر یہ جہاز بحیرۂ اسود میں انسانی مقاصد کے پیش نظر بھیجے گئے ہوں) ان کے قیام کا زمانہ بھی ۲۱ دن محدود کر دیا گیا ہے۔ ان دفعات کا یہ اثر ہوگا کہ بحیرۂ اسود کے ملکوں کے بڑے جہازوں کے لئے تو آبنائے کھولی جائے گی مگر دوسرے ملکوں کے جہازوں کے لئے بند رکھی جائے گی۔

زمانہ جنگ میں جنگی جہازوں کی عبوری کے متعلق موثر اور کارگر دفعات ۱۹ سے ۲۱ تک ہیں۔ اگر ترکی غیر جانب دار ہے، تو غیر جانب دار ملکوں کے لئے صرف امن کے زمانے کی شرائط عاید ہوں گی، مگر جنگ میں شریک ہونے والے ملکوں کے جہاز اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ البتہ اگر وہ جمعیت اقوام کے ضابطۂ قوانین کی پابندی کرتے ہیں، یا وہ ایک ایسی

ریاست کی مدد کے لئے جا رہے ہیں جو نا جائز غصب کا شکار ہوئی ہے
اور اس سے باہمی امداد کے معاہدے میں ترکی بھی شریک ہے، اور
وہ معاہدہ جمعیت اقوام کے رشتۂ اتحاد سے متعلق ہے اور باضابطہ
طور پر مصدقہ ہے، تو جنگ میں شریک والے ملک کا جہاز بھی گذر سکے گا
اگر ترکی جنگ میں شریک ہے، یا وہ سمجھتا ہے کہ اسے جنگ کا
نمایاں طور پر خطرہ ہے تو حسب مندرجہ بالا جنگی جہازوں کا داخلہ یا عبوری
حکومت ترکی کے فیصلے کی پابند ہوگی۔ آبنایوں میں کسی بھی وقت کسی جنگ
میں شریک ہونے والے ملک کے جہازوں کے داخلہ کا حق کوئی حیثیت
یا وزن نہیں رکھے گا

اٹلی حالانکہ مانٹرو کانفرنس میں شریک نہیں تھا، مگر اس کے بعد (۲ر مئی ۱۹۳۸ء
کو جب انگریزی اور اطالوی سمجھوتے پر دستخط ہو گئے) وہ بھی شریک ہو گیا۔ اس
معاہدے پر تمام دستخط کرنے والے فریقوں کی طرف سے بہ استثنائے جاپان ۹ر نومبر
۱۹۳۶ء کو تصدیق ہو گئی۔ جاپان کی تصدیق ۱۹ر اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔

معاہدہ بلقان، ۲۱-۱۹۲۰ء میں جو اتحاد صغیر (Little Entente) عمل میں
آیا تھا، اس میں بلقان کی ریاستوں میں رومانیا، یوگوسلاویہ۔ اور چیکوسلاویکیہ
شریک تھے۔ چیکوسلاویکیہ کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ہنگری کی نظر ثانی (Revision-
ism) کے مطالبے کا مقابلہ کرے۔ پھر ۱۶ر فروری ۱۹۳۳ء میں اس اتحاد کو پارلیمنٹ
کے قانون کے ذریعے مضبوط کر دیا گیا، حالانکہ اس قانون کی رو سے باہمی فوجی امداد
کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، البتہ یہ استثنا رکھا گیا کہ اگر ہنگری ٹری نون کے صلحنامے
کی نظر ثانی کا مطالبہ طاقت کے ذریعے کرے تو فوجی امداد بھی دی جائے گی۔ ستمبر
۱۹۳۳ء میں یونان اور ترکی میں تحفظ کی ضمانت اور باہمی امداد کے متعلق ایک معاہدہ

ہوا جس کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ اگر بلغاریہ یونان پر ہاتھ مارنے کا حوصلہ کرے جس کا امکان تھا تو ترکی اس کی امداد کو آئے۔ اسی اثناء میں ۱۹۳۰ء میں غیر سرکاری طور پر بلقان کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس نے تمام بلقان کی ریاستوں کو باہم عملی اشتراک عمل کے لئے آمادہ کر دیا۔ مگر اس صورتِ حالات میں عارضی طور پر یوگوسلاویہ اور بلغاریہ کے آپس کے جھگڑے سے خلل آگیا۔ یہ جھگڑا دونوں ملکوں میں مقدونیہ کے قضیے سے اٹھا تھا، مگر شکر ہے کہ انہی ایام میں دونوں ملکوں کے بادشاہوں کی ملاقات ہوئی۔ اور یہ جھگڑا نرم پڑ گیا۔ اب باوجودیکہ ترکی، یونان، یوگوسلاویہ اور رومانیا باہمی سمجھوتے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مگر بلغاریہ اپنے نظر ثانی والے مطالبے سے سرمو پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ فروری ۱۹۳۴ء کو ایتھنز میں باہمی صلح مشاورت کا معاہدہ طے ہو گیا اور اس سے بلغاریہ اور البانیہ کو مستثنیٰ کر دیا گیا جو پہلے ہی سے اٹلی کے اثر میں تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کی شرکت کے لئے دروازہ کھلا رکھا گیا کہ وہ چاہیں تو بعد کو بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ اس اتحاد کی رو سے آپس میں بلقانی سرحدات کی ضمانت کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا تھا کہ اگر ان کے مشترکہ مفاد پر کوئی آنچ آئی تو وہ اس کے حل کے لئے سب ملکر مشورہ کریں گے۔ اتحاد میں دو دیباچے مخفی رکھے گئے تھے۔ جن کا مضمون بعد کو شائع کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ اگر کبھی کسی غیر بلقانی ریاست کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام ہو اور اس میں بلقان کی کوئی ریاست بھی شریک ہو تو پس کی امداد کی جائے گی۔ مگر درحقیقت اس فیصلے کا افادہ مشکوک تھا اور بعد کو خود ترکی اور یونان نے اعلان کر دیا کہ اتحاد کی ان دونوں افتتاحی دفعات میں سے کسی کی رو سے بھی وہ کسی بڑی طاقت کے ساتھ شرکت جنگ کے لئے مجبور نہیں ہوں گے۔ یہ اتحاد، جس کے فیصلے انگورہ میں اکتوبر، نومبر ۱۹۳۴ء میں

قانوناً تسلیم کئے گئے، بنیادی طور پر باہمی امن و صلح کے لئے تھا۔ اس میں اس امر سے اور بھی پختگی آ گئی کہ چاروں طاقتوں نے روس کے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا جس میں غاصب (Aggressor) کی تعریف و توضیح کی گئی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر یہ امر مسلم ہو گیا کہ روس کی طرف سے کسی غاصبانہ اقدام کا خوف نہیں ہے —— حتیٰ کہ بے سربیا کے معاملے میں بھی نہیں۔

اس اتحاد کے دوسرے ہی سال سے کچھ ایسے واقعات رونما ہو گئے کہ بلقان کا معاہدہ نہایت ضروری ہو گیا۔ کاؤنٹ چیانو کے برلن کے سفر کے بعد ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک بیان اخبار میں شائع ہوا کہ بہت سے معاملات کے سلسلے میں ایک معاہدہ طے پایا ہے جس میں جنوب مشرقی یورپ کا بھی ذکر تھا۔ یہ بیان تشویش ناک تھا۔ بلقان کی تمام ریاستیں روز بروز جرمنی کی تجارت کی محتاج اور پابند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اٹلی کے اس اعلان نے جو بار بار دہرایا جا رہا تھا کہ اس کے بنیادی مفادات بحیرۂ روم سے وابستہ ہیں، صورت حالات کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں آسٹریا پر جرمنی کے قبضے اور ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر اٹلی کے تسلط نے یونان اور یوگوسلاویہ کی حربی حیثیت ختم کر دی تھی ایک طرف بلقانی تعاون کی ضرورت شدید ہو گئی تھی اور دوسری طرف یہ ضرورت، کہ محوری طاقتوں (Axis Powers) کو کسی نوع چھیڑا نہ جائے لمحہ بہ لمحہ ان کے دماغوں پر مسلط ہو رہی تھی یہ ضرورت اس خطرہ کے ماتحت تھی کہ جرمنی سے حسابات کی صفائی کے انتظامات کی شرائط ناقابل اطمینان تھیں اور وہ ایسا خریدار ہے جو اپنے قرضہ جات سوا اس کے کہ مقررہ برآمد کے ذریعے ادا کرے، کسی دوسری صورت میں ادا کرنے کے یا تو قابل نہیں، یا قصداً نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ ان کے سامنے سیاسی صورت حالات کی بے ثباتی اور ان ممالک کا حشر تھا جنھوں نے ان طاقتوں کے مقابلے میں مدافعت

کی ہمت کی تھی صرف ترکی کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم تھی اس لئے کہ اس کا جغرافیائی محل وقوع دفاعی حیثیت سے قابل اطمینان ہے اور دوسری طرف سوویٹ یونین سے اس کے تعلقات سوائے ایک عارضی شکررنجی کے جو مانٹرو کانفرنس کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، بالعموم خوشگوار تھے۔ یہ امر ناگزیر تھا کہ ریاستہائے بلقان کے درمیان جو بھی اتحاد ہوگا، اس کی قیادت ترکی کے ہاتھ میں ہو گی۔ وہ اس قابل بھی تھا کہ بلغاریہ پر بھی، اس کے مطالبات کے باوجود دوستانہ طور پر معاہدے کے لئے زور ڈالے۔ اس باب میں ایک قدم اور آگے اٹھا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۳۷ء کو بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کے درمیان ایک دیرپا دوستانے کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے نتیجے کے طور پر ۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو بلغاریہ نے سالونیکا کے مقام پر اتحاد بلقان کے چاروں شرکاء کے ساتھ غیر جارحانہ معاہدے پر دستخط کئے۔ بلغاریہ سے یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ موجودہ سرحدات کی ضمانت کرے، یعنی اس سے اس کے ان مطالبات سے، جو جنوبی دبروجا (Dobrouja) اور بحیرۂ ایجین میں داخلے کے لئے راستے کے متعلق تھے، دستبردار ہونے کے لئے نہیں کہا گیا مگر وہ خود اس بات پر راضی ہو گیا کہ طاقت سے کسی تبدیلی کی کوشش نہیں کرے گا۔ معاہدہ نیولی کی فوجی دفعات منسوخ کر دی گئیں اور بلغاریہ نے اپنی جو ازسر نو اسلحہ بندی کی تھی، اسے قانوناً تسلیم کر لیا گیا۔ جب اٹلی نے البانیا کو فتح کر لیا تو بلغاریہ کے ان مطالبات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو اس کے بلقانی پڑوسیوں کے متعلق تھے۔ بلغاریہ بحیرۂ اسود کی ایک ساحلی طاقت ہے۔ اور اسی حق کی بنا پر وہ ترکی سے تعلقات پیدا کر کے اپنا فائدہ کرنے کا متمنی ہے، جو آبنایوں کا کرتا دھرتا ہے۔ بلغاریہ کی تجارت پر جرمنی کا سولہ آنہ قبضہ ہے اور یہی وہ رکاوٹ ہے جو اسے اپنے ہمسایوں سے تعلقات پیدا کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے

اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید یہ رکاوٹ پیش نہ آتی۔

۱۹۳۹ء میں ترکی کی خارجی حکمت عملی کی رفتار۔ ترکی نے بلغاریہ اور یونان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بحیرۂ ایجین سے لے کر بحیرۂ اسود تک سرحدی قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرنا شروع کیا، مگر یہ احتیاطی تدابیر تھیں کسی امکانی بیرونی حملے کے مقابلے میں اپنے دفاع کی، نہ کہ بلقانی ہمسایوں کے خلاف۔ البانیہ کو جب اٹلی نے فتح کرلیا تو ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کو مسٹر چمبرلین، وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں ایک بیان دیا کہ بحیرۂ ایڈریاٹک بحیرہ روم ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور وہاں جو واقعات رونما ہوئے ہیں برطانیہ ان کی طرف سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے یقین دلایا کہ اگر رومانیا اور یونان کی آزادی کو کسی طرف سے خطرہ ہوا اور انھوں نے خود اس خطرہ کے دفاع کا فیصلہ کیا تو برطانیہ ان کو اپنی طاقت بھر مدد دے گا۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ برطانیہ کے اس ارادے کی اطلاع ترکی کو بھی بھیج دی گئی ہے جس کے تعلقات یونان سے دبنا جانتی ہے۔ طویل گفت و شنید کے بعد لندن اور انگورہ میں ایک ساتھ ایک مشترکہ اعلان شائع کیا گیا (۱۲ مئی ۱۹۳۹ء) کہ کسی مستقل معاہدے کے معاملے کو تو ابھی معلق رکھا گیا ہے لیکن اگر اس عرصے میں اگر کوئی ایسا غاصبانہ واقعہ پیش آئے جس کا نتیجہ بحیرۂ روم میں جنگ کی صورت میں رونما ہو تو حکومت برطانیہ اور حکومت ترکی دونوں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ اور اپنی طاقت بھر ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ ترکی اور فرانس کے درمیان بھی اسی موضوع کے مشترکہ اعلان پر ۲۴ جون کو دستخط ہوئے۔ جس کے لئے فرانس کی طرف سے اسکندرونہ کے علاقے سنجک کی واپسی سے میدان ہموار کر دیا گیا تھا۔ یہ یاد رہے کہ سنجاک کا علاقہ اس سے پہلے شام کے مندوب کے ساتھ ساتھ فرانس کے زیر حکومت تھا

اور جب سے وہ ترکی کو واپس کر دیا گیا ہے وہ ہاتے جمہوریہ کی صورت میں ہے۔
اس زمانے میں امید کی جا رہی تھی کہ برطانیہ روس سے کوئی معاہدہ کرنے میں
کامیاب ہو جائے گا۔ اگر یہ معاہدہ ہو جاتا تو ترکی کے لئے اور بھی آسانیاں فراہم
ہو جاتیں۔

بہر صورت ان اعلانات کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصالحت ینوآن کے وقت
بحیرۂ روم میں قزاقی کا مقابلہ کرنے کے لیئے مغربی ریاستیں اور ترکی ایک دوسرے
سے تعاون کریں گے۔ ۸ر جولائی ۱۹۳۹ء کو ترکی کے وزیر خارجہ ایم۔ سراج اوغلو
نے ان اعلانات کی تشریح کے دوران میں کہا تھا کہ یہ اعلان ایک سلسلۂ واقعات
یعنی جلبش" تعزیری کارروائیاں" مانسرو کا معاہدہ، اور مصالحت ینوآن کا نتیجہ ہے۔ ترکی
نے اس بات کو بتاکید ذہن نشین کرانے میں بڑی محنت کی کہ" یہ نئے معاملات کسی نوع
روس سے ہمارے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوں گے" ۵ مئی ۱۹۳۹ء کو جب روس
کے نمائندے ایم۔ پوٹیمکن نے اپنا انگورہ کا قیام ختم کیا تو ایک بیان شائع کرایا
گیا کہ امن و تحفظ کے قیام کے لئے دونوں حکومتیں یکساں طور پر کوشاں رہیں گی
اور مشترکہ مفادات کے معاملے میں دونوں حکومتوں میں تبادلۂ خیال اور مشورے
کی جو روایت قائم ہے وہ جاری رہے گی۔ جرمنی اور سوویٹ روس کا باہمی معاہدہ
ترکی کے لئے ایک کاری ضرب تھی، اس لئے کہ اس سے ترکی اور روس کے درمیان
تعلقات کی جو خوشگواری تھی، اس پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

جرمنی کے ساتھ بھی ترکی کے تعلقات مناسب تھے۔ وزیر اعظم نے ۱۲ر ستمبر
۱۹۳۹ء کو کمیٹی (Kamutey) میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ" جرمنی سے
ہمارے تعلقات بین الاقوامی قانون کے مطابق ہیں۔ ترکی اس سے براہ راست کسی
قسم کا اختلاف نہیں رکھتا" بہر نوع، ۵ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو اعلان کیا گیا کہ جرمنی اور

ترکی کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہے، اس کی تجدید نہیں کی جائے گی۔

ترکی برطانیہ اور فرانس سے ایک طویل المدت سمجھوتے کے لئے گفت و شنید میں مصروف تھا، کہ مئی اور جون میں دونوں ریاستوں اور ترکی میں جو مشترکہ اعلانات شائع ہوئے تھے، وہ مستحکم اور وسیع ہو جائیں۔ اسی اثنار میں جرمنی اور روس کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا اور ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو وزیر خارجہ ایم۔ سراج اوغلو نے ماسکو کا سفر کیا تاکہ سوویٹ گورنمنٹ سے اس نئی صورت حال کی وجہ سے جو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، اس پر غور و بحث کی جا سکے۔ یہ سفر بہت طویل تھا۔ اس لئے کہ اسی درمیان میں ماسکو میں ۲۷ر ستمبر ۳۹ء کو جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فان ربن ٹراپ گفت و شنید کے لئے آ گئے۔ اور ایم۔ سراج اوغلو کو گفت و شنید ملتوی کرنی پڑی۔ اکتوبر میں جب گفت و شنید پھر سے چلی تو غیر متوقع مشکلات اٹھ کھڑی ہوئیں اس لئے کہ روسی حکومت نے چند نئی تجویزیں پیش کیں، جن کی نوعیت اس وقت تک صاف صاف ظاہر نہیں ہوئی۔ اس دوران میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ سمجھوتے کی بات چیت مکمل ہو چکی تھی۔ صرف دستخط ہونا باقی رہ گئے تھے وہ اس لئے کہ ترکی اس امید میں تھا کہ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ روس سے بھی ہو جائے گا جو جدید ترکی کا دیرینہ دوست تھا۔ یہ امید تو پوری نہ ہوئی مگر فرانس اور برطانیہ کے ساتھ اتحاد ثلاثہ پر ۱۹ر اکتوبر ۳۹ء کو دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے دیباچے میں یہ فیصلہ درج ہے کہ روس سے جنگ کی حالت میں ترکی کسی صورت میں بھی اس معاہدے کا پابند نہیں ہو گا۔ یہ فیصلہ اس امر کا شاہد ہے کہ ترکی ماسکو سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کو اپنی بنیادی حکمت عملی تصور کرتا ہے۔ ماسکو سے انگورہ کو واپس آتے ہوئے ایم۔ سراج اوغلو نے استانبول میں اس بات کا اعادہ کیا کہ "ماسکو میں روسی مدبرین سے میرے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ

میرا سفر ترکی اور سوویٹ کے درمیان دوستانہ تعلقات کو قائم رکھنے کا سبب بنا ہے اور
مجھے امید ہے کہ گفت وشنید آئندہ پھر کسی وقت شروع کی جا سکے گی۔"

سلطنت متحدہ اور فرانس کے ساتھ ترکی کا جو معاہدہ ہوا ہے، اس کی مدت پندرہ
سال رکھی گئی ہے۔ اس معاہدے کے فیصلوں کے ماتحت اگر ترکی پر یورپ کی کوئی
طاقت حملہ کرے۔ یا کسی طاقت کے غاصبانہ اقدام کی وجہ سے بحیرۂ روم کے
علاقوں میں جنگ چھڑ جائے اور ترکی کو شریک ہونا پڑے تو یہ دونوں ریاستیں اس کی
امداد کو آئیں گی۔ اسی طرح اگر کسی طاقت کے غاصبانہ اقدام کی وجہ سے بحیرۂ روم کے
علاقوں میں جنگ چھڑ جائے اور اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس کو شریک ہونا پڑے
تو ترکی ان کی مدد کرے گا۔ ترکی مغربی ریاستوں کی اس صورت میں بھی امداد کرے
گا اگر وہ رومانیہ اور یونان کے ضامن کی حیثیت سے کسی کے مقابلے پر جنگ میں شریک
ہوں۔ اگر کسی وجہ سے معاہدے کی پہلی دو دفعات کا اطلاق ایسے کسی معاملے پر نہ ہوتا
ہو، تو فوراً شرکاء معاہدہ کے درمیان مشاورت عمل میں آئے گی۔ اور ترکی بہرصورت
مخلصانہ طور پر غیر جانب دار رہے گا۔ ایک عمومی دفعہ کے ماتحت یہ فیصلہ بھی کیا
گیا کہ اگر کوئی یورپین طاقت کسی ایسی یورپین ریاست پر غاصبانہ اقدام کرے جس نے
شرکاء معاہدہ میں سے کسی ایک سے یہ سمجھوتہ کیا ہے کہ اس (غاصبانہ اقدام کی) صورت
میں اس کی بقاء آزادی کے لئے اس کی امداد کی جائے تو شرکاء معاہدہ اس باب
میں مشورہ کریں گے یا متحدہ طور پر کارروائی کریں گے۔ یا اگر ایسے غاصبانہ اقدام سے
شرکاء معاہدہ میں سے کسی کو خطرہ لاحق ہوتا ہو، تب بھی اس خطرے کے سلسلے میں
متحدہ کارروائی یا باہمی مشورہ کیا جائے گا۔ معاہدہ دستخط ہو جانے کی تاریخ سے
عمل پذیر ہوگا اور جمعیت اقوام میں اس کی رجسٹری ہوگی۔ (اس معاہدے کا پورا
مضمون ایک قرطاس ابیض کی صورت میں شائع کیا گیا ہے جس کا نمبر مسودہ

۱۲۳ ۱۲۳ معاہدے کے دیباچے کا ذکر جس کے ماتحت یہ فیصلہ ہے کہ معاہدے کے فیصلوں ۱۹۳۹ء ہی کی رو سے ترکی روس سے جنگ میں شریک ہونے کے لئے مجبور نہیں ہوگا، پہلے آچکا ہے انگورہ کے اس معاہدے کے فیصلوں کو مانٹرو کانفرنس کی ان پابندیوں کی روشنی میں جانچنا مفید ہوگا جو ترکی کے اوپر عاید ہوتی ہیں۔

اس معاہدے پر دستخط کئے یہ معنے ہیں کہ بحیرۂ روم میں تحفظ اور دنیائے عرب میں امن و امان کی بدیہی ضمانت ہو گئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اٹلی میں جو بیرونی ممالک کے اخبارات کے نمائندے ہیں، انھوں نے اس معاہدے کے متعلق لکھا کہ اٹلی کے سرکاری حلقوں میں اس معاہدے کو نہ تو اس حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے کہ یہ اٹلی کے مفادات کے لئے خطرہ ثابت ہوگا اور نہ اس حیثیت سے کہ اٹلی بلقان کی ریاستوں کا جو ایک غیر جانب دار بلاک قائم کرنے کی فکر میں ہے (تاکہ جنگ کا بحیرۂ روم میں امکان جاتا رہے) اس میں کوئی مزاحمت ہو گی۔ (ملاحظہ ہو مانچسٹر گارجین بابتہ ۲۰ اکتوبر ۳۹ء اور ٹائمیز بابتہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء ایک خاص مضمون)

یہ معاہدہ نہ صرف بحیرۂ روم کے تحفظ کا ایک شگون ہے، بلکہ مشرق وسطیٰ کے لئے بھی جہاں میثاق سعد آباد کے شرکا، میں ترکی کی قائدانہ حیثیت ہے امن و امان کا ایک نیک فال ہے۔

جب ترکی میں سمجھوتہ ہو گیا تو عراق اور ایران میں تھوڑی سی تشویش پیدا ہو چلی تھی کہ کہیں ترکی دوسری سرحدوں کی بھی نظر ثانی کے لئے بضد نہ ہو جائے مگر ترکی کی طرف سے میثاق کے فیصلوں کی دیانتدارانہ پابندی نے اس تشویش کو دور کر دیا ہے اور جھگڑے کا امکان مٹ چکا ہے۔ مصر مشرق وسطیٰ کی ایک ریاست بھی ہے اور اسے بحیرۂ روم کی بھی طاقت کہا جا سکتا ہے۔ ترکی سے اس کے تعلقات ٹھوس نہیں تھے۔ مگر اگست میں ترکی کے نمائندوں کے سفر سے

اس سے بھی تعلقات قائم کئے گئے۔ مصر میثاقِ سعد آباد میں شریک نہیں تھا۔ پھر بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ برطانیہ، فرانس اور ترکی کے باہمی معاہدے کا قاہرہ میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور اخباروں نے اعلان کیا کہ اس معاہدے کے ذریعے پورے کا پورا مشرق وسطیٰ اتحادیوں کی طرف آگیا ہے۔

(تلخیص)

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوف نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا کر جامعہ میں پڑھے، شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کا ایک جامع اور اہم مقدمہ ہے، جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت اردو ۲؎ قیمت انگریزی ۳؎

اتاترک

از محمد مرزا صاحب دہلوی۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے واقعات اور حالات جمع کرنے کی بہت سے لوگوں نے کوشش کی ہے لیکن مصطفےٰ کمال کے سیاسی، مذہبی اور اصلاحی نظریوں اور ان کی زندگی کے مقدس مشن کی اصلی روح سے ان لوگوں نے کم سروکار رکھا ہے۔ اس کتاب نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

قیمت مجلد ۲؎

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

نئی دہلی

کھیل اور تعلیم

(فضل الدین صاحب اثر - ایم اے)

اوسط درجے کے ہندوستانی گھروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بچے پیٹے جاتے ہیں اور اکثر کھیل کے پیچھے۔ کوئی دن ہی ایسا جاتا ہوگا جب کہ ماں یا باپ بچوں کو کھیل سے منحرف کرنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ ان کے خیال میں بچوں کا کھیل میں زیادہ دلچسپی لینا مدرسے کے کام سے بے پروائی کا مرادف ہوگا یا آوارگی کا پیش خیمہ بنے گا یا ہوائی قلعے بنانا سکھائے گا۔ لیکن کاش ہمارے والدین کو بچے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا کہ کھیل بچے کا وہ فطری حق اور اس کی زندگی کی وہ اہم شرط ہے جس کے خلاف جانا بچے کی ہستی کو مٹانا ہے۔ ستم یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں بالغ العمر لوگوں کے آرام و آسائش اور تفریح و دلبستگی کا ہر سامان مہیا ہوگا۔ لیکن کوئی ایک گوشہ بھی ایسا نہیں ہوتا جسے بچہ اپنا سمجھ سکے اور جس میں دو چار چیزیں اس کی دلچسپی کی موجود ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ہنوز بچے کی شخصیت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ اور ہم یہ بالکل بھولے ہوئے ہیں کہ کھیل بچے کی زندگی کا سب سے بڑا قانون اور اس کی روحانی اپج اور بالیدگی کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ کھیل ہر ملک ہر قوم، ہر طبقے کے بچوں کے لئے یکساں دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر امیروں کے بچے قیمتی کھلونوں میں اپنی کھوئی ہوئی جنت ڈھونڈھتے ہیں تو غریبوں کے بچے سڑک کے کنارے گھروندا بنا کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ اور اگر تہذیب یافتہ قوموں کے بچے چھوٹے چھوٹے ریڈیو سٹ بنا سکتے ہیں تو تہذیب کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والی قوموں کے بچے برسات کے پانی میں کاغذ کی ناؤ تیرا کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔

مسئلے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ماہرین نفسیات نے کھیل کے متعلق چھان بین کرنے

میں کافی وقت صرف کیا ہے۔ اور یقیناً یہاں اُن کے مختلف نظریوں پر ہمارا ایک اجمالی تبصرہ
دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کھیل کے متعلق سب سے زیادہ قدیم اور مقبول نظریہ وہ ہے جو عموماً شلر اور اسپنسر
کے نام سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ نظریہ شلر اور اسپنسر سے بہت پہلے قائم ہو چکا
تھا) شلر کا خیال تھا کہ کھیل انسان یا حیوان کی اُن قوتوں کے اخراج کا ذریعہ ہے جو کام میں نہ
ہونے سے بچ رہتی ہیں۔ چنانچہ کھیل میں مصروفیت ایک بے مقصد مصروفیت ہے۔ اسی گمان
کے ماتحت شلر نے کھیل کو "فاضل قوت کا بے مقصد اخراج" کہا ہے۔

شلر کے اس نظریے پر دو اعتراضات ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام کھیل کو ایک سعی لاحاصل
سے تعبیر کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ چڑیوں کا تنہائی میں شاخ پر بیٹھے بیٹھے چہچہا اٹھنا
یا تتلیوں کا ایک پھول سے دوسرے پھول پر چہکنا بھی بے مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زبان
میں یہ ایک دعوت ہے، اپنے ہم جنسوں کے نام اور وہ دعوت جس پر ان کی نسل کی بقا کا انحصار
ہے۔ دوئم اگر شلر کے نظریے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہم ان بچوں کے کھیل میں دلچسپی لینے
کوئی وجہ پیش نہیں کرسکتے جنھیں نہ پیٹ کے لئے روٹی میسر ہے اور نہ تن کے لئے کپڑا۔

اسی سلسلے میں بے جا نہ ہوگا اگر ہم کھیل اور آرٹ کے درمیان اس رشتے پر بھی غور کریں
جو شلر نے قائم کیا تھا۔ شلر کا خیال تھا کہ کھیل اور آرٹ کے درمیان ایک رشتہ ہے، کیونکہ
دونوں انسان کی بے ساختہ مسرتوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ اور اس مقام پر بھی جہاں شاعر
اپنے دل کا درد بیان کرتا ہے وہ اس مسرت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ وہ کس کامیابی کے ساتھ
اپنے تاثرات دوسروں تک پہنچا رہا ہے۔ پھر کھیل اور آرٹ دونوں میں ایک قسم کا ضابطہ
اور متانت داخل ہے۔ اگر کوئی افسانہ نویس، آداب افسانہ نویسی کا پابند ہے تو کھیل میں حصہ
لینے والے بچے بھی کھیل کو بغیر سلیقہ اور شعور کے کامیاب نہیں بنا سکتے۔ شلر کی اسی بات
سے انیسویں صدی کے مشہور و معروف شاعر ولیم مورس نے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"زندگی بغیر محنت جرم ہے اور محنت بغیر خوبی کے گناہ"۔
اور یہی وہ تخئیل ہے جس نے ثابت کر دیا ہے کہ جمالیاتی حس کوہ المپیا پر رہنے والے دیوتا اور دیویوں کی بخشش نہیں ہے کہ جسے مل گئی، مل گئی اور جسے نہ ملی، نہ ملی۔ بلکہ بڑی حد تک یہ ایک اکتسابی چیز ہے۔ چنانچہ بچوں کو کھیل ذریعے اپنی قوتوں کو اُجاگر کرنے دیجئے اور وہ ضرور ایک دن ان تمام چیزوں میں جو اُن کے حیطۂ تخلیق میں ہیں حسن کا شعور اور سلیقہ پیدا کر سکیں گے۔

اسپنسر کا نظریہ شلر کے نظریے سے مختلف ہے۔ حالانکہ اس کا نام بھی اس کے ساتھ وابستہ کیا جا چکا ہے۔ اسپنسر کے خیال میں بچے کے متعلق ورڈز ورتھ کا یہ قول کہ
"اس کے تمام افعال و مشغولیت بے پایاں نقالی ہوتی ہے"۔
حرف بہ حرف صحیح ہے۔ چنانچہ بلی کے بچے کا لکڑی کے ٹکڑے کو اچھال اچھال کر پکڑنا چوہے پکڑنے کی نقل ہے۔ اور اسی طرح لڑکیوں کا گڑیوں سے کھیلنا امور خانہ داری کا آئینہ۔ کارل گروس کا نظریہ جو آگے چل کر پیش کیا جائے گا اسپنسر کے اس نظریے کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

لارڈ کیمس کے نقطۂ نظر سے کھیل ایک محض تفریحی شغل ہے، جس کی نہ کوئی حقیقی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی خاص مدعا بیسویں صدی کے ابتدائی دور تک جرمنی میں یہ نظریہ بہت مقبول تھا۔ اسی بنیاد پر پروفیسر لذارس نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے۔
"بے مصرف کاہلی سے با مصرف تفریحی کھیل کی طرف قدم اٹھاؤ"۔
پروفیسر لذارس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ محنت کے دلچسپ مشغلے کو مکمل آرام پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لارڈ کیمس کا یہ نظریہ اپنی جگہ اٹل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کھیل کی کوئی مکمل توضیح پیش نہیں کی گئی ہے۔ فی الحقیقت یہ شلر اور اسپنسر کے فاضل قوتنا

والے نظریے کا متضاد پہلو ہے۔ اور ہم اسے اسی وقت قابل قبول سمجھ سکتے ہیں جب کہ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ مختلف کاموں میں مختلف اعضا پر تکان کا اثر ہوتا ہے۔ بچے میں پڑھتے وقت وہ اعضا تھک سکتے ہیں جو پڑھنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے مدرسے کے بچوں کے نئے جوش کے ساتھ بھاگ دوڑ میں شریک ہو سکنے کی۔

عہد حاضر کے ایک ماہر نفسیات مسٹر پیٹرک نے لارڈ کیمس ہی کی تخیل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ہماری نازک نازک رگوں اور چھوٹے سے چھوٹے اعصاب کا استعمال بڑھتا گیا ہے اور یہاں تک کہ اب زندگی مستقل دیدہ ریزی اور مسلسل دردسر بن کر رہ گئی ہے چونکہ ہم باریک قسم کے کام مثلاً لکھنا، پڑھنا اور چھوٹی چھوٹی مشینوں کا استعمال زیادہ دیر تک نہیں کر سکتے اس لئے اب مجبور ہیں کہ ہم نسل انسانی کے ان قدیم مشاغل کی طرف لوٹیں۔ جس میں ہمارے جسم کے بڑے بڑے اعضا بھی استعمال ہو سکیں مثلاً شکار، پیرنا وغیرہ۔

مسٹر پیٹرک کے خیال میں بچے عمر رسیدہ لوگوں کے مقابلے میں اس لئے کھیل کا زیادہ شوق رکھتے ہیں کہ ان کے دماغ میں وہ مرکز ہنوز قائم نہیں ہونے پاتے جو انھیں باریک اور نازک قسم کے مشاغل میں حصہ لینے کے قابل بنا دیں۔ اس لئے اگر ہماری دنیا سائنس کی تجربہ گاہوں کارخانوں اور بینکوں پر مشتمل ہے تو جنگل، دریا، چشمے، شکارگاہیں اور لڑائی کے میدان بچے کی دنیا ہیں۔

وقت کی رفتار پر نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیٹرک صاحب حقیقت تک پہنچ گئے ہیں لیکن اول تو یہ چیز محتاج ثبوت ہے کہ انسانی حافظہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ Hormic Process کے ماتحت ہمارے گذشتہ تجربے ہمارے موجودہ روش و کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ماضی کے تجربوں کی وہ انفرادیت یقیناً قائم نہیں رہتی جس کی جانب مسٹر پیٹرک نے اشارہ کیا ہے۔ پھر ہمارے پاس اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ عہد

قدیم میں انسان کے دماغ کے اعلیٰ حصوں کا نشو و نما نہ ہو سکا تھا۔

کارل گروس نے اپنی دو تصنیفات "جانوروں کے کھیل" اور "انسان کے کھیل" میں ایک اور بھی زیادہ دلچسپ اور نیا نظریہ پیش کیا ہے:۔

"جانور کھیلتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ نوخیز ہیں بلکہ اس لئے کہ انھیں کھیل کے لئے فطرت سے ایک مخصوص زمانہ ملتا ہے اور اسی زمانے میں اُنھیں زندگی میں شریک ہونے کی تیاری کرنی پڑتی ہے یہ بات اتنی صحیح نہیں ہے کہ جانور کھیلتے ہیں جب تک وہ چھوٹے رہتے ہیں جتنی کہ یہ بات کہ وہ جب تک چھوٹے رہتے ہیں اُن کے لئے کھیلنا ضروری ہے تاکہ وہ بڑے ہوکر زندگی کے اہم اور سنجیدہ کاموں کے لئے اپنے کو تیار کرسکیں۔"

گروس کا یہ کہنا کہ جانور کھیل کے ذریعے اپنی روزمرہ کی زندگی کو مکمل بناتے ہیں بجا ہے لیکن انسان کے کھیل کو اس زاویہ نظر سے دیکھنا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ اول تو بچوں کے بہت سے کھیل مثلاً آنکھ مچولی یا دھوپ چھاؤں ایسے ہیں جنھیں نہ بالغ العمر لوگوں کی زندگی کی نقل کہا جاسکتا ہے اور نہ اُن سے کسی قسم کی ذہنی یا جبلّی تربیت مقصود ہو سکتی ہے۔ اس باب میں گروس کا نظریہ صرف اسی حد تک قابل قبول ہے جہاں تک کھیل انسان کے جسمانی نشو و نما میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ پھر بچے کی جملہ حرکات و سکنات کو زندگی کے کاروبار کی نقل سمجھنا یہ ثابت کرنا ہے کہ بچہ اپنی تمام عمر احمقوں کی جنت میں بسر کرتا ہے۔ حالانکہ بچے کی زندگی اپنی جگہ خود ایک مکمل اور جامع زندگی ہے۔ بچہ نہ صرف اپنی جگہ ایک پوری شخصیت کا مالک ہوتا ہے بلکہ وہ انتہا درجے کا خوددار اور حساس بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ایسے کھیل کھیلتا بھی ہے جو نقل کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً چور اور سپاہی یا حاکم اور مجرم کے کھیل، تو اس کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کم مائیگی کا اظہار کرے بلکہ وہ تو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ اس چھوٹی عمر میں بھی بڑوں کی دنیا اور بڑوں کے کاروبار میں کس حد تک عقل رسائی اور ہمت سے کام کر کے دکھا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچہ ہمیشہ کھیل میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقتور ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اگر کسی کہانی کو ڈرامے

کی شکل میں پیش کیا جائے تو اکثر بچے ہیرو کا پارٹ اپنے لئے پسند کریں گے۔ ایک روز شام کو ٹہل کر واپس آتے وقت برٹرنڈ رسل نے اپنے بچے سے کہا کہ ممکن ہے ہماری غیر موجودگی میں ہمارے گھر پر ایک مسٹر ٹڈلی ونکس کا قبضہ ہو چکا ہو۔ اور اب وہ شاید ہمیں گھر میں داخل نہ ہونے دے، یہ بات محض مذاق کی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن شام کو برٹرنڈ رسل کے بچے نے رسل صاحب کے مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر غصے کی آواز میں کہا:۔ ۔۔۔ جائیے اس گھر میں مسٹر ٹڈلی ونکس کا قبضہ ہو چکا ہے اب یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا!" یہی نہیں بلکہ بچہ دانستہ طور پر خوفزدگی کے اثرات کو بھی پسند کرتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک بچہ شیر کی طرح دھاڑنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا اس سے خوف کے وہ ہی اثرات لیتا ہے جو اصل شیر کی موجودگی میں ہو سکتے ہیں۔

کارل گروس کے نظریے میں جہاں تک جبلتوں کے اجاگر ہونے کا تعلق ہے میک ڈوگل نے ایک ترمیم پیش کی ہے ان کا فیصلہ ہے کہ کھیل میں ہر جبلت اسی طرح کام نہیں آتی جس طرح وہ زندگی میں حقیقی مواقع پر کام آتی ہے۔ مثلاً کھیل کھیل میں جب دو کتے کے بچے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو زخمی کرنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ جب وہ سچ مچ لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔

اسی قدر دلچسپ نظریہ اسٹینلی ہال کا ہے اُن کے نزدیک کھیل ہمارے جبلی اور وراثتی اثرات کا ترجمان ہے۔ ہم کھیل کے ذریعے ان تمام منازل سے گذرتے ہیں جن سے ہمارے آباو اجداد ترقی کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں گذر چکے ہیں۔ چنانچہ بچوں کا پیڑ پر چڑھنا اس عہد کی یادگار ہے جب انسان درختوں پر رہتا تھا اور بچوں کا چڑیوں پر پتھر پھینکنا اس بات کی جب انسان پتھروں سے واقعی جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر گروس کا خیال تھا کہ کھیل سے جبلتوں میں جلا پیدا ہوتی ہے تو ہال کے نزدیک جبلت کھیل میں تسلی پا چکنے کے بعد زندگی میں کم زور پڑ جاتی ہے چنانچہ وہ انسان جو کھیل کے سلسلے میں اپنی جبلتِ خود پسندی کا دل کھول کر اظہار کر چکا ہو روزمرہ کی زندگی میں زیادہ خود پسند بننے سے احتراز کرے گا۔

یہ سب کچھ بجا سہی لیکن ہم یہ کیوں کر تسلیم کرلیں کہ دنیا کی تمام قوموں کا ارتقاء ایک ہی معیار کے مطابق اور ایک ہی رفتار کے ساتھ ہوا ہے۔ پھر وئزمین بڑی حد تک یہ بات طے کرچکا ہے کہ اکتسابی خصوصیات وراثتی طور پر منتقل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے کھیل کے دوران میں ہمارا ان منازل سے گزرنا جنھیں انسان ارتقا کے سلسلے میں نہ معلوم کب طے کرچکا ہے۔ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

ہال کے نظریئے کے آخر الذکر پہلو کے ساتھ ساتھ ارسطو کی پیش کردہ "تزکیہ جذبات" کے نظریہ کا ذکر بھی لازمی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کھیل ایک safety valve کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے انسان کے وہ جذبات جو سماج کے لئے ضرر رساں ہوسکتے ہیں صرف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ کشتی، مُکا بازی وغیرہ قسم کے کھیل انسان کو غصہ وغیرہ تکلیف دہ عادات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

گروس اور کلاپرید دونوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ کھیل میں جبلت کے استعمال کے بجائے وہ جذبہ صرف ہوجاتا ہے جو جبلت سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو غصے کی حالت میں کھانے کی پلیٹ توڑ کر یا کمرے کے دروازے کو زور سے بند کرکے باہر چلے جانے سے تسکین ہوجاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے ایڈرینالین (وہ زہریلا مادہ جو ایڈرینالین غدود سے خارج ہوتا ہے اور غصے کا محرک بنتا ہے) صرف ہوجاتا ہو اور انسان کو غصے کے خطرناک نتائج سے بچا لیتا ہو۔

مس ایپلیٹن نے بھی ۱۹۱۰ء میں کھیل کی ایک توضیح پیش کی تھی۔ یہ توضیح نئی ضرور ہے لیکن سقم سے خالی نہیں۔ اُن کے نزدیک کھیل بڑھتے ہوئے جسم کا ایک جائز تقاضا ہے۔ یہ نظریہ ممکن ہے بچوں کے کھیل کی کوئی مناسب تشریح ہو۔ لیکن بڑوں کے کھیل سے اس کا زیادہ لگاؤ نہیں ہوسکتا۔

یہ چند وہ نظریے تھے جو ماضی نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ ہمارے لئے ان میں سے کوئی

ایک نظریہ بھی مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سب نظریے ایک دوسرے کی مدد سے کھیل کی پوری پوری نفسیاتی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور ان کے ذریعے ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

انسان بالطبع نشو و نما کی صلاحیت لے کر پیدا ہوا ہے اور حرکت اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عمر اور جسمانی حالتوں کا اثر فعالی کی نوعیت پر ہمیشہ پڑا ہے اور پڑے گا۔ پھر کھیل کے ذریعے انسان اکثر اپنے ان خوابوں کو با معنی بنا لیتا ہے جو کبھی اس کے لئے بے تعبیر تھے۔ ممکن ہے وہ شخص جو شطرنج کے کھیل میں ہار جیت پر جان دیتا ہے کبھی زندگی میں فتح کا یقین رکھنے کے جواب میں شکست کھا چکا ہو یا حقیقی زندگی میں وہ اپنے آپ کو کسی کمزوری کے باعث دوسروں پر فتح یا قابو پانے کا اہل نہ پاتا ہو۔ ڈراموں اور ناولوں سے وابستگی پیدا ہو جانے کا راز ہی یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو کسی مفروضہ کردار میں دیکھنے لگتا ہے۔

کھیل کے متعلق اس قدر نفسیاتی تحقیق و انکشاف سامنے آ چکنے کے بعد اس کی تعلیمی اہمیت کو تسلیم کر لینا لازمی ہے۔ کھیل کی سب سے بڑی اور عالمگیر خصوصیات خوشی اور آمد ہیں۔ چنانچہ ہمارا استاد اسی وقت کامیاب بن سکتا ہے جب وہ بچوں کے تعلیمی کام کو مشقت کی سطح سے بلند کر کے اس سطح پر لے جائے جہاں بچے اپنے کام میں اسی خوشی کے ساتھ حصہ لے سکیں جس خوشی کے ساتھ وہ کھیل میں شریک ہوتے ہیں۔ بچوں کی زندگی کا بیشتر حصہ کھیل میں گذرتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کھیل کو اُن کی تعلیم کا مرکز نہ بنایا جائے۔ کھیل کو ایک مستقل طریقۂ تعلیم بنا کر روشناس کرانا فروبل کا کام تھا۔ اس کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

"سبق جو کھیل سے اور کھیل کے ذریعے دیئے جائیں۔ جو زندگی سے اور زندگی کے ذریعے دیئے جائیں وہ بذات خود بھی سب سے زیادہ موثر، آسان، سہل الفہم اور ترقی بخش ہوتے ہیں اور طالب علم پر بھی واقعی اثر کرتے ہیں۔"

گڑیاں ہی لیجئے۔ چھوٹے بچّوں کے لئے کھیل کا کھیل ہیں اور کام کا کام۔ پہلے گڑیاں بنیں گی پھر اُن کے لئے کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔ پھر گڑیوں کے لئے گھر چاہئے اور گھر کے لئے چھوٹی چھوٹی میز کرسیاں اور کھانے کے چھوٹے چھوٹے برتن چاہئیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک گڑیا کی ضرورتیں ایک "گڑیا خاندان" کی ضرورتیں بن جاتی ہیں۔ اور اس طرح بچّہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں سماجی حقوق سمجھنے لگتا ہے۔ گڑیوں کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ گڑیاں بیمار پڑتی ہیں، گڑیاں مرتی ہیں، گڑیاں ایک دوسرے کے یہاں جاتی ہیں۔ گڑیاں سیر و تفریح کی غرض سے بچّے کی دنیا میں دور دور مقامات کا سفر کرتی ہیں۔ یہ تمام مشاغل وہ ہیں جو چھوٹے بچوں کے لئے زبان، حساب، مقامی جغرافیہ، سائنس اور سماجی علوم کا مرکز بن سکتے ہیں "یہ گڑیا ہے، یہ گڑیا کا گھر ہے" وغیرہ قسم کے جملوں سے زبان کی ابتدا کریں گے۔ حساب کے سلسلے میں گنتی، جوڑ، گھٹانا۔ گڑیوں کے کپڑے۔ گڑیوں کے برتن، اور گڑیوں کی میز کرسیاں وغیرہ سب ذریعہ تعلیم بن سکتی ہیں گڑیوں کے گھر کے سلسلے میں انھیں بتایا جا سکتا ہے کہ گھر کی انسان کو ضرورت کیوں پیش آئی اور انسان گھر کے علاوہ موسم کے اثرات سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرتا ہے۔ گڑیاں وقت پر سوتی جاگتی ہیں اور وقت پر کھاتی پیتی ہیں۔ یہاں صحت کے اصول آجاتے ہیں۔ الغرض اسی طرح بچوں کا پورا ابتدائی نصاب اُن کے کھیل کے ذریعے انھیں سکھایا جا سکتا ہے۔ میڈم مانٹوسری کا طریقہ تعلیم بھی کھیل کے متعلق انھیں انکشافات پر مبنی ہے۔ بچہ اُستاد کی زیر نگرانی اپنا راستہ اپنے آپ تلاش کرتا ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق چیزوں کو پسند کر کے خود ہی اُن کی اچھائیوں اور برائیوں کو محسوس کرتا ہے اور بالآخر عزت نفس، خودداری، خوداعتمادی۔ الغرض رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ سیکھ جاتا ہے جو درجوں میں بیٹھ کر کتابیں رٹنے والے بچوں کو کبھی میسّر نہیں آتا۔ ڈاکٹر مانٹوسری کے اس خیال سے نہ صرف پروفیسر نن جیسی ہستیوں نے موافقت کی ہے بلکہ برٹرنڈرسل نے خود اپنے بچّے کی مثال پیش کر کے اس ضبط و تادیب پر حیرت ظاہر کی ہے جو اُن کے بچّے میں اس طرح بغیر کسی دباؤ کے پیدا ہوگئی۔

ذرا اور بڑے بچوں کے کھیل مختلف ہوتے ہیں وہ تاریخ کے واقعات کو رٹنے کے بجائے ڈرامے کے ذریعے دلچسپ بنا کر اپنا لیتے ہیں۔ اِن بڑے لوگوں کے لئے کھیل ہی کو مدنظر رکھتے ہوئے مسٹر آرم سٹورنگ نے انکشافی طریقہ تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی۔ طالب علم ایک محقق کی حیثیت سے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے تجربے کرے اور ان سے اپنے نتیجے نکالے۔

خود وردھا اسکیم کا سب سے زیادہ نیاپن اور بااثر ہونا اس بات میں ہے کہ اس نے تعلیم کا وہ طریقہ تجویز کیا ہے جو بچے کے فطری تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ سات سال سے چودہ برس تک کی عمر کے بچوں میں فطری طور پر یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ کچھ چیزیں بنائیں اور کچھ چیزیں توڑیں۔ کھیل میں بچے کے اسی فطری ذوق وشوق کی پذیرائی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے کھیل کو محض سعی لاحاصل بنانے کے بجائے ایک ایسے حرفے کی شکل دیتے ہیں جو ایک طرف اگر امیری اور غریبی کا فرق مٹا دے تو دوسری طرف تعلیم کو کسی حد تک خود پرور بنا دے۔ ملک میں آج بھی ایسے لوگ بے شمار ہیں جو کہتے ہیں کہ حرفہ بچوں سے ناروا مشقت لینے کا آلہ بن جائے گا۔ لیکن ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کے پاس پہننے کو ضرورت سے زیادہ کپڑے اور کھانے کو ضرورت سے زیادہ کھانا موجود ہے اور جو آرام کرسی پر بیٹھ کر دنیا اور زندگی کو رنگین نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

کھیل کے ذریعے صرف نصاب کا پورا کرنا یا نہ کرنا ہی ناممکن نہیں ہے بلکہ کھیل اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا آلہ بھی بن سکتا ہے۔ یوں کوئی فراز محراب ومنبر سے لاکھ پند ونصائح کی بارش کرے لیکن نتیجہ کوہ کندن وکاہ بر آوردن کا مصداق ہوگا۔ بوائے اسکاوٹس کی تحریک کی اصلی بنیاد ہی یہ ہے۔ کھیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بچے قانون کے اندر رہ کر آزاد رہنا سیکھتے ہیں اور مسٹر گارڈنر کے ان الفاظ کی حقیقت کو پہنچ جاتے ہیں۔

"آزادی محض ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک سماجی معاہدہ ہے۔"

ڈیوی صاحب نے کھیل کے طریقہ تعلیم کے متعلق دو اندیشے ظاہر کیئے ہیں۔ اول یہ کہ بچے

ـروں کی نقل کرتے کرتے قدامت پسندی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور وہم اسی بنار پر ان میں
ـلط طریقوں اور غلط عادات کے پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ لیکن یہاں ڈیوی صاحب
ـستاد کے فرض کو نہ معلوم کیوں نظر انداز کر گئے ہیں بچہ کتنی ہی آزادی کے ساتھ اپنا کام کرے
ـیکن اس کا ماحول بہر طریق اُستاد کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مانٹو سری نے اُستاد کو ایک
ـماشائی کی حیثیت دی ہے لیکن ان کا یہ ہرگز مقصد نہیں تھا کہ اُستاد ایک غیر ذمہ دار تماشائی
ـی حیثیت اختیار کرے بلکہ اسے بچے کے پاس مدد کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ یہی
ـوجہ ہے کہ عہد جدید کے اُستاد کی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ بجائے ایک ملازم
ـپیشہ چپراسی کی دار کے "فلاسفر، رہبر، اور دوست"، والی حیثیت کا مالک
ـہو چلا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ کہنا کہ اچھے اُستاد کی کتاب زندگی کا عنوان علم نہیں
ـمحبت ہے، اس حقیقت کی تائید میں ہے اور اس لئے ہمارا نصب العین ہی برنارڈ شا کے الفاظ
ـمیں اُس مدرسے کی تخلیق ہونا چاہیے جہاں

"کام کھیل ہے اور کھیل زندگی، ایک میں تینوں اور تینوں میں ایک"

تعلیمی تاش

کھیل کا کھیل ہے اور تعلیم کی تعلیم۔ بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم نے ان تاشوں
کو پسند کیا ہے۔ اپنے بچوں کے لئے ضرور منگوائیے۔

قیمت تاش کلاں ۸، تاش خورد ۴، ہندی ۱۲، انگریزی ۷
مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی

(اختر انصاری صاحب بی اے آنرز)

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے۔

میں نے اپنا طویل سفر شروع کیا۔ سنسان جنگلوں اور وسیع میدانوں میں نور کی بارش کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ میرے رُخِ انور کی ضیاپاشیوں سے زمین کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا۔ جہاں راتوں کو ہولناک تاریکیاں چھائی رہتی ہیں وہاں میں نے طور کے جلوے بکھیر دیے۔ جن فضاؤں پر قبرستان کا سناٹا طاری رہتا ہے اُن میں لطیف و نازک موسیقی کی لہریں دوڑا دیں۔ مہیب درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے قدموں میں سیال چاندی کے دریا بہا دیے۔ میری چال اٹھلائی ہوئی تھی۔ میری ادائیں مستانہ تھیں۔ میرا نکھار نظر افروز تھا۔ مہینے کی چودھویں تاریخ تھی اور دنیا جانتی ہے کہ چودھویں رات کو میری سج دھج میری چمک دمک، اور میرے حسن کا بناؤ انتہائی دلفریبی اور پاکیزگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ خیر، جنگلوں اور میدانوں کو عبور کرتی ہوئی آگے بڑھی تو آم کے مہکتے ہوئے باغوں میں داخل ہوئی۔ سوئے ہوئے درخت جاگ اُٹھے اور پتے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کوئل نے کوکنا شروع کیا۔ اس کا چوٹ کھایا ہوا دل میرے شباب کی بہار دیکھ کر تڑپ اُٹھا اور وہ بے قرار ہو ہو کر اپنا دکھ بھرا گیت الاپنے لگی۔ ساری فضا اُس کے نشتریں نغموں سے معمور ہوگئی۔ یہ میری موجودگی کا اثر تھا، ورنہ کوئل کی کوک میں یہ دلگدازی کیفیت اور یہ خنجریت کہاں! خود میں نے کوئل کی فریاد سے کوئی اثر نہ لیا۔ معشوقانہ بے نیازی اور محبوبانہ بے التفاتی کے ساتھ اپنے سفر کو جاری رکھا۔ تھوڑی دیر جھیل کی سطح پر رقص کیا اور موجوں کی آغوش میں جھولا جھولا۔ پھر سرسوں کے لہلہاتے ہوئے

کھیتوں میں پہنچ گئی۔ بسنت پھولی ہوئی تھی اور دُور دُور تک پیلے پیلے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بازو پھیلا دئے اور ان گلزاروں کو اپنی نور بھری آغوش میں لے لیا۔ میری سیمنیاں پھولوں کی رنگت میں پیوست ہو گئیں اور ایک عجیب دلکش سماں بندھ گیا۔ میں اپنے حُسن کو اسی طرح لٹاتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ تمدن اور انسانی آبادی کے آثار نمودار ہوئے ـــــ مصنوعی نہریں، بجلی کے تار اور کھمبے، فیکٹریاں اور کارخانے، پھونس کے جھونپڑے، کچے پکے مکانات اور کہیں کہیں عالیشان کوٹھیاں! میں ان سب کو نور میں نہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب میں شہر کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی۔ اٹھلاتی، جھومتی، مستی بکھیرتی اور نور چھلکاتی چلی جا رہی تھی کہ سامنے درختوں کی آڑ میں مجھے اپنے پرستار شاعر کا دو منزلہ مکان دکھائی دیا۔ بالا خانے پر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ کھڑکی کھُلی ہوئی ہے۔ دل اُچھل پڑا۔ چھاتی دھڑکنے لگی اور رُوح میں ارتعاشس پیدا ہو گیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا، "چاندنی! آج تو تمھاری قسمت جاگ اُٹھی۔ کھڑکی کھُلی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمھارا شاعر واپس آ گیا"

یہ کھڑکی تقریباً ایک سال سے بند تھی۔ میں ایک سال تک اپنے حسن کی مکمل آرائش لے ساتھ آتی رہی اور یہاں سے ناکام لوٹتی رہی۔ میں نہایت اشتیاق کے ساتھ چھم چھم کرتی ہوئی آتی، درختوں میں سے جھانک کر کھڑکی کی طرف دیکھتی، اور جب اس کو بند پاتی تو افسردہ ہو جاتی، اور اپنے سیمین ہاتھوں سے کھڑکی کی بلائیں لے کر ٹھنڈے سانس بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

یہاں ایک شاعر رہا کرتا تھا۔ وہ میرا پرستار تھا۔ میری صباحتوں پر جان دیتا تھا۔ اس کو میرے جلوۂ سیمین کے ساتھ عشق تھا جن راتوں کو میری آب و تاب معمول سے زیادہ ہوتی، خصوصاً چودھویں رات کو، میں کھڑکی کے راستے سے دبے پاؤں اُس کے

کمرے میں داخل ہو جاتی۔ وہ فرش پر بیٹھا ہوا مصروف مطالعہ نظر آتا۔ اس کے چاروں طرف کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ پڑی ہوتیں۔ میں اندر پہنچ کر اپنی ساری آب و تاب اُس پر نچھاور کر دیتی اور خود اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتی۔ وہ کتاب ہاتھ سے رکھ دیتا اور کمرے کی مصنوعی روشنی کو گل کر دیتا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو جاتا۔ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا۔ اس کے دل کی ساری بے چینی، اس کی روح کی ساری تڑپ اُس کے سارے شاعرانہ جذبات سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آ جاتے۔ کبھی وہ فرش پر دراز ہو جاتا، گویا مجھ سے ہم آغوش ہو جانا چاہتا ہے۔ کبھی گنگنانے لگتا۔ اور کبھی قدرے بلند آواز سے ایک سحر آفریں دھن میں گانے لگتا۔

فلک سے نور بھرے خم لنڈھا رہا ہے چاند   میں صبحِ خُلد نہ لوں ایسی رات کے بدلے

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا   تجھ پر تو اِک قیامت عہدِ شباب لایا

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو   رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے   تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

وہ ان شعروں کو اس قدر سوز و گداز کے ساتھ گاتا کہ میں اپنی روح میں ایک تموّج اور ایک اہتزاز محسوس کرتی اور میرا سارا وجود مترنم ہو جاتا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ گاتے گاتے اپنی بیاض نکال لیتا اور اس میں سے وہ اشعار پڑھنے لگتا جو اس نے میرے حسن کی تعریف میں لکھے تھے۔ میری محبت شاید اس کی سرشت میں داخل تھی، کیونکہ اُس کی قوتِ شعری کا بڑا حصہ میرے لئے وقف تھا اور میں اس کے شاعرانہ نغموں کے بہترین اجزا پر قابض تھی۔ وہ میرے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار

کیا کرتا تھا۔

چاندنی ایک آگ ہے، پگھلی ہوئی، سرد، اور بھیگی ہوئی! یہ میری سلگتی ہوئی جوانی کی ٹھنڈک ہے کاش میں اس کو سمیٹ کر اپنے سینے میں رکھ سکتا!

اگر چاندنی کے سوا کائنات کی تمام دلفریبیاں ختم ہو جائیں تب بھی یہ دنیا حسین کہلانے کی مستحق ہوگی!

دن کی روشنی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ اور چاندنی؟ یہ شاعروں افسانہ نویسوں عشق پسند اور خیال پرست لوگوں کے لئے خلق کی گئی ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ کائنات عمر خیام کا ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ بدبخت ہی وہ انسان جو ایسی رات سو کر گزار دیتا ہے!

چاندنی ایک موسیقی ہے، سہانی، نرم اور معطر! یہ صرف دردمند لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

چاندنی ایک شراب ہے، روپہلی، نورریں اور دہکتی ہوئی! کاش میں اس شراب سے اپنا جام بھر سکتا!

یہ اور اس قسم کے خیالات وہ میرے متعلق اپنے اشعار میں پیش کیا کرتا تھا۔ جب وہ ان اشعار کو گاتا تو میں مست ہو جاتی اور جھومنے لگتی۔ یہ اس کا نذرانۂ محبت تھا اور میں اس کو بصد شوق قبول کرتی۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ اشعار گانے چھوڑ دیے۔ اب زیادہ تر ایسے شعر اس کے ورد زبان رہنے لگے جو ایک والہانہ شیفتگی اور ایک پُر جوش جذبۂ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے مثلاً

شعر ہو، نغمہ ہو، بہار ہو تم — رشک کرتی ہے مجھ پہ اک دنیا

گل‌رنگ، عارض لالہ گوں، زلفیں شمیم انگیز — خدا آباد رکھے اِس جوانی کے گلستاں کو

یہ نگاہ میں عکس شباب ہے — دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے

سرِ زانو پہ ہو اُس کے اور جان نکل جائے — مرنا تو مسلّم ہے، ارمان نکل جائے

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

صرف یہی نہیں کہ وہ ان اشعار کو گایا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تبدیلیاں مجھے
کے اندر نظر آئیں۔ اس کی جوانی کا روپ پہلے سے زیادہ نکھر گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک
ہولی چمک پیدا ہوگئی — ایک لوچ، ایک رسیلا پن، ایک آرزومندانہ کیفیت! ایسا معلوم
تھا کہ اس کی روح آنکھوں میں سے جھانک رہی ہے اور کسی کی پرستش کے لئے بے قرار ہے
نے یہ نتیجہ نکالا کہ اُس کو کسی سے محبت ہوگئی ہے، وہ کسی کافر ادا کی زلفِ سیاہ کا اسیر ہوگیا
کسی ساحرہ کا جادو اُس پر چل گیا ہے۔

اور میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ کیونکہ ایک رات جب میں اُس کے کمرے میں گئی تو میں نے
کہ اُس کے قریب ایک چھوٹی سی گول میز پر ایک دوشیزہ کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ یہ تصویر
نہایت نازک اور خوبصورت فریم میں جڑی ہوئی تھی اور یقیناً حسنِ نسوانی کا ایک نادر نمونہ
کر رہی تھی۔ آنکھیں شباب کی مستی سے لبریز تھی اور اُن سے نشہ برس رہا تھا۔ گویا شراب کے
ہیں کہ لنڈھائے جا رہے ہیں! ہونٹوں سے تبسم کا ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا جس سے سارا چہرہ
ب تھا۔ تصویر کا ہے کو تھی، لطافت اور رعنائی کا ایک دلآویز خواب تھی!

"تو واقعی شاعر محبت میں مبتلا ہے۔" میں نے اپنے دل میں کہا، "اور یہ ہے وہ زہرہ جمال جس نے
کے دل کو مسحور کیا ہے، جس کی یاد میں وہ مزے لے کر عشق بھرے شعر گایا کرتا ہے۔"

اتنے میں شاعر نے میز پر سے تصویر اٹھائی اور اُسے ہاتھ میں لے کر اس طرح دیکھنا شروع کیا جس طرح کوئی آئینہ دیکھتا ہے۔ اُس وقت وہ اپنی آنکھوں سے صاف یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا، "مجھے تم سے محبت ہے! میں سراپا آرزو ہوں! میں اشتیاق کی دنیا ہوں"! اور جب آنکھیں محبت کا پیغام پہنچا چکیں تو اس نے یہ شعر گایا اور کچھ اس طرح تڑپ کر گایا کہ میں اپنی نیم مدہوشانہ حالت سے چونک پڑی اور فضا میں ایک بجلی سی کوند گئی:۔

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر نگاہِ شوق! اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے

یہ نغمہ ابھی فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ اُس نے بے اختیار اپنا منہ تصویر پر رکھ دیا۔

"چاندنی! تمھارا پرستار اس دوشیزہ کو دل و جان سے چاہتا ہے"! میں نے اپنے آپ سے کہا میں رشک و حسد جیسے انسانی جذبات سے عاری ہوں۔ اس لئے شاعر کی محبت کا راز معلوم کر کے میں بالکل رنجیدہ نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے مسرت کا ایک بے لوث جذبہ اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا۔ "میری خوشی تو اسی میں ہے کہ میرا پرستار خوش ہو گا" میں نے اپنے دل میں خیال کیا، "پھر اگر وہ ایک دوشیزہ کے عشق میں راحت اور مسرت کا سامان پاتا ہے تو میرے نزدیک اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے"۔

چنانچہ جوں جوں شاعر کی فریفتگی بڑھتی گئی میری مسرت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ میں اُس کے کمرے میں جاتی۔ وہ محبت بھرے نغمے الاپتا۔ تصویر سے باتیں کرتا اور اس کو بار بار چومتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھا کرتی اور اپنے ابدی سکون کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی طمانیت کے مزے لوٹا کرتی۔

ایک رات میں اُس کے کمرے میں پہنچی تو اس کو بہت افسردہ اور مغموم پایا۔ کمرے کی روشنی پہلے ہی سے گل تھی اور وہ تکیوں میں اپنا چہرہ چھپائے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اُس کو میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور بے معنی نگاہوں کے ساتھ کھڑکی کے باہر دور کسی چیز کو تکنے لگا پھر اُس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی تصویر کے اوپر جم گئیں۔ آج وہ تصویر کو میز پر سے اُٹھاتے ہوئے

جھجھک رہا تھا۔ گویا کوئی چیز ہے جو دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ دور سے بیٹھا حسرت کے ساتھ اُس کو دیکھتا رہا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ اُس کی سرد آہوں سے میرے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور مری روح تھرتھرا اُٹھی۔ پھر اُس نے نہایت دردناک لَے میں یہ شعر گایا۔

مرے دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ دے کوئی　　کہ آج تھوڑی سی تسکین چاہتا ہوں میں

جتنی دیر میں وہاں رہی وہ اس شعر کو گاتا رہا اور سرد آہیں بھرتا رہا۔

اب جب بھی میں جاتی اُس کو اسی سوگوار کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتی۔ وہ اشعار بھی جو کچھ دنوں سے اُس کی زبان پر رہتے تھے اور جن کے ذریعے وہ اپنے ولولۂ عشق کا اظہار کرتا تھا اُس نے گانے چھوڑ دیئے۔ اب اگر وہ کبھی گاتا بھی تو صرف ایسے شعر گاتا جن میں فراق کے صدموں کا ذکر ہوتا۔ مثلاً

کیا قہر ہی جدائی جب چاندنی کھلی ہو　　آنکھوں سے رات بھیم ٹوٹا کئے ستارے

جوانی اور ہنگاموں سے خالی　　یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے!

چاندنی اور اداس تنہائی!　　تم ہو کس حال میں خدا جانے

ایک دن اس آخری شعر کو گاتے گاتے اُس کا دل بھر آیا اور آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ پھر وہ کچھ اس طرح بیتاب ہو کر رویا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ گئے۔ گویا ایک چھائی ہوئی گھٹا تھی کہ یکایک برس پڑی۔

اُدھر چند دن سے جو اُداسی اور غمگینی اُس پر طاری تھی وہ میرے لئے ناقابل فہم نہ تھی۔ اور بس گریۂ بے اختیار کا سبب بھی میں سمجھ سکتی تھی۔ صورتِ حال سے صاف ظاہر تھا کہ اُس کو محبت کی ناکامیاں ستا رہی ہیں اور جدائی کے صدمے خون رُلا رہے ہیں۔ البتہ یہ سمجھنا میرے لئے مشکل تھا کہ یہ ناکامیاں کیوں ہیں اور اِن جدائی کے صدموں کا باعث کیا چیز ہے۔ یا تو دوشیزہ نے اُس کی

محبت کو ٹھکرا دیا تھا، اور یا خارجی حالات کے سبب سے محبت کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں۔ بہرحال شاعر کی فراق زدگی ایک روح فرسا اور ناقابلِ انکار حقیقت تھی۔

اور اب جو میں نے اس کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو میں بلبلا اُٹھی۔ میرا دل اس کی تکلیف کے احساس سے پاش پاش ہو گیا۔ اگر خدا نے مجھے زبان دی ہوتی تو اُس وقت میں شاعر سے کہتی "میرے پرستار! میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو۔ میں دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سفر کرتی ہوں۔ ہر جگہ جاتی ہوں اور ہر مقام کی سیر کرتی ہوں۔ دنیا کی کوئی مہ جبیں میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ دوشیزائیں بھی جو حرم کی چار دیواری میں مقید ہیں اور سورج کی روشنی سے پردہ کرتی ہیں، میرے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ میں تیری محبوبہ کو کہیں نہ کہیں ڈھونڈھ ہی لوں گی، کسی نہ کسی دن ضرور اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اور جب وہ مجھے مل جائے گی تو اُس کو اپنی روپہلی چادر میں لپیٹ لوں گی، اس کے چاروں طرف اپنے نور کا جال بچھا دوں گی۔ اور تیری محبت کا پیغام اُس تک پہنچاؤں گی۔ تیری آہوں کا سوز، تیرے آنسوؤں کی موسیقی، تیرے اندوہناک نغموں کا گداز، تیری بے خواب راتوں کی بے چینیاں، تیرے دل کی جلن، تیری روح کی تپش، ان تمام چیزوں کو لے جا کر اُس کے قدموں میں ڈال دوں گی۔ وہ متاثر ہو گی۔ یقیناً تیری محبت کا جواب محبت سے دے گی۔ پھر یہ جدائی کے صدمے نہ رہیں گے یہ محرومیاں اور یہ الم نصیبیاں ختم ہو جائیں گی۔ میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو!" یہ سب میں اُس سے کہتی اور اس طرح اُس کو تسکین دیتی۔ مگر افسوس میں منطق سے محروم ہوں۔ میرے مرمریں ہونٹوں پر سکوتِ دوام کی مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بیکسی کے ساتھ اُس کو روتا ہوا دیکھتی رہی اور جب روانگی کا وقت آیا تو اسی حالت میں اُس کو چھوڑ کر چلی آئی۔

اگلے دن اُدھر سے میرا گذر ہوا تو کھڑکی بند تھی۔ میں دیر تک کواڑوں کا سہارا لئے کھڑی رہی لیکن کھڑکی نہ کھلی۔ آخر کار مایوس ہو کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اس طرح تقریباً ایک سال تک کھڑکی بند رہی۔ میں بدستور ماہ بماہ ادھر سے گزرتی رہی اور

رابر اس سوال پر غور کرتی رہی کہ شاعر یکایک کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا۔ اس کے علاوہ یہ امید بھی برابر میرے دل میں رہی کہ ایک نہ ایک دن کھڑکی ضرور کھلے گی اور میں ضرور اپنے پرستار کو دیکھوں گی۔

چنانچہ گزشتہ رات جب میری نظر کھڑکی پر پڑی اور میں نے اس کو کھلا ہوا پایا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں اپنی اس وقت کی خوشی اور گھبراہٹ کو بیان نہیں کر سکتی۔ بہرکیف دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھی اور کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

شاعر موجود نہ تھا۔ لیکن وہ دودھ جیسا سفید فرش بدستور بچھا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ چھوٹی گول میز بھی اپنی جگہ پر تھی، اگرچہ اس پر سے وہ تصویر غائب تھی جو کبھی شاعر کے پرستارانہ جذبات کا مرکز تھی۔ کمرے کی ظاہری ہیئت تقریباً وہی تھی جس سے میں ایک سال پہلے تک واقف تھی۔ کوئی قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم مجھے ماحول کے مختلف اجزا میں ایک خاص ترتیب اور خاص سلیقے کا احساس ہوا۔ کمرے کی آرائش میں کسی نسوانی ہاتھ کی کارفرمائی نظر آ رہی تھی۔ یہ شاعر کی سوگوار دنیا میں ایک خفیف مگر دلچسپ اضافہ تھا۔ میں اس پر غور کرتی ہوئی کمرے کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ یکایک میری نظر دوشیزہ پر پڑی جو ایک آرام دہ کرسی پر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اس کمرے میں جہاں کبھی ایک تنہائی پسند شاعر کے سوا کسی دوسرے متنفس کو نہ دیکھا تھا، اس طرح ایک دوشیزہ سے دوچار ہونا پڑے گا میں اس تصادم کے لئے قطعی تیار نہ تھی، گھبرا سی گئی اور بدحواس ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ میری موجودگی سے بالکل بے خبر تھی اور ایک دلربایانہ انداز میں مصروفِ مطالعہ تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور بسنت کے موسم کی لطیف ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ چہرہ کا سفید دمکتا ہوا رنگ نیلی ساڑی کی وجہ سے اور بھی دمک رہا تھا۔ گردن جیسے بلور کا ٹکڑا! عریاں سینہ جیسے آفتاب کی قاش! گوری کلائیاں جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا نور! اور پاؤں خدا کی پناہ! وہ اس قدر نازک

اور شفاف تھے کہ معلوم ہوتا تھا مرمر کو تراش کر بنائے گئے ہیں یا برف کے گالوں سے تیار کئے گئے ہیں۔

میں اس کے فردوس حسن کا نظارہ کر رہی تھی کہ مجھے اس کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر کسی ایسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا جس سے میں آشنا تھی۔ حافظے میں حشر سا برپا ہو گیا۔ گویا یادوں کے پوشیدہ خزانے کھنگالے جا رہے ہیں اور نہاں خانۂ ماضی میں سے کوئی چیز کھود کر نکالی جا رہی ہے۔ لمحہ بھر یہ کاوش رہی۔ اور اس کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ میں اس حسن کی ملکہ کو پہچان گئی۔ اس کی آنکھوں کی مستی اور ہونٹوں کا تبسم، یہ دونوں چیزیں میں اس تصویر میں دیکھ چکی تھی جو ایک سال قبل تک شاعر کے سامنے میز پر رکھی رہتی تھی اور جس کو پوج کر وہ اپنے جذبۂ پرستش کو آسودہ کیا کرتا تھا۔

میں خوشی کے مارے بیتاب ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "چاندنی! یہ شاعر کی محبوبہ ہے تمہارے محبوب کی محبوبہ! یہ وہی کافرہ ہے جس نے کبھی شاعر کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا، جو اس کی زندگی کے پُرسکون دریا میں طوفان اور تلاطم بن کر آئی تھی۔ وہ اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ آخرکار اس نے اس کو پا ہی لیا۔ کتنی حسین ہے یہ! اور شباب سے کس قدر بھرپور! یہ واقعی پرستش کے قابل ہے۔"

میں ان خوشگوار خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ شاعر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا اور اس کے سامنے فرش پر لوٹنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش خدا نے مجھے زبان دی ہوتی اور میں شاعر سے کہتی "تم آ گئے! میرے پرستار! میرے محبوب! تم آ گئے! میں کتنی خوش ہوں! اور تم تنہا نہیں آئے بلکہ اپنی دل کی ٹھنڈک اور اپنی روح کے اجالے کو بھی ساتھ لائے۔ تمہاری مراد بر آئی۔ تمہاری امیدوں کا دامن پھولوں سے بھر گیا۔ تمہاری آہیں اور تمہارے آنسو رائگاں نہ گئے۔ میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں۔ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہوں۔ آہ! میں کتنی خوش ہوں!"

میں اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی اور وہ خالی بے جان نظروں سے کھڑکی کے باہر دور

کسی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے کیف تھا اور جذبات سے عاری۔ آنکھوں میں وہ شرارے نہ تھے جو ایک سال پہلے تک پائے جاتے تھے۔ نہ ہونٹوں پر وہ تبسم کی بے قرار موجیں! وہ کسی الجھن میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید ان دنوں کو یاد کر رہا تھا جب اُس کی زندگی میں نہ محبت تھی نہ محبت کی تلخیاں اور شیرینیاں۔ بس ایک تڑپ تھی اور ایک بے چینی! اُس کا سرشار دل تھا اور چاندنی راتوں کی پُر رونق بہاریں!

دوشیزہ کرسی پر بیٹھی ہوئی مطالعے میں مصروف تھی۔ وہ شاعر کی موجودگی سے اسی قدر بے پروا تھی جس قدر میری موجودگی سے بے خبر۔ شاعر بھی اُس کی طرف کوئی توجہ نہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات تکلف اور رسمیت کی تمام حدود کو توڑ چکے ہیں اور اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں التفاتِ باہمی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یکایک شاعر چونک سا پڑا۔ جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے خشک لہجے میں دوشیزہ سے کہا، "روشنی گل کر دو!" دوشیزہ نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی ہے۔ بالآخر اس نے کہا "کیوں ؟"

ایسا معلوم ہوا کہ کسی ساز کے ایک تار کو اتفاقاً مضراب چھو گئی۔ اور ایک ہلکا سا نغمہ فضا میں گونج کر رہ گیا۔ اُس کی آواز بے انتہا سریلی تھی۔

"اس لئے کہ میں کہتا ہوں،" شاعر نے کڑک کر جواب دیا۔ آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک نیا شعلہ دیکھا ــــــ غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ! میں سوچنے لگی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو ایک سال پیشتر اس عورت کی تصویر کو پوجتا تھا۔

دوشیزہ تقریباً ایک لمحہ بالکل ساکت رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور ہونٹ بے طرح کانپنے لگے۔ اس نے کتاب کو زور سے زمین پر دے مارا اور کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا بدن جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔

"اب تمھیں میرا پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے؟" اس نے کہا اور بے اختیار رو پڑی۔

"پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے" شاعر نے اُس کے لفظوں کو حقارت آمیز لہجے میں دہرایا۔ میں تمھیں پڑھنے کو کب منع کرتا ہوں! دوسرے کمرے میں جا کر نہیں پڑھ سکتیں؟"

"دوسرے کمرے میں!" دوشیزہ نے کہا، "اور اس کمرے میں کیا ہوا؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے تیری صورت بُری معلوم ہوتی ہے"

شاعر نے جواب دیا" دیکھو مفت میں جھگڑا نہ کرو۔ میں اِس روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم نے میری جان عذاب میں کر دی۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میری وجہ سے تمھاری جان عذاب میں آ گئی ہے۔ تو پھر نکال باہر کرو نا! قصہ ختم ہو۔ تمھارا جی بھر گیا۔ اب کیا ضرورت ہے تمھیں میری!"

"پھر وہی! نکال باہر کرو! نکال باہر کرو! یہ کہنا خوب سیکھ لیا ہے۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ یہ جو سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہا ہوں، اِدھر سے اُدھر مارا پھر رہا ہوں......."

"سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہے ہو تو کیا میں نے تم سے کہا ہے کہ مصیبتیں جھیلو!"

"ہاں اور کیا! یہ سب تمھاری وجہ سے ہے۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی"

"اور میری زندگی برباد نہیں ہوئی؟ میں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ خاندان پر لات ماری۔ اپنی عزت گنوائی....." وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی آواز بھرّا گئی۔

"تم نے عزت گنوائی اور میں نے بڑی نیکنامی حاصل کی! میں نے سارے زمانے کی برائی مول نہیں لی؟ اپنے خاندان والوں کو دشمن نہیں بنایا؟ میں گھر سے بے گھر نہیں ہو گیا؟ سال بھر تک تمھیں لئے لئے پھرا۔ دنیا کی ٹھوکریں کھائیں....."

"اب اس سب کی ذمہ دار میں ہوں؟ میں نے اپنا سب کچھ اسی لئے قربان کیا تھا کہ جوتیاں کھاؤں! ___ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!" یہ کہہ کر وہ کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"روؤ! خوب روؤ! تمھیں اور آتا ہی کیا ہے!" شاعر نے کہا۔

"میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!— میرے اللہ یہ میں نے کیا کیا!—" وہ یہ کہتی جا
تھی اور روتی جاتی تھی۔

"اچھی طرح سے رو لو۔ میں جاتا ہوں" شاعر نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔

دوشیزہ زور زور سے رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کمرے کی فضا میں نالوں سے
ارتعاش پیدا ہو گیا۔

مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں اس کے گریۂ بے اختیار کی تاب نہ لاسکی جس طرح دبے
پاؤں کمرے میں گئی تھی اسی طرح دبے پاؤں چلی آئی۔

"میں اس کو صرف شاعر سمجھتی تھی۔ لیکن وہ پہلے مرد تھا اور بعد میں شاعر! آہ! یہ میں بھول
گئی تھی۔" میں یہ سوچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے!

خیالستان سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کی جوانی کے زمانے کے لکھے ہوئے یہ فسانے
اسقدر پُر رومان ہیں کہ شاید ہمیشہ جوان رہیں گے۔ تمام افسانوں کے پس
منظر پر وہ شگفتہ مدہوشی سی چھائی ہے کہ آپ کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ بارھواں اڈیشن ہے۔
دیکھا ہو تو ضرور دیکھئے۔ قیمت دو روپیہ عہ

بنی اسرائیل کا چاند مصنفہ رائڈر ہیگرڈ۔ مترجمہ عبدالمجید صاحب حیرت بی اے۔ اس
ناول میں بھی پرانے مصر کے ایک بہت مشہور رومانی عہد کا ذکر
ہے۔ اور پھر اس رومانی ماضی کے دھندلے میں عشق و محبت کی سرگرمیاں ناول شراب دو آتشہ
ہو گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ عہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

ملک الشعراء ذوق

۳۔ قصائد

نورالحسن صاحب ہاشمی

ذوق کا نام دراصل ان کے قصائد کی وجہ سے زندہ ہے اور رہے گا۔ اس لئے نہیں کہ
توسطین میں سوائے ان کے اور کوئی ممتاز نظر نہیں آتا بلکہ اس لئے کہ ظفر شاہ کے دربار کے بگڑنے
ر انگریزوں کے ساتھ واقعیت کی آمد نے گویا اس صنف ہی کو اڑا دیا ہے۔ اور اسی لئے ان کے
صائد کی تاریخی حیثیت ادب میں ہمیشہ اہم اور مسلم رہے گی۔

ذوق نے اپنے قصائد کی داغ بیل سودا کے قصائد پر ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ خود مختلف
وم میں دستگاہ رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی زبان پر قدرت۔ لیکن سودا کی سی پیچ اور آمد
تی۔ سودا اساتذہ فارسی کے قصائد کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ان کے قصیدوں پر قصیدے
ہ چکے تھے اس لئے اب ذوق کو دوبارہ اساتذہ فارسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی۔ لہذا
ودا ذوق کے لئے اچھے دلی ہاتھ آئے۔ اس کے علاوہ اردو میں اس وقت تک دوسرے
عراء اس قدر اس صنف میں مشہور و معروف بھی نہ ہوئے تھے۔ دلی کے کوچہ و بازار سودا کے
صائد کی تعریف سے گونج رہے تھے۔ اسی لئے ذوق نے جو کچھ سیکھا اس میں زیادہ تر سودا
ے تتبع سے سیکھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوق سودا کے کئی معنوں میں شاگرد ہیں۔ حالانکہ سودا کا اشہب تخیل
ذوق کے سمند تصور سے کہیں زیادہ بادپا ہے۔ وہ جتنی گہرائیوں میں جاتے ہیں، جتنی موشگافی

جوش، زور اور نزاکت تخیّل دکھاتے ہیں وہ ذوق سے بن نہیں پڑتی۔ کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ چھلاوہ پن وہ تیزی، طراری اور جولانی جو سودا کے یہاں ہے ذوق کو میسر نہیں آتی۔ ذوق کے یہاں سودا کی سی اپج بھی نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے ترجیعی کام زیادہ ملتا ہے۔ سودا جگہ جگہ پر اجتہاد کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ برخلاف اس کے ذوق صنائع و الفاظ کے پھیر میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

مُقابلہ
تشبیہ و استعارہ

(سودا)

ہاتھی۔ کوئی کہتا ہے بیٹھے ہے کھڑی آپ کو رات / کوئی بولے ہے نہیں چہرے پہ دن کے ہے خال
برہمن اس کو تو گنیش دیوتا بوسے / کہے ہے شیخ ہوا کعبہ رواں تعمیر
اس طرح دانتوں میں خرطوم ہے اس کے جیسے / موسم سردی کے ہوں کوتاہ دن اور رات دراز

(ذوق)

〃 تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ / سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال
کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے / بشنکر راہ میں مانگے اگر اس سے اطفال

تو جو محراب عماری میں ہوا جلوہ نما / اس کے دانتوں میں بہ خرطوم سے سوجھی تمثیل
خانہ قوس میں خورشید جہاں تاب آیا / دن ہی کوتاہ ہوئے اور ہوئی رات طویل

(سودا)

تلوار۔ عرض میں سے دو طرف ہو کے لگے بہنے طول / پڑے دریا میں جو تفرقہ انداز اجل

ذوق

〃 آب داری میں تری تیغ کہ ہے برق کی موج / کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش سیال

سودا

زلف یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگے تھیں دل / جس طرح ایک کھلونے پہ ہیں دو بالک
وحشت وہ تیر کہ عالم میں نہیں جس کے پناہ / چشم وہ ترک کہ ہو قوم جنہوں کا ازبک
دونوں عارض گویا شیشے ہیں مئے گلگوں کے / خط ان دونوں میں یوں جیسے نمکداں میں نمک
کمر اس کی میں نہ دیکھی کہ کروں اس کا وصف / تھی وہ اک آہوئے دل کیلئے چیتے کی لپک
بات اس لطف سے بہکے تھی دہن سے اس کے / بادہ جوں ساغر لبریز سے جاتا ہے چھلک
آگے تجھ بحر کرم کے صدف پر گوہر / مٹھی اس کی ہے جیسے نکلے بشدت چیچک
تشبیب مجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک / دی دمیں آ کے خوشی نے در دل پر دستک

ذوقؔ گلکاری زیادہ اچھی کرلیں گے لیکن سوداؔ کی سی مصوری نہیں کرسکتے اور غالباً یہ دونوں کے طبائع کا اثر ہے کہ ایک رند مشرب شخص ہے اور ایک عابد و زاہد سظاہر ہے کہ رند کی دنیا کس قدر لامحدود ہوتی ہے اور زاہد کی کس قدر محدود، اور یہ طبائع کا اثر ہر دو کے قصائد میں نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ سوداؔ کے یہاں جوش، جذبہ اور روانی ہے۔ ذوقؔ کے یہاں متانت، جزالت اور گرمی تخیل کا میدان سوداؔ کا ہے لیکن مشق اور استادی

پوچھا میں کون ہو بولی کہ وہ میں ہوں غافل
نہ لگے تو ق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیز دلبا
زندگانی کی حلاوت ہو جہاں میں جب تک

کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی نادان
پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

گریز۔ بسنت خاں کی مدح میں ایک باغ کی تعریف کرتے ہوئے خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔

القصہ سن کے جو بی نے تابئر سے کہا
جو مدعا ہو باغ سے کہ اس کی گفتگو

بولی کہ مدعا تو یہی ہے کہ تا ابد
اس میں بسنت خان بہادر ہو اور تو

یا امام ضامن کے قصیدے کی تشبیب میں زمانے کی خراب حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گریز کرتے ہیں۔

نہیں ہے امن کہیں زیر آسمان ہرگز
بجز زمین خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

یا امام کاظمین کی تعریف میں امرا و روساء کی نخوت کا بیان ہوتا ہے اور جب طبیعت کسی خاں کی تعریف کر کے روزی کمانے کا ارادہ کرتی ہے تو پیر عقل طمانچہ مارتا ہے کہ

حیراں ہوں میں کہ شکل نگیں پر نام غیر
اپنا تو روسیاہ کرے گا کہاں تلک

رکھے قلم کو مدح میں ایسوں کے سرنگوں
سجدہ کرے ہیں جس کو زمین و زماں تلک

یا قصیدہ باب الجنت میں بہار کے ذکر میں کہتے ہیں کہ میرے شعر پھولوں سے اچھے ہیں کیونکہ

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مدح کا
ذات پر جس کے ہے مہربن کنیہ عز و جل

(ذوقؔ)

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی

پہنچا کلک لشکر بار ان سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

زنجیر میں جوہر کے رہے تیغ ہمیشہ
خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

تشبیب — بعد شاہان سلف کے ہے تجھے یوں تفضیل
جیسے قرآں پس توریت و زبور و انجیل

گاہ غم میں ہے کہ شیشے میں کیا کیا ہے سیر
روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

دیگر۔ سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں تنہا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ حور طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں

پری کی صورت، چمن کی نگہت گراس کا شیدہ تو اس کا جلوہ
زبان شیریں، بیان رنگیں، کلام رنداں، خرام مستاں

انیس خلوت جلیس جلوت، حریف حکمت ظریف صحبت
یہ بزم یاراں بدل بہاراں۔ یہ اہل عزلت سگلے بداماں

جبیں بشکل مہ منور، عرق کے قطرے ہیں سیمیں اختر
ہلال ابرو، نگاہ جادو، خدنگ مژگان و چشم فتاں

نے ذوق کو کافی اونچے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ذوق کے زمانے میں چوں کہ زبان بھی متروک الفاظ سے کافی صاف ہو گئی تھی اس لئے بالکل موجودہ اردو معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کے قصائد میں فارسیت زیادہ ہے بہ نسبت بھاشا پن کے جو سودا کے زمانے کی پہچان ہے۔ نیچرل سادگی بھی ذوق کے قصائد میں سودا کی سی نہیں اور اس کی بھی وجہ یہی کہ ان کی دنیا محدود تھی۔ ایک تنگ و تاریک مکان کی رہائش۔ خارجی فطرت کی صنّاعیاں کیسے بیان کرتے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سودا میں فطانت تھی اور ذوق میں استعدادی قابلیت۔

طبعاً ذوق کو قصائد سے بہ نسبت غزل کے زیادہ مناسبت تھی۔ اس لئے کہ علوم متداولہ سے واقف، الفاظ اور ان کی نشست سے بخوبی آگاہ، سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں پر عبور، صنائع و بدائع و دیگر رعایات لفظی کے ماہر، مشق سخن نہایت بڑھی ہوئی اور یہی تمام چیزیں اس زمانے کی روایات تھیں ناممکن تھا کہ ذوق قصیدہ کہتے اور وہ مقبول نہ ہوتا۔ ظفر حالانکہ بے بس بادشاہ تھا پھر بھی ذوق کے لئے سنجر سے کم نہیں تھا۔

ذوق چوں کہ تقلید اچھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی خاص جدّت قصیدے میں نہیں کی اور اکثر بیشتر سودا کے قصائد کے مضامین کا چربہ اتارتے رہے۔ لیکن الفاظ کی شان و شوکت، چمک دمک سے وہ آب و تاب پیدا کر دیتے تھے۔ جس سے قصیدے میں ایک عجیب شان پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے

بروے رنگیں نگار بستاں، شگوفہ خنداں گرہ خنداں — بوئی پیچاں سے عشق پیچاں جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب جھلکا ہی جو دیکھو بینی تو یا الہی — دہن میں غنچہ، لبوں میں گلبرگ، روئے روشن میں ماہ تاباں
نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن صراحی آسا — وہ گول بازو، وہ گورے ساعد وہ پنجہ رنگیں بجوں مرجاں
کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے — اور اس پہ سو نور لہر کھائے بھرا سینہ ہیں دو قمر فروزاں
وہ ران روشن وہ ساق سیمیں وہ پائے نازک حنائیں رنگیں — وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں — بہت جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجیب ناداں

علاوہ علمیت کی وجہ سے بھی ان کی تشبیب سودا سے اکثر ارفع اور جزیل ہو جاتی ہے[1]۔ حالانکہ ان کے بیشتر قصائد ایسے ہیں جن پر ان کی نظر ثانی نہیں ہو سکی ہے۔ پھر بھی وہ اردو ادب کے خزانے ہیں۔ خصوصاً مرصع تشبیبوں میں ذوق کی قدرت الفاظ دیکھ کر حیرت کا باعث ہوتی ہے۔ تشبیب دراصل ممدوح کو متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ ہوا کرتی تھی جو مختصر جامع اور مناسب باتوں پر مشتمل ہوتی لیکن ذوق کے زمانے تک وہ شاعر کے فن و ہنر کی نمائش کا ایک موقع بن گئی۔ اسی لئے ذوق کی تشبیب عموماً طویل ہوتی ہیں خصوصاً ان قصائد میں جس کے بناتے وقت انہوں نے بہت دلچسپی لی ہے۔

---

[1]

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

کبھی ہمت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت

کبھی تعلیم و عقائد کتاب و سنت
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت

کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہاں
اور کبھی کرتا تھا باطل بسیار اشفقت

کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
کبھی تکرار و تناسخ پہ مجھے سو حجت

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو نامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغ جہان میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ خاطر دلگیر

کرے ہے وا لب غنچہ کو در ہزار سخن
چمن میں موج تبسم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوا ہے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچہ منقار بلبل تصویر

اثر سے باد بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمین پہ ہمسر سنبل ہی موج نقش حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی نے آتے دانہ برگ ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحہ تو دیر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کی حنائی

گریزؔ کا موقعہ شاعر کو اپنی نزاکت تخییل دکھانے کا موقعہ ہوتا ہے اور عموماً شعراء اسے خوب صورت بنانے کے لئے طرح طرح کی شاعرانہ نزاکتوں کو باندھنے کا اہتمام کرتے ہیں لیکن یہاں بھی ذوق نے کوئی نرالی ترکیب نہیں نکالی اور بیشتر وہی پرانے طریقے برقرار رکھے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیص اسی لئے عموماً بالکل سیدھی سادی طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اہتمام بہت ہوتا ہے لیکن وہ اہتمام یا تو پرانے طرز کا ہوتا ہے کہ گریز واقع ہونے سے پہلے ہی قیاس معلوم کر لیتا ہے کہ گریز کس موقعہ پر اور کس طرح ہوگا۔ اس لئے جب وہ واقع ہوتی ہے تو اس میں کوئی ندرت نہیں محسوس ہوتی یا تشبیب اور مدح کو جوڑنے کے لئے گریز کا جوڑ ایسا دفعتاً یا دلفریب نہیں ہوتا جو دل پر کھٹکے اور بے اختیار تحسین پر مجبور کر دے۔

مدحؔ میں بھی وہی پرانا طریقہ برقرار رکھا ہے۔ یعنی کبھی بادشاہ کی شجاعت و دلیری کی، کبھی ان کے عدل و انصاف کی، کبھی اس کی عقل کی اور کبھی صورت و شکل کی، دشمنوں

بقیہ صفحہ کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی
ہو قلزمِ عمّاں پہ لب جو متبسم ..... تا لاب سمندر کو کرے چشم نمائی
کرتی ہے صبا آ کے کبھی مشک فشانی کرتی ہے نسیم آ کے کبھی لخلخہ سائی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

عـ بہادر شاہ کی صحت یابی پر جو قصیدہ لکھا اس کی تشبیب میں تمام دنیا جہان کی تندرستی کا ذکر کرتے ہوئے آخر اس طرح گریز کرتے ہیں۔

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو جب کہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا

یا "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" والے قصیدے میں "نوید بہجت" مجسم نظر آئی تو اس نے خواب راحت سے جگانا شروع کیا محض اس لئے کہ

فکر کر تہنیت عید کا اس شاہ کی تو دور میں جس کے ہے ہر صبح صباح دولت
وہ شہنشاہ بہادر شہ کسریٰ انصاف خسرو جم، حذم و داور و دارا حشمت

اس طرح "ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق" ان کو اس طرح سمجھاتا ہے کہ

تو بھی کر تہنیت عید کا اس کی سامان کہ ہے وہ خسرو دیں حامی دین برحق

اور حاسدوں کی برائی، بادشاہ کی تلوار، ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف۔ غرض یہی مقررہ طریقے تھے۔ تعریف میں اس قدر غلو کہ اعتدال تو اعتدال عقل و خیال بھی متحیر ہو جائے کہ کس طرح ناممکن باتیں ممکن بنا دی گئی ہیں۔

ذوق کی دعاؤں میں بھی کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ مناسب ہیں اور مقررہ قواعد و گذشتہ مثالوں کے بالکل مطابق۔ سوائے ایک "بیدمشک"

بقیہ صفحہ وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اس کی
اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکو روئے، نکو خوئے، خجستہ منظر
وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ خال

وہ مسیحا دم یوسف رخ و داؤد الحان
چشمہ فیض و ہنرکان عطا، بحر نوال

آسماں جاہ عطارد قلم و مہر علم
مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسرو جم حشم و دارا و کسریٰ انصاف
شاہ دارا دل و سلطان سکندر اقبال

یا۔ چلے نہ اشرفیٔ آفتاب عالم میں
خط شعاع سے اس پر جو نہ ہو تحریر

ابوالظفر شہ والا گہر بہادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہر یار، والا جاہ
خدیو مہر، کلہ خسرو و سپہر سریر

جہاں مسخر کہ عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین بخت نصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے
تو بوئی بوئی سے ہر خاک کی بنے اکسیر

مرا الٰہی آب پہ ہوتا زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی ہوتا فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل
سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

یا تار ہی بخیۂ خورشید پہ ہر روز طلا
تا گرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر

دانۂ انجم گردوں سے پروئے جب تک
رشتہ کاہکشاں میں شب یلدا گوہر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوا دم صبح
تا بکے شبنم سے سر دامن صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہوئے
برسیں نیسان کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر زر نصیب
ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

مطلع ثانی ۲۰ سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

عطارد میر منشی زہرا ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت تیرا گردوں میر لشکر ہو

سر ہفت آسماں جب تک کہ دور ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

کے کہ سراسر دعائیہ ہے اور جو ذوقؔ کے عام طرز میں ایک نئی بات ہے۔

زیادہ تر قصائد بہادر شاہ کی تعریف میں ہیں۔ اس لئے کہ ان کے استاد اور ملازم تھے اور ملازمت کی وجہ سے ہر اُس موقعہ کے متلاشی رہتے تھے جس پر وہ قصیدہ پیش کیا جا سکتا تھا غسل صحت کا موقعہ ہو یا عید کی خوشی نوروز ہو یا کسی کی شادی۔

سنگلاخ زمین اور مشکل ردیف و قافیے نصیرؔ و سوداؔ کے تتبع میں حاصل ہوئے اور اس کے علاوہ طغرائے امتیاز بھی تھا کہ مشکل ردیف و قافیے میں قصیدے سی طویل نظم سر کر کی جائے۔ لیکن ایسی دردسری اس میں شک نہیں کہ قصیدہ کی شان کو اکثر بڑھا دیتی ہے کیونکہ مشکل ردیف و قوافی کی وجہ سے غیر مانوس اور ادق الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور جن کی وجہ سے قصیدے میں خواہ مخواہ جزالت آ جاتی ہے۔ حالانکہ قصیدے کے لئے نامانوس اور ادق لغات ضروری نہیں پھر بھی اگر روانی اور تناسب سے پروئے گئے ہوں تو قصیدے کی شان کو بڑھاتے ہیں۔

ذوقؔ کے قصائد کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ ان کی زبان پختہ اردو ہے۔ یعنی وہ زبان جو ولیؔ نے شروع کی تھی اور میرؔ و مرزاؔ نے پروان چڑھائی۔ ذوقؔ کے یہاں پہنچ کر بالکل منجھ کر صاف ہو گئی ہے۔ ایرانی قالینوں میں اب ٹاٹ کے پیوند نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فارسیت زیادہ ہو گئی ہے۔ مگر قصیدے میں اگر غور کیا جائے تو بغیر شان و شوکت کے گذارہ نہیں اور شان و شوکت کے لئے بغیر فارسی عربی الفاظ کے چارہ نہیں۔

سلیقے سے نگینہ کی طرح جڑے ہوئے الفاظ، شان و شوکت سے بھرپور، صنائع لفظی و معنوی سے مستحکم، علمیت کے زور سے بھاری اور جزیل۔ یہ تمام باتیں اگر دیکھنا ہو تو ذوقؔ

ما؎ پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں — کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں
ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق — پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق
ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارمتق — تاب رخسار فلق سرخی رخسار شفق
ہیں مرے آبلۂ دل کے تماشا گوہر — اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

کے قصائد کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں سادگی و سلاست کا مذکور نہیں۔ یہاں بذلہ سنجی، ہجو یا ظرافت کا گذر نہیں۔ جو چیز ملے گی وہ عالمانہ، جو کچھ نظر آئے گا وہ فاضلانہ حسن و جمال کی شعریت کا یہاں ٹھکانہ نہیں۔ ہر شے متشرع ہے متین اور سنجیدہ۔ تشبیہ و استعارے بھی قواعد کے لحاظ سے پختہ نظر آئیں گے لیکن بیشتر ایسے پھول ہوں گے جن میں بو باس نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد کی زیادہ تقلید نہ ہو سکی۔ یوں تو زمانہ بھی بدل گیا تھا اور بدل رہا ہے لیکن پھر بھی ذوق کے بعد جن شعراء نے قصائد کہے وہ اس پائے کے نہ تھے۔ محض اس لئے کہ ان شعراء کو نہ تو الفاظ پر اتنی قدرت تھی۔ نہ خود میں اتنی جامعیت دوسرے یہ کہ غدر کے بعد جو دو ایک نوابین رہ گئے تھے وہ زیادہ فیاضی نہیں کر سکتے تھے اس لئے ان کے درباروں میں قصیدوں کے بجائے غزلوں کا زیادہ زور تھا۔

ہم عصر ہونے کی وجہ سے غالبؔ کے بھی قصائد کا خیال آتا ہے۔ حالانکہ ذوقؔ کے سامنے غالبؔ کے قصیدے پوچھے نہ جاتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے تھوڑے سے قصیدے اپنی بے ساختگی، روانی اور معنویت کے لحاظ سے ذوقؔ

غالبؔ کی تشبیب کا ڈھنگ

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار
مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ — ریزۂ شیشہ سے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ — تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل — راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

یا

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت — سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

یا

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

کے قصیدوں سے یقینی بلند ہیں اور لفظی نشست، در و بست اور ترصیعی اعتبار سے ذوق کے بہتر ہیں۔ لیکن یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے گلدستے سے کیا فائدہ جس پر خوشبو نہ ہو۔ اس کے علاوہ غالب کے قصیدوں میں جو روانی اور تسلسل ہے اسے پُر شکوہ الفاظ کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر ذوق کے قصائد کے پڑھنے سے سامعہ پر ایک پر جوش اور زوردار، پرشکوہ قسم کا احساس ہوتا ہے تو غالب کے قصائد سامعہ کو مسحور کر کے اپنی ترتیل و ترنم میں بہا لے جانا چاہتے ہیں۔ قصائد چونکہ سنانے کی چیز ہوتی تھی اس لئے سماعت پر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کیلئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

یا۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام — الخ

غالب کا گریز کا ڈھنگ۔

نغل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ — طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا — چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

قصیدوں میں شاندار الفاظ کی روایت دراصل بادشاہوں کے جنگی کارناموں کی مدح سرائی کی بدولت پیدا ہوئی۔ بعد میں یہ ہوگیا کہ جو شاندار الفاظ کو مرتب و منظوم کردے وہ قصیدہ گو ہوسکتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے بھی شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے اور اس میں وہی کامیاب ہوسکتے ہیں جنھیں فطری اُپج کے ساتھ الفاظ کو سلیقے سے بٹھانے کا ڈھنگ معلوم ہو۔ اردو میں فارسی کی طرح زیادہ قصیدہ گو پیدا نہیں ہوسکے کیوں کہ اردو خود شہنشاہیت کے آخری دور میں پیدا ہوئی۔ جمہوریت میں اس قسم کے موقعے اور پھر ایسے جن میں شاعروں کو منافع کی امید ہو

(بقیہ صفحہ)

یا

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ — یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامہ ہذیاں تحریر — یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

یا

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرۂ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام

مدح و دعا کی مثال۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایت لشکر کھلا
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوے پایۂ منبر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآل سعی اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریب طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفتر مدح جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجز اعجاز ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خط لوح ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

شاد پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے پیشہ ور شاعری کا زمانہ رخصت ہو رہا ہے اب اگر کسی کی شان میں قصیدے کہے بھی گئے تو وہ واقعیت سے زیادہ نزدیک ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں کلاسیکل قسم کے قصیدوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ لیکن ذوق کے قصائد کی تاریخی حیثیت اردو ادب میں ہمیشہ مسلم رہے گی۔

دیوان غالب

(جرمنی ایڈیشن)

دیوان مکمل ہے جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں آخر میں بیاض کے لئے نفیس حاشیہ دار سادہ اوراق شامل ہیں جلد کا رنگ سبز، سرخ، نیلا سائز ۹ × ۶ خوبصورت ملائم جلد۔ اس پر سنہرے دلفریب نقش و نگار اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ دیوان ایک خوبصورت سرخ کیس میں فروخت ہوتا ہے۔ اور اب اس تخفیف قیمت کے بعد بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا دیوان غالب اردو کی خوبصورت کتابوں میں سب سے سستی کتاب ہے۔ اب تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن طبع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ لیکن اس ایڈیشن کی جو شہرت اب سے دس سال قبل تھی وہی اب بھی ہے۔ قیمت قسم اول ۲ روپے آٹھ آنے۔ قسم دوم ۲ قسم سوم بغیر جلد عہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

پیامِ روح

(حضرت کشتہ سندیلوی)

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر — اے کہ تیرے دم سے روشن کو و کاخ و بام و در
اے کہ تیرے زیرِ فرماں باغ و راغ و کوہ و دشت — اے کہ تجھ سے بہرہ ور کاہ و گل و برگ و شجر
اے کہ تیرے شوق میں بیتاب و غلطاں مضطرب — اے کہ تیرا منتظر ہر ذرہ و انجم و گہر
اے کہ تیرے ذوق میں دریا بہ دریا یم بہ یم — اے کہ تیرے عشق میں صحرا بصحرا در بدر
اے کہ تیرے ہجر میں ہر چاک گل اک چاکِ دل — اے کہ تیرے غم میں شبنم قطرۂ خونِ جگر
اے کہ تیرا عکسِ رنگیں برگ برگ و شاخ شاخ — جلوہ افگن، جلوہ پیما، جلوہ فرما، جلوہ گر
اے کہ تو رونق فزائے عالمِ کون و مکاں — اے کہ تو زینت گرائے تحت و فوق و بحر و بر
اے کہ تیرا ذکر خود افسانہ و افسانہ خواں — اے کہ تیری یاد خود دیوانہ و دیوانہ گر
اے کہ تیری جستجو لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم — اے کہ تیری آرزو روز و شب و شام و سحر

حسرت اندر حسرتم اے جلوۂ وسعت نواز
دم بدم ذوقِ دگر بینم بہ اندازِ دگر

جہاں میں ہوں

(جناب سلاّم مچھلی شہری)

تغیّر ہی مرا حسنِ طبیعت ہے جہاں میں ہوں
مرے ہاتھوں میں خود آئینِ قدرت ہے جہاں میں ہوں

لومت سے نظامِ مذہبی سے۔ قصر والوں سے
جدھر دیکھو بغاوت ہی بغاوت ہے جہاں میں ہوں

ضلۂ آتشیں خونی مناظر یہ شعلہ زا وادی
مری باغی نگاہوں کو یہ جنّت ہے جہاں میں ہوں

لوہیت بھی میری شوخیوں کی قدر کرتی ہے
مرے احکام کی تابع مشیّت ہے جہاں میں ہوں

ہاں تقدیر کو دلچسپیوں میں یاد کرتے ہیں
مقدّر زیرِ دامِ مردِ ہمّت ہے جہاں میں ہوں

لم میں اس غلام آبادی سے کچھ پرے ہٹ کر
مرے خوابوں کی اک آزاد جنّت ہے جہاں میں ہوں

سلاّم! اب کچھ دنوں میں اک نیا دور آنے والا ہے
کہ لرزاں میرے نعروں سے حکومت ہے جہاں میں ہوں

بین الاقوامی سیاست
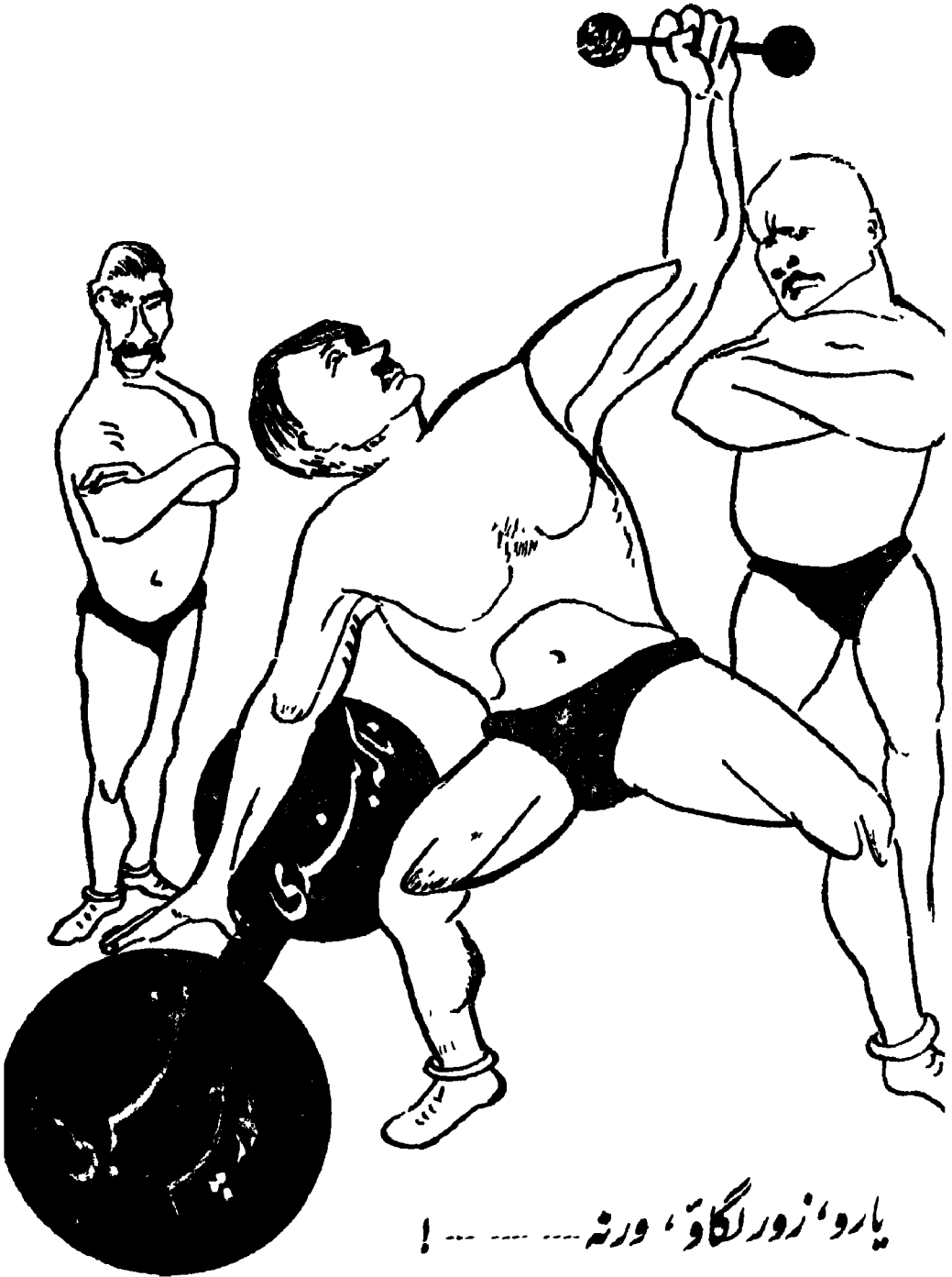
یارو، زور لگاؤ، ورنہ .... !

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

یادگار جگر

یہ بابو رنگ بہادر لعل جگر گورکھپوری مرحوم کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جسے پانڈے سرسوتی پرشاد جی نے مرحوم کی وفات کے بعد ترتیب دیا ہے سب سے پہلے تاریخ وفات کے چند قطعے اور مرتب کا دیباچہ ہے اس کے بعد حضرت فراقؔ گورکھپوری، حضرت مجنوںؔ گورکھپوری اور متعدد حضرات کے تعارف اور مقدمے ہیں، آخر میں جگر مرحوم کا مجموعہ کلام ہے۔ حضرت فراقؔ اور اُن کے بعد حضرت مجنوںؔ اور دوسرے مقدمہ نگار حضرات نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ حضرت جگرؔ کی سیرت کو ہر پہلو سے اجاگر کیا جائے۔ یہ اپنی جگہ پر مستحسن ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اُن کے کلام کو ان کی سیرۃ کا محتاج بنا کر پیش کرنا شاعر کا صحیح تعارف نہیں ہے۔

جہاں تک اصل کلام کا تعلق ہے، خوب ہے۔ حضرت جگرؔ متاخرین کی صف میں آتے ہیں انھیں حضرت وسیم خیر آبادی کا تلمذ حاصل تھا جو حضرت امیر مینائی کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں حضرت امیر مینائی اور اُن کے ہمعصروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

قائل نہیں ہوں آپ کے قول و قرار کا — اِک روگ ہو گیا ہے مجھے اعتبار کا

کس کام کا وہ دل جو نہ ہو اختیار کا — دل لیجئے نہ آپ کسی بے قرار کا

اک دم سمند عمر کا جمتا نہیں قدم — کیا جانئے نکالا ہے کس شہسوار کا

معلوم اس کو ذائقہ ہے شراب کوثر کی — ضرور چھپ کے کہیں شیخ جی نے پی ہوگی

نظر لگائے یہ دونوں متاع دل پر ہیں | حیا و ناز میں اب جنگِ زرگری ہوگی
زبانِ شیشۂ مے پر صدائے حق حق ہے | یہ دخترِ رز کسی واعظ کے منھ لگی ہوگی

ہوئی اک عمر میرے خانۂ دل سی نہیں نکلی | کسی کی حسرتِ دیدار بھی پردہ نشیں نکلی
نکالے سے نکلتی ہی نہیں ہے اب تو سینے سے | تری تیغ نگاہِ ناز بھی کیا دلنشیں نکلی

اُس زمانے میں عموماً غزل الفاظ کا ایک رنگین طلسم ہوتی تھی۔ لکھنؤ کا اثر غالب تھا، خیالات الفاظ کے پری خانے میں گم ہو جاتے تھے۔ مگر حضرت جگر کے کلام میں جہاں یہ رنگ ہے، وہاں خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کا حصہ بھی کافی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں رنگ تو وہی جلال و امیر کا ہے، مگر علوئے خیال کا لطف بھی موجود ہے اور یہی جگر کی خصوصیت کلام ہے۔

اے جگر قطرۂ خوں دل ہے، مگر یہ قطرہ | جوش میں آئے جو بڑھتا تو سمندر ہوتا
کنشت و کعبہ دونوں ایک ہی منزل کے رستے ہیں | کوئی آیا کہیں ہو کر کوئی آیا کہیں ہو کر
کہنا کہ اہلِ دیر و حرم کو ہے انتظار | مل جائے میکشوں میں جو تم کو جگر کہیں
چل دیے سب کے سب سحر کے وقت | رنگ دیکھا گیا نہ محفل کا
جب جفا پر ہی جان دیں لاکھوں | کس لئے پھر وفا کرے کوئی
یہ ٹکٹکی ہے سوئے بام و در جگر کیسی | ادھر تو دیکھئے حضرت! کدھر کو دیکھتے ہیں

غرض جگر کے کلام میں ایک کیف ہے، جو ایک کہنہ مشق غزل گو کے کلام میں ہونا چاہئے۔ اگر جگر کی عمر کچھ دن اور حقِ رفاقت ادا کرتی تو مرحوم کی ذات سے اردو شعر و ادب کی کافی خدمت ہوتی۔ اور ان کا مرتبہ اساتذۂ فن میں مسلم ہو جاتا۔

کتاب چھوٹے سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جس کا نصف حصہ تو مقدمات و تقاریظ پر مشتمل ہے، اور نصف اصل دیوان پر۔ کتاب ظاہری حسن کے اعتبار سے بھی خوب ہے، کتابت طباعت کافی روشن اور کاغذ عمدہ ہے، جلد خوبصورت اور حروفِ زر سے مزین۔ قیمت درج نہیں ہے، مرتب جناب

پانڈے سرسوتی پرشاد، گورکھپور ہائی اسکول گورکھپور کے پتے سے مل سکے گی۔ (ب۔ع۔

پطرس کے مضامین:۔

از سید احمد شاہ بخاری ایم اے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر، دہلی۔ قیمت عیر

حالی پبلشنگ ہاؤس نے حال ہی میں پطرس کے مضامین کا تیسرا اڈیشن تیار کیا ہے۔ پہلے اڈیشن ہی سے پطرس کی حیثیت بطور مزاحیہ نگار کے اُردو ادب میں قائم ہو چکی ہے۔ اردو زبان کے مزاحیہ میں محض پطرس ہی ایسے ہیں جن کا نصب العین محض تفریح کے اور کچھ نہیں زندگی کی معمولی سے معمولی چیزیں ہیں اور اُن میں تفریح کا سامان ڈھونڈھ لیتے ہیں، کتوں، کا اگر بیان کریں گے تو اس طرح گویا جیسے آ انھیں بالکل پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں۔ اردو میں پیروڈی کو زیادہ تر سید صاحب ہی نے رواج دیا ہے۔ ذرا سے جملوں اور جملے کی ترکیبوں سے وسیع اور دلچسپ باتوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں لیکن ہم سید صاحب سے ایک شکایت ہے وہ یہ کہ اب انھوں نے اس طرز نگارش کو قطعی طاق پر رکھد ہے حالی پبلشنگ ہاؤس والے صاحبان اردو ادب پر احسان کریں گے اگر سید صاحب سے کچھ اا بھی لکھوالیں۔ کتابت و طباعت بہت خوب ہے۔ اس اڈیشن میں ایک دلچسپ مضمون لاہور کا جغرافیہ اور شامل کیا گیا

مرقع عالم:۔

مولفہ سید شرف الدین قادری۔ عبدالقادر اینڈ سنس، چار مینار حیدرآباد۔ دکن و مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت دو روپے آٹھ آنے تجارتی $\frac{20\times30}{16}$ یعنی کتابی سائز)

اردو میں ایک اچھے اٹلس کی بہت بڑی کمی تھی۔ شرف الدین صاحب نے مرقع کو ترتیب دے کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن یہ مرقع عام اٹلسوں کی طرح نہیں ہے بلکہ تمام جغرافیائی نقشوں کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کے نقشے بھی دیے ہیں۔ نقشوں کے علاوہ مختلف جغرافیائی معلومات مثلاً عجائبات خشکی، عجائبات تری۔ دنیا کا ہوائی سفر۔ دنیا کی نباتات، نسل انسانی، دنیا

کے کاروبار، دنیا کے قیمتی پتھر وغیرہ بہت سے مفید مضامین بھی پیش کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سکندر اعظم کے زمانہ سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک کی ہندوستان کی تاریخ بھی مختصراً بیان کر دی ہے۔ یعنی اس صورت سے قادری صاحب نے یہ مرقع جغرافیہ اور تاریخ دونوں کے طلباء کے لئے ناگزیر بنا دیا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور دنیا کی مشہور ترین چیزوں کی تصویریں سہ رنگی اور فوٹو بلاک میں دی گئی ہیں۔ قادری صاحب نے یقیناً بڑی ہمت کی ہے۔ کتاب کی خوبصورت چھپائی۔ جلد اور ترتیب کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بہت کم ہے۔

کلیات بحری:۔

مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ قیمت تین روپیہ (سے،) ۳۱۲ صفحات

بحری بارھویں صدی کا ایک دکنی شاعر ہے۔ اس کی مثنوی من لگن مشہور ہے اور کئی دفعہ چھپ بھی چکی ہے لیکن بحری کی غزلیات ابھی تک عام پبلک کی دسترس سے باہر تھیں۔ حفیظ صاحب نے ان تمام غزلوں کو جن کی تعداد ایک سو تیرہ ہے چند چھوٹی چھوٹی نظموں اور "بنگ نامہ" کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مثنوی من لگن اس میں شائع نہیں کی ہے۔

بحری دراصل ایک صوفی منش شاعر تھا۔ اس کی مثنویاں، نظمیں اور غزلیں ہر ایک میں صوفیانہ خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ حفیظ صاحب چونکہ خود بھی صوفیانہ دل و دماغ رکھتے ہیں اس لئے بحری کے انتخاب کے لئے وہ بہت موزوں شخص ثابت ہوئے۔ غزلیات میں حالانکہ بحری نے لفظی رعایات کا بہت خیال رکھا ہے پھر بھی ولی کی طرح بحری کی کلیات بھی اردو ادب کے ارتقا میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ حفیظ صاحب نے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اپنے دکن و پونا کے قیام کی وجہ سے حفیظ صاحب دکنی زبان سے بخوبی واقف ہو گئے تھے

اس لئے وہ یہ مشکل شعر کے معنی اور آخر میں پرانے متروک دکنی الفاظ کی ایک فہرست بھی دے سکے ہیں۔ بعض اشعار کی تشریح میں کہیں کہیں خامیاں رہ گئی ہیں لیکن وہ نظر ثانی میں درست ہوسکتی ہیں۔

ابتدا میں حفیظ صاحب نے ایک سو اکیس صفحے کا دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں بحری کے زمانے کی سیاسی تاریخ اور ادبی ماحول کا ایک پس منظر پیش کیا ہے تاکہ بحری کے کلام کا صحیح تاریخی اور ادبی ماحول کے تصور کے ساتھ مطالعہ کیا جاسکے۔ حالانکہ موصوف نے اس میں بہت سے غیر ضروری چیزیں شامل کردی ہیں مثلاً بحری کے ہمعصروں کا مفصل بیان اور ان کا انتخاب یا ولی کے متعلق محض کلیات ولی سے استفادہ جو اب پرانی چیز ہوگئی ہے۔ اور یوم ولی کے مقالات اور موتی کے ولی نمبر کے مضامین کے سامنے اس کی تحقیقات اب پرانی ہوگئی ہے وغیرہ لیکن یہ سب جزوی باتیں ہیں۔ حفیظ صاحب کی یہ ساری کوشش ایک ادبی احسان ہے جو ہر اردو ادب کے پرستار کو ماننا پڑے گا۔ موصوف کی یہ کاوش ہر قدیم اردو کے طالب علم کو رہنمائی کا کام دے گی۔

امیر العروض:۔

مرتبہ بزمی انصاری صاحب۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز بکسیلرز کشمیری بازار لاہور قیمت عہ/ ۱۲

اردو میں عروض پر رسالوں کی بہتات ہے۔ اُن ہی میں یہ ایک اضافہ ہے۔ حالانکہ بزمی صاحب نے بہت محنت کی ہے لیکن کوئی خصوصیت پیدا ہونے نہیں پائی۔ اگر وہ "معارف" یا رسالہ "اردو" کے وہ پرانے مضامین بھی پڑھ لیتے جن میں عروض کو آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ مبتدیوں کے لئے اور آسانی فراہم کردیتے۔ آج کل تو نومشقوں کا کیا ذکر بڑے بڑے ادیب عروض سے ناواقف بنتے ہیں، اور اس کی وجہ محض یہی ہے کہ عروض ابھی تک بعید آسان صورت میں نہیں پیش کیا گیا ہے۔ اختصار تو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی "قواعد اردو" میں کافی کردیا ہے لیکن آسانی ابھی تک نہیں آسکی ہے۔ بزمی صاحب نے ترتیب اور تمام قواعد شاعری کو فراہم و یکجا کرنے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت محنت اور کاوش سے کام لیا ہے اور عروض کے طالبعلم

کے لئے تمام مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ لیکن مبتدیوں کے لئے یہ عروض اب بھی وہی چیستاں ہی ہے جو پہلے تھی۔ حالانکہ یہ چیستاں ہی ایسی ہے کہ باوجود مفید ہونے کے ابھی تک آسان صورت میں پیش نہیں کی جاسکی اور ابھی تک اس کے جاننے والوں میں اختلاف آرا ہو جاتا ہے (اخبار حقیقت ۱۱ر جولائی ۱۹۳۷ء و اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۷ء) لیکن مسئلہ کے دقیق ہونے کی وجہ سے بزمی صاحب پر الزام اس کا نہیں آتا۔ ان کی محنت کی داد یقینی دی جائے گی کہ طالب علموں کے لئے ایسی مفید کتاب تیار کر دی۔ آئندہ اڈیشن میں بزمی صاحب ذرا اتنا اور خیال رکھیں کہ مسائل کو ذرا اور وضاحت سے بیان کریں اور اساتذہ کے اشعار مثال میں زیادہ دیں کیونکہ اساتذہ کے اشعار پہلے ہی سے زبانوں پر چڑھے ہوتے ہیں بہ نسبت آپ کے یا میرے شعروں کے۔

یورپ کے تاثرات:۔

مرتبہ بدر شکیب صاحب۔ سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب، چارمینار حیدرآباد دکن قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸/)

بدر شکیب صاحب نے اس کتاب میں پچیس مشہور ہندوستانی لوگوں کے تاثرات قلمبند کئے ہیں جو یورپ اور وہاں کی زندگی سے متاثر ہوئے تھے۔ اس فہرست میں علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر زور وغیرہ حضرات شامل ہیں۔ بدر صاحب کا یہ خیال نہایت خوب رہا۔ ہمیں یورپ کی خوبیوں اور خرابیوں کی مکمل تصویر ان حضرات کے بیان سے مل جاتی ہے۔ کتاب بھی بڑی دلچسپ ہوگئی ہے لیکن اگر بدر صاحب ملک کے بڑے بڑے دیگر لیڈروں کو جو ریاست حیدرآباد سے باہر رہتے ہیں اس میں شامل کر لیتے تو اس کتاب کی دلچسپی میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا۔ بہرحال کتاب بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ سرورق بھی بڑی خصوصیت کا ہے۔

جوئبار:۔

ازجناب بسم سین صاحب ظفر تقطیع بڑی۔ ضخامت ۹۶ صفحات کتابت وطباعت اوسط کاغذ بہتر قیمت ۱۲ر مجلد عہ ملنے کا پتہ قیصر ادب ملتان چھاؤنی۔

جوئبار ایک ہونہار شاعر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں۔ غزلیں بھی اور چند ہندی یا نیم ہندی گیت بھی۔ ان سب میں تخیل کی ایک خاص رفعت زندگی اور جان پائی جاتی ہے۔ اگر مشق سخن جاری رہی تو ہمیں امید ہے کہ ظفر صاحب اردو شاعروں میں نمایاں حیثیت حاصل کرلیں گے۔

رسید کتب

نئے مسائل۔ مصنفہ محمد مرغوب الدین بی اے۔ بی ٹی مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۸ر

خزینۂ رباعیات فارسی۔ مرتبہ سید الرحمٰن خانصاحب شیروانی پرنٹنگ پریس علیگڈھ قیمت درج نہیں

شاعر کی دنیا (حصہ اول) مولفہ عظیم الدین صحبت بی اے (عثمانیہ) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت ۸ر

تفسیر سورہ والشمس۔ مؤلفہ مولانا حمیدالدین فراہی مکتبہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڈھ قیمت ۸ر

عصر نو (نظمیں) مصنفہ محمد صادق ضیا صاحب۔ مکتبہ قصرالادب دفتر "شاعر" آگرہ۔ قیمت ۱۲ر

تاریخ اخلاق اسلامی۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ

دولت عثمانیہ " "

رسالہ جات:۔

نگار	نظیر نمبر	قیمت	عہ
ساقی	سالنامہ	"	عہ

اُردُو اکادمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اب سے چند ماہ قبل اردو اکادمی نے بارہ سیاسی اور معاشی مضامین کا اعلان کیا تھا اور ہر مضمون کے سب سے اچھے مقالے پر ڈھائی سو روپیہ کا انعام بھی متعین کر دیا تھا۔ اس اعلان کے بعد ۱۰۶ حضرات نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور اپنا مقالہ وقت مقررہ پر بھیج دیں گے۔ گو بعد کو مدت میں توسیع بھی کر دی گئی مگر افسوس ہے کہ تمام حضرات کے مقالے وصول نہ ہو سکے۔ زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ اکثر مقالے صرف قصے کہانیوں پر مشتمل تھے۔ بعض حضرات نے محنت کافی کی تھی مگر دوسرے نقائص کی وجہ سے ہمارے ججوں نے انھیں پسند نہیں کیا۔ صرف مندرجہ ذیل مقالے ججوں کے پاس آخری فیصلے کے لیے رہ گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہم بہت جلد اُن حضرات کو نتیجوں سے مطلع کر سکیں گے جن کے مقالے پسند کیے جائیں گے:-

جناب سلطانہ قاضیہ صاحبہ
جناب شاہد حسین صاحب رزاقی
جناب پیارے لال صاحب بھلّہ
جناب گوپی ناتھ صاحب اَمن۔
جناب حیات اللہ صاحب انصاری
جناب بشیر احمد صاحب ڈار
جناب عبدالحکیم صاحب
جناب سری کرشن صاحب سنہا
جناب ساون رام صاحب پریتم
جناب ڈاکٹر بول چند و سید ذبیر الحسن صاحبان
جناب محمد یونس صاحب
جناب عبدالرحمٰن صاحب ٹونکی
جناب سبط حسن صاحب
جناب عبدالسلام خورشید صاحب

جناب محمد صدیق خاں صاحب	جناب محمد قاسم صاحب
جناب عشرت صدیقی صاحب	جناب محمد مجیب صاحب
جناب خواجہ معین الدین صاحب	جناب شیخ عبدالوحید صاحب
جناب نسیم مرزا صاحب رزقی	جناب آفتاب احمد صاحب مختار

آخر میں ہم اُن تمام صاحبان کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس مقالہ نویسی میں دلچسپی لی۔ ان حضرات کے نام ایک سال کے لیے رسالہ جامعہ مفت جاری کر دیا گیا ہے اور مکتبہ کی بہترین کتابوں میں سے ایک تحفۃً ارسال کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ پیش کش قبول فرمائی جائے گی۔

سکریٹری

اُردو اکاڈمی، جامعہ ملیہ، نئی دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ قائم شدہ ۱۸۷۷ء

زائرین کعبہ کے لئے گذشتہ ساٹھ سال کے حاجیوں کو لے جانے والا اولین جہاز

زائرین کعبہ کے لئے مژدہ

حکومت ہند نے حاجیوں کے سفر حجاز کے لئے انتظام کر دیا ہے اور اب آپ اپنی حج کی دیرینہ اور پاکیزہ آرزو کو پورا کر سکتے ہیں۔ مغل لائن زائرین حج کے لئے ہر قسم کی سہولت فراہم کرتا ہے۔

روانگی کی تاریخیں

"ایس ایس خسرو" ۴۰۴۰۴ ٹن بمبئی سے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو چلے گا اور کراچی سے ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو

"ایس ایس اسلامی" ۵۷۰۵ ٹن بمبئی سے ۲۰ دسمبر کو چلے گا اور کراچی سے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو۔

مشروط روانگی

ایس ایس "رضوانی" ۴۴۰۵ ٹن بمبئی سے ۲ جنوری ۱۹۴۰ء کو چلے گا اور کراچی سے ۵ جنوری ۱۹۴۰ء کو

بشرط ضرورت آخر میعاد تک خاص جہازات بھی روانہ کئے جائیں گے۔

بمبئی تا جدہ		کراچی تا جدہ	
درجہ اول	۶۲۱ روپے	درجہ اول	۵۹۰ روپے
درجہ دوم	۴۴۶ روپے	درجہ دوم	۴۲۲ روپے
ڈک (چھت)	۱۶۳ روپے	ڈک (چھت)	۱۹۰ روپے

حاجیوں کو لے جانے والے جہازات اور ان کی روانگی نیز دیگر امور کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتوں پر خط و کتابت کیجئے۔

میسرز ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ بمبئی — میسرز گری مس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ کراچی

میسرز ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ کراچی

مطبوعاتِ امیریہ دار التصنیف و تالیفات لکھنؤ

دیوان ثاقب - یہ مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ان کی غزلیات قطعات، تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے، تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانسو پچاس صفحات قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ہیے (علاوہ محصولڈاک)

انیس اخلاق - میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمے کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن ادارہ امیریہ دار التصنیف و تالیف نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع - آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہو جانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں قیمت ۴ر علاوہ محصولڈاک۔

مفتاح البیان - حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین ابو البیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب جروی مولف جواہر البیان وغیرہ۔ فن ذاکری اور روزہ خوانی پر نہایت مفید کتاب قیمت ہر حصہ ۸ر علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ: دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

مستند اور زبردست اسلامی تاریخ

ترجمہ تاریخ علامہ ابن خلدونؒ از علامہ حکیم احمد حسینؒ

جس کی خریداری کے بعد تاریخ کی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی

جلد اول۔ حضرت نوحؑ کے زمانے سے چھٹی صدی عیسوی تک کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت عہ/

جلد دوم۔ ملک فارس، یونان اور سلاطین قسطنطنیہ کے حالات درج ہیں۔ ۳۰۲ صفحات قیمت عہ/

جلد سوم۔ حضور خاتم المرسلین کی ولادت سے عہد خلافت حضرت صدیقؓ تک کے حالات درج ہیں ۳۰۵ صفحات قیمت عہ/

جلد چہارم۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے سے حضرت امام حسینؓ کی تفویض خلافت تک ۴۵۰ صفحات قیمت عہ/

جلد پنجم۔ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت حضرت عمر بن عبدالعزیز تک ۴۰۴ صفحات قیمت سے/

جلد ششم۔ خلفائے بنی امیہ کے آخری تاجداران عباسی خلیفہ مہدی تک ۵۰۲ صفحات قیمت عہ/

جلد ہفتم۔ خلفاء عباسیہ ہارون رشید، امین، مامون، معتصم واثق کا عہد ۳۰۱ صفحات قیمت سے/

جلد ہشتم۔ زمانہ انحطاط دولت عباسیہ کے دس تاجداروں کا عہد ۳۶۴ صفحات قیمت سے/

جلد نہم۔ خلفاء عباسیہ کا آخری دور اور دولت ہائے مصریہ، اسماعیلیہ عبیدیہ تک ۴۱۴ صفحات سے/

جلد دہم۔ اندلس میں شاندار اسلامی حکومت کے ابتدائی حالات ۳۰۹ صفحات۔ قیمت سے/

جلد یازدہم۔ اندلس کا آخری دور اور کامل اسلامی حکومت کا زوال ۳۱۰ صفحات قیمت سے/

جلد دوازدہم سلجوقیوں، غوریوں اور غزنویوں کا دور حکومت ۴۴۰ صفحات قیمت سے/

جلد سیزدہم۔ غوریوں، دہلیوں اور تاتاریوں کی فتوحات ہند کے حالات اور ہندستان پر مسلمانوں کے حملے کے صحیح واقعات ۳۰۲ صفحات قیمت سے/

جلد چہاردہم۔ سلاطین سلجوقیہ اور ملک خوارزم کے حالات چنگیز خاں کا حملہ اور اسلامی حکومتوں کی بربادی وغیرہ۔ ۳۴۰ صفحات قیمت سے/

ملنے کا پتہ:۔ دفتر الاسلام سبزی منڈی الہ آباد

ہندوستان کا معیاری رسالہ "ساقی" دہلی رقم طراز ہے۔

"اس موضوع پر اردو زبان میں اس سے قبل کوئی کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی"

پریم سوگ

ادیب فطرت نگار منشی پریم چند جی کی حیات اور انکی خصوصیات تحریر پر سیر حاصل تبصرہ

از

جناب محمد حسام الدین صاحب غوری

جس کا مقدمہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی لنڈن پروفیسر ادبیات اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

صحیح ادبی ذوق اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب بہترین ادیبوں کی خصوصیات تحریر کو ذہن نشین کر کے ادب کے بیش بہا خزانوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر آپ ادب کے ذریعے خیالات میں وسعت ذہنیت میں انقلاب اور قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو "پریم سوگ" کا مطالعہ کیجئے۔ "پریم سوگ" کے مطالعہ سے نہ صرف صحیح ادبی ذوق پیدا ہوگا بلکہ آپ کی تحریروں میں زندگی و شگفتگی پیدا ہو جائے گی۔ خصوصاً طلبا کے لئے "پریم سوگ" کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ قیمت صرف ۸ر

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

یا

محمد شریف الدین مہتمم دار الادب کباڈی گوڑہ ۲۱۲ سکندرآباد

الندوۃ کا دوبارہ اجرار

عربی تعلیم، اسلامی علوم اور مقاصد ندوۃ العلمار کی اشاعت اور اسلامی علوم و مسائل کی تحقیق و تشریح اور دین و ملت کی خدمت کے لئے ندوۃ العلمار کے رسالہ "الندوہ" کا دوبارہ اجرار علامہ سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم ندوۃ العلمار کی زیر نگرانی عمل میں آرہا ہے۔ امید ہے کہ اہل شوق قدردانی فرمائیں گے۔ ضخامت ۶۴ صفحات۔ قیمت دو روپیہ سالانہ

درخواستیں اس پتے سے آئیں

حامد علی ندوی منیجر "الندوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ

رفیق باغباں

کاشتکاری اور باغبانی کے فن میں یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کا حسین و جمیل ٹائیٹل پیج جنت نظیر ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی نہایت درجہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہوتا ہے۔ اس کے بلند پایہ مضامین بے کار نوجوانوں کو باکار بنا دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ زمیندار اور کاشتکار دونوں کی فنی خدمت اس کا خاص شعار ہے۔ قیمت بہت کم یعنی صرف دو روپیہ سالانہ۔ یہ رسالہ ۲۲×۱۸ کی تقطیع کے ۳۲ صفحات پر نہایت آب و تاب سے شایع کے ساتھ اردو زبان میں ماہانہ شایع ہوتا ہے۔

اس بے بہار رسالہ کو حاصل کرنے کے لئے جلدی کیجئے تاکہ دیہات کی نحوست بھی فوراً ہی دور ہو جائے۔ یہ رسالہ اپنے مضامین کی بہتری کے باعث تمام صوبوں کی حکومتوں کا منظور شدہ ہے۔

منیجر رسالہ "رفیق باغباں" ہن ہن نرسری سہارنپور

ادب، آرٹ اور فلم کا ماہوار مجلہ

چاند

زیر ادارت جناب غازی نبباسی

چاند میں ہر ماہ نہایت دلچسپ اور رومان آفریں افسانے، دلآویز و دلنواز کہانیاں سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی نظمیں و غزلیں، فلمی و معلوماتی مضامین اور ہزاروں دلچسپیوں کا سامان پائیں گے۔

"چاند" اردو ادب کا وہ بلند پایہ اور روح پرور
ماہ نامہ ہے

جو

ملک کے سربرآوردہ ادباء کے اشتراک سے شائع ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ ایک روپیہ بارہ آنے مع محصول ڈاک

نے کا پتہ:- مینیجر رسالہ "چاند" بمبئی نمبر ۸

نمونہ کا پرچہ ۴ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جا سکتا ہے

(ٹ) سالانہ خریداروں کو تازہ عید نمبر اور دوسرے شائع ہونے والے خاص نمبر مفت دیئے جائیں گے

طلبار، مدرسین اور محکمہ تعلیم کا حقیقی خیرخواہ

ایجوکیشنل گزٹ

یہ رسالہ ۱۹۲۳ء سے محکمہ تعلیم، مدرسین اور طلبار کی خدمات کے فرائض سرانجام دے رہا ہے صحیح معنوں میں طلبار کا بھی خیرخواہ، مدرسین کا حقیقی ترجمان، محکمہ تعلیمات کا غمگسار اور ارباب حل و عقد کا مونس و غمخوار ہے۔ محکمہ ہائے تعلیم پنجاب، یوپی، بمبئی پریذیڈنسی، بہار، اڑیسہ، ریاست پٹیالہ کپورتھلہ، گورنمنٹ۔ ریاست فریدکوٹ، ریاست جیند، انڈسٹریل سکولز پنجاب، ریاست حیدرآباد دکن اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کی طرف سے باقاعدہ منظور شدہ ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ہمیشہ پابندی اوقات کے ساتھ جالندھر شہر سے شائع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ادارت میں سید عابد علی صاحب عابد ایم اے، ایم او ایل، ایل ایل بی، پروفیسر رام سروپ کوشل ایم اے۔ ایم ایس قریشی اسکوائر ایم اے، بی ٹی اور محمد ابراہیم محسن جالندھری کے علاوہ اور بھی متعدد اہل قلم حضرات شریک ہیں۔ سید غلام رسول صاحب طاہر ہاشمی عباسی، جالندھری سابق مدیر اس کے مستقل مقالہ نگار ہیں۔ جن کا نام نامی تعلیمی دنیا میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔

رسالہ کا ایک حصہ چھوٹے بچوں کے لئے وقف ہے جس کی زبان بے حد آسان، طرز بیان دلکش اور لکھائی چھپائی جلی قلم سے کی جاتی ہے۔ رسالہ میں تعلیمی مضامین کے علاوہ علم و ادب اور دوسرے اصناف ادب پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ رسالہ کا سائز [illegible] ہے۔ سالانہ چندہ صرف [illegible] نمونہ کا پرچہ [illegible] کے ٹکٹ بھیج کر منگائیے۔

المشتہر۔ مینیجر رسالہ "ایجوکیشنل گزٹ" ریلوے روڈ جالندھر شہر

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

رسالہ دینیات:۔ یہ مختصر رسالہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے لئے لکھا گیا ہی جو ہائی اسکولوں کی آخری جماعتوں یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں تعلیم پاتے ہوں۔ انکے علاوہ عام ناظرین بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے پہلے ایڈیشن کو سرکار آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات نے جماعت دہم کیلئے شریک نصاب کیا تھا۔ اب یہ دوسرا ایڈیشن ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہی۔ ہمارے یہاں دینیات کی تعلیم کا عام اندازہ اب تک یہ رہا ہی کہ طلبار کو زیادہ تر فقہی مسائل پڑھائے جاتے ہیں جیسیں نماز روزہ اور طہارت اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں کی تفصیلا ہوتی ہیں عقائد کی تعلیم نسبتاً کم ہوتی ہی اور وہ بھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ طالب علم کو آخری وقت تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلام کیا ہی؟ کیا چاہتا ہی اور کیوں چاہتا ہی؟ اس کے عقائد کا انسان کی زندگی سے کیا تعلق ہی وہ اگر تسلیم کئے جائیں تو ان کا فائدہ کیا ہے اور نہ تسلیم کئے جائیں تو ان کا نقصان کیا ہے۔ اسلام محض تحکم کے طور پر ان عقائد کو منوالینا چاہتا ہی یا اس کے پاس ان کی صحت و صداقت کیلئے کوئی دلیل بھی ہی۔ یہ تمام امور دین کی سمجھ اور اعتقاد کی درستی کے لئے نہایت ضروری ہیں اور جب تک یہ ذہن نشین نہ ہو فقہی مسائل کی تعلیم کوئی فائدہ نہیں دے سکتی کیوں کہ ایمان کے بغیر احکام کی اطاعت ممکن نہیں اور ایمان صرف عقائد ہی کے ٹھیک ٹھیک سمجھنے سے مستحکم ہو سکتا ہی۔

یہ رسالہ اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہی۔ اس میں دینی تعلیم کا ایک نیا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہی جو پرانے طریقے سے بہت کچھ مختلف ہے اور خصوصاً موجودہ زمانے کے لحاظ سے مفید تر ہی۔ اس میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہی اور قرآن ہی کے طرز استدلال کی پیروی کی گئی ہے۔ قیمت ۱۰/ محصولڈاک ۲/

پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن لاہور

عدیم النظیر رعایت

"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

اگر آپ دنیا بھر کے تازہ ترین واقعات وکوائف اور موجودہ جنگ کے تفصیلی حالات نیز بہترین دلچسپ ومفید مضامین کی معلومات سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو ہمارا ہفتہ وار اخبار الموسوم:

"روزانہ اخبار" بریلی

خریدیے۔ جو بفضلہ تعالیٰ ۲۲ سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ ہم نے سنہ ۱۹۴۴ء کے لئے جو جدید خریدار کے ساتھ یہ عدیم النظیر رعایت کی ہے کہ آج ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کے اندر جو صاحب "روزانہ اخبار" بریلی کے جدید خریدار ہوں تو ان سے بجائے بشرح ماہ مستقل مقررہ قیمت مبلغ چھ روپئے سالانہ کے صرف ع سالانہ معہ محصولڈاک پیشگی قیمت لیجائیگی غالباً اس زمانے میں جب کہ اشیاء طباعت وکاغذ وغیرہ نہایت گراں ہیں مذکورہ بالا رعایت ایک عدیم النظیر ہے اور ع سالانہ قیمت معہ محصولڈاک پر آپ کو کوئی ہفتہ وار اخبار نہیں مل سکتا۔

(نوٹ) دو روپیہ سالانہ رعائتی قیمت کے جو صاحب پانچ جدید خریدار پیدا کریں گے ان کے نام ایک سال تک اخبار مذکور مفت حاضر کیا جائے گا۔

المشتہر

ایس، ایم مہراہی اسسٹنٹ منیجر "روزانہ اخبار" بریلی

یو، پی

قیمتوں میں رد و بدل

مندرجہ ذیل کتابوں کی قیمتوں میں یکم جنوری سنہ [illegible] سے کچھ رد و بدل ہوا ہے۔ ارباب ذوق اور خصوصاً تاجران کتب نوٹ فرمائیں۔

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
رحمۃ للعالمین	؏ر	؏ر
نقوش سلیمانی	سے ر	؏ر
مضامین محمد علی	سے ر	؏ر
یورپ کی حکومتیں	؏ر	عہ ر
گئودان	سے ر	؏ر
بیوہ	؏ر	عہ ر
واردات	؏ر	عہ ر
خیالستان	؏ر	؏ر
مشاہدات سائنس	؏ر	؏ر
جنون وحکمت	سے ر	.

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں

دہلی لاہور لکھنؤ بمبئی

نور اللغات

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ایل ایل بی

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مستند اور مفصل لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعراء حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا۔ اس کے ایک عرصے کے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تحقیق و تشریح میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ غرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدردانی کا مستحق۔

دو رائیں

اردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغات سے افضل ہے۔ مرتب نے اسے بے حد محنت و جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے۔ اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم و زبان داں حضرات اسکی قدر کما حقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔ "زمانہ"

اردو کے تمام مروجہ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، دخیل کلمات کا پورا استقصار کیا گیا ہے اور شعرائے اردو اساتذہ کے کلام نظم و نثر پر ہر جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔ دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے اسے متعدد مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ "نگار"

نور اللغات	جلد اول	الف - ب	صفحات	۶۴۲	قیمت	دس روپے
"	" دوم	پ - غ	"	۵۱۴	"	چھ "
"	" سوم	ف - ق	"	۶۹۲	"	دس "
"	" چہارم	ک ی	"	۱۰۳۲	"	چودہ "

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں (۱) جامع مسجد دہلی (۲) لوہاری دروازہ لاہور (۳) امین آباد لکھنؤ (۴) پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی نمبر ۳

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیارشدہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے سنہ ۱۸۳۹ء سے اب تک نواسال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی زمانے کی رفتار کے موافق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے ان خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خرید کرنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

تعلیمِ بالغاں

اس وقت خاص بالغوں کے لئے اردو کی درسیات کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے۔ بچوں کی کتابیں بڑی عمر کے لوگوں کے لئے نہ دلچسپ ہوتی ہیں نہ موزوں اس لئے ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بالغ مبتدیوں کے لئے رسائل کا یہ سلسلہ ترتیب دے رہا ہے اور تقریباً دو سو رسائل کا خاکہ تیار کیا گیا ہے جو بالغوں کے پورے نصابِ تعلیم پر حاوی ہوگا۔ رسائل سلسلہ تعلیم و ترقی کی کتابت، ضخامت اور مضامین میں مدارج کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔

ان رسائل کا اصل منشا یہ ہے کہ اردو پڑھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے اور کتب بینی کا شوق پیدا ہو تاکہ آیندہ کتب خانہ تعلیم و ترقی کے ذریعہ بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ خود بخود جاری رہے اور پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد آدمی پھر ان پڑھ نہ بن جائے۔

حسب ذیل رسائل اس سلسلہ میں شائع ہو چکے ہیں یا زیر طبع ہیں ان کا سائز ۲۰×۱۶/۸ ہے۔ ہر رسالہ کم و بیش ۱۶ صفحات کا ہے۔

۱۔ **نماز**۔ یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور مسائل جو نماز کے متعلق بتائے گئے ہیں۔ ۱۶ صفحات قیمت ۱ر

۲،۳۔ **حکایتیں مکمل**۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی پیاری اور سادے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں جو اخلاقی اور سماجی اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ قیمت ۲ر

۴۔ **حبیبِ خدا**۔ آں حضرت کی سیرت پاک بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۱ر

۵۔ نظمیں۔ یہ مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ پہلی نظم "حمد" دوسری "دعا" تیسری "نعت" چوتھی "ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام" پانچویں "جو کرنا ہو ابھی کرو" اور چھٹی "جاگو اور جگاؤ" قیمت ۱ر

۶۔ میونسپلٹی۔ اس میں باتوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ قیمت ۱ر

۷۔ صدیق اکبرؓ۔ رسول خدا کے سب سے پہلے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات زندگی۔ قیمت ۱ر

۸۔ خط وکتابت۔ آسان عبارت میں یہ بتایا گیا ہے کہ خط کیسے لکھا جائے اور کیسے خط کا جواب دیا جائے۔ قیمت ۱ر

۹۔ قومی گیت۔ اس میں اچھی اچھی قومی نظمیں جمع کردی گئی ہیں قیمت ۱ر

۱۰۔ ہمارا ہندوستان۔ اس کتاب میں ہندوستان کا تمام حال بیان کیا گیا ہے قیمت ۱ر

زیر طبع کتابیں

ضلع کا انتظام	قیمت ۱ر
غزلیں	" ۱ر
عمر فاروقؓ	" ۱ر

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

تعلیمی تاش

اس تاش کی ایجاد نے دنیائے تعلیم میں انقلاب پیدا کر دیا ہے ہر ایک کلاس کے طالبعلم اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، وکیل، بیرسٹر، کالجوں کے پروفیسر، اسکول کے ہیڈ ماسٹر سب ہی اس تاش سے کھیل سکتے ہیں۔ یہ تاش اس طرح سے تیار کیا گیا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کے ساتھ اور استاد اپنے شاگرد کے ساتھ کھیل سکتے ہیں۔ اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ قابلیت بڑھتی ہے کھیل کا کھیل ہے اور تعلیم کی تعلیم۔ بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے اس کو پسند فرمایا ہے۔ اس کے ذریعہ سے بچوں کو تعلیم بھی دیجا سکتی ہے۔ کھیلنے کے قواعد بکس کے ہمراہ دی جاتی ہے۔ قیمت فی بکس۔ بڑا سائز اردو انگریزی ۲ر انگریزی ۱ر۔ چھوٹا سائز اردو ۲ر۔ چھوٹا سائز انگریزی ۲ر۔ بڑا سائز اردو ۲ر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

تعلیمی صندوق

پہلی جماعت کے بچوں کی اردو پڑھائی کا مکمل سامان موجود ہے۔ اس سامان کے ذریعہ بچے چھ مہینے میں پڑھنے لکھنے لگ جاتے ہیں۔ زیر ہدایت مولوی عبد الغفار مدہولی نائب نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر اوکھلا تیار کیا گیا ہے۔ جس پر سات سال سے بچے کامیاب طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ کل صندوق کی قیمت علاوہ محصولڈاک دس روپیہ (عـــہ) ہے جو پیشگی آنا چاہیے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

MATIA MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

جامعہ

زیرادارت :- نورالحسن ہاشمی - ایم - اے

جلد ۴۳ - نمبر ۳	مارچ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن محبوب المطابع دہلی

آپ کی کتابوں کی طباعت

آپ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہمارے سپرد فرماکر مندرجہ ذیل باتوں سے بالکل مطمئن ہو سکتے ہیں :-

۱- کتاب صحیح چھپے گی -

۲ - دیدہ زیب کتابت ہوگی -

۳- اچھا دبیز کاغذ استعمال کیا جائے گا-

۴ - نفیس طباعت ہوگی -

۵- نہایت خوشنما اور مضبوط جلد سازی کی جائے گی -

۶ - بہت خوبصورت گرد پوش دیا جائے گا -

غرضکہ

آپ کی کتاب جملہ لوازم طبع سے آراستہ ہوگی

لیکن

یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب

(۱) آپ اپنی کتاب کی طباعت کا انتظام ہمارے سپرد فرمائیں -

(۲) سستے خراب کام کے مقابلے میں اچھے نفیس کام کے لیے نسبتاً زیادہ خرچ کریں

مکتبہ جامعہ، قرولباغ، دہلی

ٹروٹسکی

کارل مارکس

لینن

ستالن

مولوتف

لیون ٹروٹسکی کا بیان

(۳)
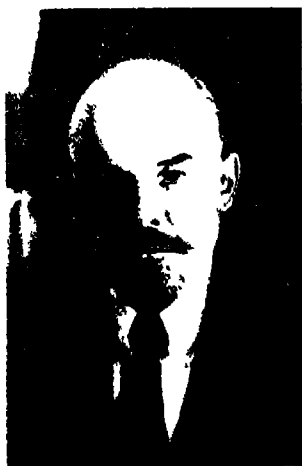
جناب م، م جوہر صاحب میرٹھی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ٹروٹسکی:- اصولی اختلاف وہی تھا کہ ہم پرولتاری بین الاقوامی انقلاب کے حامی تھے اور اسٹیلن کہتا تھا کہ ایک ملک میں انقلاب قائم رہ سکتا ہے۔ سوویٹ یونین میں اشتراکی انقلاب ہو گیا اس کو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں اور نتیجتاً سرمایہ دار جماعتوں سے اتحاد رکھنا ضروری ہے اور اس اتحاد پر پرولتاریوں کو بھینٹ چڑھانے میں کوئی نقصان نہیں، سنہ ۱۹۲۴ء میں اسٹیلن خود یہ کہتا تھا کہ انقلاب ایک ملک میں زندہ نہیں رہ سکتا اس کو زندہ رکھنے کے لئے عالم گیر انقلاب کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ روسی انقلاب واحد ملک کا انقلاب تھا۔ وہ مستقل طور پر ختم ہو گیا۔ اب کسی جدّ و جہد کی ضرورت نہیں محکومی طبقے کے لئے اس نظریے کے یہ معنی تھے کہ کھاؤ، پیو اور چین کرو۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اسٹیلن نے ہماری پارٹی کو عہدوں سے برطرف کر دیا۔ لیکن اب بھی ہم اپنے آپ کو پارٹی کا ممبر ہی سمجھتے رہے ہم عہدہ دار نہیں رہے تھے لیکن پارٹی کے ممبر تھے اور پارٹی کے جلسوں میں اپنے اختلافات کی بابت بحث و مباحثہ کر سکتے تھے۔ لیکن جب ہٹلر کو یہ موقع دیا گیا کہ جرمنی کا مالک بن جائے اور جب سوویٹ یونین ہٹلر کی دوستی کا خواہاں ہوا۔ تو ہم نے کہہ دیا کہ کمنٹرن اب مردہ ہو چکی ہے۔ اب ہمیں ایک نیا سیاسی ادارہ قائم کرنا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک ہمارے اور اسٹیلن کے درمیان کافی اختلافات ہو گئے اور ہم سیاسی کمیٹی سے نکال دیے گئے۔ اب سیاسی کمیٹی کا حال یہ ہے کہ اس کے ممبروں میں سے ایک بھی کوئی غیر زبان نہیں جانتا۔ کمنٹرن کے ہاتھ میں مختلف ملکوں کے ساٹھ اداروں کی باگ ڈور ہے اس لئے کتنا ضروری ہے کہ ممبر

دوسری زبانیں جائیں۔ دورانِ مخالفت میں یہ بھی ہوا کہ ہمارے جو مضامین حکومت کے
خلاف ہوتے تھے اسٹیلن ان کو چھپنے سے روک دیتا تھا۔ سوویٹ یونین میں دوسری
چیزوں کی طرح پریس بھی حکومتی طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ سیاسی کمیٹی کے جلسوں میں ایک
اسٹینوگرافر ہوا کرتا تھا وہ سب تقریریں قلم بند کیا کرتا تھا جو بعد میں چھپتی تھیں جب چین کے انقلاب
کے متعلق کمیٹی بیٹھی اور بحث ہوئی تو یہ بہانہ کرکے کہ اس مجلس کی کارروائی کو عام کرنے سے
بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ اسٹینوگرافر کو تقریریں قلم بند نہ کرنے دیں اور ہمارے
مضامین نہ چھپنے دیے اس پر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں چند نوجوانوں نے اُن کو چھاپا اس سلسلے
میں سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں گرفتاریاں عمل میں آئیں اسی سال اکتوبر کے انقلاب کی یادگار
منائی گئی اور سرکاری جلوس نکلے جس میں ہماری پارٹی کے لوگ بھی شریک تھے۔ لیکن ہمارے
جھنڈوں پر مختلف نعرے ثبت تھے۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ مختلف پارٹیاں مختلف نعرے مقرر
کرلیتی تھیں۔ ہماری پارٹی کے یہ نعرے تھے کہ کولک۔ حکومتی طبقہ اور نئی اقتصادی پروگرام
کے خلاف جہاد کرو۔ خفیہ پولیس والوں نے ہماری پارٹی کے جھنڈے چھین کر تلف کردیئے اور
کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لینن گریڈ میں ریڈک اور زینوویف کو جلوس نکلنے سے دو گھنٹے
قبل ہی گرفتار کرلیا۔ اس واقعے کے بعد میرے نام زینوویف کا ایک خط آیا جس کا آخری جملہ
یہ تھا "اسٹیلن ان واقعات کی بابت بہت ہی زہر آلود افسانے مشتہر کرے گا اس لئے عوام
کو سچے واقعات سے آگاہ کرنے کا فوراً انتظام کرنا چاہیئے" اگرچہ عوام ہمارے ساتھ کافی ہمدردی
رکھتے تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس سال حکومت نے جلوس کا انتظام فوجی طریق پر کیا تھا ہر
دستے کے آگے خفیہ پولیس کے آدمی سادے کپڑوں میں تھے اور حکومتی طبقے کے لوگ
خاص خاص مورچوں پر تھے۔ کارخانوں کے ڈائرکٹر اور سکریٹری وغیرہ بھی جلوس کے ہمراہ
تھے اور مزدوروں پر نظر رکھتے تھے۔ حکومتی طبقے نے ہمارے خلاف کافی انتظام کر رکھا
تھا۔ اس لئے جب خفیہ پولیس کے آدمیوں نے ہماری پارٹی کے جھنڈے توڑ ڈالے تو کوئی

مزدور نہ بول سکا۔ کیوں کہ ان بے چاروں کی روٹی کا سوال تھا۔ اگر کچھ مزدور ہمدردی ظاہر کرتے تو اگلے ہی دن سکریٹری کارخانے سے نکال دیتا جس کے یہ معنی ہوتے کہ مزدور بھوکے مرجاتے۔ کیونکہ سارے کارخانے حکومت کے ہیں اس لئے سوویٹ یونین میں اگر کسی غریب پر حکومت کی نظرِ عنایت نہ رہے تو حکومت اس کو بھوکا مار سکتی ہے۔ اس لئے جلوس میں مزدور کا ہمارے ساتھ ہمدردی کرنا اس کے لئے حیات و موت کا سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں معمولی انسان ڈر جاتا ہے جس ملک میں ایک استبدادی جماعت تمام طریق پیداوار پر قبضہ کرلے اور صرف حکومتی طبقے کا مفاد مدنظر رکھے وہاں پوری چنگیزی ہوجاتی ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کی برسی پر ہماری پارٹی نے جو مظاہرے کئے ان کو اسٹیلن نے بغاوت کے نام سے پکارا اور بائیں جماعت کے ممبروں کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔

فینرٹی :- جلوس میں پانچ لاکھ کے قریب آدمی تھے۔ مسٹر ٹراٹسکی اس میں سے کتنے آپکے ہم درد ہوں گے ؟

ٹراٹسکی :- یہ کہنا مشکل ہے۔ اس جلوس میں وہ پرانے ممبر نہیں تھے جنھوں نے اکتوبر کے انقلاب میں حصہ لیا تھا بلکہ نئے ممبر تھے جو نئے قواعد کے مطابق ممبر بنائے گئے تھے سنہ ۱۹۲۳ء سے قبل وہ ممبر سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس نے اکتوبر کے انقلاب میں حصہ لیا ہو لیکن سنہ ۱۹۲۳ء میں سب سے زیادہ قابل قدر ممبر وہ ہوگیا جس نے بیس پچیس سال تک ایک ہی فیکٹری میں کام کیا ہو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کی اہمیت بڑھ گئی اور ایک مزدور حکومت میں ایسی تبدیلی ہونی ہی چاہئے تھی لیکن دراصل یہ قانون اور اغراض کے لئے بنایا گیا تھا اس قانون کے یہ معنی ہوئے کہ سنہ ۱۹۰۵ء سے جو مزدور ایک ہی فیکٹری میں کام کرتا رہا ہو وہی سب سے اہم ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور اس کے بعد کا زمانہ وہ تھا جبکہ مزدور طبقہ انقلاب کے لئے تیار ہو رہا تھا اور آئے دن ہڑتالیں اور مزدوروں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی تھی۔ جو مزدور سیاسی حالات کو سمجھتے تھے اور انقلابی جدوجہد میں حصہ لیتے تھے ان کو زار کی حکومت پکڑ کر سائبریا پہنچا دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو مزدور

فیکٹریوں میں باقی رہ جاتے تھے۔ وہ بہت ہی کمترین اور جی حضوری قسم کے انسان ہوتے تھے جب پارٹی کے ممبر ہونے کی یہ سب سے اہم شرط ٹھہری کہ مزدور بیس سال تک ایک ہی فیکٹری میں رہا ہو تو دوسرے الفاظ میں جو سب سے زیادہ "نیازمند" "فدوی اور" "میں ہوں آپ کا تابعدار" قسم کا مزدور ہوا وہ ہی پارٹی کا سب سے اہم ممبر ٹھہرا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں پارٹی میں انقلابی قسم کے لوگ بہت کم ہو گئے تھے اور حکومت کے اشارے پر چلنے والے جی حضوری بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میرا خیال ہے کہ بیس تیس ہزار مزدور ہمارے ہم خیال تھے کیونکہ جب ہماری پارٹی کے لوگ جھنڈے لے کر نکلے تو اُن کے ساتھی مزدوروں نے اُن کو منع نہیں کیا۔ بہت سے مزدوروں کی اخلاقی ہمدردی پارٹی کے ساتھ تھی لیکن ہمارے ساتھ مل کر وہ کوئی عملی جدوجہد کرنے کو تیار نہیں تھے اُن کا یہ رویہ تھا "دیکھو وقت آئے گا تو دیکھیں گے"۔ ہماری پارٹی انقلاب کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسٹیلن نے اس مظاہرے کو بغاوت کہنا شروع کر دیا اور پندرھویں کانگریس کے بعد ایک قلیل عرصے میں تمام ملک سے گیارہ ہزار کے قریب آدمی سائبریا جلاوطن کر دیے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ہماری پارٹی کے قریب ساٹھ ہزار مرد اور ایک لاکھ عورتیں اور بچے سائبریا میں جلاوطن تھے۔

گولڈمین: (ٹروٹسکی کا وکیل) اس کمیشن کے سامنے ٹروٹسکی کے بیانات دلوانے کا یہ مقصد ہے کہ اسٹیلن کی حکومت نے ٹروٹسکی پر جو الزامات لگائے ہیں ان کی تردید میں ثبوت پیش کئے جائیں کیرف کے قتل کے بعد سے سوویٹ یونین میں سات سیاسی مقدمے ہو چکے ہیں جن میں بالواسطہ ٹروٹسکی کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں جو مقدمے ہوئے ان میں براہِ راست ٹروٹسکی اور اس کے لڑکے کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے اور سوویٹ یونین کی عدالت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ یہ دونوں سوویٹ یونین میں جب بھی داخل ہوں فوراً گرفتار کر لئے جائیں۔

الزامات کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

(۱) سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کے سربرآوردہ لوگوں کے قتل کی سازشیں، خاص کر کیرَف کا قتل۔

(۲) سوویٹ یونین میں کارخانوں۔ ریلوں وغیرہ کے تباہ کرنے کی عملی تدبیریں تاکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے۔

(۳) سوویٹ یونین کے نظام کو تباہ کرنے کے لئے ایک جماعت کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہو کہ مزدوروں اور فوجیوں کو قتل کیا جائے۔ سامانِ حرب بنانے کے کارخانوں کو تباہ کیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کی فوجی طاقت کو صدمہ پہنچے۔

(۴) جرمنی اور جاپان سے خفیہ سازباز۔ تاکہ یہ دونوں ملک، سوویٹ یونین پر حملہ کریں اور یونین میں اندرونی بدامنی پیدا کرنا تاکہ ٹروٹسکی خود سوویٹ یونین کا حاکم بن جائے

(۵) سوویٹ یونین میں سوشلسٹ طریقِ پیداوار کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کو ازسرنو زندہ کرنے کی کوشش۔

میں اس کمیشن کے روبرو ثبوت پیش کروں گا کہ مندرجہ بالا الزامات غلط ہیں اور جو افسوسناک واقعات یونین میں رونما ہو رہے ہیں ان کی تمام ذمہ داری وہاں کے حکومتی طبقے پر ہے۔

مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ عام اطلاع کے لئے اپنی سوانح عمری مختصراً بیان کریں گے۔

ٹروٹسکی : میرا اصل نام لیوَن ہے۔ باپ کا نام برونسٹین تھا۔ آج کل میکسیکو کے ایک مقام کیوکن میں اپنی بیوی اور چار سکرٹیریوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا پیشہ تصنیف وتالیف ہے۔ تقریباً چالیس سال سے میں مارکس کے انقلابی تخیل کا حامی ہوں اور اس کی اشاعت میں سرگرم ہوں۔ میں نے سب سے پہلے روس میں ۱۸۹۸ء میں ایک غیر قانونی مزدور سبھا قائم کی تھی جس کی بنا پر مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا اور ڈھائی سال تک جیل میں رکھا گیا تھا۔ پھر چار سال کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں بھی میں نے ایک غیر قانونی مزدور سبھا بنائی

صرف دو سال ہی گذرے تھے کہ میں سائبریا سے فرار ہو گیا۔ بھاگتے وقت پاس پورٹ پر میں نے اپنا نام ٹروٹسکی لکھا تھا اور اسی نام سے میں مشہور ہوں۔ سائبریا سے بھاگ کر میں لندن پہنچا اور اسکارا اخبار کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ یہ لینن کا اخبار تھا جس کا یہ مقصد تھا کہ جو روسی نوجوان تعلیم کے لئے یورپ آئے تھے اُن میں مارکس کے فلسفے کی تبلیغ کی جائے۔ میں ۱۹۰۵ء میں خفیہ طریقے پر روس گیا اور ایک سال تک انقلابی تحریک پھیلاتا رہا۔ سال کے آخر میں پیٹرو گریڈ کے سوویٹ کا ممبر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کی انتظامیہ کمیٹی کا ممبر ہو گیا اور آخرکار سوویٹ کا صدر ہو گیا۔ اس وقت میری عمر قریب ۲۶ سال کے ہوگی۔ میں نے ۱۸ سال کی عمر سے انقلابی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ میں ۲۶ سال کی عمر میں سوویٹ کے پہلے صدر کی گرفتاری پر صدر منتخب ہو گیا۔ اس وقت میں نہ صرف صدارت کا کام انجام دیتا تھا بلکہ دو اخباروں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب حکومت نے تشدد شروع کیا تو سوویٹ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ میں بھی گرفتار ہو گیا اور ڈیڑھ سال جیل میں رہا اس کے بعد مجھے ساری عمر کے لئے جلاوطن کر کے سائبریا روانہ کر دیا گیا۔ لیکن وہاں میں آٹھ دن رہ کر پھر فرار ہو گیا اور آسٹریا پہنچا۔ وہاں سے ایک اخبار جاری کیا اور سات سال تک اس اخبار کے ذریعے روسی مزدوروں میں تبلیغی کام کرتا رہا۔ میں غیر قانونی طریقے پر روس میں اپنا اخبار داخل کرتا تھا۔ اور آسٹریا میں بھی مزدوروں کی تنظیم کا کام کرتا تھا جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور آسٹریا میں روسی گرفتار کئے جانے لگے تب میں سوئزرلینڈ چلا گیا اور وہاں مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتا رہا۔ سوئزرلینڈ کے دوران قیام میں ایک کتاب "جنگ اور انٹرنیشنل" لکھی جنگ کے دوران میں "دوسری انٹرنیشنل" کے ممبروں کی روش بدل گئی تھی۔ وہ بین الاقوامی نقطہ نگاہ چھوڑ کر قومیت پسند بن گئے تھے۔ میں ۱۹۱۴ء کے آخر میں فرانس گیا یہاں سے ڈھائی برس تک روسی زبان میں اخبار نکالا اور فرانس میں جنگ کے خلاف تبلیغ کرتا رہا۔ تبلیغ کرنا اس لئے ممکن ہوا کہ جنگ شروع ہونے کے دو سال بعد تک

فرانس میں اظہار خیال اور تحریر و تقریر کی کافی آزادی تھی۔ لیکن ۱۹۱۶ء کے آخر میں مجھے فرانس سے اسپین پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک ہفتے بعد مجھے حراست میں لے لیا گیا۔ اور کوئی ایک ماہ بعد امریکہ پہنچا دیا گیا۔ امریکہ پہنچ کر بھی میں جنگ کے خلاف تبلیغ کرتا رہا۔ اور وہاں کی سوشلسٹ پارٹی سے بحث و مباحثے میں سرگرم رہا۔ جب پیٹروگریڈ سے روسی انقلاب کی خبریں آئیں تو سب روسی وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔ جن میں میں بھی تھا۔ لیکن کناڈا پہنچنے پر انگریزی پولیس نے جرمن جاسوس ہونے کے الزام میں مجھے پکڑ لیا اور جرمن کیمپ میں بھیج دیا۔ انگریز خود یہ جانتے تھے کہ میں جرمن جاسوس نہیں ہوں۔ انگریزی سفیر نے خود مجھ سے کہا "ہم نے زار کی حکومت کے کہنے پر تم کو پکڑ لیا ہے"۔ زار روس کی حکومت ہمیشہ سے میرے خلاف تھی اور دراصل اس نے ہی مجھے فرانس سے نکلوایا تھا۔ فرانس کے وزیر اعظم پر زور ڈالا گیا کہ مجھے نکال دے۔ واقعہ یہ تھا کہ اسی زمانے میں ٹولن میں روسی سپاہیوں نے افسر کو قتل کر دیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ فرانس کی آزاد فضا میں رہ کر روسی سپاہیوں نے روسی افسروں کے استبداد کو ختم کرنا چاہا تھا۔ لیکن روسی جاسوسوں نے میرا اخبار ان سپاہیوں میں بانٹ دیا اور یہ مشتہر کر دیا کہ میرا اخبار پڑھنے سے سپاہیوں کے خیالات فاسد ہو گئے اور انھوں نے افسر کے خلاف بغاوت کر دی۔ فرانس کے اعلیٰ افسر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "زار سے ہماری دوستی ہے اور وہ حکومت آپ کے قیام فرانس کے خلاف ہے اس لئے آپ معاف کریں گے۔ اگر ہم آپ کو مہمان نہ رکھ سکیں"۔ ہاں! تو جب میں کناڈا کیمپ میں مقید تھا تو لینن نے میرے جرمن ایجنٹ ہونے کے متعلق ۱۹۱۷ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا پہلا جملہ یہ ہے:-

"کیا ایک لمحے کے لئے بھی کوئی انسان یہ یقین کر سکتا ہے کہ ٹروٹسکی جیسا انسان جس کی عمر انقلاب کی خدمت میں گذری کبھی بھی جرمن حکومت کا گرگا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اس کو جرمن جاسوس بتاتا ہے وہ ٹروٹسکی پر بہتان لگاتا ہے"۔

کچھ عرصے بعد پٹیرو گریڈ کے سوویٹ نے حکومت کنا ڈا پر زور ڈال کر مجھے رہائی دلوادی اور میں روس پہنچ گیا۔ میں شروع میں بولشیوک پارٹی کا ممبر نہ تھا بلکہ میری ایک الگ پارٹی تھی جس کے تین، چار ہزار ممبر تھے لیکن میری پارٹی اور بالشیوک پارٹی کا پروگرام ایک ہی تھا جب پروگرام ایک تھا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ دونوں کو ملا دیا جائے۔ اس کے متعلق لینن سے ذکر آیا اس کی بھی یہی رائے ہوئی چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کانگریس میں اس اتحاد کا اعلان کر دیا گیا۔ مجھے دو چار ماہ ہی بالشیوک پارٹی میں ہوئے ہوں گے کہ کرنسکی کی سرکار نے تشدد شروع کر دیا لینن نے فن لینڈ میں پناہ لی لیکن مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ ہم دونوں پر یہ الزام تھا کہ ہم جرمن جاسوس ہیں۔ زینوویف اور کیمونیف پر بھی یہی الزام لگایا تھا۔ اسٹیلن چونکہ اس زمانے میں مشہور نہیں ہوا تھا اس لئے نظریں اس پر نہیں پڑیں کچھ عرصے بعد کورنیف نے کرنسکی کے خلاف بغاوت کردی۔ کرنسکی کو ہماری مدد کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے ہمیں رہائی مل گئی۔ میں جیل سے سیدھا ونٹر پیلس پہنچا اور سرکاری نمائندوں کے ساتھ باتیں کیں۔ جب اکتوبر کا انقلاب ہوا تو میں نے اس میں بہت نمایاں حصہ لیا جس کا ذکر اسٹیلن یوں کرتا ہے:۔

> "اکتوبر کے انقلاب کی کامیابی کا سہرا ٹروٹسکی کے سر ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فوج کا سوویٹ کی موافقت کرنا اور انقلابی پارٹی کے عمل میں نتیجہ خیز تیزی پیدا کرنا ٹروٹسکی کا ہی کام تھا"

لیکن چھ سال بعد ۱۹۲۴ء میں اسٹیلن اپنی کتاب "ٹروٹسکی ازم اور لینن ازم" میں لکھتا ہے

> "ٹروٹسکی نے اکتوبر کے انقلاب میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا اور دراصل لے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ پارٹی میں نسبتاً نیا آدمی تھا"

جب بالشیوک پارٹی کے ہاتھ میں حکومت آگئی تو میں پیٹرو گریڈ کے سوویٹ کا صدر ہو گیا اور فوجی کمیٹی کا سکریٹری بھی رہا۔ اس کے بعد وزیر خارجہ ہو گیا اور پھر وزیر فوج۔ میں تین برس تک روسی فوج کی تنظیم میں مشغول رہا۔ کام کی اتنی شدت تھی کہ تین سال تک ریل کے ڈبے

کو اپنا گھر بنانا پڑا۔ خانہ جنگی ختم ہونے پر میں ملک کی اقتصادی ترقی کی طرف متوجہ ہوا
۱۹۲۳ء تک میں وزیر جنگ رہا اور سیاسیہ کیٹی یعنی پولٹ برو جو کمیونسٹ
پارٹی کا اہم ادارہ تھا اس کا ممبر رہا۔ مئی ۱۹۲۴ء میں مجھے وزارت سے علیحدہ کر دیا گیا۔
میرے علیحدہ کرنے کی سازش میں اسٹیلن۔ ریٖنوٖییف اور کمینونیف شامل تھے۔ یہ تینوں اصحاب
مثلث کہلاتے تھے اور ان کا یہ اتحاد میرے خلاف استعمال ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنا اثر ملک
کے گوشے گوشے میں قائم کر لیا تھا اور تار کے خفیہ لفظ بنا لئے تھے۔ یہ سب میرے خلاف تھا
میں نے کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں بہت اہم حصہ لیا تھا۔ پارٹی کے پروگرام اور اہم اعلانات
میری ہی محنت کے مرہون منت ہیں۔ مجھے ۱۹۲۷ء میں پارٹی سے اس لئے نکال دیا گیا کہ
سوویٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین میں سربرآوردہ لوگوں کی جو ذاتیں بن گئی تھیں میں اُن کی مخالفت
کرتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ان ذاتوں نے خاص حقوق کی جو رسم جاری کر لی ہے اس کو ختم
کیا جائے تاکہ طریق پیداوار سے ملک کے تمام باشندوں کو یکساں فائدہ ہو۔ میرا
بین الاقوامی نقطۂ نگاہ تھا اس اختلاف کی بنا پر مجھے پارٹی سے نکال دیا گیا اور وسط
ایشیا کے ایک مقام الما آتا بھیج دیا گیا۔ وہاں میں تصنیف کا کام کرتا رہا اور دو کتابیں
تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں۔ "لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل" اور "مستقل انقلاب"
روسی حکومت نے ان کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی اس لئے وہ امریکہ میں چھپی ہیں
الما آتا میں ایک روز روس کی خفیہ پولیس کا افسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "آپ
اپنی تصنیف کا کام بند کر دیں۔" مجھے غصہ آگیا اور میں نے اُسے سخت سست کہا۔ اس
وقت تو وہ چلا گیا لیکن اگلے روز اُس نے آکر یہ اطلاع دی کہ مجھے کسی دوسرے ملک
میں بھیجا جا رہا ہے۔ اب مجھے ترکی روانہ کر دیا گیا۔ جہاں میں ساڑھے چار سال رہا۔ وہاں
سے میں نے ایک اخبار نکالا جو میرے خیالات کا آئینہ ہے۔ ترکی کے دوران قیام میں
میں نے بہت سی کتابیں اور مضمون لکھے۔ ساڑھے چار سال میں صرف ایک ماہ کے لئے

ترکی سے باہر گیا وہ بھی اس لئے کہ کوپنیگن کی یونیورسٹی کے لڑکوں نے مجھے انقلاب روس پر تقریر کرنے کو بلایا تھا۔ میں ۱۹۳۳ء میں فرانس چلا گیا وہاں قریب دو سال کے گذارے اور تصنیف میں مشغول رہا۔ لیکن جب ۱۹۳۴ء میں فرانس میں فسطائی شورش ہوئی اس وقت مخالفوں کو موقع مل گیا۔ گیوبل نے جرمن اخباروں میں ایک خیالی سازش میرے سر منڈھی اور فرانس کے اخباروں نے اس کو بڑی سرخیاں دے کر چھاپا۔ گیوبل نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ فرانس میں فسطائی بغاوت میں نے کرائی ہے۔ اس وقت فرانس کی حکومت نے مجھ سے کہا کہ ملک کے اخباروں نے اس قدر شور مچا دیا ہے کہ ہم آپ کے خلاف کچھ کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم آپ کو بظاہر تو فرانس سے اخراج کا حکم دیں گے مگر آپ خفیہ طریقے پر رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اعلان نکل گیا کہ ٹروسکی نکال دیا گیا ہے مگر میں اس اعلان کے سال بھر بعد تک فرانس میں موجود رہا۔ کچھ دن بعد ناروے کی حکومت تبدیل ہوگئی اور وہاں عنانِ حکومت مزدور جماعت کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس وقت مجھے خیال ہوا کہ ناروے میں زیادہ آرام اور آزادی سے گذرے گی۔ چلو وہاں چلیں۔ مجھے ناروے میں داخلے کی اجازت مل گئی اور میں اوسلو میں مقیم ہوگیا۔ یہاں بھی وہی تصنیف کا کام کرتا رہا ۱۹۳۶ء میں زینوویف، کیمنیف کے مقدمے کے بعد ناروے کی حکومت نے مجھے پکڑ لیا اور یہ الزام لگایا کہ میں اُن کے ملک میں سیاسی ریشہ دوانیاں کر رہا ہوں۔ اور میرے ایک مضمون کو جو دراصل فرانس کے متعلق تھا اور امریکہ کے ایک اخبار نیشن میں چھپا تھا اس کو ریشہ دوانیوں کے ثبوت میں پیش کیا۔ لیکن میری گرفتاری کی اصل وجہ سوویٹ یونین کا دباؤ تھا یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہے کہ ناروے میں میرے بارسوخ دوست ہیں۔ دوسرے ناروے چھوٹی سی جگہ ہے وہاں ہر بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ علم ہوا تھا کہ یونین کا سفیر ناروے کے وزیر خارجہ سے ملنے آیا تھا اور میری گرفتاری کی بابت کہتا تھا۔ کچھ روز بعد ناروے کی حکومت نے مجھے رکھنے سے انکار کر دیا۔ میرے فرانسیسی دوست

بڑے پریشان ہوئے۔ کیونکہ ناروے سے نکلنے کے یہ معنی تھے کہ روسی خفیہ پولیس
گرفتار کرے گی۔ ۹ر دسمبر کو مجھے یہ معلوم ہوا کہ میکسیکو کی حکومت نے مجھے داخلے کی
اجازت دے دی ہے۔ یہ آج تک نہ معلوم کرسکا کہ کس کی کوشش سے میں میکسیکو پہنچا
یہ میری سیاسی زندگی کے خد و خال ہیں۔ میرے چار بچے تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں
ایک لڑکی نینا تھی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے خاوند کو روسی خفیہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔
وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ زندگی کی پریشانیاں بہت بڑھ گئیں۔ وہ تنہا اس کا مقابلہ نہ
کرسکی۔ چنانچہ نہ خاک سوگئی۔ دوسری لڑکی زینا تھی وہ علاج کے لئے جرمنی آئی ہوئی تھی
اس کا خاوند اور بچے روس ہی میں تھے۔ جرمنی کے دورانِ قیام میں اس نے سیاسی تحریکات
میں حصہ نہیں لیا لیکن میرے ساتھ اس کا بھی روس میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔
خاوند اور بچوں کی جدائی نے اس کی طبیعت پر گہرا اثر کیا اور اس نے خودکشی کر لی میرا
ایک بیٹا سرگی ہے وہ یونین میں کسی اسکول میں استاد تھا۔ وہ سیاست سے بے بہرہ تھا
اور اسی لئے اس کو خیال تھا کہ روسی حکومت اُس کو کچھ نہ کہے گی۔ میری جلاوطنی کے بعد بھی
وہ روس میں رہتا تھا۔ لیکن کب تک۔ آخر اس پر بھی مزدوروں کو زہر دینے کا الزام لگایا
گیا مجھے معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہے۔ لیکن ہے وہ سوویٹ یونین میں۔ دوسرا بیٹا
سیئوف میرے ساتھ ہے۔ اس کو بھی سوویٹ یونین میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

گولڈمین:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ ریڈک وغیرہ کے اقرار جرم کے باوجود ماسکو کے مقدمے کو
سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کی سازش سمجھتے ہیں۔ اگر ریڈک وغیرہ مجرم نہ ہوتے تو وہ
کیوں کھلے اجلاس میں اقرار جرم کرتے۔

ٹروٹسکی:۔ مجھے معلوم ہے کہ ریڈک اور اس کے ساتھیوں کے اقرار جرم سے جو انھوں نے کھلے
اجلاس میں دنیا کے پریس کے سامنے کیا عوام مغالطے میں پڑ گئے ہیں۔ عوام کا یہ خیال ہے
کہ پریس کے نمایندوں کی موجودگی میں ریڈک وغیرہ جو کچھ بھی چاہتے کہہ سکتے تھے۔ وہاں اُن

پر کوئی بیرونی دباؤ نہیں تھا۔ جب انھوں نے خود اقرارِ جرم کر لیا تو شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور چونکہ اُن کے بیانات میں ٹرو ٹسکی اس سازش کا سرغنہ بتایا گیا ہے اس لئے یہ ضرور مجرم ہے۔"

میں اس خیال کی تردید میں بجائے خود کچھ عرض کرنے کے تاریخ کے مشہور پروفیسر چارلس اے بیرڈ کا خیال پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ پروفیسر موصوف نے اس تحقیقاتی کمیشن میں شرکت سے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے ایک فاضلانہ تحریر لکھی ہے۔ جو پروفیسر صاحب کی علمیت کا اندازہ کرتے ہوتے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں "میں نے ماسکو کے مقدمے کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ٹروٹسکی کے خلاف جو کچھ بھی الزامات ہیں اُن کا ثبوت ریڈک اور اُس کے ساتھیوں کے بیان کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ عالم کا مطالعہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ اقرارِ جرم خواہ وہ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ہی کیوں نہ ہو کسی جرم کا ثبوت نہیں ہو سکتا" اس جملے کے الفاظ 'ہی کیوں نہ ہو' سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر بیرونی دباؤ کے مسئلے کو قابلِ بحث سمجھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے قرونِ وسطیٰ کی مذہبی عدالتوں اور توہمات کے تاریک زمانے سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ مجمع کے سامنے اقرار جرم ہوا۔ اگرچہ مجرم نے جرم نہیں کیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک جب تک کسی کے خلاف خارجی شہادت نہ ہو اس وقت تک اس کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتے۔ اسی اصول پر اُن کا خیال ہے کہ جو شخص مجھ کو مجرم ٹھہرائے اس کو کوئی ایسی خارجی شہادت پیش کرنی چاہئے جس کا غلط اور صحیح ہونا جانچا جا سکے۔ اور اگر میرے خلاف کوئی ایسی شہادت دستیاب نہیں ہو سکتی جس کو ٹھونک بجا کر دیکھا جا سکے تو میں مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ جب پروفیسر صاحب کا یہ خیال ہے کہ اقرارِ جرم کسی کو مجرم گرادننے کے لئے کافی شہادت نہیں ہے اور میں مجرم ثابت نہیں ہو سکتا تو جنھوں نے اقرارِ جرم کیا وہ بھی مجرم ثابت نہیں ہو سکتے۔ یہ مقدمہ سوویٹ یونین کی حکومتی طبقے کی میرے اور میری پارٹی کے خلاف ایک سازش ہے۔ اس مقدمے میں حکومتی طبقہ سوائے زبانی شہادتوں کے کوئی تحریری شہادت پیش نہ کر سکا اور جن شہادتوں کو خراد پہ

چڑھایا جا سکتا تھا۔ اُن کو میں نے غلط ثابت کر دیا۔ چند مجرموں نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے فلاں وقت فلاں جگہ ملے اور میں نے اُن کو ہدایات دیں۔ میں نے یہ ثابت کر دیا کہ میں اس وقت اس مقام پر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ماسکو کے مقدمے کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں مجرموں کے خلاف کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کی گئی جس کو ٹھونک بجا کر دیکھا جا سکے۔ دوسرے اقرار جرم میں بھیڑ چال ہے۔ ہر مجرم قریب قریب ایک سے الفاظ میں اقرار جرم کرتا ہے۔ اور حکومت کا وکیل جو سوال کرتا ہے اس کا جواب 'جی ہاں' کے سوا اور کچھ نہیں دیتا۔ سب ملزموں کی یہ بھیڑ چال ایک سمجھ دار انسان کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ یہ سب جعلی کارروائی ہے۔

کولڈمین :۔ مسٹر ٹروٹسکی۔ جلاوطنی سے قبل آپ کا سوویٹ یونین کی صنعت و حرفت کی بابت کیا خیال تھا؟

ٹروٹسکی :۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک میں اس پر لڑا کہ صنعت و حرفت کو تیزی سے ترقی دینی چاہئے میں نے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب "روس کا رخ سرمایہ داری کی سمت ہے یا سوشلزم کی سمت" لکھی تھی جس میں یہ بتایا تھا کہ اشیاء کی پیداوار کو موجودہ مقدار سے بیس گنا یا اس سے بھی زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسٹیلن اور اس کی پارٹی نے مجھے مخبوط الحواس کہا اور صنعتی دیو کا لقب بطور طعن دیا۔ سوویٹ حکومت نے میرے ساتھیوں کو بھی صنعتی دیو کہنا شروع کر دیا۔ لیکن واقعات نے یہ بتایا کہ میں مخبوط الحواس نہیں تھا۔ پیداوار میرے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھی۔ جب میں ۱۹۲۷ء میں برقابی اسٹیشن کے بنوانے پر شدت سے مصر تھا تو مرکزی کمیٹی میں اسٹیلن نے مجھے یہ جواب دیا تھا کہ ہمارے لئے کسی قسم کا برقابی اسٹیشن بنانا ایسا ہی مضر ہے جیسے کسان کے لئے گائے خریدنے کی بجائے گراموفون خریدنا۔ اسٹیلن یہ سمجھا۔ یہی نہیں کہ ملک کی صنعتی حرفتی ترقی کے بغیر سوشلزم چل ہی نہیں سکتا اور اس کی ترقی کے لئے بجلی کا انتظام ملک کے لئے از حد ضروری ہے۔

گولڈمین:۔ جب پنج سالہ پروگرام شروع ہوا تو آپ نے کیا اظہار خیال کیا تھا۔

ٹروٹسکی:۔ پنج سالہ پروگرام ۱۹۲۸ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۳۲ء میں ختم ہوا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں پروگرام کا خیال پیدا ہوا اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ پروگرام کی بموجب کام کرنے سے پہلے سال اس وقت کی پیداوار سے نوگنی زیادہ پیداوار ہوگی۔ دوسرے سال گھٹ کر آٹھ گنی رہ جائے گی اور اسی طرح گھٹتی رہے گی۔ یہاں تک کہ آخری سال صرف چار گنی رہ جائے گی۔ اس اندازہ سے مجھے سخت اختلاف تھا۔ یہ اختلاف جب بڑھا تو گرما گرمی کی نوبت آگئی۔ میں نے اس پروگرام کا نام بطور طعن "تخریب صنعت" رکھا کیونکہ اس پروگرام سے پست خیالی اور کم ہمتی ٹپکتی تھی۔ اور جس قدر پیدا ہو سکتا تھا یہ پروگرام اس سے بہت کم پر اکتفا کرتا تھا۔ میری مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ پروگرام دوبارہ بنا جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب "روس میں اصلی حالت" میں کیا ہے۔ دوسرے پروگرام میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ پانچوں سال نوگنی پیداوار رہے گی۔ میں اس پر بھی لڑا اور میں نے بتایا کہ پیداوار قریب ۲۰ گنی ترقی کر سکتی ہے۔ زار کے زمانے میں موجودہ مقدار سے ۶ گنی زیادہ مقدار تھی میں نے اس کو تگنا کر دیا۔ ہماری پارٹی نے کہا کہ جو کچھ ترقی ہو سکتی ہے اس سے ہمارا اندازہ کہیں کم ہے۔ ۲۰ گنی ترقی سے بھی زیادہ ترقی ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پروگرام شروع ہونے کے پہلے ہی سال یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک تھا۔ صنعت بہت تیزی سے بڑھی۔ چنانچہ پھر پروگرام کو تبدیل کرنا پڑا۔ اب حکومتی طبقے کو یہ سوجھی کہ پروگرام پانچ سال کی بجائے چار سال ہی میں پورا کر دینا چاہیئے۔ میں نے اپنے اخبار بولیٹن میں بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ جو عملی لوگ نہیں ہوتے ہیں اُن کی خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کام شروع کرنے سے قبل وہ ترقی کے امکانات کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور جب خلاف توقع اچھے نتیجے نکلتے ہیں تو اندھا دھند ترقی کی کوشش کرنے ہیں۔ میں حکومتی طبقے کی اس تیزی کے خلاف تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے تباہ کن نتیجے کی خبر تھی۔ اس وقت میری

تردید میں یہ کہا گیا کہ ملک پر حملہ ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہمیں روس کی اقتصادی حالت اس معیار پر پہنچا دینی چاہیئے جس پر دشمنوں کی ہے تاکہ مقابلہ ہو سکے چنانچہ روس میں امریکن طرز کی فیکٹریاں بنا دی گئیں لیکن سڑکیں ندارد۔ رسل و رسائل کا انتظام مفقود۔ فیکٹری کے مزدوروں کے لئے مکان نہیں بنے اور جہاں بنے وہاں صفائی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وبا پھیل گئی۔ مزدور مر گئے۔ فیکٹریاں بند ہو گئیں یا اُن کی پیداوار گھٹ گئی۔ حکومت نے اپنی نالائقی کا الزام دوسروں کے سر منڈھا۔ فیکٹری کے کارکنوں پر مقدمے چلا دیے کہ یہ ٹراٹسکی کے پیرو ہیں اور دیدہ دانستہ ملک کی اقتصادی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ داری میں جنسوں کی کمی وبیشی کا اندازہ قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ سے ہوتا ہے۔ لیکن اشتراکی نظام میں بازاری داموں کی غیر موجودگی کی وجہ سے خود حکومت کو باضابطہ اعداد و شمار کی مدد سے جنس اور خریدار میں توازن قائم رکھنا ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک جنس کس مقدار میں بنے کہ سماج کے لئے کافی ہو۔ لیکن یونین میں کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ کیا شے کس مقدار میں بنانی چاہیئے اس لاعلمی کی بنا پر صنعت و حرفت میں بہت ہڑبونگ مچ گئی میں نے اس زمانے میں صاف طریقے پر یہ کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے تاریک ماضی کو فراموش نہیں کر سکتے اور یہ تیزی بجائے اقتصادی ترقی کے آشوب (Crisis) پیدا کر دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا

لولڈمین :۔ اب آپ کو جو کچھ اخباروں کے ذریعے سے معلوم ہوتا رہتا ہے اس کی بنا پر یونین کی صنعتی ترقی کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹراٹسکی :۔ یونین میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہمیشہ سے میرا یہ خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی نسبت سوشلسٹ طریق پیداوار سے صنعت و حرفت بہت تیزی سے ترقی کر جاتی ہے یونین میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ وہاں کا حکومتی طبقہ نہیں ہے بلکہ انفرادی ملکیت کا ختم ہو جانا اور پروگرام سے کام کرنا ہے اگر روس میں جمہوریت ہوتی تو اس سے بھی زیادہ ترقی ہوتی۔ میں سرمایہ دارانہ معترضین کے مقابلے میں یونین کے اقتصادی حالات کی

حمایت کرتا ہوں لیکن حکومتی طبقے کی پالیسی کے نقائص بھی بتاتا ہوں۔

گولڈمین:۔ کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ اجتماعی طریقِ زراعت کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

ٹروٹسکی:۔ زراعت میں بھی غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا۔ پہلا پروگرام اس خیال سے شروع کیا گیا تھا کہ جملہ مزروعہ آراضی کی ۲۰ یا ۲۲ فی صدی میں اجتماعی طریقِ زراعت جاری کیا جائے گا۔ لیکن پروگرام کے تیسرے سال ہی ۶۰ فی صدی کر دیا گیا۔ ہم نے مخالفت کی کہ مشین نہیں، کاریگر نہیں۔ ملک میں سڑکیں نہیں۔ رسل و رسائل کا سامان نہیں۔ اُن کی عدم موجودگی میں ساٹھ فی صدی اراضی میں اجتماعی طریقِ زراعت شروع کرنا تباہی کو مہمان بنانا ہے۔ لیکن حکومتی طبقے نے نہیں مانا اور اس کے طریقِ کار نے پروگرام کو خاک میں ملا دیا۔ زراعت میں ترقی تو کیا ہوتی تھی لیکن اس عجلت کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ لاکھوں کسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ میں اجتماعی طریقِ زراعت کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن جس طریق پر حکومتی طبقے نے اس کو شروع کیا اس کا مخالف ضرور ہوں۔ اجتماعی طریق پر کاشتکاری کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ کاشتکاروں میں اتحادِ عمل کی عادت پیدا کی جاتی تاکہ کاشتکار خود اجتماعی طریقِ پیداوار کے حامی ہو جاتے۔ یہ ضروری تھا کہ کاشتکاروں کو اجتماعی طریق کے فوائد بتائے جاتے نہ کہ امیر کاشتکاروں (کولک) کو مار دیا جاتا۔ میں کولک سے ڈرتا نہیں۔ یہ دوسروں سے کام کراتے ہیں۔ میں سیاسی مصالح کی بنا پر کولک کو مارنے کا مخالف تھا۔ چنانچہ حکومتی طبقے نے جب کولک کو مارا تو بہت سے کسان خوف کے مارے یونین کے دشمنوں سے مل گئے۔ حکومتی طبقے کی حماقتوں کی وجہ سے عام تباہی ہونی لازمی تھی صنعت و حرفت اور زراعت سب میں کمی واقع ہو گئی۔ اب الزام سے بچنے کے لئے حکومتی طبقے نے لوگوں کو پکڑنا، مارنا، جلاوطن کرنا شروع کر دیا اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ اقتصادی زندگی کی بدحالی کا ٹروٹسکی ذمہ دار ہے۔ حکومت کا یہ کہنا کہ ٹروٹسکی دوسرے ملکوں میں بیٹھا ہوا یونین میں بدنظمی پیدا کر رہا ہے۔ اُن کی اپنی ناقابلیت کا اعتراف

کرتا ہے۔ کیا میں اتنا طاقت ور اور بارسوخ انسان ہوں کہ جلاوطنی کی حالت میں ایک غیرملک میں بیٹھا ہوا یونین کی فیکٹریاں اُڑوا رہا ہوں اور وہاں کی حکومت بے بس ہے ۔ کوئی صحیح الدماغ یہ باور نہیں کرسکتا۔ حکومتی طبقے نے اپنی حماقتوں کو چھپانے کے لئے اعداد وشمار کے ماہروں کو غائب کرنا شروع کردیا تھا ۔ چند کو سائبریا جلاوطن کردیا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ صنعتی پارٹی پر مقدمہ چلادیا تھا اور پروگرام کے کمیشن میں جو ماہر ممبر تھے اُن کے خلاف مقدمہ چلادیا تھا تاکہ حکومت اپنی غلطیاں اُن کے سر منڈھ سکے ۔حکومت پہلے انجینیر سے اپنی مرضی کے مطابق پروگرام بنواتی تھی اور جب وہ کامیاب نہیں ہوتے تو انجینیر پر مقدمہ چلادیا جاتا تھا۔ حالانکہ انجینیر کی اس میں کوئی ذمہ داری نہیں ہوسکتی تھی۔ سوکالنف مورخ گروتمین ماہر اقتصادیات ۔ بازارف جو پروگرام کے کمیشن کا ممبر تھا۔ پوپوف جو اعداد وشمار کے محکمے کا افسر تھا ان سب کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں سما گئے ۔اُن کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے غلط اعداد وشمار دینے سے انکار کردیا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومتی طبقے کے دیے ہوئے اعداد وشمار پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ دیدہ ودانستہ غلط اعداد وشمار دینے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں ۔یہ مثل مشہور ہے کہ جھوٹوں کا حافظہ نہیں ہوتا اور کہیں نہ کہیں ان کی گرفت کی جاسکتی ہے ۔ چنانچہ اسٹیلن نے پنج سالہ پروگرام کو جو ایک سال قبل پورا ہوچکا تھا بہت کامیاب بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ آخر سال میں بیس گنی ترقی ہوئی تھی لیکن مولوٹف نے اپنی ایک تقریر میں کہا "ہم پروگرام کے آخری سال میں صرف آٹھ گنی پیداوار کرسکے" اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بیس گنے کے صرف آٹھ گنے رہ گئے تو پانچ سال کا کام چار سال میں کس طرح ختم ہوگیا اور اس کی کیا وجہ کہ صرف آٹھ گنا ہو پایا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکومتی طبقے نے طریق پیداوار کی مشکلات اور مختلف پہلوؤں پر غور نہیں کیا اور کام شروع کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف آٹھ گنی پیداوار ہو کر رہ گئی میں نے اپنے اخبار میں حکومتی طبقے سے یہ سوال کیا تھا کہ اسٹیلن اور مولوٹف کے ان متضاد

بیانات کی کیا وجہ ہے لیکن بے سود۔ کوئی جواب نہ ملا۔ حکومتی طبقے نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جب کبھی عوام کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ اقتصادی اور سیاسی نظام میں کچھ تبدیلی کی جائے حکومت فوراً یہ کہنے لگتی ہے کہ یہ بائیں جماعت کی ریشہ دوانیاں ہیں عوام بالکل مطمئن ہیں۔ حکومت طاقت سے ہر اصلاحی تحریک کو دبا دیتی ہے اس کا یہ نتیجہ یہ ہے کہ جس جماعت یعنی عوام کے بل پر سوشلزم کامیاب ہو سکتا ہے وہی گونگی ہو کر رہ گئی ہے

گولڈمین:۔ (کمیشن کے ممبروں سے مخاطب ہو کر) اب یہ بیان کیا جائے گا کہ مسٹر ٹروٹسکی کا انفرادی کشت و خون اور وحشت پھیلانے کی بابت کیا خیال ہے۔ ان کے خیالات واضح کرنے کے لئے ان کی تحریرات سے اقتباسات پیش کئے جائیں گے جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ مسٹر ٹروٹسکی کبھی بھی کیرف کے قتل کی سازش میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں ٹروٹسکی لکھتے ہیں "انفرادی کشت و خون کے لئے اس قدر توازن دماغی۔ دلیری اور راز داری کی ضرورت ہے کہ اس کو کبھی جماعتی شکل میں اختیار نہیں کیا جا سکتا مارکسٹ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے ان کی پارٹی جماعتی تنظیم چھوڑ کر زار روس کے محل میں سُرنگ لگانا حماقت سمجھتی ہے۔" ٹروٹسکی ۱۹۰۹ء میں دوبارہ لکھتا ہے "انفرادی کشت و خون جہاں حکومت میں بے چینی اور گھبراہٹ پیدا کرتا ہے وہاں وہ انقلابی جماعت میں بھی خوف اور انتشار پیدا کر دیتا ہے۔ سرمایہ دار جماعت بھی پہلے سے زیادہ چوکنی اور مضبوط ہو جاتی ہے اور انقلابی جماعت کو کچل ڈالتی ہے، انفرادی کشت و خون اب روس میں تو ختم ہو گیا لیکن پنجاب اور بنگال میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ یہ اس ملک کی سیاسی خامی کی علامت ہے۔ شاید مشرقی ممالک میں اس کا چرچہ کچھ عرصے رہے لیکن روس میں تو یہ ایک قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ انفرادی غارت گری اگر اثر بھی کرتی ہے تو بہت غیر مستقل سرمایہ دار حکومت کسی خاص وزیر کے بل پر نہیں چلتی اگر کسی نے اس کو مار بھی دیا تو دوسرے

نے اس کی جگہ لے لی۔ اس قسم کے قتل سے سرمایہ دار نظام میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا وہ زندہ رہتا ہے اس کے برخلاف عوام میں ہراس اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا کرتا کہ کسی وزیر کو مار دینے سے کوئی نظام ختم ہو جایا کرتا تو مزدور جماعت کی تنظیم میں سالہا سال صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر چند خطاب یافتہ لوگوں کو بارود سے ڈرا دینے سے سرمایہ داری کی بنیادیں ہل جایا کرتیں تو پارٹی بنانے، جلسے کرنے، تبلیغ کرنے، الیکشن لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کافی ہوتا کہ کسی طرح پارلیمنٹ کی گیلری میں چلے گئے اور تمام وزیروں کے گولی مار دی۔ ہمارے نزدیک انفرادی قتل و غارت مضر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے عوام سے خود اعتمادی جاتی رہتی ہے وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ کوئی دلیر آدمی انھیں مصیبت سے نجات دلائے گا۔" مسٹر ٹروٹسکی کیا آپ کیرف کے قتل کے اسباب و علل پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

ٹروٹسکی:۔ اس قسم کی واردات اس وقت ہوتی ہے جب نوجوان طبقہ بالکل زِچ ہو جاتا ہے۔ ہر نوجوان کی نمو کے لئے کھلی ہوئی سیاسی فضا ضروری ہے۔ آنے والی نسل موجودہ نسل کی ضرور مخالفت کرتی ہے اور اپنی راہیں خود پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جب نوجوانوں پر سب طرف سے تخلیق کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اس وقت اس قسم کے دھماکے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس خاص قتل کی بابت مجھے کوئی علم نہیں۔ بہت ممکن ہے اس قتل کی تہہ میں کوئی عورت ہو اور حکومتی طبقے نے کیرف کو بدنامی سے بچانے کے لئے یہ معاملہ دبا دیا ہو۔ کیرف کے قتل سے پہلے بھی میں یہ کہتا رہا ہوں کہ انفرادی قتل و غارت نقصان دہ ہیں۔

مسٹر ڈیوی (صدر کمیشن) مسٹر ٹروٹسکی یہ بتائیے کہ سوویٹ یونین کے باشندوں سے آپ کی خط کتابت نجی معاملات کی بابت ہے یا سازشی قسم کی ہے؟

ٹروٹسکی:۔ میں سوویٹ یونین کے باشندوں سے جو کچھ بھی خط کتابت کرتا ہوں اس کو اپنے اخبار میں چھاپ دیتا ہوں

میری خط و کتابت اس نوعیت کی نہیں ہوتی جس کو عام نہ کیا جاسکے ۔ میری خط و کتابت میں
یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اپنا انقلابی فرض نہیں بھولنا چاہیئے تاکہ جب ملک میں نئی لہر اُٹھے جس کا
شروع ہونا لازمی ہے ۔ تو ہم اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں ۔

مسٹر ڈیوی :۔ تو آپ سازشی خط و کتابت سے انکار کرتے ہیں ؟

ٹروٹسکی :۔ یہاں سازشی کا لفظ ذرا پیچیدگی پیدا کرتا ہے ۔ معمولی عبارت جو کارڈ پر لکھی جاسکتی ہے
وہ بھی سازشی قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ حکومت نے خط و کتابت کے خلاف سنسر لگا رکھا
ہے ۔ اگر میں کسی طرح سنسر سے بچا کر اپنا اخبار یونین میں پہنچا دوں تو یہ بھی سازشی کارروائی
کہلائے گی ۔ لیکن ایسا میں ضرور کروں گا کیونکہ یہ میرے معتقدات کے خلاف نہیں ہے ۔
یہ میرے اظہار خیال کا ایک طریقہ ہے میں اس کو ذرا اور واضح کر دوں ۔ اکتوبر کے انقلاب
سے قبل میرے لئے یہ ممکن تھا کہ مجھے پارٹی کے فیصلوں سے جب بھی اختلاف ہوتا تھا تو اپنے
خیال کا اظہار علانیہ طریقے پر کر سکتا تھا کیونکہ ہماری پارٹی کی روایات جمہوری تھیں ۔ لیکن اب
جبکہ ہر جمہوری روایت استبدادیت میں تبدیل ہوگئی ہے ۔ حکومتی طبقے کی نظر میں ہر عمل
سازشی ہوگیا ہے ہر وہ اختلاف جو دوسرے ملکوں میں سیاسی صحت کی علامت سمجھا
جاتا ہے اس کو روس میں سازشی گردانا جاتا ہے ۔ حکومت ہر اختلاف کو سازش شمار کرتی
ہے میں جانتا ہوں کہ میں اور میرے دوست سوویٹ یونین ، اٹلی ، جرمنی میں سازشی
طریقے پر اپنے خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ صرف اس لئے کہ وہاں کسی دوسرے طریقے
کی گنجائش ہی نہیں اگر ان ممالک میں جمہوریت ہوتی تو ہمیں خفیہ کارروائی کرنے کی ضرورت
نہ تھی ۔ لیکن ہمارے خیالات سازشی نہیں ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ اسٹالن کو مار ڈالو ۔ فیکٹری
کو اُڑا دو ۔ ہم روسی نوجوانوں سے یہی کہتے ہیں کہ اشتراکی طریق کاشت اور صنعت کو ترقی
دینے میں بہت جلدی کی جا رہی ہے اس عجلت سے جو خطرے پیدا ہوتے ہیں ان کا ضرور
اعلان کرتے رہنا چاہیئے اگر ہمیں کوئی رجعت پسند کہتا ہے تو کہنے دو ڈرو نہیں ۔ قتل و غارت

مت کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں سے بہترین نوجوان ضائع ہو جائیں گے بلکہ یہ کرو کہ چھوٹی چھوٹی ٹکریاں بنالو اور اُن میں تبلیغ کرو۔ پارٹی کی تاریخ پڑھو۔ اور مستقبل کے لئے تیاری کرو۔ اگر کوئی ان کو سازشی باتیں گردانتا ہے تو گردانے۔ جمہوری حکومتوں میں یہ سازشی خیالات شمار نہیں ہوتے۔ اب ہمیں جرمنی سے بھی خط کتابت کرنے میں بہت دقت ہوگئی ہے اگر ۱۹۳۳ء کی جرمنی کا آج کی حالت سے اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سوشلسٹ کا اقتدار کتنا کم ہوگیا ہے۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے پر اسٹیلن نے کہا تھا کہ یہ ایک وقتی تبدیلی ہے۔ کچھ دن کے بعد ہٹلر کو خود زوال ہو جائے گا۔ میں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ اس سے زیادہ بے وقوفی کی بات کہنا مشکل ہے۔ ہٹلر کا عروج جرمن تاریخ میں پرولتاریوں کی سب سے زبردست شکست ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جرمنی میں روز بروز ہمارا اثر کم ہورہا ہے۔ سوویٹ یونین میں بھی ۱۹۳۳ء سے ردّ عمل ہورہا ہے اس کو آج ۱۳ سال ہوگئے۔ زینو ویف اور کیمو ویف پر مقدمہ اور پارٹی سے میرے اخراج نے روسی پرولتاریوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہم لوگ پارٹی کے روح رواں تھے۔ سوویٹ یونین کے باشندوں اور نیز حکومتی طبقے میں دو مختلف قسم کے ردعمل ہورہے ہیں۔ عوام میں اضمحلال کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ وہ حیران ہیں کہ کیا کریں وہ اس طرح خیال کرنے لگے ہیں "جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا" لیکن حکومتی طبقے میں رد عمل مختلف قسم کا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اِس وقت موقع ہے پہنچ جالو۔ اب حکومتی طبقے نے اس کا کافی انتظام کرلیا ہے کہ ہماری خط کتابت بھی نہ ہونے پائے۔

ولڈمین :۔ کیا آپ کے خیال میں سوویٹ یونین میں جلد کوئی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ کیا جلد اسٹیلن کی حکومت ختم ہوسکتی ہے؟

ٹروٹسکی :۔ یا تو مزدوروں کی جمہوریت اس کو ختم کردے گی اور عوام کی طاقت ہی ایسا کرسکتی ہے

یا فسطائی ردِ عمل اس کو ختم کر دے گا۔ انفرادی تشدد سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

گولڈمین:۔ جب آپ مزدوروں کی طاقت کا ذکر کرتے ہیں تو کیا آپ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی مزدور اسٹیلن کے گولی مار دے گا؟

ٹروسکی:۔ ہرگز نہیں ۱۹۳۳ء میں میرا یہ یقین تھا کہ بلا کشت و خون کے حکومت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم سوویٹ یونین میں انقلاب نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اصلاح چاہتے تھے۔ جب ہٹلر کو فتح ہو گئی اور اسٹیلن اور کمنترن کے کان پر جوں تک نہ رینگی تب ہمیں یہ یقین ہوا کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل انقلابی نہیں رہی اور اس میں یہ قابلیت نہیں کہ ہماری سب سے زبردست شکست سے درست نتائج اخذ کر سکے۔ کمنترن کے مفلوج ہو جانے پر ہم نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی اور اس کا نام "چوتھی انٹرنیشنل" رکھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سوویٹ یونین میں ایک نئی انقلابی پارٹی بنائی جائے۔ اس عمل کا جواب اسٹیلن نے مرکزی کمیٹی کے ۱۹۲۷ء کے اجلاس میں یہ دیا "حکومتی طبقے کو سوائے خانہ جنگی کے اور کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی" ریڈک نے اس کا یہ جواب دیا "کہ یہ چنگیزی ہے"۔ ہمارا اب تک یہ خیال تھا کہ پارٹی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے عہدہ دار بدل دے لیکن سٹیلن کے بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ پارٹی کی طاقت سے اسٹیلن اور اس کے حکومتی طبقے کو برطرف کرنا ممکن نہیں ۱۹۳۳ء کے وسط تک ہمارا یہی خیال رہا کہ صلح اور صفائی سے کام ہونا ممکن ہے۔ لیکن جب ہٹلر کی فتح ہونے دی گئی اور ہم نے یہ دیکھا کہ کیونسٹ پارٹی میں خاموشی ہے اس وقت ہم یہ سمجھے کہ اسٹیلن واقعی درست کہتا تھا کہ اس کو اور حکومتی طبقے کو برطرف کرنے کے لئے ایک سیاسی انقلاب کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ میں سیاسی اور سماجی انقلاب کا فرق بتا دوں انقلاب فرانس کی مثال لیجئے وہ سماجی اور سیاسی دونوں قسم کا انقلاب تھا۔ سماجی انقلاب وہ اس معنی میں تھا کہ اس نے جاگیردارانہ طریق پیداوار اور ملکیت کو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور ملکیت میں بدل دیا تھا لیکن فرانس میں سیاسی انقلاب تین ہوئے۔ ای

طرح روس میں اکتوبر کا انقلاب ایک سماجی انقلاب تھا یعنی اس نے سرمایہ دارانہ ملکیت کو تباہ کرکے اشتراکی ملکیت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ یونین میں حکومت استبدادیت پسند ہے لیکن ملکیت کی شکل ہنوز اشتراکی ہے۔ لیکن حکومتی طبقے سے اشتراکی ملکیت کو ہر وقت خطرہ ہے اگر چند سال یہی حالت رہی تو حکومتی طبقہ پھر ملکیت کی نوعیت بدل دے گا فی الحال سوویٹ یونین میں صرف سیاسی انقلاب کی ضرورت ہے تاکہ اس قسم کی تبدیلی کی جائے کہ اشتراکی ملکیت کا فائدہ عوام کو ہو نہ کہ حکومتی طبقے کو۔ حال ہی میں چوتھی انٹرنیشنل کا اجلاس ہوا تھا وہاں یہ تجویز منظور ہوئی تھی :۔

"سوویٹ یونین کی مزدور جماعت محسوس کرتی ہے کہ آزادی سے تبلیغ کرنے کے تمام دروازے اس پر مسدود کردئے گئے ہیں اس لئے مجبوراً سوویٹ یونین کی حکومت کے خلاف انقلابی جنگ کرنی ہوگی۔ یہ جماعت مارکسسٹ ہونے کی بنا پر انفرادی کشت و خون کو برا کہتی ہے اور ہنگامی سعی کو بے کار خیال کرتی ہے حکومتی طبقے کو صرف ایک بیدار جماعت جو منزل مقصود کو سمجھتی ہو ختم کرسکتی ہے"

میں یہ بتادوں ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ فعل اور قول میں اختلاف ہو۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ انفرادی کشت و خون سے منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں تو میں اس کا برابر اعلان کرتا رہتا۔ میں نوجوانوں سے درخواست کرتا کہ سٹیلن کے گولی مار دو۔ میں سٹیلن اور اس کی پولیس سے ڈرتا نہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کہتا کیونکہ میں مارکسسٹ ہوں مجھے یقین ہے کہ انفرادی کشت و خون سے ہمارا ہی نقصان ہے۔ کیونکہ اس طرح بہترین نوجوان ضائع ہو جاتے ہیں۔

فینزلی :۔ جب آپ انقلاب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کیا اس میں تشدد بھی شامل ہے ؟ میرا مطلب اجتماعی تشدد سے ہے۔

ٹراٹسکی :۔ اس کا بہت کچھ انحصار حکومت پر ہے اگر حکومت نے سیاسی دباؤ سے اپنا رویہ

نہ بدلا تو عوام کو تشدد استعمال کرنا پڑے گا۔ میں تشدد کو جائز خیال کرتا ہوں۔

فینرٹی:۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ اگر حکومت تشدد کے بل پر قائم رہنا چاہے گی تو عوام بھی اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کریں گے۔

ٹروٹسکی:۔ بالکل درست۔ میرا یہی خیال ہے۔

فینرٹی:۔ قطع نظر اس کے کہ انفرادی تشدد کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔ کیا آپ تشدد کو اس لئے برا خیال کرتے ہیں کہ اس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؟

ٹروٹسکی:۔ انفرادی تشدد کارگر ہتھیار نہیں ہے اور میرا یہ خیال تجربے کی بنا پر ہے ہماری انقلابی پارٹی میں اس معاملے پر بہت اختلاف رائے تھا۔ پارٹی کے کچھ ممبر کہتے تھے کہ انفرادی تشدد کارگر ہو سکتا ہے کچھ اس کے خلاف تھے۔ میں اس طریق کے خلاف تھا۔

فینرٹی:۔ آپ اس کو کارگر ہتھیار نہیں سمجھتے؟

ٹروٹسکی:۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی اعتبار سے میں اس کو مزدور جماعت کے مفاد کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں۔

فینرٹی:۔ تو قطع نظر اس کے کہ تشدد اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے یا برا۔ کیا انفرادی تشدد کارگر نہیں ہوتا؟

ٹروٹسکی:۔ میں اپنا خیال اور واضح کر دوں۔ اگر عوام پر از حد ظلم ہو رہا ہو۔ جیسا کہ چند ملکوں میں ہو رہا ہے تو ہر وہ عمل جس سے عوام کو حکومتی تشدد سے نجات مل سکے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جائز ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس عمل سے عوام آزاد ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ میں جو تشدد کی مخالفت کرتا ہوں تو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے نہیں کرتا میں اخلاقی لحاظ سے اس کو برا نہیں سمجھتا بلکہ میری مخالفت صرف اس بنا پر ہے کہ انفرادی تشدد ایک ایسا ہتھیار ہے جو اچٹ کر اپنے ہی لگتا ہے

گولڈمین:۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بیل صاحب نے سوال کیا تھا کہ آپ سوویٹ یونین کے عوام کو

کس طرح اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔

ٹروٹسکی:۔ میرا یہ خیال ہے کہ اب سوویٹ یونین کی قسمت کا فیصلہ یورپ کے حالات پر منحصر ہے اگر اسپین میں مزدور جماعت کو فتح ہو گئی اور فرانس میں مزدور زور پکڑ گئے تو سوویٹ یونین میں انقلاب ہوا رکھا ہے۔ یونین میں عوام ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئے ہیں ان کے سامنے دو راستے ہیں یا اسٹیلن کی حکومت کو تسلیم کریں یا ہٹلر کی جب دو میں سے کسی ایک کو پسند کرنا لازمی ہو تو ظاہر ہے کہ اسٹیلن بہتر ہے۔ یورپ میں اگر ہماری موافقت میں فضا بدلی تو یونین میں عوام ضرور سر اٹھائیں گے۔ مجھے اس وقت کا انتظار ہے۔ اس وقت مجھ سے جو کچھ بھی خدمت ہو سکے گی میں کروں گا۔ انقلابی لیڈر کو صبر کی بہت ضرورت ہے۔ وہ دنیا کی نبض پر انگلی رکھے بیٹھا رہتا ہے۔ مجھ پر یہ الزام لگانا کہ میں اسٹیلن کو مارنا چاہتا ہوں اور خود ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہوں غلط ہے میں کبھی طاقت کا بھوکا نہیں ہوا۔ جس زمانے میں میرے ہاتھ میں طاقت تھی اس وقت بھی میں اپنے اس زمانے کو بہترین سمجھتا تھا جب میں تصنیف میں مشغول رہا کرتا تھا۔ آج کل مجھے گویا تعطیل ملی ہوئی ہے۔ میں تصنیف میں وقت گذارتا ہوں اور خوش ہوں ہاں اگر میرے خیال کے مطابق سوویٹ یونین میں انقلاب ہوا تو میں ذمہ داری لینے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

فلینرڈ:۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا ہٹلر کی مدد سے اسٹیلن کو شکست دینے سے آپ کا کوئی فائدہ ممکن نہیں ؟

ٹروٹسکی:۔ ہاں! مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں جاپان اور جرمنی سے ساز باز کر کے اسٹیلن سے طاقت چھیننا چاہتا ہوں۔ یہ میرے مخالفوں کا کتنا جاہلانہ خیال ہے۔ کیا روسی حکومت مجھ کو یہ بتا سکتی ہے کہ مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس سازش کی بدولت میں اپنے دوست اپنا مستقبل سب کھو دوں گا اور اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر میں ہٹلر سے ساز باز کر کے اسٹیلن کو شکست دے بھی دوں تو کیا ایک لمحے کے لئے بھی یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ہٹلر اپنی

فتح کے بعد مجھے ایک منٹ کے لئے بھی زندہ چھوڑے گا۔ کیا وہ یہ کہے گا کہ ٹروٹسکی ہم نے تمھارے لئے سوویٹ یونین فتح کر دیا۔ جاؤ حکومت کرو۔ اور کیا وہ میری حکومت ہوگی وہ تو ہٹلر کی حکومت ہوگی۔ میں سیاسی میدان میں بڑھا ہوگیا اور انقلاب میری گھٹی میں ہے۔ کیا میں یہ نہیں سمجھتا کہ جرمنی اور جاپان کے ساتھ سازباز کرنے سے میری اپنی ہی تباہی ہے۔

بنرٹی :۔ مسٹر ٹروٹسکی کیا پہلے جاپان میں انقلاب ہوگا اور پھر اس کے بعد جرمنی میں؟

ٹروٹسکی :۔ بالکل درست۔ میرے خیال میں پہلے جاپان میں انقلاب ہوگا۔ کیوں کہ جاپان کی حالت اس وقت وہی ہے جو روس کی زار کے زمانے میں تھی۔ جاپان میں استبدادی حکومت ہے جس نے عوام کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے میں وہاں کا سماجی اور اقتصادی تضاد رنگ لائے گا اور موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کے ایک ساتھ ہی ٹکڑے اُڑ جائیں گے اس کے بعد میرے خیال میں جرمنی میں انقلاب ہوگا۔ جرمنی اِس وقت چند ہاتھوں میں ہے اور وہاں زندگی کا ہر پہلو اس قدر پوشیدہ ہے کہ اگر لڑائی چھڑ گئی تو وہاں انقلاب ہونا لازمی ہے جیسا جنگِ عظیم میں ہوا تھا۔ لیکن وہ سوشلسٹ انقلاب نہیں ہوگا جیسا کہ روسی حکومتی طبقے کا خیال ہے سماجی اور اقتصادی تضاد جرمنی میں پورا عمل کر رہا ہے۔ جب حکومتی طبقہ مجھ پر الزام لگاتا ہے کہ میں جرمنی اور جاپان کی موجودہ حکومتوں سے مل کر سوویٹ یونین کے خلاف سازش کرتا ہوں تو مجھے بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ حکومتیں ہیں جن کو میں چند دن کا مہمان سمجھتا ہوں کیا میں ان حکومتوں سے دوستی کروں گا جو خود فنا ہونے والی ہیں؟

عبدالغفور صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم کی قوموں میں ایک سرکاری ممتحن ہوتا تھا جو بڑے سخت اور کڑے امتحان کے ذریعے لوگوں کے کردار کی جانچ کیا کرتا تھا۔ بعضوں کے خیال میں حضرت ایوب کے قصے میں اور دوسرے پیغمبران کرام کی آزمائشوں میں شیطان اس اہم فریضے کو انجام دیتا تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ ممتحن نے شیطان کی جگہ لے لی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ جتنی عالمگیر شہرت شیطان نے اپنے مخصوص حلقے میں پائی ہے ممتحن بھی اس سے کچھ کم نہیں رہا۔

سنا ہے کہ پہلا ممتحن ایک چینی تھا اور پہلا امتحان سول سروس کا مقابلہ۔ شاید اسی لئے ہمارے سماج نے بھی سب امتحانوں میں سے سول سروس کے امتحان کو پہلی جگہ دی ہے۔ شروع تعلیم سے ہی بچے کو سول سروس کی آسمانی بہشت دکھائی جاتی ہے۔ جس میں داخل ہو کر وہ مادی دنیا کی نفرت انگیز اور ذلیل کش مکش سے محفوظ ہو جائے گا اور ایک بلند کنارے سے انسانی زندگی کی گندی ندی کا دور سے نظارہ کر سکے گا۔ جس میں ہزاروں فلاکت زدہ انسان ڈوبتے تیرتے ہاتھ پاؤں مارتے ڈبکیاں کھاتے چلے جاتے ہیں۔ کامیابی پر وہ اپنے قلب میں ایک خوش گوار گرماہٹ اپنے جسم میں ایک پھیلاؤ محسوس کرتا ہے۔ کیوں نہیں! وہ اس اعزاز کا پورا حق دار ہے۔ کیا وہ زندگی کی کش مکش میں مردانہ وار نہیں لڑا؟ اس نے تعلیمی زینے کے آخری چکر پر۔ منصبی مینار کے چوٹی کے پتھر پر پاؤں جمانے کی کس قدر جان توڑ کوشش کی کمبخت کس قدر پھسلن! کتنی بلندی اور کتنا اژدہام تھا! کیا دھکم دھکا! کس قدر کشتم کشتا۔ مگر آخرکار لڑتے بھڑتے۔ مارتے مرتے، گرتے گراتے اس نے اوپر کے پتھر پر قدم جما ہی لئے۔

اب کوئی اُدھر کا رُخ بھی تو کرے دیکھو کیسی پٹخنی دیتا ہوں۔ اور کروں بھی تو کیا؟ اس مینار کی چوٹی پر جگہ بھی تو ایک ہی کے لئے ہے، یہ ہے زندگی کا مقابلہ جس کے لئے ہمارے امتحان ہمارے بچوں کو تیار کر رہے ہیں۔ ایک ذلیل مقابلہ جس کا تخیل حیواتی دنیا کی کش مکش حیات سے لیا گیا ہے۔ ہاں اس بہیمانہ کش مکش کی بے پناہ طاقتوں کو خود سماج کا شکار کرتے ہوئے دیکھ کر ہم کو ایک اطمینان ضرور ہوا ہماری تعلیم اب سائنس کی بہترین روایات پر گامزن ہے!! حیرانی کی بات ہے کہ وہ اخلاقی اقتصادی اور روحانی تعاون جو ہندوستان کے دیہی اور شہری برادریوں میں پایا جاتا ہے اس کا ہلکا سا عکس بھی ہم نہ تو نظام تعلیم کے تخیل میں پاتے ہیں اور نہ اس کی اس معراج کمال ہی میں جسے امتحان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

"ہم جس نقطۂ نگاہ سے تعلیم دیتے ہیں اس کا مقصد محض طلبار کو انعام کی گھوڑ دوڑ کے لئے تیار کرانا ہوتا ہے۔ امتحان کیا ہے اچھی خاصی انعامات کی ڈربی ہے۔ ہم ایک پبلک مظاہرے کے ذریعے سے طلبار کو محنت اور کوشش کی ترغیب دلاتے ہیں اور امتحانی فہرست میں ان طلبار کا نام مشتہر کرتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی ترکیب سے اپنی آن رکھ لی ہے؟ ان میں سے بعض شہ زور گھوڑے تو انعام لاتے ہیں ان پر روپیہ لگانے والے ہزاروں لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتے ہیں۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کو "طوق زریں" کی بجائے تانگوں، اکوں بلکہ حیدرآبادی "جھٹکوں" یا "کھٹکھٹوں" میں جوت دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس تعلیمی گھوڑ دوڑ کا نتیجہ۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ جو پیچھے رہے وہ ہی جہنم میں جائے، عاقبت کی خبر تو اللہ میاں ہی جانتے ہیں۔ ہاں ہندوستان میں پیچھے رہنے والے تو جیتے جاگتے ہی جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔

امتحان کیا ہے؟ ایک نظام تعلیم میں اس کی کیا جگہ ہے؟ اس سوال کا جواب تو ماہرانِ علیم ہی دے سکتے ہیں۔ ہمیں تو اس پر ایک بچپن کی پڑھی ہوئی کہانی یاد آجاتی ہے کہ ایک جادوگر نے ایک پتلا بنایا تھا اور جب اس میں جان پڑی تو وہ ایک ہیبت ناک دیو بن گیا اور بجائے غلام کے اس نے ایک آقا کی حیثیت اختیار کر لی۔ امتحان شروع میں اچھے خاصے بھلے قسم کے خادم

ہوں گے مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے ایسا زور باندھا کہ آقا کی جگہ پر متمکن ہوگئے، ایک ایسی عالم گیر مشین کی طرح جس کا کوئی لیور غلطی سے دب گیا ہو جو چلنے لگی تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ اگر اسی طرح چلتی رہی تو ایک دن سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح پورے نظام تعلیم کی شان دار عمارت کو اینٹ اور چونے کا ڈھیر بنا کے رکھ دے گی امتحان کا مقصد کیا ہے بقول ایک ممتحن "یہ ایک گستاخانہ کوشش ہے انسانی لاعلمی کی گہرائیوں کو ناپنے کی" علمیت کی نہیں بلکہ لاعلمی کی۔ ممتحن اپنے امتحانی ساحل کو بچّے کے ذہنی سمندر کی گہرائیوں میں ڈالتا ہے تاکہ اس کی تھاہ مل جائے۔ بعض طلبا تو اس کی رفتار کو تہ تک پہنچنے سے میلوں پیشتر روکنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات ساحل تہ پر پہنچ بھی چکتے ہیں لیکن جہل کی ثقالت کی وجہ سے پتہ بھی نہیں چلتا کہ تہ تک پہنچ چکے ہیں یا نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس بحرِ ناپیدا کنار کے تجسس میں دھوکے باز قسمت ہمیشہ ممتحن کی ہی معاون نہیں رہتی اکثر طالب علم کا ساتھ بھی دیتی ہے۔ اس تفتیش میں جتنا قسمت اور اتفاق کا جزو شامل ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس کے خوفناک جال سے بمشکل ایک جان توڑ کوشش کے بعد نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

ہمارے امتحان کیا جانچتے ہیں۔ کیا جانچنا چاہتے ہیں کیا وہ ان اقدار کے جانچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جنھیں وہ جانچنا چاہتے ہیں کیا ایک ممتحن مختلف کاپیاں جانچتا ہوا یکساں معیار قائم رکھ سکتا ہے؟ کیا ایک ہی کاپی کو مختلف اوقات پر جانچ کر وہ ایک ہی نمبر دے سکتا ہے؟ یہ ہیں چند سوالات جو بیرونی امتحانوں کے سلسلے میں اکثر پیدا ہوجاتے ہیں لیکن سماج تو ان سوالات کو بالکل درگذر کر جاتا ہے۔ اسے تو افراد کے اوپر سیدھے سادھے لیبل لگے ہوئے ملنا چاہئیں۔ اس کے لئے تو تعلیمی نتائج اتنے ہی علیٰی اتنے ہی متعین ہونا چاہئیں جیسے ریلوے کے محکمے میں اول درجہ، دوسرا درجہ اور تیسرا درجہ محض اتنا ہے کہ ممتحن لوگ ذرا دوسرے درجے میں زیادہ لوگ بھر دیتے ہیں تاکہ ان پر ریلوے والوں جیسا اعتراض نہ ہو کہ درجہ سوم میں بہت زیادہ دھکا پیل ہوجاتی ہے۔

ریلوے میں تین یا زیادہ سے زیادہ چار ڈبے ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی یونیورسٹیوں کی جدت اس بارے میں ضرور داد طلب ہے۔ ان میں سے ایک نے تو اس 'تعلیمی ریل' میں اتنے درجوں کا انتظام کر دیا ہے جتنے امتحان کے انتہائی نمبر۔ اور ریل سے تو اسے تشبیہہ دینا ہی غلط ہے یہ ایک تعلیمی زینہ ہے جس میں سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں۔ منزل نہیں ہے۔ ہر کامیاب طالب علم دوسرے طالب علم کے سر پر قدم جمائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر دوسرا ہے اور علی الترتیب ایک کی دم دوسرے کے سر سے بندھی ہوئی چلی جاتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اتنا تفصیلی انتظام کیسے کیا!

اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ یونیورسٹی ہر طالب علم کے ڈویژن کا ہی اعلان نہیں کرتی بلکہ اس کے حاصل کردہ نمبروں کو بھی سماج کی اطلاع کے لئے مشتہر کر دیتی ہے۔ ہر وہ طالب علم جس نے ۸۰۰ میں سے ۳۶۰ نمبر حاصل کئے ایسے طالب علم سے ایک حسابی برتری محسوس کرتا ہے جس نے ۳۵۹ نمبر لئے اور یونیورسٹی طلبار کے نمبروں کا اعلان کر کے پہلے طالب علم کو ہر اُن اقدار کے لحاظ سے جو امتحان جانچ سکتا ہے دوسرے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فوقیت دے دیتی ہے اور ۳۶۰ والے کو ہر وقت یہ دل خوش کن احساس رہتا ہے کہ اس کے جوتوں کی ایڑیاں ۳۵۹ والے کے سر پر جمی ہوئی ہیں۔ مگر غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا ایک ممتحن ۸۰۰ نمبر والے امتحان میں اتنے معیار قائم رکھ سکتا ہے؟ اگر وہ ان طلبار کے ایک نمایندہ حصے کا اُستاد ہوتا تو کیا وہ اس جماعت میں اتنے ہی درجے قائم کر سکتا جتنے طلبا ہیں۔ تجربی اور نفسیاتی لحاظ سے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا امتحان کا تخیل میکانیکی ہے۔ ہم نے طلبار اور اُن کے قویٰ کو اچھی خاصی مشینیں سمجھ لیا ہے جن کی اہمیت اور قابلیت کسر اعشاریہ سے کئی ہندسے نیچے تک صحیح جانچی جا سکتی ہے۔ دوسرے ہم طلبار کی قابلیت کو 'کُل' کے لحاظ سے نہیں بلکہ 'جزو' کے لحاظ سے پرکھتے ہیں اور پھر اجزار کی قیمت لگا کر سمجھ لیتے ہیں کہ کُل کا پتہ چل گیا۔ اجزار کے لحاظ سے آپ شاید ۸۰۰ نمبر والے امتحان میں اتنے ہی درجے قائم کر سکیں۔ مگر کُل کے لحاظ سے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

اور جب کہ یہ امتحان قابلیت کو جانچنے کے ہوتے ہیں مقابلے کے نہیں ایسی صورت میں تو نمبر دے

کا اعلان کرنا بے انصافی ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔

مارچ اور اپریل کا مہینہ تخیل کے سامنے موسم بہار کے دل فریب نظارے پیش کرتا ہے بسنت کی سہانی رُت ، ہولی کی رنگین پھوار ۔ مگر مدارس میں انھیں مہینوں میں نئے رنگ کی ہولی کھیلی جاتی ہے ۔ یہ ہے طلبا کے خون کی ہولی ان دنوں آپ اکثر اخباروں میں پڑھیں گے آج فلاں جگہ ایک دسویں جماعت کے طالب علم نے ریل کے نیچے سر رکھ دیا ۔ کل دوسرے نے زہر کھا کر اقدام خودکشی کی ۔ یہ تو وہ المیہ ڈرامے ہیں جن کا رنگ اکثر اخبار کی سرخیوں میں جھلک جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں نہیں لاکھوں خودکشیاں ہوتی ہیں طفلانہ مسرتوں کی اُمنگ اور شوق کی۔ ولولہ اور جذبات کی، جو عوام کی نگاہوں کے سامنے نہیں آتیں۔ امتحان ایک شیر نہیں جو کھلے بندوں موت کا چیلنج دیتا ہو۔ یہ تپ دق کے جراثیم ہیں۔ جو نظام تعلیم کو اندر ہی اندر گھن لگائے چلے جا رہے ہیں اس کے بھیانک سائے سے جو دن بدن لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چھوٹی جماعتوں کے بچے بھی محفوظ نہیں۔ ایک حساس اُستاد نے زمانہ ہوا ایک امتحان دینے والے بچے کے تاثرات کو اپنے روزنامچے میں محفوظ کر لیا تھا اس میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آج ربلو کا سالانہ امتحان تھا۔ اب تک تو سال بہ سال برابر کامیاب ہوتے چلے آ رہے تھے کامیابی نہیں بس یہ سمجھئے کہ لڑھکتے ہوئے چلے آئے تھے۔ مگر پانچویں میں آ کر رُک گئے اور ایک دفعہ رُک کے بس رک ہی گئے۔ امتحان کیا تھا اچھی خاصی ہنڈن برگ کی لائن تھی سال بھر تو برابر مارک ٹائم کرنے اور مارچ کے مہینے میں ایک جان توڑ یورش اور اس کے بعد باعزت نہیں بے عزت ...انی۔ ایسے دو حملے ہو چکے تھے۔ اب کی تیسرا تھا۔

اور اس مرتبہ تو ربلو کی تیاری ہمہ گیر تھی ایک کار آزمودہ جرنیل کی طرح اور سچ پوچھئے ...ل تجربہ شکستوں سے ہوتا ہے فتوحات سے نہیں، انھوں نے اس مرتبہ محاذ کے سبھی رُخ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ دینی اور دنیوی ،صوری اور معنوی ۔ روحانی اور جسمانی یہ تیاری ...ل سے ہو رہی تھی۔

اور کم بخت امتحان اس کا سایہ بھی تو دن اور مہینوں کے گذرنے کے ساتھ لمبا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ ریلو کی شاہ راہِ زندگی اور شاہ راہ گیا یہ تو اچھی خاصی دلدلی پگڈنڈی تھی۔ اس پر قسمت کے ستمگر ہاتھ نے امتحان کچھ ایسے ہی قرینے سے جڑ دیئے تھے جیسے سڑک پر کے کھمبے سال سال کے فاصلے پر، فرق اتنا ہی تھا کہ بجلی کے قمقموں سے روشنی پھوٹتی ہے اور "امتحانی قمقموں" میں سے تاریکی۔ ہر ایک امتحان ایک نقطہ تھا جس سے ظلمت کے دھارے بہہ کر نکلتے تھے جن میں کہیں کہیں معصوم خوشیوں کا خون جھلکتا تھا اور بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ جہاں گذشتہ "قمقمے" کا اندھیرا ختم ہوا وہاں آیندہ کا بھیانک سایہ شروع ہو جاتا تھا۔

ریلو کو یاد رہے کہ پچھلے سال جب انھیں تپِ محرقہ چڑھا تو اس کا مزا ہفتوں منہ سے نہ گیا امتحان کی تلخ کامی تو مہینوں چلتی۔ اور بھولیں بھی کیسے جب فیل ہونے کے دوسرے دن اسکول گئے تو ٹانگوں میں کچھ عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک خفیف سی گھبراہٹ اور بے کلی کی لہر ہچکولے کھاتی ہوئی ٹانگوں سے اوپر چڑھتی گئی اور دل کے قریب آکر رک گئی۔ اور نگاہ! پھر ریلو کی نگاہ ایسی جھکی کہ اٹھائے نہیں اٹھتی ایک زمانہ وہ بھی تھا جب جھکائے نہیں جھکتی تھی اب انھیں اپنے ماتھے اور رخساروں پر کچھ تکلیف دہ جلن سی محسوس ہوا کرتی تھی لوگوں کی نگاہیں نہ تھی ہولی کے انار تھے جن کی چنگاریاں ان کے بدن پر پڑ کر کبھی کبھی سوئیوں کی نوک کی طرح چبھ جایا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ہمت کر کے جو آنکھ اٹھا کے دیکھا تو ان کا پرانا ہمجولی حمدو کھڑا ہوا منہ چڑا رہا ہے۔ منہ کیا بلکہ مجسم 'چڑاہٹ' بنا ہوا ہے گویا کہہ رہا ہے دیکھا بچہ ہم نہ کہتے تھے کہ تم فیل ضرور ہوگے اس پر تو ان کے ضبط کے بند ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے من کے مندر میں دراڑ نہیں آئی بلکہ ایک بجلی گر گئی جس نے مٹی اور چونے کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ چھوڑا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے شیشے کے جھاڑ فانوس میں کھینچ کر پتھر مار دیا ہو۔

دوسرے بچے تو اس واقعے کو بھول گئے مگر ریلو اس معاملے میں کچھ عجب حساس واقع

ہوئے تھے اور کیوں نہ ہوتے، تھی بھی تو اُن کی خودی کی شکست ۔ وہ خودی جسے گلی ڈنڈا کے
بیسیوں میچ بغیر ایک شکست کے جیت کر پروان چڑھایا گیا تھا وہ اکثر اسے بھلانے کی کوشش
کرتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے اور ان دنوں خواب بھی کیسے دکھائی دیتے! ارے رام۔ ایک
جھرجھری لے کر) ایک دفعہ تو سپنے میں دیکھا کہ دو بڑے دیو ریلو کو پکڑ کر ایک لوہے کے پھاٹک کے
اندر لے گئے۔ اندر ایک شخص لوہا گرم کر رہا تھا بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھیں لال کبوتر کی طرح
ریلو کو دیکھ کر اس کی مونچھیں ذرا اوپر کو اٹھیں اور اس میں سے قہقہ کی عجب بھیانک سی آواز نکلی یہ
دیکھتے ہی ایک برف جیسی تیز سنسناہٹ ریلو کی ریڑھ کی ہڈی میں سے زن سے نکل گئی ارے
یہ تو ممتحن ہے۔ ریلو نے ایک مرتبہ تو دونوں ایڑیاں فرش میں جمادیں اور ایک طفلانہ جوش میں
اپنے جسم کو پیچھے کی طرف سے اس انداز سے جھٹکا گویا ان کے عزم صمیم کی تاب دنیا کی کوئی طاقت
نہ لاسکے گی مگر ان دونوں نے ریلو کو زبردستی پکڑ کر آگے کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ممتحن کے ہاتھ
میں ایک سرخ دہکتا ہوا نعل کی شکل کا لوہا ہے جس کی شکل لفظ فیل کی طرح ہے یہ ہٹنے لگے تھے
کہ اس نے یہ دہکتا ہوا انگارہ اُن کے ماتھے پر رکھ دیا اس پر ریلو نے بھاگنے کی کوشش کی
ٹانگیں جواب دے گئیں۔ آواز دیتے ہیں تو گھگی بندھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ریلو نے دل
میں کہا عجب ماجرا ہے جان کی جان جا رہی ہے اور کوئی سنتا نہیں۔ اب مرے۔ اب جان گئی۔
اتنے میں ایک چیخ ماری اور آنکھ کھل گئی دیکھا تو اُن کا چھوٹا بھائی رامو اُن کے ماتھے پر زور
سے چٹکی لے رہا تھا۔

اس خواب کا اثر ان پر بہت دنوں رہا اکثر ان کا ہاتھ غیر شعوری انداز میں ماتھے پر پہنچ
جاتا تھا کہ کہیں رات کا خواب کوئی مستقل نشان تو نہیں چھوڑ گیا اکثر تنہائی میں اور ہجوم میں بھی
انھیں محسوس ہوتا تھا کہ فضا ایک حقارت بھرے قہقہے اور فیل کی صدا سے معمور ہے۔ فیل ہوکر
ریلو کچھ سنجیدہ مزاج سے ہوگئے تھے اب زندگی کو زیادہ اہم سمجھنے لگے تھے اگر پرانے
دوست جو اوپر کے درجوں میں پہنچ گئے تھے کبھی گلی ڈنڈے کی دعوت دیتے تو یہ کترا شرما کر علیحدہ

ہوجاتے تھے پرانی دوستیاں کچھ ختم سی ہوتی جارہی تھیں اور نئی کے لئے ریلو ابھی کچھ ایسے تیار نہ تھے۔ روح کی خوفناک تنہائی! کیا کبھی انسان تنہا بھی ہو سکتا ہے؟ جسمانی نہیں معنوی لحاظ سے ریلو کو اس کا تجربہ نہ تھا مگر ناکامیابی کے بعد ہوگیا وہ اپنے آپ کو گھر میں اور گھر کے باہر گلی میں اور گلی کے باہر کچھ عجیب اجنبی سا۔ کچھ کھویا کھویا سا محسوس کرتے تھے دوست بھی ان کی اسی عادت کی وجہ سے اب ان سے بچ کر نکل جاتے تھے کہتے تھے کہ ازمنہ وسطیٰ میں ہر کوڑھی کے پاس ایک خاص قسم کی گھنٹی ہوتی تھی جونہی وہ آبادی کے قریب پہنچتا تھا تو اسے بجاتا تھا اس کی آواز سن کر لوگ راستہ چھوڑ کر الگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو آنچل میں چھپا لیتی تھیں۔ شراب خانوں میں طوفان مچانے والے نوجوان دم بھر کے لئے ٹھٹک جاتے تھے تاکہ اس کا منحوس سایہ کسی پر پڑ نہ جائے۔ ریلو کے پاس کوئی گھنٹی تو نہیں تھی ہاں اُن کے چہرے پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا "اندر آنے کی اجازت نہیں" کا تختہ چڑھا ہوا ہے۔

ریلو کی حالت تو کچھ ایسی ہوتی جاتی تھی جیسے کسی ستر بہتر برس کے بوڑھے کی ہوتی ہو جس کے سامنے سے ساتھ کے دوست اُٹھتے جاتے ہوں اور دن بدن اس کے اور نئی پود کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جاتی ہو مگر بوڑھا تو مرے ہوئے دوستوں پر صبر کر لیتا ہے ریلو جیتے جاگتے کودتے پھاندتے دوستوں کی 'موت' پر کیسے صبر کر لیتے۔ آج کل وہ جماعت میں سب سے پیچھے بیٹھتے تھے ایک کونے میں 'ٹھٹکے' دیے ہوئے۔ آگے بیٹھتے تو ماسٹر صاحب کی نگاہ پڑتی ورنہ ایسے ماسٹر صاحب کی نگاہ سب بچوں پر نہیں پڑ سکتی تھی ان کا عقیدہ تھا کہ کام وہ جو نگاہ کے نیچے رہے اور بچہ وہ جو ڈنڈے کے سایے تلے پھلے۔ ریلو سے خفا رہتے تھے کم بخت دیکھو بانس کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ریلو کا پڑھائی میں جی بھی نہیں لگتا تھا چبائے ہوئے کو چبانا اور اُگلے ہوئے کو نگلنا ریلو کے بس کا روگ نہ تھا ریلو میں جدت تھی اور انتہائی جدت اگر بازار ایک راستے سے گئے تو واپسی دوسرے سے ہوتی تھی اگر راستہ بھر ایک ٹانگ پر کودتے گئے تو لوٹتے میں دوسری پر۔ ایک مرتبہ تو وہ پہرلول

کے اسٹیشن تک پیدل بھیا کے ساتھ گئے تو تمام راستے ریل کی لائن پر دونوں پنجوں سے ایسی احتیاط سے چلتے رہے تھے گویا کسی سے شرط بندھ گئی ہو۔

اور اسکول! اسکول میں تو وہی دو برس کی پڑھی ہوئی کتابیں دہرائی جاتی تھیں اور تاریخ کے گھنٹے میں تو ماسٹر صاحب اپنی ۱۵ سال کی پرانی کاپی میں سے لکھوایا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ یہ کاپی ماسٹر صاحب اسکول میں ملازم ہوتے وقت باہر سے اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے اس کا کاغذ بھی سالوں کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتا گیا تھا اور اب ملگجا سا ہو گیا تھا اس کے استعمال کے لئے بھی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ ٹیفو (ایک لڑکے کا نام) نے اس کا ایک ورق جلدی سے جو الٹا تو پورا کاغذ ایک گزک کے ٹکڑے کی طرح چھوٹی چھوٹی پٹریوں میں بکھر گیا تھا۔ اور ماسٹر صاحب نے پھر ٹیفو کو وہ مار ماری ہے کہ یاد ہی کرے گا اسی کاپی میں سے ماسٹر صاحب تاریخی کہانیاں لکھایا کرتے تھے کہانیاں سننے کا تو ریلو کو بہت شوق تھا۔ مگر سُنی ہوئی کہانی کو سننے سے انھیں چڑ تھی اگر ان کی نانی اماں نے شام کے دھندلکے میں کبھی غلطی سے پہلے سنی ہوئی کہانی شروع بھی کر دی تو ریلو آنکھیں بند کر کے جھوٹ موٹ سونا شروع کر دیتے تھے مگر جماعت میں کیا کریں یہاں تو آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں اور اگر ستانا بھی چاہو تو کان کھینچ کر سنوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اکثر پچھلی بنچوں کا گشت کرتے ہوئے ماسٹر صاحب ریلو کی طرف اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ اُن کی انگلی اس وقت غصے کے مارے ایک ہلکے سے دائرے میں گھوما کرتی تھی۔ "بے حیا دیکھو تو! (انگلی کو آگے کی طرف زور سے بڑھاتے ہوئے گویا کوئی بھالا ہے) بے حیا بانس کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بھینسا بنا ہوا ہے بھینسا۔ منہ پر ڈاڑھی آنے والی ہے اور ابھی اماں کے لال پانچویں جماعت ہی میں ہیں"

اس پر ریلو اپنے آپ کو سکوڑ کر ڈسک کے اندر گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی اُن کا گھٹنا ڈسک کے آگے کی لکڑی سے ٹکراتا تھا۔ ایک شدید درد ہلکی سی

کراہ، اور پھر خاموشی۔ مصیبت یہ تھی کہ اُن کے بدن میں ایک غضب کی لچک تھی کہ کم بخت ہر سال کیا ہر مہینے بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اور ان کے ڈسک سے ان کو یہ ضد تھی کہ پچھلے تین سال میں ایک انچ بھی نہیں پھیلا مگر ڈسک کا بھی کیا قصور تھا؟ ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ اگر لڑکوں کو آرام دہ ڈسک دیئے جائیں تو کم بخت ان پر سو جاتے ہیں اور سبق نہیں سنتے اور ڈسک تو سبق سنوانے کے لئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اونگھوانے کے لیے۔

ہاں تو یہ ڈسک بیٹھنے کے کام تو آتے تھے مگر ریلو ان سے زیادہ مفید کام لیتے تھے اکثر بیٹھے ہوئے فیل اور پاس کا رمل ڈالا کرتے تھے ایک پرانے لنگوٹیئے یار سے جو اپنے تجربے کی بنا پر ماہر بن گیا تھا چاک کا ٹکڑا مل جاتا تھا جلدی جلدی ڈسک کے اوپر لکیریں ڈالتے تھے اور پھر دو دو کر کے کاٹتے جاتے جوں جوں آخری لکیروں پر پہنچتے تو ان کا ننھا سا دل دھڑکنے لگ جاتا تھا۔ دھک، دھک، دھک۔ اگر ایک باقی رہ جاتی تو رہ رہ کر چہرے پر مسکراہٹ پھوٹی پڑتی اور کہیں سب کٹ گئیں تو ایک جھجکتی ہوئی نگاہ اپنے ہم ڈسک رفیق پر ڈال کر ڈسک پر تھوک کا ترشح اور اس کے بعد اس زور سے لکیروں کو مٹاتے تھے گویا ڈسک کی لکڑی کا چورا چورا کر ڈالیں گے۔

مگر اس مرتبہ تو ان کی تیاری فال اور رمل سے کچھ بے نیاز معلوم ہوتی تھی اب کے تو پوری روحانی اور انسانی طاقتوں سے استمداد کی گئی تھی، امتحان سے کچھ دن پہلے اُن کی نانی اماں انھیں گوروجی کے استھان پر لے گئی تھیں گوروجی اس وقت بھنگ کی ترنگ میں بہک رہے تھے اصل گیان دھیان کی سمادھی لگی ہوئی تھی۔ بھنگ کی تیز تیز مہک ریلو کو پسند تھی۔ سنا تھا کہ دیوتاؤں کو اس کی بو بہت پسند ہے گوروجی نے بھوج پتر پر لکھا ہوا ایک منتر دیا اس میں بھی ویسی ہی لپٹیں آرہی تھیں اور اشیرباد دیتے ہوئے کہا جا بچہ گھر سے نکلتے ہوئے اسے چٹیا میں باندھ لینا اور امتحان کے کمرے میں داخل ہوتے وقت تین بار اوم شانتی پڑھ لینا۔

ریلو کے دل میں خوشی کچھ بے طرح کلبلیں کر رہی تھی۔ اتنی کامیابی پہلے کبھی نہیں ہوئی جب گورو جی نے منتر دیا ہے تو ان کے چہرے پر کس قدر تیقن کس قدر تقدس، کتنی روحانیت تھی۔ ریلو نے منتر کو حفاظت سے مٹھی میں دبا لیا تھا۔ بار بار انگلیاں دباتے تھے۔ مٹھی بھینچ بھینچ کر، ایسا نہ ہو کہیں نکل بھاگے آخر روحانی چیز تو ہے ہی کیا اعتبار ہے اور پھر ان جیسے بدقسمت کو اتنا بڑا عطیہ۔ واہ پربھو تیرے دین کے ڈھنگ نیارے ہیں۔

آج امتحان کی صبح تھی۔ اٹھتے ہی ریلو کے دل میں جذبات کا کچھ ابال سا آرہا تھا پہلے تو اس نے اٹھتے ہی سب کو پرنام کیا پھر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے مندر میں پہنچے اور ایک دیوی جو انھیں خاص طور پر پسند تھی اس کے ننھے سے پاؤں کے پاس ایک پھول رکھا۔ واپس آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ اوپر کا نیچے ہو رہا ہے۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور ریلو اپنے انجانے ہوئے تاریک مستقبل کے سامنے ششدر کھڑے تھے بار بار دل سے سوال کرتے تھے آج مجھے کتنے نمبر ملیں گے؟ ناشتہ خاص طور پر دہی سے کیا گیا تھا۔ یہ متبرک غذا ویدک زمانے کے مقدس دنوں کی یادگار ہے۔ کیا ان دنوں میں بھی امتحان ہوتے تھے رخصت ہوتے وقت اماں نے چار پیسے دیئے تھے راستے میں دو پیسے ایک فقیر کو دے دے سنتے ہیں غریبوں کی دعا میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ ممکن ہے انھیں کے طفیل سے خدا اس کی کم لیاقتی سے چشم پوشی کرلے۔ اس خیرات کے صدقے شاید حساب کے وہ لمبے لمبے سوال پرچے میں نہ آئیں جن میں بڑی بڑی رقمیں ہوتی ہیں۔

ریلو اسکول سے بہت دیر میں لوٹا۔ کوئی چار پانچ کے درمیان گھر میں داخل ہوا تو چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا کم زور چہرہ پہلے سے زیادہ اترا ہوا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

ریلو امتحان میں کیسے رہے؟ کتنے نمبر ملے؟ اماں نے پلنگ کے پاس آکر پوچھا۔ ریلو پہلے تو کچھ جھینپا پھر منہ بسورا کیا اور اس کے بعد تو آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔ اس کی ماں کے

چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچ لئے اور کپڑا جو وہ سی رہی تھی اس کے ہاتھوں سے چھٹ گیا" تم روکیوں رہے ہو۔ کیا تم فیل ہو گئے (اُوں اوں مجھے فیل کر دیا گیا) ؟ ارے کم بخت خدا تجھے غارت کرے میں تو پہلے ہی سے یہ جانتی تھی۔ ہائے ہائے (دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) تم نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

اس پر ریلو کی آنکھوں سے ایک سیلاب بہہ نکلا (رو رو کر ہچکیاں لیتے ہوئے) اوہنہ، اوہنہ میں تو ساری ساری رات بھی کام کرتا رہا۔ مگر فائدہ کچھ نہ نکلا۔ اس ہفتے تو برابر بارہ بجے اٹھا کرتا تھا۔ ہائے میرے نصیب!

ارے نصیب تو میرے پھوٹ گئے۔ جو تمہارے جیسا کم بخت میری کوکھ سے نکلا۔ مصیبت تو مجھ پر ٹوٹی (ہاتھ ملتے ہوئے) ہے ہے تم نے میرا دل جلا کر کوئلہ کر دیا (ذرا سنبھل کر) اچھا ٹھہر تو سہی۔ کنج بہاری بابو (ریلو کے ماموں کو پکار کر) ذرا آکر دیکھو تو سہی اس نامراد نے کیا غضب ڈھایا ہے۔ بابو کنج بہاری نے کہیں دور دفتری فائلوں کے نیچے سے آواز دی، آتا ہوں۔

بابو کنج بہاری ریلو کے ماموں اور سرپرست، کلکٹری میں کلرک تھے دفتر سے واپسی پر کاغذات ساتھ لے آیا کرتے تھے اور گھر پر کام کیا کرتے تھے۔ ریلو کی ماں نے کچھ دیر تو انتظار کیا پھر خود اُٹھ کر اُن کے پاس گئی۔ "بھیا کچھ سنا بھی کیا ہوا ریلو اب کے پھر فیل ہو گیا" یہ کہہ کر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "دیکھو اب میرا سر نہ کھاؤ۔ ہم نے کتنی مرتبہ تم سے کہا کہ تمہارا یہ لاڈ پیار للا کو خراب کر دے گا مگر تم نے سب سنی اَن سنی کر دی۔ اب اپنے کرموں کا پھل کھاؤ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ریلو کو تو بیٹھے جوتا اور اُٹھتے لات ہونا چاہیئے۔ اس بدمعاش کے تو جوتے لگتے رہنا چاہئیں تھے جوتے۔ اور اس کے کیا۔ لگنے تو تمہارے چاہئیں۔"

"ہائے بھیا مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ تم نے تو بہت بہت کہا مگر میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے

اور بھلا تم نہ مارو گے تو کون مارے گا۔ مجھ میں سکت کہاں۔ اچھے بھیا ذرا چلو تو سہی۔ ایک دفعہ جی بھر کے مار تو لو میرے کلیجے کی بھڑاس نکل جائے۔"

اس پر بابو شیام بہاری نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور کچھ دیر سوچنے لگے۔ ساتھ ساتھ میز پر انگلیاں بجاتے جاتے تھے۔ آخرکار ایک انگلی زور سے میز پر مار کر اٹھ کھڑے ہوئے گویا انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا ہے۔

ریلو نے ماموں کو آتے دیکھا تو گویا سکتے میں آگیا اس کے چہرے پر اُس کسان کی مایوسی جھلک رہی تھی جس کی پکی ہوئی فصل پر اولے پڑ گئے ہوں اور جس کے لئے چڑھتی ہوئی گنگا کی طغیانی یا آندھیوں کے جھکڑ ایک سرسری سی سرسراہٹ ہو کر رہ گئے ہوں۔

"ارے ریلو تمھاری اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ فیل ہو گئے؟"

ریلو نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ منہ بسور لیا۔

ماموں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا جن میں آنسو جھلبل جھلبل کر رہے تھے، پھر ان گرد آلود رخساروں کو جہاں آنسوؤں نے بہہ بہہ کر آڑی ترچھی ندیاں بنا رکھی تھیں۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ کسی کام کا نہیں۔ اس کے دماغ میں تو بُھس بھرا ہوا ہے بُھس" (غصے میں سیدھی انگلی سے سر پر زور کا ٹھونگا لگاتے ہوئے گویا جانچ رہے ہیں کہ بھس ہے یا وہ بھی نہیں)

"دیکھو شیاما تم مفت میں اُس کے لئے ہلکان ہو رہی ہو (دوبارہ متوجہ ہو کر) ابے گدھے فیل ہو گئے؟ آخر بتاؤ تو کس مضمون میں؟ کیسے فیل ہوئے۔ کچھ پتہ بھی تو لگے بس فیل فیل کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

ریلو نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا۔ "انگریزی میں۔ ماسٹر صاحب نے لاطینی کے اسم صفت پوچھے تھے ...... مجھ سے cat کا پوچھا (ایک ہلکی سی دھاڑ مار کر) میں نے غلطی سے Felem بتا دیا۔

'ارے تم سے بلی کا اسم صفت نہیں بتایا گیا ولا رے میاں بتاؤں قصور کس کا ہے تمہارا نہیں۔ تمہارے ماسٹر صاحب کا ہے۔ آج کل کے استاد تو زنانے ہیں زنانے۔ ایک چھڑی اُٹھانے سے تو شاید ان کی کمر میں بل پڑ جائے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے زنخے نہ تھے۔ ہمارے مولوی صاحب کے پاس ایک ڈنڈا رہتا تھا (دونوں ہاتھوں سے دائرہ بنا کر) یہ موٹا اور یہی اسم صفت جو تم سے نہیں بتایا گیا ارے گدھے اسی ڈنڈے کے طفیل ہم نے ہزاروں ہی یاد کر ڈالے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے ہماری کتاب کے دائیں صفحے پر درمیان سے شروع ہوتے تھے۔ (ہاتھ بڑھا کر) یہ لمبی فہرست اگر اس وقت بھی مجھے پہلا حرف یاد آ جائے تو پوری کتاب سنا دوں پوری! (پوری پر معنی خیز دباؤ دیتے ہوئے) ارے تم بلی کا کہتے ہو۔ ہم نے گدھے، گھوڑے، کتے، کتے کیا کتے کے پلے کے بھی اسم صفت یاد کر لیے تھے۔ اور انگریزی زبان میں اس کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ خیر انگریزی میں تو ہمیں پتہ ہی تھا کہ تم کیا تیر مار لوگے۔ مگر تاریخ، جغرافیہ، حساب کیا سبھی میں دیوالہ نکل گیا (ریلو ایک سسکی لے کر) اب کے تاریخ میں تو سب کچھ یاد کیا تھا۔ مگر کیا کروں۔ ماسٹر صاحب نے محمد تغلق کے دانت ٹوٹنے کی تاریخ دریافت کر لی۔ آہ، آہ بالکل دماغ سے ہی نکل گئی۔ اس کی بجائے ہمایوں کے گھٹنا ٹوٹنے کی تاریخ بتا گیا۔ پھر اس کے بعد کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ہائے ہائے دوسروں سے کیسے کیسے سوال پوچھے ہیں مجھے سبھی یاد تھے'۔

'اور جغرافیہ؟'

'جغرافیے میں ایک شہر کے متعلق پوچھا تھا (جھنجھلا کر سوچنے کی کوشش کرتا ہے) "کومبا؟" (ماتھے کو انگلی سے سہلاتے ہوئے گہری سوچ میں) کومبا ٹو رس؟ نہیں نہیں! ہاں ٹمبکٹو...... آہ ...... آہ میں نے سبھی برِ اعظم یاد کر لیے تھے بس جنوبی امریکہ رہ گیا تھا۔ اسی میں سے سوال آ گیا'

"سوال آ گیا! بدمعاش کہیں کا۔ پاجی۔ نالائق ......" ریلو کے ماموں کچھ اچانک ہی برس پڑے۔ گالیوں کی بھوار نہیں اولے یوں پڑ رہے تھے جیسے بھادوں کی بدلی کسی مسافر کو دفعتاً جنگل میں آ لیتی ہے۔

'ارے ملعون تمھیں تعلیم دلائی جا رہی ہے۔ تمھیں زندگی میں کس قدر شاندار موقع دئے جا رہے ہیں.....' شام بہاری بابو میں کمزوری یہ تھی کہ ہن کی طرح انھیں بھی غصہ کم آتا تھا منہ جُھٹ غصہ تو آ بھی جائے۔ ہتھ جُھٹ بہت ہی کم۔ اس لئے اکثر انھیں غصہ لانے کے لئے گالیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ جب بھاری بھرکم گالیوں کی وجہ سے منہ کے پٹھے گرما جاتے تو ہم کا متعدی اثر ہاتھوں پر بھی ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ لوگ تو کہا کرتے ہیں کہ کسی کی زبان چلے کسی کا ہاتھ چلے مگر اس وقت گالیوں کی برکت سے ان کی زبان بھی چلتی تھی اور ہاتھ بھی۔ غصے کے اس طوفان کو طغیانی کے درجے پر برقرار رکھنے کے لیے برابر الفاظ کی رَو بہی چلی جاتی تھی۔ تیزی میں اور بھی جھلّا جھلّا کر چیختے تھے۔ شاید ڈر یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ یہ الفاظ کا اُٹھایا ہوا طوفان دھیما پڑ گیا تو اسے دوبارہ اُٹھانا مشکل نہیں ناممکن ہوگا۔

ریلو کے ننھے سے جسم کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر۔ کان کھینچ کر .... زور سے دھپ لگاتے ہوئے 'بدمعاش میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا .... اگر پھر ایسی حرکت کی ..... . سور کہیں کا ....' یہ کہہ کر اُسے ایک ہاتھ سے زور سے دھکیل کر اور جلدی سے اسے چھوڑ چھاڑ کر اپنے کمرے میں گھس گئے۔ اس غصے کا ان پر عجیب سا اثر ہوا دل سا بیٹھنے لگا اور وہ ایک کرسی پر کچھ بے طرح گر گئے۔ کمزوری کو چھپانے کی لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی مری ہوئی آواز میں ریلو کی ماں سے بولے۔

'دیکھو تمھاری خاطر ہم نے آج ریلو کو پیٹ دیا ہے۔ ہم دوبارہ ایسا کام ہرگز نہیں کریں گے۔ تم اسے اسکول سے اُٹھا کیوں نہیں لیتیں؟

احساسِ کمتری

(سید محمد اختر صاحب)

[اس مقالے میں احساسِ کمتری (Inferiority Complex) کے متعلق جس نقطۂ نگاہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ ڈاکٹر ایڈلر کی Individual Psychology کی روشنی میں ہے۔]

جدید نفسیات کی روشنی میں آج یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ بچپن کے تجربات افراد کی زندگی پر ایک توصیفی اثر ڈالتے ہیں۔ اور یہ کہنا ایک صداقت ہے۔ کہ بچپن کے ذہنی اثرات ہماری آنے والی زندگی کی تشکیل میں ممد ہوتے ہیں، صحت، خرابی صحت، عقلِ سلیم یا بے عقلی انھیں اثرات کا نتیجہ ہیں۔

شیر خوارگی کے سالوں میں ہی بچے اپنی زندگی کا لائحہ تیار کر لیتے ہیں اور گہوارہ چھوڑنے سے قبل انسان بن یا بگڑ جاتا ہے۔ یہ مثل کہ ننھے درخت کی شاخ کو جس طرح چاہیں موڑا جا سکتا ہے بجنسہٖ انسانی دماغ پر صادق آتی ہے۔ طفولیت کے ابتدائی ایام ہی میں بچے کی جذباتی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ وہ یا تو پختگی اور عقل مندی کے ساتھ محبت کرنا سیکھ جاتا ہے اور یا اپنے اندر خام اور بگاڑنے والی محبت کا عنصر پیدا کر لیتا ہے۔ وہ سیکھتا ہے کہ اس کا ماحول موافق ہے یا مخالف۔ اور کیا وہ اپنے ماحول پر شور مچا کر یا رو کر چھا سکتا ہے؟ یا کوئی ایسا شخص ہے۔ جو حالات پر قابو رکھتا ہے اور اس کی منشا، کو سمجھتا ہے۔ یہ تمام واقعات اور اسی قسم کی اور کئی حقیقتیں نوخیز دماغ پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں یہ تمام تاثرات جو بچپن سے دماغ قبول کرتا ہے۔ اُن مٹ ہوتے ہیں اور ان کے اثرات لڑکپن اور جوانی میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فروتری کے احساسات کم سنی میں ہی پیدا ہونے لگتے ہیں حالات کی ناموافقت یا تربیت

کی ذراسی فروگذاشت احساس کو پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے اس مقالے میں ہم ان اسباب پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے جو بلوغت کے بعد ہم میں شعور کمتری پیدا کرنے کے اصل موجب ہیں۔ بے چارگی طفولیت کا بنیادی خیال ہے۔ بچہ فطرتاً اپنی خوراک، عافیت، حفاظت اور رفاقت کے لئے دوسروں کا محتاج ہے اور اپنی اس محتاجی کی حالت میں اسے اپنی بے چارگی کا علم بھی ہو جاتا ہے وہ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ دوسرے ہی اس کی ہر ایک ضرورت کو پورا کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کے اثر پذیر دماغ میں اپنی کوتاہی اور دوسروں پر انحصار کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

بچہ بڑھنے میں جتنا عرصہ زیادہ لے گا۔ اسی قدر بے چارگی کا احساس زیادہ راسخ ہوتا جائے گا۔ انسانی بچہ دوسروں کی محتاجی سے نکلنے میں دوسری جنسوں سے زیادہ وقت لیتا ہے دوسری انواع کے نوزائیدہ بچے چند ہی ماہ میں پختگی حاصل کر لیتے ہیں۔ بطور مثال بلی کا بچہ کتے کا پلا چند ہی ماہ میں خود اعتمادی حاصل کر لیتا، اور اپنی خوراک اور حفاظت کا سامان خود کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے خلاف انسانی بچہ کئی سالوں کے بعد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو اور اپنی احتیاط کو خود پورا کرے۔ اکثر حالات میں تو یہی خواہش ہوتی ہے۔ کہ یہ زمانہ اور بھی دراز ہوتا جائے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ بہت سے بچے جب تک سن بلوغت سے آگے نہیں بڑھتے۔ دوسروں کی محتاجی سے باہر نہیں نکلتے۔ دراصل دست نگری کا یہ احساس ہی ایک قسم کی اقتصادی اور سماجی فروتری ہے۔ جو اُن کے فکری اور جذباتی پس منظر پر چھا جاتی ہے۔

بہت سے ترقی پسند ادیبوں کا خیال ہے۔ کہ ہمارے موجودہ زمانے کی نصف سے زیادہ برائیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مرد اور عورتیں دیر سے جوان ہوتے ہیں اور انھیں خود مختارانہ کام کی طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ انھیں بھیڑوں کا ایک گلہ بنا دیا جاتا ہے اسی لئے ہر ملک میں آمر پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر بچوں کے سن بلوغت تک پہنچنے میں رکاوٹیں ہوں

اور اُن کے پرورش پانے اور اپنے فرائض کے احساس میں کمی رہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ
وہ بچے زندگی اور اس کے مختلف مسائل کو زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور وہ سماجی اور اجتماعی
ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ زندگی کے متعلق ان کے اس رویئے کا نتیجہ ہی اخباروں
میں سنسنی خیز واقعات ہیں۔ فلمی اور ناٹکی ناموروں اور کھلاڑیوں کی پرستش " طلاقوں کی کثرت
یہ سب حالات جذباتی اور اخلاقی تلون ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے اس دورِ تمدن میں سماجی
اور اجتماعی ذمہ داری کی ناکامی کا نتیجہ ہی آمروں کی پیداوار ہے۔ کہا جاتا ہے۔کہ جمہوریت
کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی آمریت کا باعث ہوئی ہے۔

آج جنگ کے شعلے اُفق یورپ پر نہایت خوفناک طور پر بلند ہو چکے ہیں اگر نفسیاتی طور
پر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ہمیں اس جنگ کی محبت ۔ توپوں سے پیار اور جنگی جہازوں سے
الفت کی تہہ میں بچپن کی ساری حرکات نظر آئیں گی ۔ بچے کھلونا بندوق سے کھیل کر خوش ہوتے
ہیں۔ لیکن یورپین قومیں اپنی بڑی بڑی توپوں اور جنگی قوت پر نازاں ہیں۔ اس میں انھیں
ایک خیالی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہ اُن کے لئے قومی افتخار ہے۔ ہزارہا بے گناہ انسانوں
کو توپ کے ایک گولے سے نیست و نابود کر کے وہ اپنے گولے کی قوت تخریب پر فخر کرتے ہیں
لاشوں اور اجسام کے ٹکڑوں میں انسانی المیہ کا منظر بھول کر انسان اپنے تباہ کن کھلونوں
کی طاقت پر فخر کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب ہمارے لوگ صحیح معنوں میں جوان ہوں گے اور ان میں
اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گا تو وہ حیرت انگیز مشینوں سے زیادہ انسانی
ٹریجڈی کو ملحوظ رکھیں گے۔

بچپن کا طویل زمانہ ہی صرف احساس کمتری کا باعث نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں وہ
دوسروں کے دستِ نگر ہوتے ہیں بلکہ تربیتِ اولاد کا ایک گہرا اور ضروری اثر بچوں پر ہوتا
ہے اور اسی اثر سے بچے آئندہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ تین قسم کے بچے آئندہ زندگی میں
کمتری کے احساس سے متاثر ہو کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں ہم ایسے بچوں کو

رکھیں گے ۔ جن میں جسمانی یا عضوی طور پر کوئی نقص ہو۔ اس میں ہر اس قسم کا نقص آ جاتا ہے ۔ جس سے بچوں کو اپنے نقائص کا احساس ہو۔ یا جیسے دوسرے بچے دیکھکر ان کا تمسخر اڑائیں ۔ ایسے نقائص بچوں میں فرد تری کا احساس پیدا کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر ہیران دو لف مشہور نفسیاتی طبیب نے جسمانی یا عضویاتی نقائص میں ذیل کی علامات لکھی ہیں ۔

موٹاپا یا بالکل دبلاپن ۔ پیدائشی داغ یا نشانات ۔ سرخ بال یا جسم پر بھورے پن کی کیفیت ۔ جسم پر زیادہ بالوں کا ہونا ۔ غیر معمولی لمبی ناک ۔ آنکھوں کی مختلف رنگت باہر نکلے ہوئے دانت ۔ مڑی ہوئی ٹھوڑی ۔ حد سے زیادہ پتلی یا موٹی گردن ۔ ٹیڑھے بازو ۔ چوڑے یا بھدے کولھے ۔ لمبی ، چھوٹی ، ٹیڑھی یا خمیدہ ٹانگیں ۔ لمبے یا چھوٹے پاؤں ۔ گنجہ سر ۔ مردوں کا نسوانی چہرہ ۔ اور عورتوں کا مردانہ چہرہ ۔ اور اس قسم کے اور بہت سے عضویاتی نقائص احساس فرد تری کے بنیادی باعث بنتے ہیں ۔ اور اس سے آپس میں مردم بیزاری ۔ تنہا پسندی اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔ ان جذبات کا پیدا ہونا طبعی لحاظ سے زیادہ سماجی حیثیت کی اہمیت رکھتا ہے ۔

ذرا آپ چند بچوں کو کھیلتے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا ۔ کہ کمزور بچہ سب کا گھوڑا بنا سواری کے کام آ رہا ہے ۔ توانا بچے کمزور بچوں پر غالب نظر آتے ہیں ۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے ۔ صرف اس لئے کہ کمزور بچہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا ۔ وہ بیچارا اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے ۔ کہ اپنی عزت کو بالائے طاق رکھدے ۔ بچپن کی یہ کمزوری اور اس کا احساس اس کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ ذلت کا یہ احساس اس کے لئے زندگی دوبھر کر دیتا ہے ۔ اور اس سے بہت سی دماغی تکالیف پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے یہ ضرر رساں جذبہ جلد از جلد دل سے نکال دینا چاہئے اگر اسے دور نہ کیا گیا تو یہ تحت الشعور میں اپنا تسلط جمالے گا ۔ اور قوت عمل پر

ایک وبا سا پڑ جائے گا۔ جو دماغی توازن کو معطل کر دے گا۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کہ اس جذبے کو دل سے نکال دینا چاہئیے۔ اس کا مطلب جدید نفسیات کی روشنی میں یہ ہے۔ کہ ہم بچے کے ذہن نشین کرائیں۔ کہ اس کا یہ جذبہ یا خوف بے معنی ہے۔ اور اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ بچوں سے ان کے استاد، دوست یا والدین خوب کھل کر باتیں کریں۔ اور بچہ اپنے دل کا حال ان سے کہتے نہ رُکے۔ تو نا بچے تو اپنے جذبے پر قابو پا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے کھیلوں کا سخت مقابلہ یا مکہ بازی موزوں ترین علاج ہے۔

کالج کے ایک پروفیسر کا تجزیہ کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ ان کا احساس کمتری اس وقت سے پیدا ہوا تھا۔ جب وہ ابھی بالکل بچے ہی تھے۔ وہ اپنے ہمجولیوں میں ذرا لمبے تھے۔ اور یہی اصل وجہ تھی۔ ان کے اس جذبے کی بسب لڑکوں میں وہ نظر آجاتے تھے۔ جماعت میں اگر کوئی شرارت کرتا تو وہ فوراً پکڑے جاتے۔ اور انہیں خصوصیت سے سزا دی جاتی۔ گویا سزا استاد کے نقطہ خیال سے جماعت کے انتظام کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتی تھی۔ مگر بچے کو محسوس ہونے لگا۔ کہ اس سے یہ سلوک جان بوجھ کر کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک کس مپرسی کی حالت میں پانے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ اس کے لمبے قد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح اسی کالج کے ایک لڑکے کے تجزیہ نفس سے معلوم ہوا کہ اس کا چھوٹا قد احساس فرو تری کا باعث بنا۔ اور بچپن سے ہی اس کی وجہ سے وہ نکو بنا رہا۔ اس احساس کی وجہ سے وہ دوسرے لڑکوں سے دور رہتا۔ کھیلوں میں حصہ نہ لے سکتا۔ اور پیشہ کے اختیار کرنے میں بھی یہی جذبہ اثر انداز ہوا۔

دوسری قسم میں لاڈلے بچے آتے ہیں۔ جنھیں زیادہ پیار نے خراب کر دیا ہو شاید یہ جملہ آپ کو حیران کر دے۔ مگر موجودہ سوسائٹی میں ایسے بچے ایک نہایت المناک

حقیقت ہیں۔ بیسویں صدی خود اعتمادی اور جرأت کی روح چاہتی ہے۔ ان صفات کے بغیر آپ موجودہ زمانہ کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ زمانہ کشمکش اور تگ و دو کا زمانہ ہے۔ اس میں بقا کے لئے یہی دو صفات ضروری ہیں۔ مگر لاڈلے بچے میں یہ صفات کہاں۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنی ناز برداری کرانا چاہتا ہے وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی ہر ایک بات کو پورا کیا جائے۔ اپنے گھر میں وہ ایک راجہ اور نواب ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک حکومت کا صدر اور ایک ملک کا امیر یا ایک ہی وقت میں تینوں۔ مشکلات، مخالفت، اس کی خلاف مرضی کام، تکلیف یا سختی۔ وہ ان باتوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عملی زندگی میں جب ناموافق حالات پیدا ہو جاتے ہیں، تو وہ جذباتی طور پر بالکل ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اس کی زندگی ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔

لاڈلے بچے کے متعلق ہم دو مثالیں دینا چاہتے ہیں۔ جس سے آپ پر مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہو سکے گی۔ پہلی مثال ایسے بچے کی پیدائش ہے جس گھرانے میں ایک ہی بچہ ہو۔ وہاں وہی سب کا لاڈلا اور پیارا ہو گا۔ ایسے گھر میں دوسرے بچہ کی پیدائش ایک نفسیاتی خطرہ ہوتا ہے۔ اگر بچے کو اس آنے والے خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہایت احتیاط سے پہلے ہی سے تیار نہ کیا جائے، تو ڈر ہوتا ہے۔ کہ شاید اس صدمے کو برداشت بھی نہ کر سکے۔ اسے تو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ وہ خاندان کی مملکت کا واحد حکمران ہے۔ لیکن دوسرے بچے کی آمد نے اس خیال کو تہ و بالا کر دیا۔ اس کی سلطنت کا صرف دعویدار ہی پیدا نہ ہوا بلکہ اسے تخت سے دست بردار ہو کر اپنی جگہ آنے والے کو دینی پڑی۔ نیا تجربہ اس پر ثابت کر دے گا کہ اب اس کی پوزیشن پہلی سی نہیں رہی۔ بلکہ گھر والوں کی توجہ کا مرکز دوسرا بچہ بن چکا ہے۔ وہ اب اپنے آپ کو "تخت سے اتارا ہوا" محسوس کرنے لگے گا۔

ان نئے حالات میں اسے کیا کرنا چاہیئے۔ بچہ نہیں جانتا۔ اس لئے وہ خود بخود مایوسی کے جذبات کو اپنے دل میں دبائے رکھتا ہے۔ ایسے بچے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بعض دفعہ رات کو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ہکلا کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یا اندھیرے میں شور مچاتے ہیں۔ لیکن ان کے یہ افعال عارضی ہوتے ہیں۔ اور ان کا چنداں فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ دبا ہوا جذبہ اور بچپن میں ان کی تذلیل ملکر ان کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جوانی میں بہت سی دماغی پریشانیوں کا باعث بچپن کے یہی تاثرات ہوتے ہیں

دوسری مثال لاڈلے بچے کی وہ حالت ہے جب وہ جوان ہو کر حقائق میں قدم رکھتا ہے۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش قسمت ہے اور اسے اپنے پیٹ کے لئے تگ و دو کرنی نہیں پڑتی۔ وہ بہت کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ تو پھر اس کے لئے کوئی نفسیاتی مشکل پیدا ہونے کا سوال نہیں رہتا۔ لیکن اگر حالات اس کے مخالف ہوں۔ تو ایسے نوجوان ایک بہت بڑی روک اپنی راہ میں حائل محسوس کریں گے۔ وہ اس نئی دنیا میں بھی اُنہیں رعایات کے طالب ہوں گے۔ جو بچپن میں انھیں میسر تھیں۔ لیکن ایسے حالات کا پیدا ہونا قریباً ناممکن سا ہی ہوتا ہے حالات کی ناموافقت انھیں دل برداشتہ کر دیتی ہے اور وہ پھر اپنے اردگرد کے ماحول سے ایسے متاثر ہوتے ہیں۔ کہ انھیں سارا زمانہ اپنے خلاف جنگ پر آمادہ نظر آتا ہے۔

بدقسمتی سے اگر لاڈلے بچے کو اپنی زندگی آپ بنانے پر حالات مجبور کر دیں اور اس کے لئے جرأت اور سرگرمیٔ عمل کی ضرورت ہو تو اکثر نوجوان ایسے حالات میں شکستہ دل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں ایسے حالات کے لئے تیار ہی نہیں کیا گیا۔ جس دنیا کے وہ باشندے تھے وہ دنیا اس کشمکش کی دنیا سے

بالکل الگ تھلگ تھی۔ چونکہ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ ہتھیار ڈال دیں۔ زمانہ کے چیلنج کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چند ناکام کوششوں کے بعد وہ اپنے آپ کو اس مایوس گروہ کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں جو ہمارے سماجی نظام میں بہت سی مشکلات کا موجب بن چکا ہے۔ سماجی طفیلی۔ دغاباز اور راز افشا کرنے والے۔ ڈاکو۔ جواری۔ فحاش۔ مسکرات کی ناجائز فروخت کرنے والے وغیرہ وغیرہ سب اسی گروہ کے افراد ہوتے ہیں۔ زندگی کا یہ لائحہ عمل ایک آسان راستہ ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے بھاگے ہوئے نوجوان مرد اور عورتیں اسی راستہ پر چلنا اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ سماجی زندگی میں تو انھیں اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بحیثیت ایک رکن ہونے کے سوسائٹی ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے جرأت اور ہمت سے کام لیں۔ اور یہی جوہر ان میں مفقود ہوتے ہیں۔ ذرا قمار خانوں اور بدمعاشی کے اڈوں پر جاکر وہاں کے آنے جانے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے آپ کو وہاں شریفوں اور نجیبوں کے نور نظر اور چشم و چراغ ملیں گے۔ جنھیں لاڈ نے تباہ و برباد کردیا۔ جو زندگی کے میدان سے اس لئے بھاگ نکلے کہ وہ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اب وہ آرام سے بیٹھے زندگی بسر کر رہے ہیں

آپ نے بعض تندرست و توانا نوجوانوں کو ایسے ذلیل پیشے سے روٹی کماتے دیکھا ہوگا جس سے حیرانی ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسی قدر سرگرمئ عمل اور قوت کا استعمال کسی شریف پیشے میں کرتے، تو ان کی زندگی نہایت کامیاب ہوتی۔ ایسے لوگوں کو شکایت ہوتی ہے۔ کہ اس قدر محنت کے باوجود انھیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آسکتی، اور دنیا میں ان کا کوئی دوست نہیں۔ حالانکہ اس کی تہ میں بھی بچپن کا لاڈ کارفرما نظر آئے گا۔ زندگی ان کے لئے ایک مصیبت اور عذاب کا نام ہے۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ وہ بچپن کی طرح دوسروں کے

دست نگر بن کر زندگی بسر کر سکیں۔ ان لوگوں کی حالت بالکل اس پودے کی سی ہے جو حرارت خانہ (Hot House) میں پیدا ہو۔ باہر کی ذراسی سرد ہوا اس کو مرجھا دے گی۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہے وہ زندگی کی سرد ہوا کو برداشت نہیں کر سکتے۔ زندگی کا مقابلہ اور بقا کے لئے جہد، اس کا تصور ان کے رونگٹے کھڑے کرنے کے کافی ہوتا ہے۔

مکروہ، قابل نفرت، اور فالتو بچوں سے جو سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور اخبارات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے۔ کہ کس قسم کے بچے مکروہ ہیں۔ اور کن بچوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج بےزبان حیوانات کو روکنے کے لئے تو قانون موجود ہے۔ اور اس کے لئے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہیں لیکن افسوس کہ اس متمدن زمانے میں اولاد سے بے رحمانہ سلوک کرنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہندوستان کی جہالت زبان حال سے پکار پکار کر اس کا ماتم کر رہی ہے۔

یہ بیرحمانہ سلوک جس کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ بدنی سزا یا جسمانی عذاب کی صورت میں ہو۔ گو یہ بدنی سزا بھی ایک وحشیانہ فعل سے کم نہیں۔ اور موجودہ تحقیقات بتاتی ہے۔ کہ بچوں کو جسمانی سزا دینا ایک ظلم عظیم ہے۔ اس سلوک کا المیہ پہلو تو وہ صدمہ ہے جس کا اثر دماغ اور روح کو پہنچتا ہے۔ ایسے ماحول میں پروردہ بچے اور پھر جن سے اس طرح برا سلوک کیا جائے جوان ہو کر بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایسے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ بس سوسائٹی کے دشمن بن کر رہ جاتے ہیں۔ نفرت سماج کی ضد ہے۔ اور محبت زندگی کا ایک مضبوط رشتہ اور انسانی برادری کی تخلیقی تحریک۔ ایسا بچہ جسے یہ محسوس کرایا گیا ہو کہ وہ مکروہ ہے۔ اور اس کی سوسائٹی کو کوئی ضرورت نہیں کیا خیال کرے گا؟ یہی کہ

دوسرے سب لوگ اس کے دشمن ہیں۔ اور سماج میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ یقین اور خیال ہی وہ بنیاد ہے۔ جس پر باغی۔ مجرم اور طفیلی اپنی زندگی کی عمارت تیار کرتے ہیں۔

باربار کا جبری تجربہ بھی اسی قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے۔ ایک ہوشیار بچہ اپنے ہم جماعتوں کے حسد کا نشانہ بن جائے اور ایک عرصہ تک وہ اس سے قطع تعلق کرلیں تو اس سے بھی اس بچے میں کمتری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ یہ بچہ گو مکروہ نہیں اور نہ وہ فالتو ہی بچہ ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک ذلت محسوس کرتا ہے کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں شرم اور ناراضگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اور وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا یہ جذبہ اس کے سینے میں ہی دب کر رہ جائے گا۔ اسی طرح مذہبی تعلیم میں اگر زیادہ سختی کو روا رکھا جائے اور بچے کی ذرا ذرا سی لغزش کو مذہبی توہین قرار دے کر اسے سزا دی جانے لگی تو نتیجہ بالکل ایسا ہی نکلے گا۔ جبریہ تجربات خواہ اس کا باعث گھر، مدرسہ یا سوسائٹی کچھ ہی کیوں نہ ہو شخصیت کو مسخ کرنے یا اسے بگاڑنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ تجربات جو شخصیت کے نشوونما اور اس کے سوسائٹی کے لئے مفید بننے میں مدد ہو سکتے کوئی تخلیقی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ بلکہ جبر کی تلخی میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ دور حاضر کے ایک مشہور و معروف نفسی ڈاکٹر میکڈوگل لکھتے ہیں کہ بچوں کو ان کی خود اعتمادی میں بغیر کسی استثنا کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے انھیں بات بات پر ٹوکنا برا ہے۔ بہت سے ہونہار بچوں کی فطری استعدادیں محض حوصلہ افزائی کے فقدان کے باعث دب کر رہ گئیں۔ اور بعض دفعہ ایک ہی جملہ ان کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔ بچوں کو بات بات پر جھڑکی بتانا اور سزا دینا ہی اصل سبب ہے لاکھوں ناخوش انسانوں اور اعصابی بیماریوں کی تکالیف کا۔ بچپن کے یہ تاثرات آئندہ زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ زندگی جو زندہ دلی کا نام ہونا چاہئے۔ مایوسی

اور ذہنی پریشانی کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

ادنیٰ گھرانوں کے بعض بچے جن کے والدین ان کی پرورش نہایت عمدگی سے کرتے ہیں بچپن میں تو خوب خوش و خرم رہتے ہیں۔ اور اس قسم کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا، جو ان کے دماغ میں احساس کمتری پیدا کر سکے۔ مگر جوں جوں وہ بڑھتے ہیں اور ان کا شعور بیدار ہوتا ہے، تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو سماجی لحاظ سے بہت کمتر درجہ کا ہے۔ انھیں اس احساس سے تکلیف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے آدمی اپنے حسب و نسب بتانے سے ذرا گھبراتے ہیں۔ یا کسی عہدہ پر متمکن ہو کر وہ غریب رشتہ داروں سے دور بھاگتے ہیں انھیں ان سے اپنا تعلق بتاتے عار معلوم ہوتی ہے اس کا باعث یہی احساس کمتری کا جذبہ ہے

کون کس وقت اپنے آپ کو فرو تر محسوس کرتا ہے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ مثلاً جس شخص کا منتہائے نظر دولت پیدا کرنا ہو۔ وہ جب اپنے سے زیادہ دولت مند آدمی سے ملے گا، تو وہ اپنے تئیں کمتر خیال کرے گا۔ لیکن جونہی وہ ایسے لوگوں سے ملاقی ہوگا جو اس سے کم درجے کے ہیں تو اپنے آپ کو برتر سمجھے گا۔ اسی طرح ایک عالم جب اپنے سے زیادہ عالم فاضل کو دیکھے گا تو اس کا احساس فروتری بیدار ہوگا۔ ایسا شخص جو سوسائٹی میں ایک نمایاں حیثیت کا طالب ہو۔ جب کسی اعلیٰ رکن سلطنت اور اس کی جاہ و حشمت کو دیکھتا ہے۔ تو وہ اپنے آپ کو ایک حقیر انسان سمجھتا ہے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ احساسات کمتری دراصل بالکل معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محض وقتی بات ہوتی ہے۔ لیکن اگر انھیں معمولی باتوں کو نشوونما دی جائے تو اس سے زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ ان دماغی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے عقل سلیم اور فطری ہمدردی تریاق کا اثر رکھتی ہے۔

تیسری اور آخری قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جن میں ذلت اور رسوائی کا خیال

جڑ پکڑ چکا ہے اور اس خیال کا باعث شاید کوئی مخفی راز یا کوئی ناقابل عفو قصور، محبت میں ناکامی، سوسائٹی کی نگاہ میں گر جانا۔ دولت کا ضائع ہو جانا۔ کوئی ایسا خفیہ گناہ یا غلطی جو ان کے دل و دماغ پر ہر وقت حادی رہے۔ اس قسم کے خیالات سے انسان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور جڑ پکڑتا ہے اگر کسی فرد کو ذاتی قدر و قیمت کا بہت زیادہ احساس ہے تو اس کو یا اس کے انا (EGO) کو ذرا سی ٹھیس لگنا اس کے جذبات کو بڑی طرح مجروح کر دیتا ہے جس کا اندمال بہت مشکل ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص جو کسی قسم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی راہ میں ذرا سی تحقیر آمیز یا کسی قسم کی معمولی بات حائل ہو جائے۔ تو وہ اس کو اپنی حد سے زیادہ تذلیل سمجھتا ہے اس کے برخلاف ایسا فرد جو ایک مذہبی ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جب کسی ترغیب سے مرغوب ہو کر کسی کمزوری کا اظہار کر دیتا ہے تو ایسے شخص کا ضمیر گناہ کی طرف زیادہ راغب ہونے لگتا ہے۔ ضمیر جتنا زیادہ گنہگار ہوتا جائے گا۔ اسی قدر اس کا احساس دماغ پر ہوگا۔ اور وہ شخص اپنے آپکو کمتر سمجھنے لگے گا۔ آج ہم مذہبی آدمیوں کے افعال دیکھکر حیران ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اس سے زیادہ یہ بات حیرت میں ڈالتی ہے کہ یہ لوگ کیوں قعر مذلت میں کود پڑے ہیں ان کی اس حالت کو دیکھ کر عوام اس سے بہت برا اثر لیتے ہیں۔ اور موجودہ سوسائٹی میں بیشتر برائیاں انھیں مذہبی لوگوں کے باعث رونما ہوتی ہیں۔ اسی لئے بعض نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ موجودہ تہذیب کے لئے مذہب ایک سم قاتل ہے۔ لیکن ان کا یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اگر ہم مذہب کو چھوڑ دیں۔ تو بھی ضمیر سچائی اور ہمدردی بنی نوع انسان کے جذبات جو دراصل مذہب کے بنیادی اصول ہیں ان کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ مذہب کو تباہ کرنے سے ہم مذہبی لوگوں کی برائیاں دور نہیں کر سکتے۔ مگر ہمیں چاہیئے کہ ان اندرونی خرابیوں کو دور کر کے ہم مذہب کو

اصلی رنگ میں پیش کریں۔ تاکہ دنیا میں امن و امان کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم آسکیں

کمتری کی خصوصیات صغریٰ | فرد تری کی خصوصیات کو ہم دو شقوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک صغریٰ اور دوسری کبریٰ۔ ذرا زیادہ تفصیل سے اگر دیکھا جائے۔ تو شق صغریٰ میں وہ احساسات آتے ہیں۔ جو بچپن کی غلط تربیت کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کبریٰ کے تحت خاص قسم کی برائیاں، جبری جذباتی تجربات وغیرہ آتے ہیں۔

علامات صغریٰ کو ہم مندرجہ سرخیوں کے تحت تقیم کریں گے

۱۔ زیر کاتہ مقصد کے بغیر اضطرابی سرگرمی۔
۲۔ سماجی حجاب اور دوسروں سے پہلو تہی۔
۳۔ حد سے زیادہ سریع الحس ہونا اور کسر نفسی کرنا۔
۴۔ سطحی پن
۵۔ کم گوئی اور بسیار گوئی
۶۔ ایک خشک مزاج نزدہ گیرانہ رویہ

اضطرابی سرگرمی ہمیشہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ شخص اپنے کو کمتر محسوس کرتا ہے کہ اسے کچھ اور زیادہ کام کرنا چاہیئے تھا۔ اگر اس کے دل میں یہ احساس نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی بے قرار نہ ہوتا۔ اس قسم کی بے سوچے سمجھے سرگرمیاں تجربات اور جدوجہد اس صداقت کی تصدیق کرتے ہیں۔ بے خوابی کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے۔ اگر بے خواب شخص کے دماغ میں سکون پیدا ہو جائے۔ تو وہ فوراً سو جائے گا۔ مگر تحت الشعور کی بے چینی اسے دن یا رات کو آرام سے بیٹھنے یا سونے نہ دے گی۔

یہ بے چینی ایک مخفی خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی شخص کا کاروبار میں ناکام ہونا یا آئندہ زندگی میں نامراد رہنا بے چین بنا دیتا ہے۔ اپنی صحت یا کسی دوست کا فکر اس

کے تحت الشعور میں ایک خوف پیدا کردے گا۔ کسی قصور کا عیاں ہو جانے کا خدشہ ہو یہ حالت پیدا کر دے گا۔ اس کا سبب جو کچھ بھی ہو۔ مگر اس آدمی کی حالت بالکل اسی طرح ہو گی۔ جیسے کوئی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنا راستہ کھو بیٹھے۔ ایسی حالت میں اس پر خوف اور تشویش کے آثار نمایاں ہوں گے۔ جب ہم اپنے گھر میں اپنے ہی ماحول میں ہوں تو اس وقت ہمارے دماغ میں کسی قسم کی بے چینی، بے قراری یا بے سوچے سمجھے کام کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں ایسی حرکات کسی کی سرزد ہونے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ فرد نفسیاتی طور پر کسی نقص یا خوف کو محسوس کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خوف کسی قریب الوقوع واقعہ کا سبب نہ ہو۔ اور اس کا باعث کوئی ایسا جذبہ جسے ہمارا شعور مطلق بھول چکا ہو۔ مگر وہ جذبہ دماغ میں محفوظ رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ خوف۔ اضطراب۔ بے خوابی۔ بغیر مقصد سرگرمی ہوتا ہے۔ یہ بات احساس کمتری کی ہر ایک خصوصیت پر صادر آتی ہے۔

سماجی ڈر اور اس کے ساتھ شرمیلا پن اور جھینپ یہ احساس کمتری کی ایک اور علامت ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بات کا کہ دوسرے لوگ اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اسے فضول جان کر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ خواہ بچپن میں ایسا کیا جائے یا جوانی میں کسی کو حقیر نظر سے دیکھا جائے۔

سماجی ڈر اور دوسروں سے پہلو تہی کرنا اس کا مطلب صرف یہی ہوتا ہے۔ کہ ایسا کرنے والے شخص کو کسی مجلس میں کوئی تلخ تجربہ ہوا ہوگا۔ اور مجلسی تذلیل کا ہی یہ اثر ہے۔ کہ اب وہ مجلس میں آنے سے گھبراتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی کو ایک دفعہ چونکہ ٹھیس لگ چکی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے کے سامنے بالخصوص جہاں اجنبی لوگ ہوں جانے سے گھبراتا ہے۔ ایسی مجلس میں اس کا تحت الشعور اسے جانے سے روکتا ہے۔ جب کسی شخص میں ایسی جھجک پائی جائے تو اس کا مطلب نفسیات کی روشنی میں یہ ہوگا۔ کہ اسے اپنے

دوستوں یا اجنبیوں سے کوئی ایسا تجربہ ہوا جس کے نتیجہ کے طور پر ایک جذباتی اندرونی جبر رونما ہوا۔ اور یہ جبر اب احساس کمتری کی صورت میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سماجی ڈر کا تعلق ذکی الحس ہونے اور کسر نفسی سے بھی ہے۔ بھلا کوئی کیوں ذکی الحس ہو اور کسی کو خواہ مخواہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہیچمدان سمجھتا رہے؟ ان باتوں کو معلوم کرنے کے لئے آپ ذرا ان حالات کے پس منظر کا مطالعہ کیجئے جن کا نتیجہ یہ خیالات ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ضرور ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہوا ہوگا جس کا اثر اُن کے دماغ پر ہے یا کسی نے ان سے نفرت کا اظہار کیا ہوگا یا اس قسم کا کوئی اور ذلت آمیز صدمہ پہنچا ہوگا۔ جس کے باعث وہ ذکی الحس ہیں۔ یا کسر نفسی کرتے ہیں جب ایک بار کسی کے ذہن میں اپنے متعلق حقارت کے خیالات بیٹھ جائیں تو پھر جونہی وہ شخص کسی غیر کے سامنے جائے گا تو تحت الشعور فوراً غیر شعوری طور پر گذشتہ یاد کو تازہ کر دے گا۔ اور وہ دوسروں کی موجودگی میں اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگے گا۔

مردوں میں تقریر۔ لباس۔ جوتا اور خوراک کے معاملے میں بہت زیادہ احساس ہوتا ہے لیکن عورتیں زیبائش، ہاتھوں، انگلیوں اور ناخونوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہیں ان میں ایک دوسری پر نکتہ چینی کرنے کی بری عادت ہوتی ہے دراصل انھیں خود اپنی فروتری کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس احساس کو دور کرنے کے لئے وہ دوسروں پر نکتہ چینی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دل کو طفل تسلی دے لیتی ہیں۔

سطحی پن بھی احساس کمتری کی ایک علامت ہے۔ یہ علامت ایسے شخص میں پائی جاتی ہے جس کا دل ہر وقت اچاٹ سا رہے۔ اس کے نزدیک کوئی چیز بھی اہم نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہر چیز کو ایک مصیبت خیال کرتا ہے دنیا اس کے لئے مصائب کا گھر ہے۔ وہ ہر ایک شے کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے۔

آپ نے بعض لوگ دیکھے ہوں گے۔ جو ایک وقت میں تو نہایت اداس شاہدہ

نفس میں محو اور افسردہ خاطر نظر آئیں گے لیکن دوسرے وقت ان کی حالت اس کے برعکس ہو گی۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہے ہوں گے اور ساری مجلس کو وہ سر پر اٹھائے ہوں گے جلد جلد مزاج کا متضاد حالتوں میں بدلنا جذباتی بے قراری کو عیاں کرتا ہے جو احساس فرد تری کو ظاہر کرنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اگر کوئی فرد جذباتی طور پر ایک حالت پر رہے تو وہ کبھی بھی ان وقتی اثرات کا مظاہرہ نہ کریگا۔ کیوں کہ ایسا کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی روح کسی جذباتی تجزیہ کی وجہ سے رک سی گئی ہے اور جو اس کے خیالات کو احساسات کے ساتھ ساتھ جانے نہیں دیتی۔

ایک خشک مزاج خردہ گیرانہ رویہ بھی احساس کمتری کا ایک اور نشان ہے۔ تنگ مزاج آدمی بھی کچھ وہمی سا ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح خردہ گیر بھی، جو شخص اپنے آپ کو سوسائٹی کا ایک فرد سمجھتا ہے یا اپنے آپ کو سوسائٹی کے قابل بناتا ہے، ایسا شخص ہرگز ہرگز خشک مزاجی سے کام نہ لے گا۔ اور نہ تنقید کو تنقید کی حد سے بڑھنے دے گا

تنقید، حق بات کو ظاہر کرنے کے لئے اور باطل کو مٹانے کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن صحیح تنقید ہمیشہ تخلیقی پہلو لئے ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ ذاتیات سے بالاتر ہونا چاہیئے وہ تنقید جو تخریبی ہو، ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ اور ایسی تنقید احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب افعال بے فائدہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا نتیجہ کوئی نہیں نکلتا ہے اور ان سے دماغ ہمیشہ بری طرف مائل ہوتا ہے۔

لیکن احساس فرد تری کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جسے مثبت پہلو کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو برتر بنانے کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ جو کچھ کام کرتا ہے۔ اسے اگر "بدل" کہہ لیا جائے تو موزوں ہو گا۔ لیکن یہ "بدل" دراصل محض ایک دکھاوے کی چیز ہو گی۔ کیونکہ سماجی طور پر یہ ایک بے فائدہ چیز ہوتی ہے یہ "بدل" محض اندرونی کمتری کو چھپانے کے لئے ہوتا ہے ورنہ درحقیقت یہ بھی احساسِ کمتری

کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ اس قسم کی علامت کو ہم ذیل کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں
۱۔ چھوٹے قد کا آدمی جو تن کر چلے۔
۲۔ کوئی شخص تکلف سے گفتگو کرے۔
۳۔ افراد جو زیادہ شاندار لباس پہنیں۔
۴۔ عورت جو مردوں کی طرح پیش آئے یا مرد جس میں زنانہ پن نمایاں ہو۔
۵۔ کوئی آدمی اپنے آپ کو یکتا خیال کرے۔
۶۔ غنڈہ پن اور جبر

"ٹھنگنا آدمی فتنہ ہوتا ہے" یہ ایک ضرب المثل ہے۔ اس کا تن کر چلنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنی جسمانی کمزوری کا احساس ہے اس کا تحت الشعور اپنا چھوٹا پن محسوس کرتا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرنے کے لئے وہ تن کر چلتا ہے۔ اگر اشخاص ہانفی کی طرف راغب ہو جاتے۔ تو ان کا احساس کمتری انھیں دنیا سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کرتا۔ اور وہ کسی تاریک کنج میں پڑے دن کاٹتے یعنی وہ زندگی کی کشمکش میں ایک طرف پھینک دئیے جاتے۔ حفاظت خود اختیاری کا ملکہ قدرت نے ہر ایک کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ اس لئے چھوٹے قد کا آدمی اپنے ماحول پر چھانے کے لئے تن کر چلتا ہے۔ تاکہ دوسرے اس کی شخصیت کو محسوس کریں۔ لیکن یہ حالت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ کیوں کہ یہ "بڑا بننا" محض ایک دکھاوے کی چیز ہے۔ جب تک کہ صحیح معنوں میں اس آدمی میں کوئی جوہر نہ ہو تعالی سے حقیقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا آدمی جو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے تن کر چلتا ہے یا بڑی باتیں بناتا ہے۔ کسی ایسے ماحول میں چلا جائے۔ جہاں لوگ اس کی ان حرکات کا تمسخر اڑانے لگیں اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔ اس کے ہوائی قلعے یکدم گر جائیں گے۔ وہ فوراً ہمت ہار کر پریشان ہو جائے گا۔ اس کی خود نمائش کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے آپ کو کمتری اور بے بسی کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا پائے گا اصلی بڑائی وہ ہے جو انسان میں اپنی لیاقت

قابلیت، شرافت کے ذریعہ پیدا ہو محض بڑا بننے سے آدمی بڑا نہیں بن سکتا۔ بڑا وہ ہے جسے دوسرے لوگ بڑا سمجھیں۔ اور اس کی موجودگی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھیں۔ ایسی حالت میں قد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہی دراصل بڑائی کی پہچان ہے۔

جو شخص تکلف سے باتیں کرتا ہے وہ گویا ذاتی کمتری کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ علامت چھوٹے طبقہ کے لوگوں میں یا کم علم رکھنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی کمتری کو چھپانے کے لئے اور سامعین پر اپنا رعب ڈالنے کے لئے تکلف سے باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ انہیں ذی علم خیال کریں عام باتوں میں مشکل الفاظ بولتے ہیں۔ اردو میں بات کرتے کرتے فارسی، انگریزی یا عربی کے ایسے اشعار سنا جاتے ہیں جنہیں دوسرے نہ سمجھتے ہوں وہ دوسروں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ وہ عام لوگوں سے بلند اور علمی طبقے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

لباس کے معاملہ میں زیادہ تکلف کرنا بھی اپنی کمزوری اور کمتری کو چھپانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ زیادہ باتیں کرنا اور لباس کے متعلق زیادہ تکلف کرنا ایک ہی نوع کی دو مختلف تصویریں ہیں اور دونوں ہی فرد تری کے احساس کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں قدرت کی ستم ظریفی کا نمونہ ہوتی ہیں لیکن وہ زیبائش اور آرام کے ذریعہ اپنی بدصورتی کو چھپانا چاہتی ہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جیسے لاڈلا بچہ، دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے روتا ہے۔

ہماری تہذیب کے نقصانات میں سے ایک نقصان یہ بھی ہے۔ کہ اکثر عورتیں اپنے آپ کو حقیر خیال کرتی ہیں۔ خاص کر ان کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ طبقہ نسوان کمتر مخلوق میں سے ہے۔ مرد وں کی بڑیں کہ وہ اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر عورتوں کے ذلیل بنانے میں ہماری صدیوں کی تہذیب کی کارفرمائی ان دونوں باتوں نے عورتوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ کمتر طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے عورتوں میں احساس فرد تری زیادہ ہوتا ہے۔ اس

کا ردِ عمل آج نظر آ رہا ہے۔ طبقہ نسواں نے سماج کے قوانین کے خلاف جو مردوں کے بنائے ہوئے ہیں علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ ذرا مہذب ممالک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آئے دن نئی نئی تحریکیں عورتوں کی طرف سے جاری ہو رہی ہیں۔ دونوں جنسوں کے ٹکراؤ نے ایک نفسیاتی کشمکش پیدا کر دی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے عمرانی اور جنسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

اگر ایک خاتون مردانہ لباس میں نظر آجائے تو کیا یہ اس کے احساس فرد تری کی بین دلیل نہیں ہے؟ وہ عورت ہوتے ہوئے مردوں کی نقل اتارتی ہے اور ویسی ہی عادات اور حرکات کرتی ہے۔ بعض مرد بھی اپنی بعض جسمانی کمزوریوں کے باعث ایسا محسوس کرتے ہیں گویا وہ محض عورتیں ہیں۔ ان کے لباس میں مردانگی کے اظہار کی جگہ نسوانیت ٹپکتی ہے۔ ان کی طرز گفتگو اور حرکات صنف نازک سے ملتی جلتی ہیں۔

اگر مرد اور عورتوں کے دماغ پوری طرح نشوونما پائیں تو پھر دونوں میں احساس فرد تری یا برتری کا نام تک نہ رہے۔ یہ جنسی فرق محض قوار کو مکمل کرنے اور اس کے پورا کرنے کے لئے ہے۔ اس فرق سے یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں بعض لوگ اپنے آپ کو یکتا خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی احساس کمتری کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ لاڈلے بچوں کے معاملہ میں یہ بات خاص کر عیاں ہوتی ہے۔ ایسے بگڑے ہوئے بچے یا بچیاں یہ یقین لے کر بڑھتی ہیں کہ وہ یکتا ہیں۔ جب بچہ جسمانی طور پر بڑھتا ہے۔ تو بعض اوقات وہ جذباتی طور پر کوئی ترقی نہیں کرتا اور دنیا کے متعلق اس کا نظریہ بالکل وہی ہوتا ہے، جو وہ اپنی پیاری ماں کے متعلق سوچتا ہے۔ یعنی سب سے وہ ماں کی طرح خراج تحسین وصول کرے گا اسی لئے آپ قوموں میں ایسے افراد دیکھیں گے جو ہمیشہ نمایاں حالت میں بنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا وہ کوئی اور پوزیشن برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ سر نئے فیشن میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ ان کی شخصیت سینکڑوں میں ایک دکھائی دے گی۔ وہ ایک

مخصوص کردار کے مالک ہوں گے۔ وہ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہیں گے۔ اور اپنے آپ کو سب سے برتر ثابت کریں گے۔ نفسیاتی طور پر ان لوگوں کی حالت بڑی قابل رحم ہوتی ہے اگر سوسائٹی میں ذرا سی بات ان کی خلاف مرضی ہو جائے۔ تو وہ اسے اپنی ہتک خیال کریں گے۔ ذرا سی ہتک ان کی عزت کو برباد کردے گی۔ ایسے لوگ معمولی حادثہ پر مشتعل ہوکر خودکشی تک کرلیں گے۔ اگر ان کے خیال کے مطابق ان کی عزت نہ کی جائے تو وہ آپے سے باہر ہوجائیں گے۔ یقین جانئے، جو فعل یا خیال انسان کو انسان سے دور رکھے۔ وہ فعل احساس کمتری کا نتیجہ ہوگا کیونکہ قدرت نے مرد اور عورت کو پیدا اس لئے کیا ہے کہ انسان ملکر ایک سماج ایک سوسائٹی بنائیں۔ اسی ہمدردی اور رفاقت سے دنیا جنت بن سکتی ہے۔

اپنے آپ کو یکتا (UNIQUE) جاننا اور جنسی تفریق یہ دونوں موجودہ تہذیب کی لعنتیں ہیں۔ اسی سے طبقوں (CLASSES) کی تقسیم شروع ہوئی۔ آج جرمن قوم کی جو حالت بنی ہوئی ہے۔ وہ یہی یکتا ہونے کا خیال ہے۔ یکتائیت کا نظریہ احساس فردتری کا دوسرا نام ہے۔ اسی کا شکار ہوکر جرمن قوم میں سے ہٹلر ایسا ڈکٹیٹر پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ جرمن قوم کے دلوں میں دوسری یورپین اقوام کے خلاف بیحد نفرت اور حقارت کے جذبات مشتعل ہیں۔ اور موجودہ جنگ جس نے امن عالم کو مخدوش کردیا ہے اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ دوسروں سے نفرت کرنا دراصل احساس کمتری کو دور کرنے کا ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الدماغ انسان اپنے آپ میں اور اپنے سے کم مرتبہ لوگوں میں فرق نہیں دیکھتا۔ اور یہی بات انسانیت کی معراج ہے سب سے آخری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں غنڈاپن ظلم اور زیادتی کرنا ہو۔ اگر مالک اپنے نوکروں کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ بتاتا رہے۔ انھیں بات بات پر گالی دے۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کے دل میں ایک خوف ہے کہ خاموش رہنے سے کہیں اس کے رعب میں فرق نہ پڑ جائے۔ وہ جبلی طور پر محسوس کرتا ہے۔ کہ اس کی ذاتی قوتیں منفی ہیں۔ اس احساس کو دور کرنے کے لئے وہ گالی گلوچ سے کام لے کر نوکروں پر رعب ڈالتا ہے۔ یہی حال اس

خاوند کا ہے۔ جو اپنی بیوی ـــــ رفیقۂ حیات ـــ پر تشدد کرتا ہے۔ یا باپ جو اپنے بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دینے لگتا ہے۔ تشدد۔ لڑنا جھگڑنا۔ تکبر۔ قسم کھانا۔ اور ہر بات کا دعا کرنا۔ یہ علامتیں جہاں نظر آئیں، سمجھ لینا چاہئے کہ اس شخص میں خود اعتمادی مفقود ہے

احساس فرد تری کی جڑ کو معلوم کرنے کے لئے آپ خود بھی اپنا تجزیہ کریں۔ یا کسی ماہر نفسیات سے مشورہ لیں۔ لیکن اگر آپ خود اپنے دماغ پر زور دے کر اپنے بچپن کے حالات کو یاد کریں۔ کہ وہ کون سے تلخ تجربات تھے جن کا نتیجہ آپ کا احساس فرد تری ہے۔ مثال کے طور پر! کیا آپ لاڈلے بچے تھے۔ کیا آپ سے نفرت کی جاتی تھی کیا آپ کو ایک فالتو بچہ سمجھا جاتا تھا، کیا آپ جسمانی طور پر کمزور تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ...... تو آپ کو اس احساس کی اصل وجہ معلوم ہو جائے گی۔

(باقی آئندہ)

نفسیات شباب

یہ کتاب برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفۂ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر ایڈورڈ اشپرانگر کی تازہ تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے۔ نوجوانوں کی مجموعی نفسی سیرت ان کی تخیلی زندگی، اُن کے عشق۔ اُن کے تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر نفسیات شباب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۰ صفحے اور قیمت اردو کی بلند پایہ علمی ادبی کتابوں کے مقابلے میں نسبتاً کم یعنی صرف تین روپے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں دفتر میں باقی ہیں۔ جلد طلب کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

نگار کا نظیر نمبر اور

موجودہ طرزِ تنقید

(از سید اختر علی تلہری صاحب جوبلی کالج ، لکھنؤ)

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا نگار (لکھنؤ) "نظیر نمبر" کے لباس میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مختلف ارباب ذوق نے نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ خصوصیتوں کو اُبھارا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ اس "مشرقی بدمذاقی" کی اصلاح کر دی جائے جس نے نظیر کے شاعرانہ کمالات کو کبھی سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس سلسلے میں جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں جناب مجنوں گورکھپوری ، جناب محمود اکبرآبادی ، جناب اختر اُرینوی اور جناب پروفیسر احتشام حسین رضوی کے مقالات خاص طور سے قابل غور ہیں ان صاحبان قلم نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے متعلق جو عنوان نظر اختیار کیا ہے اس پر بیشتر مارکس کے خیالات کی مہریں لگی ہوئی ہیں دوسرے لفظوں میں یہ تمام مقالے نوجوان ادیبوں کی اصطلاح میں "ترقی پسندانہ طرزِ بحث" کے ترجمان ہیں۔ البتہ جہاں تک پروفیسر احتشام حسین صاحب کا تعلق ہے گو اُن کا اسلوب نظر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے تاہم انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کافی منطقیانہ احتیاط کے ساتھ تنقید کے جدید "اشتراکی مذاق" کے راستے پر وہ بھی چلے ہیں مگر اپنے دوسرے ہم سفروں کی طرح یہ نہیں کیا ہے کہ نظیر کے ماسوا دوسرے تمام شعراء کے خیالات و افکار کے شاداب پھولوں کو جاگیردارانہ نظام (فیوڈل سسٹم) کی پیداوار قرار دے کر "سبزہ بیگانہ" کی طرح روندتے چلے جائیں انھوں نے بھی "اشتراکی مذاق" کے ماتحت نظیر کے بہت سے ٹیڑھے بیڑھے بدہیئت خذف ریزوں کو لعل و گہر سمجھ لیا ہے لیکن ذرا بچ بچ کر تحسین و ستائش کے ساتھ نظیر کی شاعری کے بعض نمایاں نقائص کی طرف بھی اشارہ کرتے چلے گئے ہیں۔ جناب مجنوں اور جناب اختر ارینوی مگر "اشتراکی نظریات" کی رو میں اتنا بہتے چلے گئے ہیں کہ انھیں اس کا بھی خیال نہیں رہا کہ زیر نظر مقالات کا مقصد نظیر کی اہمیت بحیثیت ایک شاعر کے واضح کرنا ہے بحیثیت ایک "جمہوریت پسند اشتراکی" کے نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر اکبرآبادی ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھیں تصویر کشی میں خاص ملکہ ہے۔ چنانچہ مختلف مناظر اور مختلف اشیا کی بڑی اچھی اچھی تصویریں انھوں نے لفظوں کے ذریعے سے کھینچی ہیں مگر جناب مجنوں کا یہ ارشاد کہ "ایسی مرقع نگاری میر حسن اور میر انیس کے بھی بس کی بات نہیں تھی" حسن ظن کی افراط ہے اگر مرقع نگاری اس کا نام ہے کہ خوب صورت "سمدھن" کے ایک ایک عضو کا بے پردہ جائزہ لے ڈالا جائے "کسبیوں" کے سینے اُن کی چٹک مٹک اُن کے "ازار بند" وغیرہ سے نظر نہ ہٹائی جائے۔ چوہوں کے اچار کا نقشہ اُتارا جائے۔ رقاصہ کے بازاری حسن میں مختلف گوشوں سے رنگ بھرا جائے تو پھر واقعتاً انیس کے بس کی یہ "مرقع نگاری" نہیں تھی۔ انھوں نے شاعری کا جو موضوع قرار دیا تھا اس میں ان مرقعوں کی کہیں سے کھپت نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی طرح اختر اورینوی کا یہ خیال کہ "یہ سوزؔ، دردؔ، سوداؔ وغیرہ بجا انفرادیت کی بھول بھلیوں میں چکر کھاتے رہے اور نظیر اجتماعی زندگی کے وسیع سبزہ زار میں کلیلیں کرتا پھرا۔ نظیرؔ کی شاعری کے مطالعے سے زندگی کے ممکنات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ نظیرؔ کی شاعری اس عہد کی منفیانہ شاعری کے ریگستان میں ایک شاداب گلستاں ہے" خوش عقیدگی کی وہ حد ہے جہاں دعوے دلیل کے روپ میں نظر آتے ہیں

اس مقام پر ضمناً یہ امر واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب مجنوں نے اپنے مضمون میں یا اختر اورینوی نے اپنے مقالے میں جو اس پر زور صرف کیا ہے کہ نظیرؔ کی شاعری کا رخ "جمہوریت" کی طرف ہے۔ اس میں پرولتاری (عوامی) رجحانات پائے جاتے ہیں واقعے کی صحیح تصویر کشی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ آج کل جو مفہوم "جمہوریت" نے اختیار کر لیا ہے۔ پرولتاری (عوامی) ادب کا جو منشا سمجھا جا رہا ہے نظیرؔ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے ان کے دماغ میں ان چیزوں کا کوئی تخیل موجود نہیں تھا پھر وہ ان سے متاثر ہو کر کس طرح لکھ سکتے تھے؟ روٹی، ہولی، دیوالی وغیرہ پر جو انھوں نے طبع آزمائی کی ہے وہ "موضوعاتِ شعر" کے انتخاب میں اُن کی اس بے باکی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے جس نے اُن سے "کھٹمل، مچھر، لیتو" جیسی جیسی چیزوں پر نظمیں لکھوائی

ہیں یہ بے احتیاطی اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے جب وہ مرقع نگاری میں فحش الفاظ کا استعمال کرتے ہیں یا انسانی اعضا کے متعلق ایسی جزئیات کی تصویر کھینچتے ہیں جنھیں دیکھ کر "شائستہ ادبی ذوق" کی جبیں پر عرق انفعال نمودار ہوجاتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپنے اشتراکی رجحانات کے باوجود الفاظ کے استعمال میں اس بے احتیاطی کے خطرے کو سمجھ لیا اور یہ لکھ کر کہ "عوام کے لفظ سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ضمناً اسے بھی واضح ہوجانا چاہیے کہ بیسویں صدی میں عوام کے لفظ نے مفہوم کے اعتبار سے جو وسعت اختیار کرلی ہے اور سیاسی اصطلاح میں جن بیدار اور سیاسی شعور رکھنے والوں کی طرف اس لفظ کا اشارہ ہوتا ہے، نظیر یا اس وقت کے کسی شاعر یا ادیب کے ذہن میں نہیں ہوسکتا۔ نظیر کے یہاں عوام سے مراد عام لوگ ہیں چاہے وہ پیشہ ور ہوں یا کوئی اور" اپنے کو اس مغالطے سے بچا لیا۔

مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کے گراں قدر مقالوں کی بنیاد چونکہ جمہوریت اور پرولتاری ادب کے اس غلط مفہوم پر ہے اس لئے علمی حیثیت سے اُن کی اہمیت بہت کم ہوجاتی ہے۔ مگر مجھے صرف اتنا ہی نہیں کہنا ہے۔ مجھے براہ راست اس موجودہ تنقیدی اصول کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے جو مارکس کے نظریے کے سانچے میں ڈھل کر شاعری کے خرمن کے لئے برقِ بلا بنا ہوا ہے۔

آج کل یہ عام دستور ہوگیا ہے کہ متقدمین کے مایۂ ناز "شعری سرمایہ" کو جاگیردارانہ نظام (فیوڈل سسٹم) کی پیداوار قرار دے کر حقیر اور ناقابل التفات بتایا جائے۔ اور اس ادب کو جو اشتراکی خیالات کے سایے میں پرورش پائے بلا امتیاز سراہا جائے اور اس طرح ہماری متاع غزل اور اس سے ملتے جلتے دوسرے اصناف پر خط نسخ کھینچ دیا جائے۔ لیکن کیا یہ اسلوب تنقید علمی حیثیت سے مفکرین کی نگاہ میں سزاوار تحسین و آفریں ہو سکتا ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔

نظر انصاف جب شاعری کا علمی حیثیت سے جائزہ لیتی ہے تو اسے یہی فیصلہ دینا پڑتا ہے کہ شاعری کی بلند مقامی ان "اقتصادی نظامات" کی پابند نہیں ہو سکتی اس کے پر وبال ذاتی حیثیت سے جس پاکیزہ اور مستقل فضا میں پرواز کے عادی ہیں اس کا مقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ عارضی چیزوں سے انہیں وابستہ کر دیا جائے۔

اگر شاعری کو ان اقتصادی نظاموں سے مقید کرایا جائے گا اور اس کے حسن و قبح کا معیار صرف یہ بنایا جائے گا کہ اس میں کیا کسی اقتصادی نظریے کی ترجمانی ملتی ہے ؟ یا ان خیالات کی جو جاگیردار نظام کی پیداوار ہیں یا اشتراکی نظام کے یا پھر "نازی" اور "فاشی" نظامات کے ؟ اور جس شاعری میں ان نظریات کی ترجمانی مل جائے جنھیں ہم اختیار کر چکے ہیں تو اسے اچھا بتایا جائے اور جو شاعری اُن کی ترجمان نہ دکھائی دے اُسے سرے سے مذموم قرار دے دیا جائے تو یہ طریقہ "ادب و شعر" کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ ان پابندیوں کے بعد وہ کبھی بین الاقوامی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ اقتصادی نظام غیر مستقل عارضی چیزیں ہیں۔ ہمہ گیری کی صفت سے انھیں کبھی متصف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جہاں یہ نظامات فنا ہوئے ایسی شاعری کے متعلق جو اُن سے پورے طور سے وابستہ رہی ہے نقطۂ نظر بھی بدل جائے گا یا جن اقوام میں ان نظامات کو مقبولیت حاصل نہیں ہے، وہ ایسی شاعری کو پسند ہی نہیں کر سکتے جس نے ان نظامات کی ہی محدود فضا میں پرواز کو منتہائے نظر قرار دے لیا تھا۔

اصل میں ہماری شاعری کی بنیاد ہی ان چیزوں پر ہے اور ہونا بھی چاہیے جنھیں مستقل حیثیت حاصل ہے اور جو ہمہ گیری کی صفت سے موصوف ہیں ایک حقیقی شاعر خواہ وہ کسی اقتصادی نظام کے ماحول میں سانسیں لے رہا ہو اپنے اردگرد سے ایسی چیزیں منتخب کر لیتا ہے جو ہمہ گیری کی صفت رکھتی ہیں اور جن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ جغرافیائی و قومی امتیازات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانیت کو متاثر کر سکیں۔ اس سلسلے میں محبت رنج والم شادی و مسرت وغیرہ کے وہ بنیادی جذبات آتے ہیں جن سے انسان بلا تفریق متاثر ہوتا ہے اور یہاں اس

سلسلے سے طرز ادا اور اسلوبِ بیان کے ان اساسی طریقوں (تشبیہہ و استعارہ و تمثیل و کنایہ وغیرہ) کو بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جن میں تمام قومیں مشترک ہیں۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شاعری کے اسلوبِ نظر کو فلسفے کے اندازِ فکر سے کوئی واسطہ نہیں ہے اگرچہ دونوں خیالات و افکار کا ذخیرہ خارجی حقائق سے حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک شاعر کا عنوان نظر فلسفی و حکیم کے طرز غور سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے ممکن ہے کہ ایک ذات میں فلسفیت و شعریت جمع ہو جائیں اور وہ دونوں کو ایک جگہ سمو کر اپنے شاہکار تیار کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک وہ جامع الحیثیتین ذات فلسفیت برتے گی اس کا کلام بھی نظم کی صورت رکھے گا۔ اس میں شعریت نہ ہوگی۔ اور جہاں اس نے شعریت اختیار کی فلسفیت رخصت ہو جائے گی۔ فلسفی کا کام حقائق کی چیر پھاڑ ہے۔ وہ اصلیت و واقعیت کو بالکل برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں حقائق کی اس بے رحمانہ تشریح سے علیحدگی کی گئی اور تمثیل و تشبیہہ اور خطابی دلیلوں سے کام لیا گیا فلسفیت ختم ہوگئی اور شعریت آگئی۔ اقبال کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے اس کے کلام کا تجزیہ کر لیا جائے تو یہی حقیقت نظر آئے گی کہ جہاں خالص فلسفہ ہے وہ شعریت کی لطافتوں سے محروم ہے اور جہاں شاعرانہ لطافتیں ہیں وہاں نظر کا رخ بدلا ہوا ہے۔ ان لطافتوں کی تہہ میں کوئی اچھوتا اندازِ بیان، کوئی نادر تشبیہہ یا پھر کوئی لطیف استعارہ کار فرما ہے۔

جوش ملیح آبادی "ترقی پسند ناقدین" کی آنکھوں کا تارا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ شاعرانہ عظمت کے بہت اونچے درجے پر فائز ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ عظمت ان نظریات سے وابستہ نہیں ہے جن کی اس نے ترجمانی کی ہے۔ بلکہ یہ عظمت ان نظریات سے ہٹ کر "معانی و بیان و بدیع" کے آفاق گیر راستوں سے آئی ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو ان نظریات سے اختلاف ہے وہ بھی اس کے شاعرانہ کمالات کے معترف ہیں۔

جوش کی "عورت" کے متعلق ایک مشہور نظم ہے اس میں باکمال شاعر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عورت کو موجودہ تعلیم نہیں دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے :-

چاندنی۔ قوس قزح۔ عورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا کب اُن کے شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار

روشنائی میں نہیں گھلتی ہے موجِ آفتاب
کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب

میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار
کاکلِ افسانہ ہو دوشِ حقیقت سے دوچار

حسن کا آغوش رنگیں دلفریب و دلربا
علم سے بن جائے اقلیدس کا صرف اک دائرہ

مصحفِ روئے کتابی روکشِ نازِ گلاب
اور بن جائے لغت یا دفترِ علمِ حساب

نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات
بزمِ کاوش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات

ظاہر ہے کہ ان دلائل کو سن کر فلسفیت مسکرا دے گی کیونکہ عورت کو چاندنی قوس قزح، شگوفہ، لالہ زار وغیرہ کے مثل قرار دے کر اس کے شانوں کو علم کے بار کے متحمل نہ ہو سکنے کا نتیجہ نکالنا حکیمانہ استدلال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ عورت کو چاندنی وغیرہ کے قبیل کی چیز سمجھنا ایک فلسفی کے نزدیک قیاس مع الفارق ہی ہوگا لیکن اس کے باوجود کہ متذکرہ بالا نظم کا طرزِ استدلال حکمت و فلسفے کے دربار میں ذرا سے احترام کا بھی مستحق نہیں ہے تاہم اس کی شاعرانہ دلفریبیوں اور دلربائیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسے پڑھ کر ذوقِ سلیم پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور انھیں غیر حکیمانہ دلائل کو مصحفِ شاعری کی آیاتِ کمال قرار دینا ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شعریت کا سرچشمہ پرپیچ در پیچ اقتصادی نظامات نہیں ہیں کیونکہ یہ حکمت و فلسفے کی چیزیں ہیں؟ البتہ ایک حقیقی شاعر کو ان حقائق سے اتنا تعلق ہو سکتا ہے کہ وہ شاعری کے ایوان کی تعمیر کے لئے ان سے ایسی چیزیں اخذ کرے جن کا تخاطب ہمہ گیر ہو اور "جو زمان و مکاں" کی قیدوں میں اُلجھ کر اپنی اپیل کی عمومیت زائل نہ کر دیں۔

ان چیزوں کے واقعی طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ شعر کا مفہوم اور اس کے اصلی حدود پیشِ نظر رہیں اگرچہ "ذوقی مفہومات" کی منطقی تحدید و تعیین نہایت دشوار ہے تاہم اگر "قانونِ استقرار" سے مدد لی جائے اور یہ طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ بالکل ہی نیا مفہوم واقعاتی حقیقتوں سے بیگانہ ہو کر اپنی طرف سے پیش کر دیا جائے جس میں "شاعر" کو

"انسان کامل" بنانے کی خواہش مضمر ہے تو اس مرحلے کے طے کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو سکتی ہے۔

قانونِ استقراء پر عمل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ان تمام افراد کے جواہر سخن پر تحلیل و تجزیے کی نظر کی جائے جنھیں مختلف زمانوں کا منجھا ہوا "ادبی ذوق" شاعریت کی سند عطا کر چکا ہے اس تول اور پرکھ کے نتیجے میں ہمیں ایسی چیزیں مل سکیں گی جن سے شعر کی حدیں متعین ہو سکیں۔ذوقِ سلیم کے معیار پر پورے اترنے والے اشعار میں جو چیزیں مشترک ملیں گی وہی "شعریت" کے کالبد کے لئے عناصر کی حیثیت رکھیں گی۔مقبول و مستند شعراء کی ادبی کائنات کے اس "استقرائی تحلیل و تجزیہ" کے بعد شعر کی ماہیت کی تعیین کے سلسلے میں یہ کہنا شاید حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ مختلف واقعات و کیفیات و حالات و مناظر سے اثر پذیر ہو کر جو ڈھلے ہوئے موزوں و خوش گوار آفاق گیر نغمے وجود میں آتے ہیں وہ شاعری ہیں۔ حالات و مناظر سے تاثر کے بعد والی منزلیں تخئیل و قوت و بیان کی مدد سے طے ہوتی ہیں۔ جذبات و واردات کے کون سے پہلو اُجاگر کئے جائیں اور کون سے تاریک رکھے جائیں۔ان کی تصویر کھینچنے میں کن لفظوں سے کام لیا جائے اور کن لفظوں سے نہیں۔تشبیہہ و استعارے تمثیل و کنائے میں سے موقع کی مناسبت سے کون سا اسلوب بیان اختیار کیا جائے اور کون سا نہیں ؟ انھیں امور کا صحیح فیصلہ مذکورہ بالا صفات سے متصف نغموں یا دوسرے لفظوں میں شاعر کی تکوین کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ شاعر کی اس ہیئت کو براہ راست "ذاتی حیثیت سے" "افادیت" یا کسی مخصوص اقتصادی و سیاسی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مقام پر ضمناً جناب اختر اریوی کی ایک فروگذاشت کی طرف اشارہ کر دینا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ جناب اریوی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے "کہ میتھو آرنالڈ کے اصول "شاعری تنقید حیات ہے" کے مطابق نظیر کی شاعری کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے" میتھو آرنالڈ نے شاعری کو "تنقید حیات" نہیں قرار دیا ہے وہ خود اپنے اُس مضمون میں جو اس نے بائرن پر لکھا ہے کہتا ہے کہ میری طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ میں شعر کی تعریف "تنقید حیات"

سے کرتا ہوں مگر یہ واقعہ نہیں ہے میں نے یہ تعریف لٹریچر کی کی ہو۔

یہ سچ ہے کہ شعر لٹریچر کی ایک شاخ ہونے کی وجہ سے آرنالڈ کے نزدیک تنقیدِ حیات سے لازماً متصف ہوگا۔ لیکن شعر کے لئے صرف اس صفت کا پایا جانا کافی نہیں ہوگا۔ شعر خاص ہے اور لٹریچر عام جو اپنے تحت میں بہت سے دوسرے افراد جو شعر سے ممتاز ہیں رکھتا ہے اس لئے شعر میں آرنالڈ کے نزدیک بھی "تنقیدِ حیات" کے علاوہ کچھ اور ایسی مزید چیزیں ہونا چاہئیں جو اسے لٹریچر کے دوسرے افراد سے علیحدہ کردیں۔ اس گذارش کا منشا یہ ہے کہ اگر بالفرض نظیر کی شاعری میں تنقیدِ حیات کافی طور سے موجود ہو تب بھی میتھو آرنالڈ کے اصول کے مطابق اس کی شاعری کا مقام بہت اونچا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تنقیدِ حیات کے علاوہ ان چیزوں میں جو شاعری کو لٹریچر کی دوسری قسموں سے الگ کرتی ہیں۔ نظیر کی بلند پائگی نہ ثابت کردی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ جب ان جدید خیالات کے علمبرداروں سے یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی شاعری کو "اشتراکی نظام" سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے ہم بھی اسے ان قیود سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اُن کے طرزِ تنقید ان کے اندازِ بحث اور اُن کے اسلوب نظر سے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی۔

وہ جب کسی شاعر کا کلام پرکھنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو اُن کے تیوروں سے اس کا صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ اقتصادی نظام کے سانچے میں شاعری کو ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب تک کہ شعر کے چہرے پر "اشتراکیت" کا آب و رنگ نہ ہو۔ اُن کی پسندیدگی کا جذبہ حرکت میں نہیں آتا جو شاعر "اشتراکی ڈھرے" سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے انھیں اس کے کلام میں جاگیردارانہ نظام کے مہلک جراثیم رینگتے نظر آتے ہیں۔ خود زیرِ بحث مضامین سے بھی ان کی اسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے آٹے دال کا بیان۔ مفلسی، پیسہ، چپاتیاں وغیرہ وغیرہ پر خصوصیت سے اُن کی پسندیدگی کی نظروں کا جم جانا اسی دل کے بھید کو بتاتا ہے۔

ہر چیز کو "اشتراکی رنگ" میں شرابور دیکھنے کی خواہش ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ میر و غالب و

انیس جیسے اساتذہ شعروادب کی شاعرانہ حیثیت کو مشتبہ دکھایا جاتا ہے اور ہر اُس پوچ گو کو جو اُن کے خیال میں اُن کی "منشا" کے خیالات وجذبات سے ہم آہنگ ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی مدح میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاتے ہیں اور بار بار یہ آواز دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ فلاں شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے گویا میر وغالب وانیس وغیرہ کی شاعری کو زندگی کی تہوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ زندگی وہی ہے جسے "اشتراکی فلسفہ" زندگی بتائے۔

ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کے انھیں شیوہائے نقد وبحث پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ زبان سے وہ کچھ کہیں لیکن حقیقت دوسری ہے۔ شعر سے متعلق اُن کی پسند اور عدم پسند کی تہہ میں ان کی ایک خاص "اقتصادی نظام" سے والہانہ وابستگی پنہاں ہے ممکن ہے انھیں اس کا احساس نہ ہو۔ لیکن ان کی یہ تنقیدی روش نتیجہ ہے اس غیر شعوری بہاؤ کا جو شاعر کو اشتراکیت سے ہم آہنگ سمجھ لینے سے ظہور میں آتا ہے۔ اس بنیادی غلطی کے بعد ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس شاعری کو پسند کر سکیں جس میں تصوف آموز محبت یا قناعت یا دنیا کی بے ثباتی کے نقشے دلفریب عنوان سے اُتارے گئے ہیں۔ انھیں اپنے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے یہ کہنا ہی چاہیئے ؎

ساتھ آنے والی کے ہے حشمت وفوج وسپاہ ؎ جا بجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں شاہ

یا پھر قحط والی وہ نظم جس میں "ازاربند" اور "سوراخ دار بند" آج کل کی اصطلاح کے مطابق۔ حیرت خیز واقعاتی انداز میں (جسے میں اپنے دوستوں سے معافی مانگتے ہوئے بھیانک قسم کی عریانی سے تعبیر کروں گا) نظم کئے گئے ہیں۔ شاعری کے بہترین معجزے ہیں اور اُن کے مقابلے میں یہ شعر

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید وپیمبر شکار ویزداں گیر

پھر غالب کا وہ قطعہ جس کا عنوان یہ ہے:۔

اے تازہ واردانِ ہوائے بساطِ دل ٭ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اور خاتمہ یہ ہے :-

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ٭ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

روکھا پھیکا بدمزہ اور سیٹھا ہے۔

شائد معارضے میں کہا جائے کہ ہمارا متقدمین کے شعری سرمایے پر سر دھننا اُن کے اشعار کو "درِ شہوار" کی لڑیاں" بھی سمجھنا نتیجہ ہے ہماری جاگیردارانہ نظام سے وابستگی کا۔ ہم چونکہ جاگیردارانہ نظام کی آغوش میں بڑھے پلے ہیں اس لئے اس کی سب چیزیں ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اس کی صناعیاں ہمیں پسند آتی ہیں اُن کے شعر و ادب کو ہم آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں اس کے جواب میں عرض کیا جائے گا کہ ہمیں بھی ان اقتصادی نظاموں سے بلند ہو کر شعر و ادب کا جائزہ لینا اور ان سیاسی و غیر سیاسی رجحانات سے اپنے دامن کو بچانا ضروری ہے۔ صحیح نقد کے لئے ہمیں اپنے ذہن کی تجدید کی بعینہٖ اُسی طرح ضرورت ہے جس طرح ترقی پسند ادیبوں کو۔ یہ سوال کہ آیا یہ علیحدگی ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ جہاں تک اُس کے امکان کا تعلق ہے اس میں کوئی استحالہ نظر نہیں آتا انسانی ذہن اس قسم کی تجدید پر اسی طرح قادر ہے جس طرح وہ فرائض تنقید ادا کرتے وقت ملکی و قومی و مذہبی تعصبات سے اپنے کو علیحدہ کرنے پر۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی تجدید دشوار ہے لیکن ناممکن نہیں ہے اگر دماغ کو "تنقیدی ورزش" میں ان امور کے ملحوظ رکھنے کا عادی بنایا جائے تو کچھ دنوں کے بعد نمایاں کامیابی ہو سکتی ہے اور اگر فی الحقیقت یہ تجدید اور علیحدگی ذہن کے لئے ممکن ہی نہیں ہے تو بھی میں عرض کروں گا کہ تنقید کا فرض صحیح طور پر ادا کرنا بھی ناممکن ہے اور اس صورت میں ہمیں ایک متشکک کی حیثیت اختیار کر کے اس فرض کی بجا آوری سے بالکل ہی دست کش ہو جانا چاہیے۔

شعر و ادب کو اشتراکی نقطۂ نظر سے دیکھے جانے کے متعلق جو اوپر مخالفانہ اظہار کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ قطعی نہیں ہے کہ متقدمین کے تمام ادبی سرمائے کو قابلِ احترام قرار

دے دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اُن کی شاعری کا جو دھارا تھا اُسے دوسرے جدید راستے اختیار
ہی نہیں کرنے چاہئیں۔ یقیناً اُسن کی شاعری کے خزانے میں بہت سے کھوٹے سکے بھی ہیں جنھیں
رد کرنا ہی پڑے گا۔ مگر بحث جو ہے وہ یہ کہ اُن کی ادبی پونجی کو مسترد یا قبول کرتے وقت ہمیں
اس جذبے سے متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ چونکہ وہ اوپری طبقہ یا متوسط طبقے سے تعلق رکھنے
والے افراد کے خیالات و افکار کی آفریدہ ہے اس لئے اُسے مردود ٹھہرانا ناگزیر ہے یا اس کا پسند
کرنا لازمی ہے۔ ان کی ادبی متاع کو منظور یا نامنظور کرنے کے لئے دوسرے معیاروں کی
ضرورت ہے جو بہرحال ان اقتصادی و سیاسی نظامات کی پابندیوں سے بے نیاز ہو سکیں
ہمارے پرانے واجب الاحترام شعرا کے متعلق آج کل یہ بہت کہا جا رہا ہے کہ اُن کی
دنیائے عشق و محبت میں "تخئیل محض" کی بلند پروازیاں ہوتی ہیں" واقعیت و اصلیت" سے انھیں
کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کو ترقی پسند مصنفین و ناقدین نے بہت بڑھا رکھا ہے۔
چنانچہ نظیر نمبر میں بھی مختلف مقالہ نگاروں کے زبان قلم سے یہ اعتراض کنایتاً ہی سہی
ادا ہوا ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات قطعاً نہیں آئی کہ نظیر کی شاعری تو زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں
پھیلائے ہوئے ہے۔ اور ہمارے دوسرے بلند پایہ شاعروں کے کلام کی جڑیں زندگی کی تہوں میں نہیں
پھیلی ہوئی ہیں؟

آیئے ذرا اس پر غور تو کریں کہ آخر واقعیت و حقیقت کا مطلب کیا ہے؟ کیا "واقعیت"
اسی وقت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ "عوام" کی "طرز معاشرت" ہی کی تفسیریں ہوں۔ انھیں کے
حرکات و سکنات کے مرقعے کھینچے جائیں۔ انھیں کے لہجے میں بات کی جائے اور انھیں کے
درد و الم کے افسانے سنائے جائیں۔ انسان کا وہ طبقہ جو "اوپری درجے" پر خواہ اپنے
دل و دماغ کی قوتوں کے بل بوتے پر یا پھر اپنی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کی مدد سے پہنچ گیا ہے
اور اس نے اپنے ہی لئے علم و ادب کے چشموں سے سیراب ہونے کے راستے مخصوص کر لئے ہیں

انھیں انسانوں کا جزو ہے اور انسانی زندگی کی وسعتوں کو بڑھا رہا ہے یہ طبقہ بھی جذبات واحساسات رکھتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات کی پیدائش کا سرچشمہ بھی مادی ہی چیزیں ہیں ایسی صورت میں ان جذبات و احساسات کو اور اُن کی گوناگوں کیفیتوں کو "واقعیت اور اصلیت وحقیقت" سے کیونکر علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی سوسائٹی کی تصویریں۔ اُن کی معاشرت کے نقشے "واقعیت" کے خلاف بغاوت کیونکر ہے؟ اُن کے جذبات واحساسات میں اگر تخئیل تصرف کرکے دلفریبی کا رنگ اعتدال کے ساتھ بھرتی ہے اور اُنھیں شعر کے قالب میں ڈھالتی ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اصلیت نہیں رہی بلکہ "تخئیل محض کی بھیانک بلند پروازی" کے قدم درمیان میں آگئے اور ان نغموں کی جڑیں زندگی کی تہوں سے الگ ہوگئیں۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ "اقتصادی رجحانات" کے ماتحت زندگی صرف اسی کو قرار دے لیا جائے جو بدقسمتی سے "جنتا" کے حصے میں آئی ہے مگر یہ وہی گڑھا ہے جس سے ایک منطقیانہ مذاق رکھنے والا نقاد بچنا چاہتا ہے وہ اپنی نظر سے زندگی کے مختلف رخوں کو اوجھل نہیں کر سکتا۔

یہ مانا جا سکتا ہے کہ اوپری طبقے کی تہذیب نے جو تیور اختیار کر لئے ہیں وہ ان تیوروں سے مختلف ہیں جن کا وجود آغاز فطرت کی "ٹھیٹھ بددی تہذیب" میں ہوتا ہے مگر یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ تہذیب و شائستگی کا دیا جن محفلوں میں جلتا ہے اُن کی ہیئت اُن محفلوں سے جنھیں "فطری بربریت" کے ہاتھ آراستہ کرتے ہیں۔ بہت فرق رکھتی ہے۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین اور ناقدین تہذیب کی اس نشوونما یافتہ کیفیت وصورت پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتے کیونکہ وہ مشینری کی برکتوں کے قائل ہیں جو فطرت سے بہرحال دور کرنے والی چیز ہے۔ آخر نیچر کی برہنگی کو انسان نے طرح طرح کے لباس پہنائے ہی دئے ہیں اور جھونپڑوں کو عالی شان محلوں میں تبدیل کر ہی دیا ہے۔

اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ صدیوں کی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد ہمارا ایک طبقہ ہی سہی جس تہذیب و شائستگی تک پہنچا ہے اسے تہس نہس کر دینا دانش مندانہ فعل نہیں ہو سکتا

البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس کو اور عروج دینے اور اس کے محدود دائرے کو اتنا پھیلا دینے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس میں تمام انسانی طبقے سما جائیں ظاہر ہے کہ اشتراکیت کا نقطۂ نظر نہیں ہے کہ سرے سے تہذیب و شائستگی ہی کا گلا گھونٹ دیا جائے انسانی بدبختیوں اور مصیبتوں کو زیادہ عام کرایا جائے اور ہماری انسانیت کو "حجری دور" کی طرف عود کرنے کی دعوت دی جائے۔ اشتراکیت کا مقصد تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تہذیب و شائستگی کے دائرے کو وسیع کرے تمام انسانوں کو اس کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ اشتراکیت موجودہ معاشرت کے نظام پر آخر آٹھ آٹھ آنسو کیوں رو رہی ہے؟ اس کی وجہ یہی تو ظاہر کی جاتی ہے کہ موجودہ سوسائٹی کے نظام نے جسم و دماغ کی آسائشوں کو چند افراد کا حصہ بنا دیا ہے تمام افراد اس کے تحت میں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں گویا اس طرح عوام کی زندگی کے معیار کی پستی اور ان کی تہذیب و شائستگی سے تہی دامنی تسلیم کی جا رہی ہے۔ اس جگہ اس امر پر بھی غور کر لینے کی ضرورت ہے کہ وہ ادب جس کی داغ بیل اس غیر شائستہ زمین پر پڑے گی کیونکر پائداری حاصل کر سکتا ہے اور وہ برگ و بار کیونکر قابل التفات ہو سکتے ہیں جو اس طرح پیدا ہوں گے؟

پروفیسر احتشام حسین صاحب نے فرمایا ہے اور صحیح فرمایا ہے کہ "نظیر کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت ناکمل ہے۔ ان کے اسلوب میں بے حد ناہمواری ہے۔ ان کے تفکرات میں گہرائی کا نام نہیں۔ ان کے احساسات اور تجربات میں ایک دہقان کی بھونڈی سادگی اور بھدی بے ساختگی ہے۔" میں اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں نظیر کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو شعرا جذبات و احساسات اور زبان و اسالیب بیان کے لحاظ سے اپنے کو عوام کی سطح پر لے آسکے اُن کے ادب و شاعری میں یہ نقائص ناگزیر طور پر پیدا ہوں گے اس سے وہی شاعر محفوظ رہ سکیں گے جو اس معاملے میں "باہمہ" ہونے کے ساتھ "بے ہمہ" بھی رہیں۔ اگر وہ اس پر قادر نہیں ہیں تو پھر انھیں "مادر و پدر" کو تکیہ کلام بھی بنانا ہوگا۔ کیچڑ اور گوبر میں تخیل کے ہاتھ

بھی تمیز نا ہوں گے۔ اور یہی نہیں نہ معلوم کیا کیا کرنا ہوگا کیونکہ "ٹھیٹھ واقعیت نگاری" کا فرض اُن کے مذاق میں اس طرح ادا ہو سکے گا۔ عوام اس طریقے سے ان کی باتیں سمجھ سکیں گے کیونکہ وہ اپنے ثقافتی معیار (Cultural standard) کی پستی کی وجہ سے اُن افکار و خیالات کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو صاف ستھرے اور اُجلے ہیں۔ پرانی شاعری پر فلسفہ و حکمت کی باتوں کو تو جانے ہی دیجئے وہ جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہیں مگر سوال یہ ہے کہ عوام اشتراکیت کے پیچیدہ خیالات ہی کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ کارل مارکس اور انجیلز کے نظریات کی ہمنوائی کا شرف بھی تو صحیح معنوں میں اُنھیں چند مخصوص افراد کو حاصل ہو سکتا ہے جو "ثقافت" کے اعلیٰ درجے طے کر چکے ہیں۔ اشتراکی فلسفہ بھی تو "متاع ہر دکان" نہیں بن سکتا۔ جوش ملیح آبادی بھی تو موجودہ سوسائٹی کا رخ بدل دینے کے بلند بانگ نقیب ہیں۔ لیکن کیا اُن کے عوام اُن کی شاعری کی عظمت کا واقعی احساس کر سکتے ہیں؟ پھر کیا "پرولتاری مذاق" پر اُن کی شاعری پر خط نسخ کھینچا جا سکے گا؟ شائستہ مذاق کی پستی کا سامان آخر کس منطق کی بنا پر دریا برد کئے جانے کا مستحق قرار پا سکتا ہے؟

یہاں اس امر کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ میرا مدعا یہ قطعی نہیں ہے کہ وہ تدبیریں نہ اختیار کی جائیں جن سے عوام کی بہبود کی صورتیں نکل سکیں یا ان کی تہذیب کا گھنونا پن، نظافت و پاکیزگی میں تبدیل ہو سکے۔ اس سلسلے میں ادب و شاعری سے بھی قطعاً کام لیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو اپنے ادب و شعر کے بڑے حصے کو وقتی ضرورت کے ماتحت اُن کے مذاق کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہی مگر اُسے "ناگزیر برائی" (Necessary evil) سمجھتے رہنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شاعری کی وہی حیثیت ہوگی جو پروپگنڈا کی خاطر والی شاعری کی یعنی "تبلیغی شاعری" کی ہو سکتی ہے۔ یہ کبھی نکھ سکھ سے درست نہیں ہو سکتی۔ اس کی ہر ادا میں بد قوارہ پن پایا جائے گا۔ جس طرح مہذب قومیں جب کسی ملک کے وحشی باشندوں ۔ام کرنا چاہتی ہیں تو انھیں بھدے کھلونے دے کر اپنی طرف ملتفت کرتی ہیں اور ان میں شائستگی

پیدا کرنے کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں اسی طرح ادب و شاعری کے یہ بھدے کھلونے دے کر عوام کو اپنی طرف رجھایا جا سکتا اور تہذیب و شائستگی کی برکتیں قبول کرنے کے لئے انھیں آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس "تبلیغی شاعری" کی "وقتی افادیت" کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت کے وقت بہت سی ناکردنی باتیں کی جاتی ہیں۔ جب کسی عام بلا کا نزول ہوتا ہے تو اس وقت عام توجہ ان خطروں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جن میں انسان اپنے کو گھیرا ہوا پاتا ہے اور اُن کے دفعیہ کے لئے ہاتھوں، پیروں کو اچھے برے ہر عنوان سے حرکت دیتا ہے۔ اس وقت "فن کاری" کی لطافتوں کی طرف التفات نہیں ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس عام دارو گیر اور چپقلش میں وقتی ضرورتوں کے ماتحت جو باتیں ہم سے سرزد ہوں انھیں لطیف المذاقیوں کا سرمایہ دار سمجھ لیں۔

مسئلے کا اس پہلو کو دیکھتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ "وقتی افادیت" کے پیمانے سے شاعری کی حقیقی عظمت و رفعت کو ناپنا شوخ ادائی ہو تو ہو لیکن دانش مندی نہیں ہے۔ "تبلیغی شاعری" یعنی شاعری برائے پروپیگنڈا قطعی طور سے اُس درجے میں نہیں رکھی جا سکتی جو "شعر عالی" کے لئے مخصوص ہے۔

غزل

(جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ گورکھپوری)

یہ تو نہیں کہ عشق پر جورِ بتاں گراں نہیں
ہاں مگر اب علاجِ غم آہ نہیں فغاں نہیں

آہ وہ شدتِ حیات جو نہ عمل میں جگمگائے
کیفِ نشاط و کیفِ غم عشق کے ترجماں نہیں

جلوہ گہِ جمالِ یار ، سجدہ گہِ سرِ نیاز
"دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں"

آج کچھ اس طرح کھلا رازِ سکونِ دائمی
عشق کو بھی خوشی نہیں حسن بھی شادماں نہیں

دیر و حرم ہیں گردِ راہ نقشِ قدم ہیں مہر و ماہ
ان میں کوئی بھی عشق کی منزلِ کارواں نہیں

نظمِ جہاں بدل نہ جائے۔ اہلِ جہاں سکون پائیں
عشق سے یہ یقیں نہیں حسن سے یہ گماں نہیں

کس نے صدائے درد دی کس کی نگاہ اٹھ گئی
اب وہ عدم عدم نہیں اب یہ جہاں جہاں نہیں

عشق نہ مٹ سکا تو پھر کس لئے خونِ آرزو
اب مجھے اور درد دے یہ کوئی امتحاں نہیں

مردہ دلوں سے کیا سنیں شرح و بیانِ زندگی
سینے میں بجلیاں نہیں جلتی ہوئی زباں نہیں

عشق حیاتِ محض کی لرزشِ بے قرار ہے
دردِ نہاں کی رازدار سازشِ جسم و جاں نہیں

کان پڑی صدا بھی آج گم ہے سکوتِ یاس میں
نغمۂ سازِ زندگی غلغلۂ جہاں نہیں

بارِ سکوں نہ اٹھ سکا ہستیٔ بے قرار سے
روزِ ازل سے دوش پر کوہِ الم گراں نہیں

گرد و غبار سے ہو صاف غم کی فضائے بیکراں
اب تو فنا و عشق کے موت بھی درمیاں نہیں

اہلِ وفا گذر گئے تیغ بکف ، کفن بدوش
مقتلِ نازِ حسن بھی منزلِ جاوداں نہیں

خونِ شہیدِ عشق کا آج ہے زیبِ داستاں
نعرۂ انقلاب ہے ماتمِ رفتگاں نہیں

وقتِ بیانِ غم کچھ آج کھوئے گئے ہیں ہم فراقؔ
کون سنے کہ خود ہمیں مائلِ داستاں نہیں

علوم جدید کا مآل

محمود اسرائیلی صاحب

ہم نے تو یہ سنا تھا علومِ جدید سے — مٹ جاتے ہیں نقوشِ جہالت دماغ سے

یورپ کے رہنے والے مہذب ہیں اور انھیں — علم و ہنر سے انس ہے نفرت فراغ سے

لیکن اس علم و فن نے یہ کیا گل کھلائے ہیں — چنگاریاں نکلتی ہیں یورپ کے باغ سے

ان خوشنوائیوں کا مگر راز اب کھلا — بلبل کے نغمے سنتے ہیں منقارِ زاغ سے

تہذیبِ مغربی کے وہ گلہائے دِل فریب — دیکھا جو غور سے تو نظر آئے داغ سے

اس کی صراحیوں میں ہلاہل تھا مے نہ تھی — دنیا ہلاک ہو گئی دَورِ ایاغ سے

اب اپنے جام زہر کا یہ خود شکار ہے
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

بین الاقوامی سیاست

آب کہو ۔۔۔۔۔۔؟

بین الاقوامی سیاست

نقشہ جنگ

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بہاراں :-

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اردو غزل کے موجودہ دور میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں کئی برس ہوئے ان کا ایک مجموعہ کلام "اثرستان" کے نام سے شائع ہو کر اردو کے ادبی حلقوں میں شہرت و قبول حاصل کر چکا ہے۔ ایک دوسرا مجموعہ کلام "بہاراں" کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ کتاب بانگ درا کی تقطیع پر تقریباً پانچسو صفحوں پر مشتمل ہے شروع کے ۲۲۵ صفحوں پر نئی غزلیں ہیں۔ ۲۵ صفحوں میں متفرق اشعار ہیں اور باقی حصے میں "اثرستان" کا انتخاب ہے۔ دیوان کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے نہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب میں زمانے کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ شاعر کے ذہنی ارتقار کا اندازہ ہو سکے۔ حالانکہ یہ بالکل غیر ضروری تھا۔ اس لئے کہ جہاں تک کہنہ مشق غزل گویوں کا تعلق ہے ان کی غزلوں کے انداز میں زمانہ کوئی خاص تبدیلی نہیں کرتا۔

بہاراں کی غزلیں شروع سے آخر تک تقریباً ایک ہی رنگ کی ہیں اور دیوان کو کوئی کسی جگہ سے پڑھنا شروع کر دے اسے اثر کا خاص رنگ جھلکتا نظر آئے گا۔ زمینوں کی شادابی الفاظ کا شاعرانہ اور فنی استعمال، بحروں کا ترنم اور موسیقی اور ایک خاص قسم کی شگفتگی۔

اثر میر کے بے حد معتقد ہیں اور وہ اس ناخدائے سخن کے رنگ میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ جا بجا میر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خصوصاً بحروں کے انتخاب میں۔ چھوٹی اور بڑی اکثر بحریں ایسی ہیں جن کے ترنم میں میر کی روح جلوہ گر ہے۔

مثال کے لئے کچھ شعر سنئے ؎

میں اس سے کہوں دکھ درد ترا بس میرؔ تو اپنا دل تو بہ ہی   سب آ ہی گئی مجھ پر ہو گی کمبخت ترا کیا جائے گا

جب سے ان سے آنکھ لڑی ہے آنکھوں میں اپنی خواب نہیں   اس پر یہ مصیبت ہے ہمدم ، صبر کی دل کو تاب نہیں

تری زلف کیوں ہو شکن شکن کہ نثار بادِ صبا نہ ہو   ترا حسن کیوں ہو چمن چمن کہ بہار آ کے فدا نہ ہو

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے ، منھ کو کلیجہ آنے دو   تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے ، ناصح کو سمجھانے دو

رک رک کے چلا چل چل کے رکا ، ساقی کی نگہ پھر جانے سے   کیا کیا نہ ابھار شیشے نے ، نکلی نہ جھجک پیمانے سے

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو ، روتے پھرنا راتوں کو   جو ہیں غافل وہ کیا سمجھیں ، عشق و جنوں کی باتوں کو

یا چھوٹی بحروں میں ؎

جس نے غم نیوش کیا   غم کو طرب جوش کیا

حسرتیں دل کی پوچھنے والے   تیرے طرزِ سوال نے مارا

ایک دوسرے طریقے سے اثرؔ کے کلام پر میرؔ کا اثر بے حد نمایاں ہے ۔ میرؔ کے اکثر مضامین کو اثرؔ نے اپنے خاص انداز میں ایک شاعرانہ حسن کے ساتھ نظم کیا ہے ۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے   دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اثرؔ نے کہا ہے ؎

اے جنوں بات پہنچ جائے جگر یا دل تک   روز تجدید کہاں تک ہو گریبانوں کی

شاید یہ میرؔ ہی کا اثر ہو کہ اثرؔ کے یہاں "بہار" اور "دل" کے اشعار بہت اچھے ہیں ۔ موجودہ

دور میں اردو کا کوئی غزل گو شاعر ان دونوں مضامین کو اتنے اتنے طریقوں سے نظم نہیں کرتا جیسے اثرؔ۔ اس مضمون کو انہوں نے بالکل اپنا بنا لیا ہے۔ یوں تو سارے دیوان میں سیکڑوں شعر ایسے ہیں لیکن اندازہ کے لئے کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ اتفاق تو دیکھو، بہار جب آئی — ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا

یاد دلواؤ اسیروں کو نہ بھولی ہوئی بات — ہم صفیرو! نہ کہو فصل بہار آئی ہے

بہتر نہیں دل سے کوئی رہبر — بڑھ کر نہیں دل سے کوئی رہزن

سچ ہی کوئی نہیں ہے برے وقت کا شریک — دل سا رفیق بھی اسی دشمن سے جا ملا

اثرؔ کے کلام میں جو ترنم ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی تقریباً ساری کی ساری زمینیں بہت شاداب ہیں اس لئے ان میں شگفتگی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کا استعمال بہت اچھا کرتے ہیں۔ خاص کر فارسی کی ترکیبوں سے اپنے شعروں میں ایک خاص طرح کی روانی اور موسیقی پیدا کر لینا اثرؔ کی خصوصیت ہے۔ مثال کے لئے ایک غزل کے کچھ شعر سنئے ؎

نرگس مست خواب آلودہ — لب لعلیں شراب آلودہ
دوش پر زلف عنبریں بکھری — اور گریباں گلاب آلودہ
پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا — اف وہ چہرہ حجاب آلودہ
مجھکو دیکھا تو دیکھئے مسرت — تھی جبیں پیچ و تاب آلودہ
یاد ہے یاد ہے اثرؔ اب تک — وہ نگاہ عتاب آلودہ

ایک دوسری غزل کے کچھ شعر سنئے ؎

چشم خونناب بستہ کے مانند ۔۔۔ دل بھی ہے صید خستہ کے مانند
بے ثباتی کا آئینہ ہوں میں ۔۔۔ نقش بر خاک بستہ کے مانند
آہ گلچیں بھی مجھ کو بھول گیا ۔۔۔ گل بیرون دستہ کے مانند

لکھنؤ کی شاعری کے ایک دور میں، جنازہ، ماتم، بالیں، بستر مرگ، مزار وغیرہ کے ذکر سے جو درد اور اثر پیدا کرنے کی ناکامیاب کوشش کی جاتی تھی اس کا عزیز پر بہت گہرا اثر تھا۔ ان کی قنوطیت کے اسی خاص انداز نے ان کی غزلوں میں تڑپ پیدا نہیں ہونے دی۔ اثر عزیز کے شاگرد ہونے کے باوجود بھی اس خاص قسم کی قنوطیت سے بالکل الگ ہیں اور اسی لئے ان کے یہاں لطیف تغزل، اس میں ہلکی سی شوخی اور طنز اور اس کے ساتھ ساتھ کیفیت سرمستی بہت زیادہ ہے۔ مثال کے لئے کچھ شعر سنئے ؎

اچھا نہیں ہوتا کبھی بیمار محبت ۔۔۔ اچھا ہے کہ تم فکر مداوا نہیں کرتے

مومن کی شوخی طنز کا لطف ہے ؎

ترا وسوسہ ہی غلط ضرور اسے تو نہ وعدہ خلاف کہہ ۔۔۔ مری آس توڑ نہ ہمنشیں اسے یاد وعدہ رہا نہو

تیرے کرم و لطف کا چرچا نہ کریں گے ۔۔۔ ایسے ہی تو ہیں غیر کہ ایسا نہ کریں گے
معلوم نہیں سن کے وہ حال دل بیمار ۔۔۔ کچھ فکر کریں گے کہ اثر یا نہ کریں گے

بہاراں کی کتابت، طباعت، کاغذ اور ظاہری شکل و صورت سب چیزیں اچھی ہیں۔ ٹرشے کی مضبوط جلد ہے۔ قیمت ۳ روپے ہے اور غالباً نظامی پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

(و ع)

رسید کتب و رسائل

۱ ۔ انجمن ترقی اردو کی کہانی	انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی
۲ ۔ خمسۂ کیفی	" " " " " "
۳ ۔ اصطلاحات پیشہ وراں	" " " " " "
۴ ۔ حیات جاوید (نیا ایڈیشن)	" " " " "
۵ ۔ تاریخ ادبیات جدید ایران	" " " " "
۶ ۔ تقویم ہجری و عیسوی	" " " " "
۷ ۔ اسلام کا نظام سیاسی	از محمد اسحاق صدیقی، اشفاق منزل، قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی قیمت ۱۲؍
۸ ۔ رسالہ ادبی دنیا (سالنامہ)	لاہور
۹ ۔ رسالہ دیہاتی کسان	سری نگر
۱۰ ۔ مفردات القرآن	سرائے میر اعظم گڈھ (یوپی)
۱۱ ۔ رسالہ نور التعلیم (بانغان نمبر)	گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ (پنجاب)

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار شدہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے سنہ ۱۸۳۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خاص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر وتیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپکو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے ان خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خرید کرنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے۔ آپ نے ہماری اصلی خوشبو سے بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔

ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر حسنا بلڈنگ لکھنؤ

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقہ میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا سے اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں شعبہ تاریخ و سیاست جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور معاملے کے امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب سید عبدالقادر اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد (دکن)

کو لکھنا چاہئے

قیمت سالانہ پانچ روپئے — فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے

مغل لائن لمیٹڈ

قایم شدہ ۱۸۷۸ء جو زائرین بیت اللہ کو فریضۂ حج کرانے کیلئے اولین اور معتمد ترین لائن ہے

مغل لائن سے حج کیجئے

کمپنی کی ایک خاص حج سروس ہے۔ جس کے جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ جہاز عازمان حج کو بمبئی کراچی اور کلکتہ سے عدن پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں

جہازوں کے نام

ایس ایس اکبر .... ۴۰۲۳ ٹن	ایس ایس جہانگیر .... ۳۵۶۶ ٹن
ایس ایس علوی .... ۲۵۶۶ ٹن	ایس ایس خسرو .... ۴۰۲۳ ٹن
ایس ایس اسلامی .... ۵۰۰۹ ٹن	ایس ایس رحمانی .... ۵۲۹۱ ٹن

ایس ایس رضوانی ... ۵۲۰۷ ٹن

مال اور مسافروں کو لیجانے کے لئے دوسری سروسیں حسب ذیل ہیں

بمبئی اور کراچی سے شہر مکلا، عدن، بربرہ، جبوتی، سوڈان، بندر سودان اور جدہ کو ہر پندرھویں دن
بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی ماریشش کو ہر دوسرے مہینہ۔
جملہ تمام جہازوں سے کیبن اور ڈک درجہ کے مسافروں کے لئے جگہ کا انتظام ہے
تمام جہازوں میں ہر مذہب و ملت کے لئے بہترین اقسام کے کھانوں کا لاجواب انتظام ہے۔
تفصیلات حسب ذیل پتے سے معلوم کیجئے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کو بمبئی۔ مینجنگ ایجنٹس ۶ ابینک اسٹریٹ بمبئی۔ تار کا پتہ "دی مغل" بمبئی

تاجر صاحبان متوجہ ہوں

کیا آپ اپنی تجارت کو فروغ دینا اور اپنی اشیاء تجارت کو ہر مسلمان کے ہاتھوں
پہنچانا نہیں چاہتے؟ اگر چاہتے ہیں تو اس کا بندوبست کیجئے اور کوشش کیجئے کہ مسلمان زیادہ سے
زیادہ آپ کے کاروبار سے آگاہ ہوں۔ اس کے لئے اشتہار کا سب سے بہتر ذریعہ اخبار "مسلم"
ہے جو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔ اس اخبار کی سب سے بڑی خصو[صیت]
یہ ہیں کہ (۱) یہ خالص اسلامی تبلیغی اخبار ہے اور کسی خاص اسلامی فرقہ کا پرچہ نہیں (۲) اس اخبار کا
کسی خاص سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں اور اس وجہ سے اس کا حلقہ بھی محدود نہیں۔ اس کا
مقصد صرف حق و صداقت کی حمایت کرنا اور کذب و باطل کی تردید کرنا ہے۔ (۳) اس اخبار کو مسلمانو[ں]
کے تمام طبقات میں یکساں مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ سب سے اہم بات جو خصوصیت سے
قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہ اخبار نفع و نقصان سے قطع نظر کر کے صرف تبلیغ اسلام کی غرض سے
جاری کیا گیا ہے اور اس کے لئے معقول سرمایہ وقف کر دیا گیا ہے۔ اس لئے نہ اس کا اجراء عارضی
ہے اور نہ اس کے بند ہونے کا خوف ہے۔ چونکہ کارکنان اخبار کی سب سے زیادہ خواہش
یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی مسلمان کا گھر ایسا باقی نہ رہے جہاں مسلم نہ پہنچے۔ اس لئے آپ خود
اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں اشتہار دینا آپ کے لئے یقیناً کامیابی کا پیش خیمہ ہوگا۔

نرخ نامہ اشتہارات

ایک صفحہ ایک مرتبہ کیلئے پندرہ روپئے
ایک کالم ایک مرتبہ کے لئے چھ روپئے

اس سے کم و بیش اور مستقل اشتہارات کے لئے مینجر صیغہ اشتہارات سے خط و کتابت کیجئے۔ امید ہے
کہ آپ کم از کم تجربہ کے طور پر اپنا اشتہار دیکر کارکنان "مسلم" کو ممنون کریں گے۔

مینجر و مالک اخبار
سید عظمت علی شاہ

مطبوعات امیریہ دار التصنیف و تالیفات لکھنؤ

دیوان ثاقب : - یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں انکی غزلیں قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت ہوجاتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے۔ تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانچسو پچاس صفحات۔ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ہے (علاوہ محصولڈاک)

انیس اخلاق : - میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و تالیفات نے مرتب کی ہے اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع : - آج کل یوروپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہوجانا یقینی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہ جائے گا۔ یہاں حکومت نے پبلک کیلئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے لوگ اس کی رو سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کرسکیں۔ قیمت چار آنہ علاوہ محصول ڈاک

سلاح البیان : - حصہ اول و دوم مؤلفہ عمدۃ الواعظین، زبدۃ الذاکرین ابو البیان مولانا سید مہدی صاحب سلیم جرولی مؤلف جواہر البیان وغیرہ - فن ذاکری اور روضہ خوانی پر نہایت مفید ہے۔ قیمت ہر حصہ ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

پتہ :- دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

علمی و ادبی

ادبی مرکز میرٹھ کا سہ ماہی رسالہ

ایشیا

اردو زبان میں اس وقت تک ایشیا کا راستہ اس لئے نیا ہے کہ ہماری زبان کے اہل قلم زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والی باتوں کے متعلق کوئی اپنا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اگر آپ اردو رسائل کو اٹھا کر دیکھئے تو سرورق پھاڑ دینے کے بعد کوئی امتیازی نوعیت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن ایشیا کے مطالعہ سے آپ کو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ایک نوعیت رکھتا ہے اور مسائل ترقیات کے متعلق اس کی اپنی ایک رائے اس کے ہر صفحہ سے جھلکتی ہے۔ ایشیا میں سیاسی، علمی، تنقیدی، اقتصادی اور ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ مقصد اور اعلیٰ معیار کی ہم آہنگی کے ساتھ۔

مندرجہ ذیل چار ابواب میں رسالہ کو تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب	نئی صبح	ادبیات سیاسیات	دوسرا باب	نیا راگ	نظم و غزل
تیسرا باب	دکھ سکھ	افسانے اور ڈرامے	چوتھا باب	کسوٹی	تنقید و تبصرہ

ہر سہ ماہی کے بعد ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت جلد شائع ہوتی ہے جس میں مندرجہ بالا ابواب میں انسانی زندگی کے اکثر اہم ترین گوشوں پر بحث کی جاتی ہے جس کا یہ اثر ہے کہ ایشیا کا اسلوب انشا پردازی عوام کے خیال میں یورپ کے بہترین رسائل سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ اس کا مقصد قدامت اور فرسودگی، غلامی اور جمود کو ختم کر کے ایک نئی زندگی کا ایسا پیغام ناظرین تک پہنچانا ہے جو ذہنی آزادی، اجتماعی نظام، علمی معلومات اور سیاسی راہبری پر منتج ہو۔ ان تمام اعلیٰ مقاصد کے ساتھ ایشیا کے مضامین میں ادبی چمک اور شاعرانہ رنگینی زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہے ہمیں یقین ہے کہ آپ اس کے مطالعہ سے ضرور مسرور ہوں گے

قیمت سالانہ صرف نمبر عمر علاوہ محصول ملنے کا پتہ

مکتبہ ساغر" ادبی مرکز" میرٹھ

سال اجرا ۱۹۳۰ء

ہندوستان کا مشہور ترین

خالص، ادبی۔ علمی۔ فنی اور اصلاحی

ماہنامہ شاعر آگرہ

اگر آپ اُردو میں اجتہاد و اختراع۔ علو اور بلندی، ٹھوس تنقید، بلند پایہ
ادبی، تاریخی، اصلاحی مضامین۔ ادب میں اضافہ خیز، ہیجان انگیز روح کو تڑپا دینے
والی نظمیں، دلچسپ اور تدبیر منزل بتلانے والے افسانے صنف نازک کے آزادانہ خیالات و رجحانات
اور ہندوستان کے تمام واقعی شعرا کا تازہ ترین کلام دیکھنا چاہتے ہیں۔

تو آج ہی ماہنامہ "شاعر" آگرہ کے خریدار ہو جائیے

جو دس سال سے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے اور جس کا ہر پرچہ ادب کا
ایک شاہکار ہوتا ہے۔ یہ فخر "شاعر" کے معیار اور حسنِ مضامین کی وجہ
سے ہے کہ نمونہ دیکھنے کے بعد کوئی صاحب فوراً اس کا خریدار
ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہترین
فائن آرٹ کا رنگین شاہکار

قیمت سالانہ عہ

ملنے کا پتہ

منیجر "شاعر" قصر الادب آگرہ

نمونہ فی پرچہ ۴؍

رفیق باغباں

کاشتکاری اور باغبانی کے فن میں یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کا حسین و جمیل ٹائٹل پیج جنت نظیر ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی نہایت درجہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہوتا ہے۔ اس کے بلند پایہ مضامین بیکار نوجوانوں کو باکار بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ زمیندار اور کاشتکار دونوں کی فنی خدمت اس کا خاص شعار ہے۔ قیمت بہت کم یعنی صرف ۱ روپیہ سالانہ یہ رسالہ ۲۲×۱۸ کی تقطیع کے ۴۰ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ اردو زبان میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اس بے بہا رسالہ کو حاصل کرنے کے لئے جلدی کیجئے تاکہ دیہات کی نحوست بھی فوراً ہی دور ہو جائے۔

یہ رسالہ اپنے مضامین کی بہتری کے باعث تمام حکومتوں کا منظور شدہ ہے۔

منیجر رسالہ رفیق باغبان ہن مین نرسری سہارنپور

مشرقی ہندوستان کا واحد آزاد خیال اخبار

الہلال

جس میں

ملکی رہنماؤں کے بیانات، دنیائے اسلام کے اہم حالات اور ہندوستانی سیاسیات پر بے لاگ تبصرے شائع ہوتے ہیں

پڑھیے

سالانہ تین روپے، ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے، سہ ماہی ایک روپیہ

منیجر اخبار الہلال بانکی پور پٹنہ

ندوۃ المصنفین کی دو اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت:- غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے اب تک کسی زبان میں اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لئے جن حربوں سے کام لیا ہے۔ ان میں سلیوری کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ جدید ترقی یافتہ ملکوں میں اسلامی تبلیغ کے لئے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے۔ بلکہ مذہبی قہر و غلبہ کے سبب ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے اثر پذیر ہے۔ "غلامی" جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں دلچسپ، مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت، طباعت کاغذ اس قدر اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ قیمت مجلد [illegible]۔ غیر مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام:- اس کتاب میں اسلام کے پیش ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی وہ نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قایم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اقتصادیات کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ [illegible] ۴۴۴ قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible] کتابت طباعت اعلیٰ، ولایتی کاغذ

مینجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی

اقبال نمبر

فی پرچہ ــــــــ آٹھ آنے

البیان

امت مسلمہ امرتسر کا ماہوار صحیفہ

جلد ۱ نمبر ۹

فہرست مضامین

آپ یہ بے نظیر اقبال نمبر صرف آٹھ آنے بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے ابھی طلب فرما لیجئے ۔

مینجر البیان امرتسر

چندہ سالانہ تین روپے

سرحد کا سب سے پرانا اور حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد پشاور

(۱) سنہ ۱۹۲۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے زیر ادارت ملک امیر عالم اعوان ہزاروی (جامعی) شائع ہوتا ہے۔

(۲) آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔

(۳) صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔

(۴) سرحد میں اصطلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی بہت کچھ ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا ہمیشہ ارگن رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار و ہندوں کے لئے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

چندہ (رعایتی) سالانہ چار روپے
ششماہی دو روپے آٹھ آنے

المشتہر

منیجر ترجمان سرحد پشاور

مشرقی صحافت کا ایک نادر شاہکار

صدق

جو گذشتہ پانچ سال سے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے

زیر ادارت

نہایت آب و تاب سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ زمانے کی ناقدری اور مذہبی حیات سے بے تعلقی کے باعث مالی مشکلات کے بھنور میں پھنس گیا ہے جس سے اس کو نکالنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلم پبلک زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی خریدار ہو کر اسے ابتلا و آزمائش کے چکر سے نکالے۔ چندہ سالانہ چار روپیہ ششماہی عہ

ملنے کا پتہ منیجر صاحب "صدق" مرشد آباد پیلس۔ گولہ گنج لکھنؤ

روزنامہ جدّت مراد آباد

جدّت ہندوستان کا بہترین، سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے۔

اس کی خریداری کے لئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال، آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپیلیں شائع کی ہیں۔

جدت دلکش نظموں، بہترین جنگی تبصرں، بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ، اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔

جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور عہ ششماہی اور عہ سہ ماہی مقرر ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرالیں۔ ایجنٹ صاحبان کو وہ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے اس لئے مشتہرین کیلئے بے حد منفعت بخش ہے۔

منیجر اخبار جدت [illegible] مراد آباد

امتحانی پرچہ جات کے لئے آپ اور کیا چاہتے ہیں

جاری شدہ ۱۹۲۶ء

ہمارے زیر اہتمام ایک مدت سے امتحانی پرچے شائع ہوتے ہیں۔ جو شاندار کامیابی ہمیں حاصل ہوتی ہے اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) امانت راز کو محفوظ رکھنا ہمارا پہلا اصول ہے۔

(۲) ہمارے یہاں قابل پروف ریڈرز موجود ہیں اس لئے غلطیاں نہیں ہونے پاتیں۔

(۳) پرچوں کی بست وکشاد اور ان کے وصول و ارسال میں کافی ذمہ داری سے کام لیا جاتا ہے۔

(۴) کاغذ جہاں تک ممکن ہو عمدہ سے عمدہ لگایا جاتا ہے۔

(۵) زیادہ سے زیادہ دس دن تک پرچے چھاپ کر واپس کر دئے جاتے ہیں۔

(۶) ہمارے نرخ ارزاں ہیں اور حسب ذیل ہیں۔

انگریزی - ہندی - گورمکھی - اردو
عربی - فارسی

فی پرچہ ۹/
تعداد ایک صد تک

ملاحظہ کرکے ہمارے کام کی داد دیجئے۔

علاوہ ازیں امتحانات کی کاپیاں اور ہر قسم کے رجسٹر فارم وغیرہ بھی ہمارے ہاں سے ارزاں نرخوں پر مل سکتے ہیں۔

آپ کا خیر اندیش

مینجر ایجوکیشنل الیکٹرک پریس، ریلوے روڈ، جالندھر شہر

انور

فیاض علی صاحب ایڈووکیٹ مصنف "شمیم" کا دوسرا مایہ ناز غیر فانی شاہکار

فیاض علی صاحب ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد اور مالک ہیں۔ حسن و محبت کی دلکش تفسیر، زندگی اور شباب کی بہترین تعبیر، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی مسائل پر بے باکانہ مگر دلنشین تنقید، فطری جذبات کی مصوری، مکالموں کی شوخی، رنگینی، شیرینی، بے تکلفی، سبق آموزی نیز ناول کے افراد کو بے حد زندہ بے انتہا دلچسپ اور کبھی فراموش نہ ہو سکنے والے بنانا ان کے سحر نگار قلم کے بے مثل اوصاف اور مخصوص کمالات ہیں۔ ان کے انداز نکتہ چینی میں شہد و شکر کی سی شیرینی اور تیر و نشتر کی سی تیزی اور چبھن ہوتی ہے۔ دل میں گدگدی پیدا کرنے والی زندہ دلی، بے ساختہ شوخیاں، دلآویز بے باکیاں، سنجیدہ مگر شگفتہ ظرافت، زبان کی لطیف حلاوت، خیالات اور ادا کی دلفریب جدت، ان کی ناول نگاری بے نظیر اور بے بہا جوہر ہیں۔

غرض کہ فیاض علی صاحب نے "شمیم" اور "انور" لکھ کر زبان اردو کی سب سے بڑی خدمت کی ہے کہ انھوں نے اردو ناول کو اس کی گری ہوئی حالت سے اٹھا کر اہل یورپ کے مشہور ناول نگاروں کے بلند ترین شاہکاروں کا ہمسر و ہم پلہ بنا دیا ہے۔ آسمان شہرت پر اگر "شمیم" ماہتاب بن کر چمکا تھا تو "انور" یقیناً آفتاب ہو کر چمکے گا۔ آپ اسے پڑھ کر رائے قائم کیجیے۔

قیمت عہ ڈھائی روپے

ملنے کا پتہ: انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

باقیاتِ بجنوری

۲۸ر فروری تک شائع ہوگی

یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین، مکاتیب اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مضامین میں گیتانجلی، وضع اصطلاحات اور ادبیہ لکھنؤ خاص طور سے قابل دید ہیں اور "داشت آید بکار" مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے بطور ایک نوٹ ہدایات کے لکھی جو اس وقت علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ "گیتانجلی" پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ سچا ادب کسی خاص فلسفہ اور تخیل کی پابندی گوارا نہیں کرسکتا۔ وضع اصطلاحات میں اردو زبان کی ترقی کیلئے نہایت مفید مشورے دئے ہیں۔ "تیرہ لکھنؤ" ایک سیاسی مضمون ہے لیکن تاریخ کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس مضمون میں مرحوم نے نہایت لطیف پیرایہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کا ماضی اس کے مستقبل کے لئے دلیل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ مکاتیب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے قیام انگلینڈ و ترکی کے حالات لکھے ہیں۔ مکاتیب کا وہ حصہ جس میں ڈاکٹر صاحب نے ترکی کے حالات پر تبصرہ کیا ہے نہایت اہم ہے اور اس کے مطالعہ سے ترکی کے دور انقلاب کی تاریخ آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے نظموں کا حصہ مختصر ہے مگر دلچسپ اور پُر کیف اور کاغذ عمدہ اور طباعت نہایت روشن اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت

نقوشِ سلیمانی

علامہ سید سلیمان ندوی کی تازہ ترین اہم کتاب۔ موصوف نے ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جتنی تقریریں اور خطبے دئے ہیں ان سب کو اس مجموعے میں جمع کردیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی ہماری زبان کا نام اور ہماری زبان بیسویں صدی میں اردو انسائیکلو پیڈیا۔ زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر اس مجموعے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت مجلد سے؍ قیمت غیر مجلد عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی۔ ایم۔ اے

جلد ۲۳- نمبر ۴	اپریل سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن مجبوب المطابع دہلی

آپ کی کتابوں کی طباعت

آپ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہمارے سپرد فرما کر مندرجہ ذیل باتوں سے بالکل مطمئن ہو سکتے ہیں:۔

۱. کتاب صحیح چھپے گی۔

۲. دیدہ زیب کتابت ہوگی۔

۳. اچھا دبیز کاغذ استعمال کیا جائے گا۔

۴. نفیس طباعت ہوگی۔

۵. نہایت خوشنما اور مضبوط جلد سازی کی جائے گی۔

۶. بہت خوبصورت گرد پوش دیا جائے گا۔

غرضکہ

آپ کی کتاب جملہ لوازم طباعت سے آراستہ ہوگی

لیکن

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب

(۱) آپ اپنی کتاب کی طباعت کا انتظام ہمارے سپرد فرمائیں۔

(۲) سستے خراب کام کے مقابلے میں اچھے نفیس کام کے لئے نسبتاً زیادہ خرچ کریں۔

مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی

"مسلمان کیا کریں"

(از قلم "ضیا" صاحب)

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں "مسلمان کیا کریں" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور میں ایک بحث چھڑی تھی اور تقریباً سات ماہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا، خوش قسمتی سے ہر خیال کے مسلمان ارباب قلم نے اس بحث میں حصہ لیا اور نہایت سنجیدگی اور خلوص سے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اب اخبار کی طرف سے اس طویل بحث کا حاصل ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی اصلی قیمت گو عہ ہے لیکن عام استفادے کی غرض سے ایک مدت کے لئے کتاب عہ میں مل سکتی ہے۔

کتاب "مسلمان کیا کریں" میں کل ۵۳ مضمون ہیں، آخر میں "مدینہ" کی اپنی رائے بھی شامل ہے مضامین کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں کوئی ۲۱ مضمون ہیں جو مسلم لیگ یا "اس قسم کی کوئی تنظیم" کی حمایت میں ہیں، اس کے بعد کانگریس کی تائید کے مضامین ہیں جن کے لکھنے والے سرد و گرم دونوں قسم کے کانگریسی حضرات ہیں، جمعیت العلماء اور مجلس احرار کے مسلک کی وضاحت میں چھ مضامین ہیں اور کم و بیش اتنے ہی "پاکستان" کی حمایت میں ہوں گے، تمام مضامین کی زبان اور اُن کا انداز بیان نہایت صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ اور بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت دلچسپ ہے، اور پڑھنے والا اکتائے بغیر اسی کو شروع سے آخر تک شوق سے پڑھ سکتا ہے، اتفاق سے یہ وصف اس قسم کی کتابوں میں بہت کم پایا جاتا ہے، مضامین کا معیار بھی بلند ہے، اور لیگ اور کانگریس کے عملی مظاہروں اور موجودہ چپقلش کا اثر اس "قلمی چپقلش" میں سرے سے نہیں، ہر فریق نے ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی اپنی بات کہی ہے ورنہ اس قسم کی بحثوں سے عموماً بحث کرانے والے صرف "گرم بازاری" چاہتے ہیں، جب کاروبار مندا ہو، اور بازار میں دوسروں کے مقابلہ

میں اپنی دکان کا قدم اکھڑتا نظر آئے تو اخبار اس قسم کا ڈھونگ رچا کر نئے سرے سے اپنی ساکھ قائم کر لیا کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان "قلمی جنگوں" سے سوائے اخبار کے مالکوں کے اور کسی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا، البتہ کچھ عرصہ کے لئے پڑھے لکھوں کو سامان تفریح البتہ مل جاتا ہے اور بس، بدقسمتی سے ہماری اسلامی صحافت کا کم وبیش یہی چلن ہو رہا ہے اور علم وادب تو ایک طرف وہ قوم وملت کے اہم اور اشد ضروری مسائل کے ساتھ بھی یہ سلوک کرنے سے نہیں جھجکتے، خدا کا شکر ہے کہ اس کے برعکس مضامین کے اس مجموعہ کو پڑھ کر "مدینہ"، کی صحیح تعمیری، اور اصلاح کن معیاری صحافت کی داد دینی پڑتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں ۵ مضامین خود ایڈیٹر صاحب کے بھی ہیں، ان کے مطالعہ سے تو "مدینہ" کے خلوص اور حق کوشی کا اور بھی یقین ہوتا ہے۔ اور مخالف سے مخالف بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی اس قلمی جنگ سے "مدینہ" کا مقصد محض تجارتی منفعت نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کو محض ایک تجارتی "شگوفہ" نہ سمجھا جائے اور ذرا تفصیل اور تحقیق سے اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے، اور اگر ہو سکے تو اس کی اشاعت وسیع پیمانہ پر کی جائے تاکہ مسلم لیگ، جمعیت العلماء اور احرار و پاکستان تحریکوں کے سورما حرب وضرب کے میدانوں میں دادِ شجاعت دینے سے پہلے یہ جان لیں کہ آخر وہ لڑتے کس لئے ہیں، اور اس لڑائی سے انھیں کیا ملے گا۔ ممکن ہے مسلم لیگ کی حمایت کے خیالات کانگرسی مسلمان کو ذرا بھی متاثر نہ کریں اور پاکستانی اہل قلم کی تمام دلیلیں متحدہ ہندوستانی قومیت والے کو کچھ بھی قائل نہ کریں لیکن اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگی اپنے مخالف کانگرسی کو دین وایمان سے خارج، فہم ودانش سے معرا اور ہندوؤں کے چند ٹکوں پر بکنے والا سمجھنا چھوڑ دے یا اپنے خیال میں ذرا سی تبدیلی کرنا گوارا کر لے، اور اسی طرح کانگرسی، لیگی کو انگریز کا پٹھو، اور سرکاری نوکری پر وطن وایمان بیچنے والا نہ سمجھے، بہرحال یہ کتاب مسلمانوں کی موجودہ سیاست کا آئینہ ہے۔ اور اس آئینہ کی خوبی یہ ہے کہ پسندِ عام وخاص کے مذاق کے خلاف اس میں شکلیں بگاڑ کر دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی

کتاب کے مباحث میں پہلی بحث مسلم لیگ یا اسی قسم کی کسی اسلامی تنظیم کے حامیوں کی ہے

مسلم لیگ کی حمایت کرنے والے ایک تو وہ لوگ ہیں جو کبھی کانگریس میں تھے۔ اور عمر کا بیشتر حصہ اس جماعت میں گزرا، اور اس کے لئے انھوں نے قربانیاں بھی کیں۔ لیکن اب وہ کانگریس سے بیزار ہیں، انھیں کانگریس کے نصب العین سے اختلاف نہیں، اگر اختلاف ہوتا تو وہ کانگریس میں جاتے کیوں؟ اور اس کے لئے قربانیاں کیوں کرتے؟ اُن کو شکایت کانگریس کے ہندو لیڈروں اور کارکنوں سے ہے، جو بظاہر وطن پرستی کا دم بھرتے ہیں لیکن دل میں سخت فرقہ پرست اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، پہلے تو اُن کے یہ خیالات دلوں تک رہتے تھے یا کبھی کبھی خلوت کی مجلسوں میں زبانوں پر آجایا کرتے لیکن کانگریسی حکومت کے زمانہ میں ان خیالات نے عملی شکل اختیار کی اور کانگریسی ہندوؤں کا ظاہر و باطن روزِ روشن کی طرح ہر عامی اور خاص مسلمان کے سامنے بے نقاب ہو گیا، جو باتیں پہلے خاص خاص مسلمان دبی زبان سے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کے خلاف کہتے تھے وہ اب عوام مسلمانوں نے صبح و شام دن دھاڑے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتی دیکھیں، ہندو کانگریسیوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں مسلمان کی ہر دُکھتی رگ کو چھیڑا، اور جب وہ شدتِ الم سے بے تاب ہو کر چِلّاتا، اور چِلّانے کے بعد اپنے آپ کو بے بضاعت اور مجبور جان کر خون کے آنسو پی کر چپ ہو جاتا تو ہندو کانگریسی ہمدردی کرنے کی بجائے مجبور مسلمان کے اس "رقصِ بسمل" کو سامانِ نشاط بناتے، اور اُس کے اخبار اس "رقص" کی تصویر کشی سے اپنے ظرافت کے کالموں کو دیدہ زیب بنانے کا کام لیتے۔

مولانا محمد علی مرحوم ۲۹ء ۳۰ء میں جب کانگریس سے روٹھے تھے تو کانگریس کا بھرم اُس وقت تک قائم تھا۔ خواص کے سوا عوام ابھی ہندو لیڈروں کے منصوبوں سے ناواقف تھے۔ اس لئے جہاں کانگریس کے خلاف عام جلسوں میں تقریریں ہو سکتی تھیں، کم از کم کانگریس کی حمایت میں بھی کچھ کہنا مشکل نہ تھا، اور عوام اتنی عقیدت سے کانگریس کے مخالف مسلمان زعماء کے حلقۂ اثر میں نہ آجاتے تھے، لیکن اب معاملہ بالکل بدل گیا ہے، ایک مسلمان رہنما جس کی تمام زندگی اپنی قوم کی خدمت میں گزری ہو، اور جس کے نامۂ اعمال میں ایک حرف کیا ایک شوشہ بھی ایسا نہ ہو جس پر کسی قسم کی حرف گیری کی جا سکے، جوں ہی اُس کی کسی بات سے یہ مترشح ہو جائے کہ وہ

کانگریس کے اثر میں ہے، فوراً وہ ایمان فروش اور اسلام دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس نقارخانے میں اس کی برأت اور صفائی کی آواز تک کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں وہ لیڈر جو دس برس پہلے کسی اسلامی مجمع میں آتے ڈرتے تھے، اور ان کی اچھی باتیں بھی عامۃ الناس سننے سے گریز کرتے تھے، اور آج بھی ان کی تمام سرگرمیاں منفیانہ حیثیت سے زیادہ نہیں لیکن یہی لیڈر جب کسی اسٹیج سے کانگریس کے خلاف کچھ کہہ دیتے ہیں مجمع ان کو اپنے دلوں میں جگہ دیتا ہے، اور جو کانگریس کو سب سے زیادہ سخت سست سنائے وہ سب سے بڑا قائد سمجھا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے اب تک کون سا کام کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ تمھیں واقعی اس بدنصیب قوم سے کوئی تعلق ہے اور تمھاری بات اس قابل ہے کہ اس پر کان دھرا جائے۔ تعجب یہ ہے کہ سرکاری ملازم تک بھی جن پر پہلے عوام کی طرف سے ہمیشہ دھتکار پڑتی تھی آج انھوں نے یہ زور باندھ رکھا ہے کہ ان کی بارگاہ قلم سے نت نئے فتوے جاری ہوتے ہیں جن کی رو سے کبھی مولانا ابوالکلام آزاد بے راہ رو قرار پاتے ہیں، اور کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین گمراہ۔ اور لوگ ہیں کہ ان فتوؤں پر سر دھنتے ہیں، اور ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی، اور ہر طرف آمنّا و صدقنا کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ان حالات میں کانگریس میں شرکت کی طرف مسلمانوں کو بلانا نہ مصلحت وقت ہے، اور نہ قوم کے مفاد کے لئے مفید، اپنوں سے بگاڑ کر ہندوؤں سے ربط ضبط کرنے سے کیا حاصل؟ اس طرز عمل سے مولانا محمد علی مرحوم کو کیا ملا، انھوں نے ہندو مسلم کش مکش میں شروع ہی سے حق گوئی سے کام لیا، ہندو تو ان سے کیا خوش ہوتے، الٹا مسلمان ان سے بگڑ گئے، اور جب وہ اپنی اس حق گوئی کی پاداش میں مسلمانوں میں غیر ہر دلعزیز ہو گئے تو کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد علی کے ساتھ مسلمان کہاں ہیں، اور یہ جو مطالبات مسلمانوں کی طرف سے پیش کر رہے ہیں ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۔۔۔ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اسلامی قیادت کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیرووں کی ذہنیت کو سمجھے اور غیر ہندوؤں کے خیالات وافکار کا بھی جائزہ لے، ورنہ ڈر یہ ہے کہ ملت چند خود غرض اور جاہ پرست رہنماؤں کے ستم قیادت کا تختہ مشق بن کر رہ جائے گی اور اس بے سمجھی اور بے تدبیری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان بحیثیت قوم کے مٹ جائے گا۔ گو اس کے افراد کی تعداد نو کروڑ سے بارہ کروڑ تک بھی پہنچ جائے،

مسلم لیگ کے حامیوں یا نئی اسلامی تنظیم کے مبلغوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر بقول کانگریسی مسلمان رہنماؤں کے، سب کے سب مسلمان کانگریس میں شریک ہو جائیں پھر بھی مسلمان تو اقلیت میں رہیں گے، اور جب کانگریس کی ہندو اکثریت کا حال یہ ہو کہ قوم پروری کی باتیں تو بہت بڑھ بڑھ کر کرے لیکن کام وہی کرے جو ڈاکٹر مونجے اور ساورکر چاہتے ہیں تو سب مسلمانوں کے کانگریسی بننے کا کیا فائدہ ہوگا وہی جواب ہو رہا ہے۔ اس وقت تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور ہماری نمائندگی کا ان کو کوئی حق نہیں، پھر تو ہم یہ کہنے کے بھی مجاز نہ ہوں گے، الغرض کانگریس کی شرکت کسی لحاظ سے بھی سودمند نہیں ہو سکتی، اور علیحدہ تنظیم کی ضرورت ہر حال میں باقی رہتی ہے۔"

سوشلسٹ یہ کہتے ہیں کہ اس وقت کانگریس پر سرمایہ دار ذہنیت کے ہندو قابض ہیں اور اردو ہندی کے جھگڑے، مذہب و کلچر کے افسانے، پرانی روایات اور بھارت ورش کے قصے جن سے مسلمان بدکتا ہے اور کانگریس کو آزادی وطن کی بجائے رام راج یا مونجے راج قائم کرنے کا الزام دیتا ہے۔ یہ سب اسی طبقے کے مشغلے ہیں ان کے خلاف ہندوستان میں مزدور اور غریب کاشتکار برابر بیدار ہو رہا ہے، سرمایہ دار ہندو لاکھ کوشش کرے اور گاندھی جی لاکھ اصلی اشتراکی بنیں بالآخر مزدور اور کاشتکار کانگریس پر قابض ہو کر رہے گا۔ بہتر یہ ہے کہ مسلمان جن کی ۹۰ فیصدی آبادی اسی محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی ہے آگے بڑھیں اور اپنے ہم پیشہ ہندو طبقوں کے ساتھ مل کر کانگریس کو موجودہ قیادت سے نکالیں، اور سامراج اور سرمایہ داری دونوں کو ختم کر کے آزاد، فارغ البال اور متحدہ ہندوستان کی بنیاد رکھیں، جہاں نہ اردو ہندی کے جھگڑے ہوں گے

اور نہ مذہب و کلچر کی کش مکش، کیونکہ محنت کش جماعتوں کو ان مسائل سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔
سوشلسٹ کی یہ دلیل کافی قوی ہے اور شاید منطق کے زور سے اس کو آسانی سے رد بھی نہ کیا جاسکے لیکن وقت یہ ہے کہ اس وقت تک جو ہندو سوشلسٹ عملی میدان میں بھی آئے ہیں اُن کے تمام کارنامے مسلمان سوشلسٹوں کے ان نظریوں کی تغلیط ہی میں ہیں، اور وہ سوشلسٹ بننے کے باوجود سخت قسم کے کٹر ہندو ہی رہے ممکن ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح کے چند گنتی کے افراد اس سے مستثنیٰ بھی ہوں عموماً وہ باتیں خواہ کتنی بھی اچھی کریں لیکن مذہب و کلچر کی سیاست میں اُن کا پورا تعاون غیر سوشلسٹوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے، چنانچہ اُن کی اس پالیسی پر یورپ کے سامراجیوں اور مشنریوں کی مثال صادق آتی ہے کہ اول الذکر کا کام لوٹ کھسوٹ ہے، اور آخرالذکر پریم اور محبت کا نام لے لے کر ان لوٹے کھسوٹے ہوؤں کو تسلی دیتا رہتا ہے تاکہ یہ غم و غصہ اور یاس و نامرادی کی وجہ سے موت کو زندگی پر ترجیح نہ دینے لگیں۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ سوشلزم اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور اسلام کے نزدیک طبقاتی جنگ جائز نہیں، اسلام محبت سکھاتا ہے اور سوشلسزم نفرت اور بغض، اور اس قسم کے اور بہت سے دل خوش کن دعوے جن کی بنیاد بیشتر خوش اعتقادی پر ہوتی ہے اور بڑی آسانی سے ان کا مسکت جواب بھی دیا جاسکتا ہے، مثلاً اگر ترک اپنی قومی زندگی کو بالکل نئے قالب میں ڈھال کر بھی مسلمان رہ سکتا ہے اور مصر و شام، اور عراق و فلسطین نئے حالات سے مجبور ہو کر پُرانا چولا اُتار کر نیا لباس زیب بدن کرسکتے ہیں، اور ہمیں اُن کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ ہم یہاں بجائے قومیت اور اسلامیت میں پیوند لگانے کے اشتراکیت اور مسلمانیت میں کوئی لازمی سمجھوتہ نہ کریں، لیکن ڈر یہ ہے کہ اگر ہم نے یہ قدم اُٹھا بھی لیا تو کیا پھر ہندو اکثریت کے ساتھ تعاون عمل ہوسکے گا، مسلم لیگ کے حامی یا علیحدہ اسلامی تنظیم کے دعوے دار اس کو قطعاً محال سمجھتے ہیں، اور ہندو قوم کی موجودہ اُٹھان اور زندگی کے جن سرچشموں سے مدتوں سے اس اُٹھان کی آب یاری ہورہی ہے، اور اب تک اس اُٹھان نے جو شگوفے کھلائے ہیں،

اُن سب کو دیکھتے ہوئے اُن کے نزدیک اس تلخ حقیقت کا انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کا خیال پیش کرنے والے اس معاملہ میں سب متفق ہیں کہ ہند
اکثریت سے انصاف اور رواداری کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یہ قوم ہندوستان میں صرف اپنا راج
قائم کرنا چاہتی ہے، اُن کے پیشِ نظر جو ہندوستان کا نقشہ ہے اُس میں مسلمان کے لئے بحیثیت مسلما
کے کوئی گوشہ نہیں، یہ ہندوستان کی تاریخ میں سے مسلمانوں کے عہد حکومت کے آٹھ سو سال محو کر دینا
چاہتے ہیں اور نئے ہندوستان کو ویدک ہند کی بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس کارِ خیر میں
مہاسبھائی، کانگریسی، سوشلسٹ اور اپنے مذہب سے بیزار ہندو سب ایک ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے
کہ گاندھی جی جو اس وقت کانگریس کے تمام کرتا دھرتا ہیں، اور سوشلسٹ لیڈر تک بھی جن سے ہمارے
کانگریسی مسلمانوں کو بڑی بڑی امیدیں ہیں وہ سب کے سب اُن کی قیادت کو دل و جان سے
مانتے ہیں، اور سان کی ہر رجعت پسند تمدنی تحریک اور ہر مسلمان دشمن اصلاحی تحریک میں مدد و معاون
ہیں اس لئے کانگریس میں شریک ہو کر متحدہ قومیت ہند کی تشکیل کرنا قومی جرم ہے۔ اس لئے ایک
فریق تو یہ تجویز کرتا ہے کہ مسلم لیگ کو مضبوط کیا جائے اور دوسرا فریق اس کے خلاف آزادی پسند
اور ترقی خواہ مسلمانوں کی ایک نئی جماعت منظم کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جمعیت العلماء اور احرار
سے متوقع ہے کہ وہ دونوں ایک، دوسرے میں مدغم ہو کر اس نئی جماعت کی قیادت کریں، اُن کی
رائے میں، اس قسم کی سیاسی تنظیم لیگ کی رجعت پسندی سے بھی بچ سکتی ہے اور کانگریس کے ساتھ
مل کر ملک کو آزاد کرا سکتی اور آزاد ہندوستان میں اسلام کے سیاسی وجود کو ہندویت کے بڑے وجود
میں مدغم ہونے سے بھی بچا سکتی ہے۔

لیگ کے حامیوں کو اس بات کے ماننے میں تو تامل نہیں کہ لیگ کی موجودہ قیادت خود ساختہ
لیڈروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ تمام تر جمہور کے مفاد سے بے پرواہیں، اُن کا خیال ہے کہ اگر لیگ
میں جمہور کے صحیح نمائندے شریک ہوں گے، تو بالضرور لیگ کی موجودہ قیادت کو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء
کی طرح گوشۂ عزلت میں پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس لئے وہ نہایت شد و مد سے لیگ کی شرکت

پر زور دیتے ہیں، اور مخالفین کے خلاف جو اس موٹی سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی نئی سیاسی تنظیم والے کہتے ہیں کہ لیگ کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا سب تانا بانا رجعت پسندی کے عنصر سے بنا ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط ایسے ہیں کہ خان بہادروں اور سروں کے سوا دوسرت کا یہاں بار نہیں، اور اگر جمہور کے نمائندے اس قصر رجعت پسندی میں بار پا بھی لیں تو مجلس عاملہ میں اُن کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ لیگ کی موجودہ قیادت کی ہوشیاری یہ ہے کہ اُس نے ہندوؤں کو گالیاں دے دے کر اور کانگریسی مسلمانوں کو بُرا بھلا کہہ کر ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ جو لیگ کو جمہوری جماعت بنانے کا ذمہ اُٹھائے اُس کو کانگریسی ہندوؤں کا ایجنٹ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یوں بھی صحیح سیاسی شعور کی کمی ہے، دوسرے ہمارا پریس بھی جمہور کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اس لئے لیگ کے سروں اور خان بہادروں کے سحر کا کاٹ کیسے ہو، بدقسمتی سے ہندوؤں کی متعصبانہ روش نے مسلمانوں کو ہندو مسلم معاملہ میں بڑا زود حس بنا دیا ہے اس لئے خداوندان لیگ بدستور یہ راگ الاپتے چلے جائیں گے اور خدا کے فضل سے جمہور کے کانوں تک لیگ کی اصلاح کے خیالات کبھی بھی پہنچنے نہیں دیں گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس جوئے شیر لانے کی سعی کو چھوڑ دیا جائے اور آزادی خواہ مسلمان جماعتوں کو ایک سیاسی وحدت میں جمع کیا جائے۔"

یہ دلائل ہیں جو کانگریس کے مخالف خواہ وہ لیگ کے حامی ہوں یا ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کے مؤید، بڑے جوش و خروش سے پیش کرتے ہیں۔ اِن دنوں ہندو کی دشمنی نے مسلمانوں کو نیم پاگل سا کر دیا ہے اور وہ انتہا پسندی کا جواب اپنی انتہا پسندی سے دینا مناسب سمجھتے ہیں اس لئے لیگ مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہے کیونکہ وہ اس معاملہ میں اعتدال کو ناروا سمجھتی ہے اور دوسری جماعت کی بات مشکل ہی سے کوئی سنتا ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے خلاف کانگریسی مسلمان ہیں۔ ان میں بعض تو اعتدال پسند

کانگریسی ہیں اور بعض انتہا پسند یعنی سوشلسٹ، اعتدال پسند کانگریسی مسلمان ہندوؤں کے موجودہ رویہ کو شک
قابل الزام قرار دیتا ہے لیکن اس کا خیال یہ ہے کہ جب مسلمان کثیر تعداد میں کانگریس میں شریک ہو جائیں گے
اور ہندو عوام کی طرح مسلمان عوام بھی اپنی جماعت کی قوت کا احساس کرنے لگیں گے تو پھر کسی بڑی سی
بڑی قوت کے لئے ان مسلمانوں کو دبانا ناممکن ہوگا۔ علیحدہ سیاسی تنظیم کی قباحت یہ ہے کہ مسلمان نہ
ادھر کے رہ جائیں گے نہ اُدھر کے، اگر وہ آزادی خواہ ہوں گے تو بالضرور انھیں کانگریس کے نقش قدم
پر چلنا ہوگا۔ اور احرار اور جمعیت العلماء کی طرح کانگریس ہی کی قراردادوں کو اپنے الفاظ پر منظور کر کے
اپنے اوپر دوسروں کو ہنسوانے کا موقعہ دینا ہوگا اور اگر وہ کانگریس کے خلاف سیاسی تنظیم کریں گے تو طبعاً
انھیں کانگریس کے ہر مسلک کے برعکس اپنی راہ نکالنی ہوگی، اور اس سے تیسری طاقت یعنی انگریز
فائدہ اٹھائیں گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم نہ کریں، کیونکہ ہندو مسلمان کی سیاست
الگ الگ نہیں۔ ملک کی سیاسی ضروریات ایک سی ہیں، اور ان کو ایک ہندوستانی کی نظر سے ہی
دیکھنا ہوگا، اور جب آپ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو کی سیاست
الگ ہو، اور مسلمان کی الگ، ورنہ دو مستقل اور با اختیار جماعتیں بنانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی
ظاہر ہے اس نفسی نفسی میں ہندو مسلمان آپس میں الجھیں گے اور وطن کی کوئی متحدہ سیاست نہ
ہوگی،

کانگریس والوں کی اس دلیل کی تائید میں احرار کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ لیگی احرار سے
خفا ہیں کہ وہ کانگریس کے حاشیہ بردار ہیں، اور کانگریسی احرار سے بیزار ہیں کہ وہ اپنا مستقل سیاسی وجود
ثابت کرنے کے لئے کانگریس کی ہر بات میں اپنی پخچر لگا دیتے ہیں، اسی سے وہ خود بھی تباہ ہو تے ہیں
اور کانگریس کو بھی بار آور ہونے نہیں دیتے، پنجاب کی سیاسی زندگی کا موجودہ انتشار بہت حد تک
اسی علیحدہ سیاسی تنظیم کا ثمرہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی اور تمدنی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اعتدال پسند
کانگریسی مسلمان تو یہ مشورہ دیتا ہے کہ مسلمان بلا کھٹکے تہذیبی، تمدنی، تعلیمی اور لسانی انجمنیں بنا سکتے

ہیں۔ یہ انجمنیں گو غیر سیاسی ہوں گی لیکن زندگی تو ایک وحدت ہے جب اُس کے ایک کونے میں حرکت ہوگی تو اُس کے اثرات باقی حصوں میں ضرور پہنچیں گے تعلیمی اور تمدنی حیثیت سے اگر مسلمانوں نے اپنے آپ کو باہم ایک جماعتی زندگی میں منسلک کر لیا تو اُن کا تمدنی وجود ہندوستان کی قومیت میں کبھی مدغم نہیں ہو سکے گا۔ یہ حضرات اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان تو مسلمان ہندو بھی ان اعلیٰ اصولوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے اور اسی طرح مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود کانگریس کو اسلامی رنگ میں رنگنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ مسلمانوں کا انتہا پسند کانگریسی، سوشلسٹ افکار کا حامل ہے، اس کے نزدیک تہذیب، تمدن اور مذہب کی موجودہ چیخ و پکار ایک خاص طبقے کی پیدا کی ہوئی ہے، اُن کے لئے لڑنا غیر تاریخی اور جلد مٹ جانے والے معاملات میں اپنی جان کھونا ہے۔ اصل چیز تو ملت کے موجودہ تقاضوں اور محرکات و سوالات کا سمجھنا ہے، اور اُن کے مطابق مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا، اس لئے ہماری جدوجہد میں بنیادی خیال یہ ہونا چاہیئے کہ نوّے فی صدی غریب مسلمان کیا چاہتے ہیں ظاہر ہے اُن کا مسئلہ بیشتر معاشی ہے۔ اور معاشی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک سیاسی، کیونکہ سیاسی آزادی کے بغیر معاشی فلاح ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ سوشلسٹ گروہ مسلم لیگ کے "خالص اسلامی" دعوؤں اور احرار اور جمعیت العلماء کی نیم سیاسی اور نیم مذہبی نعروں کو بیکار سمجھتا ہے، اُن کے خیال میں یہ کہنا کہ "مسلمان مذہب اور فرقہ پرستی کے نام ہی سے اُبھر سکتے ہیں" اس کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ ۲۰ سال میں ہماری اسلامی تحریکات خالصتًا جذباتی اور ہنگامہ پرست رہی ہیں اور اُنھوں نے مسلمانوں کا خمیر ہنگامہ پسند اور مرثیہ خواں بلکہ اعجاز طلب بنا دیا ہے، سوشلسٹ کا یہ خیال بہت حد تک صحیح ہے، آج ہر مسلمان کی زبان پر یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہندوستان میں خلافت راشدہ کی سی حکومت چاہتے ہیں، اور آپ یقین کیجئے کہ ان میں سے ایک بھی خلافت راشدہ کی حکومت کو صحیح معنوں میں جانتا بھی نہیں ہوتا، اسی طرح سوشلزم کے مقابلہ میں عام و خاص اسلام کے اُصولوں کو پیش کرتے ہیں لیکن جو اصول وہ پیش

کرتے ہیں، اکثر اُن کی اپنی تخلیق ہوتے ہیں، اور تاریخ اسلام سے اُن کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان حالات میں سوشلسٹ کہتا ہی کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ "ان ارزان اور فرقہ پسندی کے غیر تاریخی محرکات کو چھوڑ کر صحیح سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر کام شروع کیا جائے"؟

یہ خیال رہے کہ یہ جماعت غیر سیاسی تنظیم کی مخالف نہیں، اُن میں سے ایک کا کہنا یہ ہے۔
"لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا میں سیاسی تنظیم کے علاوہ ملت کے لئے اور کوئی شیرازہ بندی درکار نہیں ہے یا مسلمانوں میں کوئی اصلاحی کام نہ کرنا چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی سیاسی صلاحیت بڑی حد تک اُن کی معاشرتی شیرازہ بندی کا نتیجہ ہوتی ہے"

اُن کے نزدیک کانگریس کو تو ایک واحد سیاسی جماعت مان لیا جائے اور ساتھ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح کا بھی کام جاری رہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ سیاست کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ایک فرد کے شخصی عقائد بھی سیاست کی داد وستد سے نہیں بچ سکتے، سیاسی اور غیر سیاسی معاملات کی حدود کیسے قائم ہوں گی اور کون قائم کرے گا۔

جمیعت العلماء اور احرار کی تائید میں تو دلیلوں کی بجائے اُن کے پچھلے مناقب اور موجودہ حریت پروری، جان سپاری اور صرف دینداری پیش کی گئی ہے، ظاہر ہے اس سے ان دو مجلسوں کے عالی قدر زعماء کی تو سرافرازی ہو سکتی ہے لیکن نفس تحریک کی افادیت کیسے ثابت کی جا سکتی ہے، ایک ممتاز احراری لیڈر کی زبان میں مجلس احرار کا شعار سیاست یہ ہے۔

"احرار مسلمانوں کے کانگریس میں ادغام کلی اور مسلم لیگ سے اجتناب کلی کے دو انتہائی نظریوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے"

یہ کلیہ بحیثیت کلیہ کے بہت دلکش ہے لیکن اس کی عملی شکل جو پندرہ برس میں احرار نے پنجاب میں پیش کی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شاعرانہ کلیہ اُن کلیات میں سے ہے جو عمل کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا، اور جب تک نظری دُنیا میں رہے بہت بھلا لگتا ہے۔

دراصل احرار نے ہندوؤں کے خلاف لیگ کی بعض شکایات اور لیگ کے خلاف

نگریس کے بعض مناسب شکووں کا خیال کرتے ہوئے بیچ کی راہ اختیار کی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے
معاملہ صرف ہندو اور مسلمان کا نہیں، بلکہ بیچ میں انگریز بھی ہے اس لئے ہمارا ہر اختلاف انگریز کے
ئے باعث رحمت ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک نئی تحریک کا تعارف ہوتا ہے، ایک صاحب جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں
ہتے "سبلۂ پاک" کے نام سے پاکستان کے عنوان سے پانچ مضمون سپرد قلم فرمائے ہیں، چند برسوں
ے یہ تحریک بعض دماغوں میں پرورش پا رہی ہے اس تحریک کا جنین تو علامہ محمد اقبال مرحوم کے
افکار سے معرض وجود میں آیا جو آپ نے لیگ کے ایک اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت کے
ران میں ظاہر فرمائے تھے، پاکستان کا نام کیمبرج کے ایک نونہال طالب علم نے تجویز فرمایا لیکن
ں ولادت مسعود کی مبارک گھڑی شاید نہیں آئی۔ ایک رسالہ میں تحریک مذکور کے نوجوان صدر اور
رٹری کی تصاویر چھپی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے روح رواں کیمبرج سے
ہندوستان تشریف لے آئے ہیں، خدا کرے اس مبارک تحریک کی داغ بیل جلد سے جلد پڑ جائے
ہم "پاکستانی" صاحب کے دعاوی کا عملی نمونہ بھی دیکھ سکیں، ورنہ دل خوش کن دعووں کی نہ کانگریس کے
کمی ہے اور نہ اشتراکی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے ہیں، اور مسلم سوشلسٹ اور احرار اور لیگ کا تو
کہنا، پتہ یہ ہے کہ یہ جماعتیں اپنے اپنے خیال سے جس مستقبل کی تصویر کھینچتی ہیں وہ اتنا رنگین و
ریب اور جاذب نظر ہے کہ آدمی مسحور ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس روشن مستقبل تک پہنچنا
ن بھی ہے یا نہیں،

"پاکستان" پر لکھنے والے نے واقعی خوب داد سخن دی ہے، انھوں نے جس انداز سے اپنے
الات قلمبند فرمائے ہیں، اُن کی تردید کرنا اتنا آسان نہیں، اُن کی تحریر میں شگفتگی، اُن کی دلیل
ں پختگی اور خیالات میں وسعت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا تعارف اس سے بہتر طریق
ے شاید ہی کوئی کرا سکے، لیکن ایک بات کا خیال رہے اُن کی ساری قلمی کاوش منفیانہ حیثیت
تی ہے، انھوں نے دوسری تحریکوں پر رائے زنی فرمائی ہے اور چن چن کر اُن کی کمزوریاں گنائی

ہیں لیکن یہ امر کہ پاکستان کی تحریک کن بنیادوں پر اٹھ سکتی ہے، اور کون سا طبقہ اس تحریک کا حامل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی بالکل وضاحت نہیں کی۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہندو اپنے قدیم کلچر کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ ہندو قوم کا یہ تقاضہ طبعی ہے، کوئی طاقت اس میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اگر ہندو اس حقیقت کو نہیں مانتا تو وہ جھوٹ کہتا ہے اور آج یا کل اُس کا عمل اُس کے زبانی دعووں کی کھلم کھلا مخالفت کرے گا، اس معاملہ میں سب ہندو یکساں ہیں، آریہ سماجی ہو یا سناتنی، کانگریسی ہو یا مہا سبھائی۔ کانگریسی مسلمان جو اب کانگریس کی ہندو ذہنیت پر سیخ پا ہیں سادہ لوح تھے ورنہ اُن کو پہلے ہی دن آج کے روز بد کا علم ہونا چاہیئے تھا۔

جمیعت العلماء والے نیک سہی لیکن وہ نئی دنیا کے تقاضوں کو کیا سمجھیں، مذہب میں وہ پہلوں کے اندھے مقلد، خیالات میں صدیوں پیچھے، سیاسی تعلیم سے یکسر عاری، اُن سے مسلمانوں کی صحیح قیادت کیسے ہو، اب سیاست نام ہے ایک پیچ در پیچ علم کا جس کی حدیں زندگی کے تمام شعبوں سے ملی ہوئی ہیں۔ موصوف کے نزدیک علماء کا اقتدار ایک لعنت ہے جس کا ختم کرنا بے حد ضروری ہے، یہ لوگ سیاست نہیں جانتے اور سیاسی رہنمائی کے مدعی ہیں۔

ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کو ماننے سے لازم آتا ہے کہ اقلیت اکثریت کا تمدن اختیار کرے تمدنی، تہذیبی اور لسانی خود مختاری سیاسی حکومیت میں پنپ نہیں سکتی۔ ہندو اکثریت میں سیاسی لحاظ سے مدغم ہو کر آپ اپنی مستقل تمدنی شخصیت باقی نہیں رکھ سکتے اس لئے مضمون نگار کے الفاظ میں اس کا حل یہ ہے!

"ہندوستان کے شمال مغرب (یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان) اور شمال مشرق (یعنی مشرقی بنگال اور جنوبی آسام) میں مسلمان ستر فی صدی سے زیادہ بستے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب مسئلہ صاف ہے، ان علاقوں میں خالص مسلم قوم کی حکومت کر دیجئے۔ بقیہ علاقوں میں ہندو قوم سے کہئے کہ وہ اپنی حکومت قائم کر لے۔ اب رہ گئی مسلم حکومت کی ہندو اقلیت اور ہندو حکومت کی مسلم اقلیت سو اس کے لئے معقول تحفظات طے کر لئے جائیں گے"

ہندوستان ہی میں ایک الگ خالص مسلم قوم کی حکومت کی تائید میں صاحب مضمون نے یورپ کی موجودہ سیاسی تحریکوں سے بہت مثالیں دی ہیں، لیکن شاید اپنی بات کی پچ میں وہ یہ بھول گئے کہ جن تحریکوں کی مثالیں دے کر وہ اپنی بات کو منوانا چاہتے ہیں اُن کی وجہ سے یورپ والوں کی زندگی اُن کے لئے عذاب جان بن گئی ہے۔ اور اب تو اس سیاسی اور معاشی طوائف الملوکی سے تنگ آکر بڑے بڑے ملک ایک ہی سیاسی وحدت میں منسلک ہونے کی تجویزیں سوچ رہے ہیں، بہرحال اپنی رائے کی تقویت میں ان مثالوں سے مدد لینا محض "صحافتی حربہ" ہے ورنہ صرف ایک الگ سیاسی وحدت کا تصور مشکل ہی سے ہمارے درد کا درمان ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس آزاد سیاسی وحدت کو حاصل کرنے کے بعد بھی ہم دوسروں کے معاشی اور سیاسی غلام رہیں،

مانا کہ ہم نے مضمون نگار صاحب کے مشورہ کے مطابق، خالص مسلم قوم کی حکومت قائم کرلی، اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس مسلم حکومت کی زندگی کے سرچشمے کہاں سے پھوٹیں گے کیونکہ صاحب موصوف کی رائے ہے!

"ہندوستان کا جھگڑا، امیری اور غریبی کا نہیں بلکہ دو معاشرتوں، دو کلچروں اور دو عقیدوں کا جھگڑا ہے، قومی عزت اور قومی بھرم کا سوال ہے۔ اس سوال پر انسان پیٹ کو قربان کرسکتا ہے ...... مسلمانوں کو یہ بتا دیجئے کہ ان کی ساری ترقیاں صرف اُن کے اپنے سرچشمے سے پھوٹیں گی......"

علماء تو پہلے ہی اس خالص مسلم قوم کی حکومت سے خارج البلد ہو گئے، رہا ہندو، اُس سے ہم نے کلی قطع تعلق کرلیا، اب بتائیے کہ یہ چشمے کون سے ہیں جن کو آپ مسلمانوں کی تمام ترقیوں کا مصدر بنانا چاہتے ہیں؟

"پاکستان یعنی دوسرے لفظوں میں اسلامستان" بنانا ایسا آسان نہیں، اور میرا خیال تو یہ ہے کہ جب ہم کبھی یہ "اسلامستان" بنالیں گے تو ہمیں افسوس ہوگا کہ کیوں ہم صرف "اس نعمت" کے لئے ہندوستان کے اتنے بڑے براعظم کے ان گنت سیاسی، معاشی اور دوسرے فوائد سے محروم

ہو گئے۔ ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک کو نئے حالات کے ساتھ اپنی زندگی کو تطابق دینے میں جو جو مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں اور ایک صدی گزرنے کے بعد بھی وہ ہنوز اس میں پورے کامیاب نہیں ہوئے، ان ملکوں سے ہمیں اپنے "اسلامستان" کی تشکیل کا اندازہ لگانا چاہیئے، اور اگر صاف گوئی معاف کی جائے تو حجاز کے "اسلامستان" سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ معاشی محرکات کو بے اثر سمجھنا کتنی بڑی نادانی ہے، سوال محض عقیدہ اور کلچر کا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی مصلحتوں کا جائزہ لینا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے،

کوئی تحریک محض نظری حیثیت سے ایک شعر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اعلیٰ سے اعلیٰ تحریک اگر نااہلوں کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ اسفل ترین بن جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ خالص مسلم حکومت کی تحریک کن بازوؤں سے قوت حاصل کرے گی، مضمون نگار کا فرض تھا کہ وہ ہمیں بتائے کہ مسلمانوں کے طبقے کے جذباتی، مذہبی، سیاسی اور معاشی تقاضے اس نئی حکومت کے متقاضی ہیں پھر بحث خالص علمی ہو سکتی تھی، ورنہ دعاوی کی بلند آہنگی سے آدمی لاکھ مرعوب ہو جائے لیکن اس سے افراد اور جماعتوں کے فطری تقاضے تو نہیں بدلا کرتے،

آخر میں ایک سوال اور ہے، یہ خالص مسلم حکومت کا پروانہ کس کی بارگاہ سے مرحمت ہو گا، ہندو تو اس کے لئے شاید ہی تیار ہو، اور انگریز اپنا نفع نقصان جانچ کر اس کے حق میں یا اس کے مخالف فیصلہ دے گا۔ اب اگر انگریز کے ہاتھ سے خالص مسلم حکومت کی نیو رکھی جائے گی تو اس کی شکل وصورت اور "مسلم" ہونے کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں، اس قسم کی "مسلم حکومتیں" خدا کے فضل سے اندرون ہند اور خارج میں بیسیوں ہیں، لیکن اگر ہندو سے لڑ کر یہ حکومت حاصل کرنی ہے تو جب ہم ہندو سے اپنا یہ حق منوا سکتے ہیں تو ہندوستان کی سیاسی وحدت کا ایک جزو رہ کر بھی ہم ہندو کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ یہ مان لے کہ ہندوستان صرف ہندو کا وطن نہیں بلکہ مسلمان کا بھی وطن ہے

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔۔ ہندوستان کو آزاد تو ضرور دیکھنا چاہتا ہے، لیکن وہ اس بات کے لئے بھی تیار نہیں کہ ہندی مسلمانوں

کا تہذیبی، تمدنی اور جماعتی وجود مفقود ہو جائے سہ

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

اُس کے نزدیک اپنا ملی وجود کھو کر آزادی حاصل کرنا بیکار اور مضر ہے کیونکہ اس سے چھ کروڑ اچھوتوں میں نو کروڑ اور اچھوتوں کا اضافہ ہو جائے گا، ایک فریق ہندو اکثریت کے تعصب کو دیکھ کر یہ حکم لگاتا ہے کہ تمدن کی حفاظت سیاسی قوت سے ہوتی ہے اور سیاسی قوت کے لئے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم ازبس ضروری ہے اُس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک "اسلامستان" ہو، دوسرا فریق کہتا ہے کہ اس وقت تمدن کی حفاظت کا سوال مقدم نہیں، معاشی اور سیاسی آزادی اہم ہے۔ اور اس کے لئے غیر مسلم استعمار دشمن اور آزادی خواہ جماعتوں کا ساتھ دینا چاہئے۔

کتاب "مسلمان کیا کریں" کے مرتب نے آخر میں یہ حل بتایا ہے کہ تہذیبی تقسیم کا اس وقت سوال اُٹھانا انگریزوں کی مدد کرنے کے مرادف ہے۔ ہم اپنے تہذیبی امتیاز کو اس طرح باقی رکھ سکتے ہیں کہ غیر ہندوستانی مخالف اور وطن دشمن طاقتوں کے خلاف ہم ہندو مسلمان ایک متحد قوم ہوں، اور اندرون ملک میں ہماری حکمت عملی مسلم قومیت کے اعتبار سے ہو،

بہر حال اصل سوال مسلمانوں کے تہذیبی امتیاز کا ہے۔ اور اس امتیاز کے طفیل ہم ہندو سے سیاسی اور معاشی تعاون کھوتے ہوئے بھی اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتے ہیں، لیکن اسی کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ یہ تہذیبی امتیاز اس قابل بھی ہو کہ وہ کل کے آزاد مسلمان کی توجہ اور اُس کی عقیدت کو اپنی طرف کھینچ سکے، ورنہ ڈر یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ نئے افکار اور انقلابی رجحانات کی یورش دنیا کی کایا پلٹ کر رہی ہے کہیں مسلمان خود اپنے اس تمدن سے بیزار نہ ہو جائیں، اور یہ نہ ہو کہ جس تمدن کی خاطر آج ہم ہندو سے برسر پیکار ہیں اور اُس کی حفاظت کے لئے "پاکستان" بنانے کے منصوبے کر رہے ہیں آگے چل کر خود ہم مسلمان ہی اُس تمدن سے ہاتھ کھینچ لیں،

تمدن کی حفاظت کاغذی عہد و پیمان سے نہیں ہوتی اور نہ محض سیاسی قوت سے، بلکہ تمدن کی اصل افادیت اور برتریت ہی اُس کی پائداری کی کفیل ہے، مصطفیٰ کمال خلافت کے نام سے لڑا،

لیکن غالب آنے پر سب سے پہلی ضرب خود خلافت کے قصر عالی پر لگائی، بہتر یہ ہے کہ اب اس سوال کو معرض بحث میں لایا جائے کہ "مسلمانوں کا تمدن کیا ہے؟" تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اس تمدن میں اتنی سکت ہے کہ وہ موجودہ معاشی، سیاسی انقلابات اور ذہنی اور فکری بغاوتوں میں جاں بر ہو سکتا ہے؟ اور کل کے آزاد ہندوستان میں ہم اس کو برقرار رکھ سکتے ہیں؟

شاید یہ بحث "مسلمان کیا کریں" سے کم دلچسپ اور مفید نہ ہو،

نوٹ

رسالہ جامعہ کے اوراق ہمیشہ اُن اہل قلم حضرات کے لئے حاضر ہیں جو اِن مسائل پر بجائے جذبات کے غور و تفکر سے کام لے کر مسلمانوں کے مفاد کے خاطر کچھ لکھنا پسند فرمائیں۔ مدیر

تاریخ مسلم لیگ

یہ نہ صرف مسلم لیگ کی تاریخ ہے بلکہ غدر کے بعد سے اب تک مسلمانوں کے سیاسی وجود کی تاریخ ہے۔ پہلے باب میں مسلم لیگ کے قیام سے پچاس سال پہلے کے حالات درج ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے دستور جدید ۱۹۳۵ء کے پاس ہونے تک کے تمام واقعات کا تفصیلی بیان اور اُس کے تمام اہم پہلوؤں پر سیر حاصل بحث اِس میں ملے گی۔ ہر شخص کے لئے جسے سیاست سے دلچسپی ہو خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اِس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔ ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت مجلد عے،

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

احساس کمتری

(شیر محمد اختر صاحب)

(۲)

احساس فروتری کی خصوصیات کبریٰ

خصوصیات صغریٰ کے متعلق ہم اوپر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اب ہم خصوصیات کبریٰ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرینگے

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ احساس فروتری ایک غلط جذباتی تکلیف کا نام ہے جو ایک شخصیت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہم آخر کیا ہے؟ چند جذبات کی مخصوص شکل —— جو شخصیت سے الگ ایک چیز ہونے کے باوجود شخصیت سے ملحق ہوتی ہے —— وہم کو ہم پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ جذباتی رنگ میں نقصان کا باعث ہوتا ہے یہی جذباتی خیالات۔ تفکرات اور محسوسات شاید کئی ایسی حالتوں کا نتیجہ ہوں۔ جن میں سے افراد گزرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ جس شخص کو کوئی ایسا تجربہ ہوا وہ بجائے ان خیالات کو دل سے نکالنے کے انھیں دل ودماغ میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اور اس کا احساس اس کی شخصیت کے لئے تکلیف اور دکھ کا باعث بنتا ہے۔ اگر وہ شخص اپنے اس تجربہ کے احساس کا دل سے بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کسی دوست یا آشنا سے باتیں کرنے لگے۔ اور یہاں تک باتیں کرے کہ وہ سب کچھ کہہ ڈالے۔ یا اُسے اس سے کسی قسم کی ذہنی تکلیف۔ شرم یا بے عزتی کا احساس نہ ہو۔ تو ان دونوں حالتوں میں اس کا دماغ بالکل محفوظ رہے گا۔ اور وہ ذہنی طور پر کسی قسم کا دکھ محسوس نہ کرے گا۔ یعنی اس کے دل ودماغ میں کوئی ایسا خیال پرورش نہ پا سکے گا جو اس کی شخصیت کا حصہ نہ ہو۔ لیکن ناراضگی غم و غصہ۔ شرم اور ذلت کا احساس۔ اگو یہ ہماری شخصیت کا حصہ نہیں ہیں۔ مگر جب یہ جذبات دل ودماغ پر قابو پا جائیں۔ تو پھر ان کا قابو میں رکھنا یا انھیں دل میں دبانا ناممکن سی بات ہے۔ ایسا کرنے والا انسان بعض دفعہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے —— جذبات ابھرتے ہیں۔ اور افراد انھیں دبانا چاہتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ذیل کی خصوصیات ہیں۔

۱۔ خوف: ابتدا میں تو یہ محض احساس کمتری کی ایک معمولی نفی کی حالت ہوتی ہے لیکن بڑھتے بڑھتے
حسِ اعصاب اور اعصاب کو کام کرنے سے قطعی انکار کر دینے کی حالت تک پہنچا دیتا ہے۔

۲۔ زندگی کا تعطل، مسکرات کا زیادہ استعمال۔ بدمستی اور دوسروں پر انحصار۔

۳۔ عشق و محبت میں ناکامی۔

۴۔ قوت واہمہ کی پرواز۔

جذباتی تکلیف کی یقینی علامت یہ ہے کہ انسان بہت دکھ تکان اور تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔
تکلیف میں آج کل بہت سے لوگ مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور اخباروں کے اشتہاری کالم دیکھنے سے معلوم
ہے۔ کہ دماغ کی تکان اور تھکاوٹ کو دور کرنے والی دواؤں کے اشتہارات کس بہتات سے شائع ہوتے
ہمارے نیم حکیم دماغی تکان کو جسمانی مرض خیال کرتے ہیں۔ اور عوام چونکہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتے وہ بھی ان کے
نسے میں آجاتے ہیں۔ اور نتیجہ معلوم۔ حالانکہ دماغی تکان کا مریض جسمانی لحاظ سے خوب مضبوط اور توانا ہو سکتا
ور جہاں ایسا مریض ہو وہاں یہ یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ اُسے دماغی عارضہ ہی ہے۔ اور اس کا علاج نفسیات
یعہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ شخص کسی جذباتی کش مکش کا شکار ہے۔ اور اس کا دماغ بغیر کسی مقصد کے سرگرم
ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ تکان محسوس کرتا ہے۔

ایسے دماغ کی مثال اُس موٹر کار کی سی ہے۔ جس کا انجن سٹارٹ کر دیا گیا ہو۔ لیکن پہیوں میں
لگا دیئے جائیں یہ بریک پہیوں پر ایک مسلسل دباؤ ڈالتی ہیں۔ جس سے صرف موٹر کی رفتار ہی
ست نہیں ہوتی۔ بلکہ پٹرول کا بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اور مشین اور نظام مشین بھی جلد خراب ہو
ے۔ بالکل یہی حال اس دماغ کا ہوتا ہے جس میں دماغی کش مکش جاری ہو۔ یہ کش مکش انسانی
ت کے لئے ایک بریک کا کام کرتی ہے۔ اعصابی قوت کا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے
طاقت زائل ہوتی ہے۔ بریک کو ہٹا دیجئے موٹر اور دماغ فوراً اپنا کام نہایت آسانی سے کرنے
لگے۔

جب یہ دماغی کش مکش اور دباؤ زیادہ طول کھینچ لے۔ تو معمولی تکان اور تھکاوٹ بڑھتے بڑھتے

اس حد تک پہنچ جائے گی جسے ہم ضعف اعصاب کہتے ہیں۔ ضعف اعصاب کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہمارے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ بلکہ دراصل یہ دماغی کش مکش اور دباؤ کے اثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بیماری جسمانی نہیں۔ بلکہ ایک روحانی تکلیف ہے۔ اس کے علاج کے لئے آپ لاکھ طبیبوں سے مقوی الدماغ دوائیں کھائیے۔ تبدیلی آب وہوا کے لئے پہاڑوں پر گھومیئے۔ لیکن دماغی تھکاوٹ اور تھکن دور نہ ہوگی شاید عارضی طور پر ماحول کی تبدیلی کچھ اثر کرے۔ لیکن جب تک دماغی کش مکش اور جذباتی دباؤ کو دور نہ کیا جائے تھکان دور نہ ہوگی۔

ضعف اعصاب کی آخری حد یہ ہے۔ کہ اعصاب کام کرنے سے جواب دے جاتے ہیں۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب یہ ذہنی کش مکش اس قدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ اعصابی اور جسمانی نظام بالکل بیکار ہوکر معطل ہو جاتا ہے۔ مریض جب اس حالت کو پہنچنے لگتا ہے تو اس سے قبل عجیب وغریب قسم کا خوف اور توہم اس میں پیدا ہوجاتا ہے مریض بلندی سے خوف کھاتا ہے۔ موٹروں سے وہ لرزہ بااندام ہوجاتا ہے۔ انسانوں کا ہجوم دیکھ کر وہ گھبرا جاتا ہے۔ ایک موہوم سا خطرہ ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ موت کا نام سن کر ایسا آدمی اکثر بیہوش ہوجاتا ہے غرض اسی نوع کے ہزارہا خدشے اس کے دل ودماغ پر مسلّط رہتے ہیں اور دماغ ہر وقت انھیں خدشات کے سوچنے میں مصروفِ کار رہتا ہے۔ اس کا اثر جسم پر بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کی علامت تشنجی حرکات۔ بھوک کا کم لگنا۔ بے خوابی۔ موت کا ڈر اور کمزوری ہے۔ اگر ان سب علامتوں کا تجزیہ کیا جائے۔ توہم کو ان کی تہ میں ایک گہرا خوف نظر آئے گا جس کی ابتدا شاید بچپن سے ہو۔ یا وہ کسی حال کے واقعہ کا اثر ہو۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ خوف کیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ خوف کی نوعیت فرد پر منحصر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپ کسی بات کو اپنی بے عزتی خیال کرتے ہیں اور اس سے آپ کے دل میں ناراضگی اور رنج ہوتا ہے۔ اس طرح دوبارہ بے عزتی ہوجانا بھی ایک خوف ہے کئی دفعہ کسی ناکامی یا ذاتی وجاہت کا زائل ہوجانا بھی ایک گہرا خوف دل میں پیدا کردیتا ہے۔ یا کسی کو یہ احساس ہوجائے۔ کہ وہ سوسائٹی میں غیر ضروری اور فالتو عنصر ہے۔ یا کسی ناکامی کے راز کا افشا ہوجانا۔ جسے وہ فرد مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ ان باتوں کا اثر بھی خوف کی صورت میں رونما ہوجاتا ہے۔ ان تمام حالتوں یا اسی نوع کی اور بہت

سی حالتوں میں جو خوف پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنا تسلط
تخیل کے لیے ترتیب جذبات کے سامنے جھکنے لگتا ہے
اس شخص پر کسی اعصابی مرض کا دورہ کوئی بعید بات نہیں۔

چند سالوں کا ذکر ہے۔ کہ انگلستان کے ایک بڑے جج نے جو
چرچار ہا کیونکہ خودکشی کا ارتکاب کسی سماجی۔ اخلاقی یا اقتصادی وجہ سے نہ ہوا،
جو انھیں اچھی طرح جانتا تھا اور اچھی طرح اُن کی ذاتی حالات سے واقف تھا ایک ماہر . بتایا کہ جج
کی بعض تقاریر پر جو اُنھوں نے دوران مقدمات میں کی تھی بڑی زبردست تنقید کی گئی۔ جسے وہ اپنی
توہین سمجھے۔ چونکہ اُن کی طبیعت ذرا بہت زیادہ حساس تھی اس لئے اُنھوں نے خودکشی کر لی۔ اس بات کو
سُن کر وہ ماہر نفسیات لکھتا ہے کہ "جج کو محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر ہے۔ کیونکہ اُس کی اعلیٰ قابلیت، دماغی
بلندی اور ضمیر کی صاف گوئی کی راہ میں اس کی موجودہ پوزیشن حائل ہو رہی تھی۔ جو بات وہ کہتا تھا۔ وہ
اس کی اسامی کی روایات کے خلاف تھی۔ اُسے جج کی روایات کو بہرحال برقرار رکھنا چاہیئے تھا۔ اس کے
دل و دماغ کے اندر ایک خوفناک کشمکش ہونے لگی۔ اس پر دو بار شدید بیماریوں کے حملے ہو چکے تھے
ان کے اثر اور کشمکش نے مل کر ایک نہایت ہی دردناک ٹریجڈی کی صورت اختیار کر لی۔"

ایک شخص خواہ وہ جج ہو یا ڈاکٹر، وزیر ہو یا معمولی انسان ہی ہر ایک اپنے لئے اپنے ذہن میں ایک
خاص معیار اپنی زندگی اور حلقہ اثر کے متعلق قائم کر لیتا ہے۔ اور اس کا برقرار رکھنا ہی اس کی زندگی کا
مقصد ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی خواب کی دنیا تباہ ہو رہی ہے۔ یا وہ اپنا اثر کم
ہوتا دیکھتا ہے۔ تو اس تذلیل اور اپنی شکست کا احساس اس کے اندر ایک جذباتی کشمکش پیدا کر دیتا
ہے۔ اس کا نتیجہ اعصاب کی کمزوری اور جسمانی طاقت کا زائل ہونا ہے۔ بعض حالات میں یہ کشمکش اس
قدر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ شخص زندگی کی حقیقت سے خوفزدہ ہو کر دیوانہ ہو جاتا ہے۔
یا خودکشی کر کے ہی مخلصی پا سکتا ہے۔

زندگی کا تعطل دوسری خصوصیت ہے۔ جس سے ہم بحث کریں گے۔ یہ بات تو ہر ایک آدمی جانتا

ہے۔ کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں بہت سی ایسی جماعتیں ہیں جن کا وجود بہت سی سماجی دشواریوں کا باعث بنتا ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت تھوڑے لوگ یہ جانتے ہوں گے۔ کہ یہ جماعتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کثرت سے کوئی فرد بشر خواہ وہ مرد ہو یا عورت جان بوجھ کر شراب خوری۔ نشہ آور چیزوں کا استعمال۔ نکما رہنا۔ دوسروں پر بوجھ بننا۔ اور پھر افشائے راز ایسے کمینہ حرکات کا مرتکب ہوتا۔ ان عادات میں پڑ کر اپنی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے افراد کے بے پناہ لشکر میں آپ کو وہ لوگ ہی نظر آئیں گے۔ جن کے دل پژمردہ ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنی طرز زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہ انھیں اپنے آپ پر بالکل یقین نہیں رہا۔ گو زبانی وہ شاید اس نظریہ کے خلاف ایک طویل تقریر کر دیں۔ وہ شخص جسے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ اور جو اپنی قابلیت کی قدر و قیمت کو خوب جانتا ہے۔ کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوگا اور جو ایسا کرتے ہیں انھیں یقیناً کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جس کی وہ تاب نہ لا سکے۔ اس مشکل سے بچنے کے لئے انھیں یہی ایک آسان راستہ نظر آیا۔ اور اسی لئے ایک گونہ بیخودی کے لئے مے سے غرض وابستہ کر لی۔

مایوسی کیسے پیدا ہوئی؟ ممکن ہے۔ کہ وہ ایک ایسا بچہ رہا ہو جسے والدین کے حد سے زیادہ پیار نے خراب کر دیا۔ اب وہ اپنی قیمت بہت زیادہ سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ زمانہ بھی اس سے وہی سلوک کرے۔ جو گھر میں اس سے ہوتا رہا ہے۔ مگر جب "بازار" میں اُسے اپنی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً مایوس ہو جاتا ہے۔ یا پھر ایک بچہ جو ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جہاں سختی اور سزا کا دور دورہ ہو یا بچے کو نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے وہ ذلیل سمجھا جاتا ہو اس کا نتیجہ بھی زندگی سے مایوسی کی شکل میں ہی ہوگا۔ محبت اور کاروبار میں ناکامی بھی آپ کو مایوس کر دے گی۔ بہر حال حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ لوگ جو سماج کے لئے ایک "مسئلہ" بن چکے ہیں دراصل اُن کے دل میں مخفی احساس ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بالکل بے فائدہ ہیں۔ اور اس احساس سے وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ عشق و محبت میں ناکامی پر ہمارے شعراء نے دیوانوں کے دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ یہ وہی احساس فروتری کا نتیجہ ہے۔ اور ہماری موجودہ پیچیدہ۔ مصنوعی اور بناوٹی تہذیب میں ایسے ناکامی کے واقعات تو اور بھی زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر لوگ جو اپنے آپ کو ذرا روشن خیال سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شادی اور محبت، قدامت پرستی

ہم اس قسم کے لوگوں کو ذیل کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ ایسی عورتیں جو اپنی صنف کو مردوں سے کمتر سمجھتی ہیں۔

۲۔ ایسی عورتیں جنھیں بچپن سے ایسی تربیت دی گئی ہے۔ کہ وہ مردوں سے نفرت کریں۔

۳۔ ایسے مرد جن میں زنانہ پن ہو۔

۴۔ ایسے مرد جنھیں عورتوں کو حقیر سمجھنے کی تعلیم دی گئی ہو۔

۵۔ ایسے مرد جو اپنی خباثت یا بچپن کے کسی تجربے کے باعث جس کا اثر اُن کے دماغ پر ہو، عورتوں سے ڈرتے ہیں۔

مندرجہ بالا قسم کے لوگ حسب معمول محبت سے بے اعتنائی دکھاتے ہیں۔ اس بے اعتنائی کی تہ میں احساسِ فروتری کا مخفی جذبہ کارفرما ہوتا ہے گو یہ لوگ ظاہرداری کے طور پر یا اپنی لفاظی کے زور سے یہ ثابت کرنے کی لاکھ کوشش کریں۔ کہ وہ عام لوگوں سے بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اور وہ بڑے آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی فروتری کے باعث وہ محبت کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر اُن میں جراٴت ہوتی تو وہ انسانی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے لئے رفیق زندگی کی تلاش کرتے۔ اور پھر دونوں مل کر سماج کی ضرورت کو پورا کرتے۔ اور یوں نسل کے محافظ بنتے۔ زندگی فطری طور پر اپنی بقا چاہتی ہے۔ جن لوگوں میں بقائے نسل کے خیال سے نفرت پیدا ہوتی ہو ان میں ضرور کسی نہ کسی فروتری کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔

آخری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں۔ جن کی قوت واہمہ اُن کی زندگی پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ توہم پرستی دراصل زندگی کی حقیقتوں، مشکلات اور رنجوں سے نجات حاصل کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ ہندوستان میں اس توہم پرستی کے وہ دردناک نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ اُن سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ تعویذ گنڈا، جھاڑ، دم یہ سب اسی توہم پرستی کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کی مشکلات کے حل کے لئے ہم عمل کی جگہ قبروں پر دعا مانگنے کو حل مشکلات سمجھتے ہیں۔ زندگی کی کش مکش میں جو کام ایک آدمی کو اپنی بقا کے لئے کرنا تھا۔ وہ کام ایک تعویذ کر دے گا۔ ہر قسم کی خیال پرستیاں دراصل توہم پرستی کی اقسام ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم زندگی کی حقیقتوں سے راہ مفر تلاش کرتے ہیں۔

موجودہ تہذیب اور اقتصادی مشکلات نے حوا کی بیٹیوں کو گھر سے نکال کر فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہندوستان میں تو اس حالت کا ابھی آغاز ہی ہے مگر مغربی ممالک میں تو یہ عام چیز ہے۔ دن بھر کی تھکی ماندہ لڑکی اس زندگی سے بھاگنا چاہتی ہے۔ اور اُسے اگر کہیں اماں ملتی ہے تو وہ واہمہ کی پرواز میں ہی میسر آسکتی ہے۔ اس لئے اکثر ایسی لڑکیاں فلم کے ہیرو کی پرستش کرنے لگتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ گویا وہ بھی ہیروئین ہیں مشکلات اور مصائب میں گھری ہوئیں۔ اور اُن کا ہیرو اُن کی مدد کے لئے پہنچتا ہے۔ ان کی توہم پرستی انہیں حقیقت سے افسانوی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اسی لحاظ سے آج کل سنیما۔ تھیئٹر اور ادب لطیف ایک نفسیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ جب کوئی مرد یا عورت اس توہم پرستی کا شکار ہو جائے تو وہ بھول جاتا ہے کہ حقیقت کی دنیا میں سرگرمیٔ عمل اور جرأت دو ضروری عناصر ہیں۔ وہ تو دن رات عالم خواب میں رہتا ہے۔ حقیقت سے بھاگنے کی عادت دماغ میں پختہ ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ بعض اوقات نہایت خوفناک ہوتا ہے بڑی بڑی صاحبِ قوت و جبروت ہستیاں بھی اس واہمہ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔

احساس کمتری کا تجزیہ اور اس کا علاج

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا فردِ بشر ہو جس میں احساس کمتری نہ ہو۔ اور شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جسے کبھی نہ کبھی یہ احساس نہ ہوا ہو۔ عصمت انونو کان سے ذرا بہرے ہیں لیکن اس جسمانی کمزوری کی اُنھوں نے پرواہ نہ کرتے ہوئے ترکی کو بچا لیا۔ اور آج وہ ترکی قوم کے نجات دہندوں میں سے ایک ہیں۔ مہاتما گاندھی کتنے کمزور بدن کے انسان ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس احساس کمزوری کے باوجود ایسا کام کیا کہ ہندوستان کی تاریخ کو بدل دیا ہے۔ صدر جمہوریت امریکہ روز ویلٹ بچپن میں منحنی جسم کے انسان تھے جس کا اثر ان کی ابتدائی زندگی اور شخصیت پر نمایاں رہا۔ لیکن اُنھوں نے طاقت حاصل کرنے کے لئے میدانِ عمل میں وہ سرگرمی دکھائی ہے جس کا نتیجہ آج اُن کی شخصیت اور خود اعتمادی کے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

صرف احساسِ کمتری کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی چیز ہے۔ تو وہ ہمارا اس احساس کے متعلق
و یہ ہے کہ اس سے ہم کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان احساسات کا مقابلہ ذرا جرأت سے کیا جائے
اس سے انسان اعلیٰ بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس کمتری شخصیت پر تسلط پا لے
ز پھر اس کا اثر ہمارے کردار پر بہت بُرا ہوگا۔ اور صحت بھی خراب ہوتی جائے گی۔

فروتری کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب عضویاتی معذوری ہے۔ حساس بچے میں
سمانی نقص یا کمزوری، ممکن ہے اس قدر نشو و نما پا جائے کہ وہ خوفناک حالت اختیار کر لے۔ اور بعض
قات ایسے حالات میں کم عمر بچے کیا بالغ اور نوجوان تک بھی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس پر
فصیل سے ہم سطور بالا میں عرض کر چکے ہیں۔

ایسا بچہ یا جوان جس میں کوئی جسمانی نقص ہو۔ اُسے بتانا چاہئے کہ وہ اس نقص کا ازالہ کرنا
ھے۔ مثلاً ایک شخص میں کوئی جسمانی نقص یا کمزوری ہے۔ تو اُسے سکھایا جائے کہ وہ اپنے اندر ایسا
ہر یا قابلیت پیدا کر لے جو اس کی کمزوری کو چھپا لے۔ اور کسی کی نگاہ اس نقص کی طرف اُٹھ بھی نہ سکے
وہ اپنے حلقہ اثر میں مقبول ہو جائے۔

لیکن اگر یہ ممکن نہیں کہ کسی صورت اس نقص کا ازالہ ہو سکے تو پھر اس کا مقابلہ ڈٹ کر مردانہ وار
ے۔ کوئی آپ پر ہنستا ہے تو اُسے ہنسنے دیجئے۔ آخر اس میں آپ کا قصور کیا؟ قدرت کا مقابلہ کون
لتا ہے۔ جسمانی نقص کو پیدا کرنے والی قدرت ہے۔ اور اکثر لوگ تو آپ کے نقص کی طرف توجہ بھی
یں گے اُن کی نگاہ میں آپ کی عزت کم کرنے کا باعث نہ ہوگی۔ ایک خدمت خلق کرنے والا اگر لنگڑا
یا اس کی ایک آنکھ خراب ہے تو لوگ اس کی قدر کرنی اس لئے نہ چھوڑ دیں گے کہ وہ کانا ہے
ڑا ہے۔ ایک آدمی کی اصلی خوبی اس کا ذاتی کمال اور کریکٹر ہے۔ ایک شخص اس لئے عزت کا مستحق
سمجھا جاتا کہ وہ (مرد یا عورت) جسمانی لحاظ سے خوب مضبوط ہے بلکہ باعزت بنانے والی چیز اس کا
ائٹی کے لئے مفید ہونا ہے۔ کوئی شخص جتنا زیادہ فائدہ مند ہوگا اسی قدر زیادہ سماج میں اس کی
ا ہوگی۔

انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جو چیز انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اُن کی انفرادیت، ذاتی جوہر، صلاحیت اور استعداد ہے۔ اور یہی چیزیں انھیں ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہیں لیکن انسانی لغزشیں، معذوری عام کمزوریاں اور پریشانی یہ ایسی باتیں ہیں جن میں سب انسان ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اور یہ قدر مشترک کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لئے آپ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے کی بجائے انھیں انسانی برادری کا ایک رشتہ سمجھئے جو ہم سب کو ملاتا ہے۔

دوسری قسم میں لاڈلا بچہ آتا ہے۔ اس کی دنیا تو اس کا گھر ہی ہوتا ہے۔ اور وہاں سب کی توجہ اس پر مرکوز رہتی ہے۔ لیکن جب وہ یہ نظریہ لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ تو اسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی۔ اور اس کا نتیجہ آپ جانتے ہی ہیں۔ اکثر لوگ ایسے جوان بچے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی ذاتی رائے اور ذاتی وقار کو مقدم سمجھتے ہوئے اس کی ذات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کا جو کچھ حشر ہوتا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

اب ذرا ہم ایک دو مثالیں دے کر اس کا علاج پیش کرتے ہیں۔ ایک انگریز پروفیسر مکنزی لکھتا ہے کہ ایک انڈر گریجویٹ اچانک تعلیم سے دل چرانے لگا۔ اور اُسے اعصابی ضعف کا دورہ ہونے لگا۔ تجزیہ نفس سے معلوم ہوا کہ اسکول میں یہ بچہ بڑا ہوشیار تھا اور اساتذہ کا منظور نظر تھا۔ لیکن جب ذرا اسکول کی زندگی کے متعلق اور کریدا گیا تو معلوم ہوا کہ اسکول میں وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے محنت کرتا تھا در اصل اسے تعلیم سے اتنی رغبت نہ تھی جتنی اپنی نمائش سے۔ اور وہ جن مضامین میں اچھا تھا محض اسی لئے تھا کہ وہ کوشش کرتا تھا کہ دوسرے لڑکوں پر وہ اپنے آپ کو ممتاز ثابت کر سکے اس سے ذرا آگے بڑھ کر پروفیسر مکنزی نے اس کے گھر کے ماحول کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ وہ دوسری شادی سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد نے یہ شادی آخری عمر میں کی تھی اس لئے وہ گھر میں بوڑھے باپ اور جوان ماں کی تمام تر توجہ کا مرکز بن گیا۔ سوتیلے بہن بھائیوں کے مقابلے میں قدرتی طور پر ماں باپ اس کی زیادہ ناز برداری کرتے۔ اس لئے جماعت میں بھی وہ سب سے اول جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اساتذہ نے اِسے نہ سمجھا بلکہ اس کو لڑکے کی طبیعت کی اُفتاد خیال کیا اور اس کی مدد

کی۔ لیکن کالج کا ماحول بالکل اور ہوتا ہے۔ وہاں ذاتی محنت اور قابلیت پر ترقی کا انحصار ہے۔ جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اُس کی قابلیت بالکل سطحی تھی تو اُس کا اثر اُس کے دماغ پر ہونے لگا۔ پروفیسر کلنزی لکھتے ہیں کہ میں نے اس لڑکے سے بار بار ملاقاتیں کیں اور آہستہ آہستہ اس کے دماغ سے فروتری کے اُن احساسات کو نکال دیا جو اُس کی زندگی پر تسلّط جمائے ہوئے تھے اور آخر کار وہ لڑکا تعلیم میں دلچسپی لینے لگا اور اس کی صحت بھی برقرار ہو گئی۔ اب وہ لڑکا کالج میں خوب اچھے نمبروں پر پاس ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک اور لڑکا اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کی دودھ پیتے بچوں کی طرح حد درجہ ناز برداری کی جاتی تھی۔ چاہیئے تھا کہ اس کی تربیت ایسے رنگ میں کی جاتی کہ وہ اپنی مصنوعی عزت اور توقیر بھول جاتا۔ برخلاف اس کے اُس کے والدین نے علانیہ اُس کی تعریف و توصیف کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ اور اس کو ہر جگہ خوبصورت قوی اور بہادر بیان کیا جاتا۔ یہی تعریفات اس کے دل کو لبھاتی رہیں اور اُسے خود پرست بناتی رہیں۔ اس کے والدین اس کی ہر ایک ضرورت اور چھوٹے سے چھوٹے وہم کو ناواجب طور پر پورا کرتے رہے۔ جب وہ کالج میں گیا۔ تو وہ کچھ اچھی طرح وہاں چل نہ سکا۔ اس کے ہم جماعت طلبہ نے اس کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ وہ اپنے دل میں دنیا بھر کی تمام محاسن کا مجموعہ اور خوبصورت اور پیاری چیزوں کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اُسے طلبہ کی یہ بے رُخی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے کئی کالج تبدیل کرنے پڑے اور بڑی مدت کے بعد وہ گریجویٹ ہو سکا۔ اس قدر تلخ تجربات کے باوجود اس کے دل سے اپنے متعلق غلط فہمی دور نہ ہوئی۔ وہ ایک صنعتی کارخانے میں بطور کیمسٹ ملازم ہوا۔ اس سے توقع کی گئی کہ وہ کم تنخواہ پر زیادہ سے زیادہ کام کرے۔ وہ اب ایسے ماحول میں تھا جہاں ملازم کو اپنے فرائض کی بجا آوری پر اتنا سراہا نہیں جاتا جتنا اُسے اس کی لغزشوں پر ڈانٹا جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں تو یہ تھا کہ وہ تمام کارخانے میں ایک نمایاں اور یکتا شخصیت ہو گا۔ اس کا علیحدہ دفتر ہو گا۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس جیسے کئی اور کیمسٹ سالہا سال سے اس کارخانے میں ملازم ہیں اور ان کی حالت نہایت خستہ ہے

تو وہ گھبرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ نوجوان بیکار گھر میں پڑا رہتا ہے کہ دنیا میں قدر دانی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

ایک بگڑا ہوا بچہ جب وہ جوان ہو جائے تو اُسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کوئی بے نظیر ہستی نہیں اور اسے یہ امید نہ رکھنی چاہئے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی طرف ویسی ہی توجہ اور انہماک کا اظہار کریں گے جو اس کے والدین کرتے تھے۔ اُسے چاہئے کہ ہمت، دلیری، اور عزم صمیم کے ساتھ زندگی کے پیش آنے والے واقعات کا مقابلہ کرے اور اپنی قابلیت اور اشتراک عمل سے، اپنے آپ کو نسل انسانی کی عظیم الشان برادری کا ایک تندرست فرد بنائے۔ صرف یہی ایک رستہ ہے جس سے وہ اپنے آپ کو دماغی کشمکش، اور ذاتی تکالیف سے بچا سکتا ہے۔

یہی حالت ان بچوں کی ہے جنھیں بچپن میں فالتو سمجھا گیا۔ یا جن سے دوسرے لوگ نفرت کرتے تھے۔ ذی عقل لوگ اس بات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ کہ کوئی کہاں پیدا ہوا۔ اور اس کے والدین کون تھے؟ وہ تو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کس کام کے قابل ہے؟ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ جو شخص امداد باہمی کی روح لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اور خدمتِ خلق اپنا نصب العین بناتا ہے تو وہ دیکھے گا کہ ہر کوئی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا اور اس کی مدد کرنا اپنا فرض خیال کرے گا۔

گو مندرجہ بالا مشورہ کتنا ہی صحیح اور اچھا کیوں نہ ہو لیکن بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں (جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) جن کے لئے بچپن کے کسی بڑے تجربہ کے زیر اثر ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور وہ احساس فروتری کے گہرے اثر کو زائل نہیں کر سکتے۔

ایک آدمی کا ذکر ہے۔ کہ وہ بیچارا چالیس برس کی عمر تک کہیں مستقل طور پر کام نہ کر سکا۔ کئی جگہ ملازم ہوا اور پھر نکال دیا گیا آخر وہ ایک بہت بڑے شہر میں پہنچا جہاں ایک اچھی اور معقول اسامی خالی تھی لیکن جب وہ منیجر سے انٹرویو کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کانپ رہا تھا حالانکہ اس اسامی کے لئے جس قدر صفات کی ضرورت تھی وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جب اُس سے

سوال کیا گیا۔ تو اس کی زبان رُک گئی۔ وہ "ہاں" کی جگہ "نہ" اور "نہ" کی جگہ "ہاں" میں جواب دینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بیچارہ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا ایک اور جگہ خالی تھی وہاں وہ پہنچ نیجر کے سامنے آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سبب اُسے خود بھی معلوم نہ تھا لیکن اس کا تجزیہ نفس کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ اس کی پیدائش محض ایک "حادثہ" تھی۔ والدین کو اس کی پیدائش سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہ لی گئی اور اس کی موجودگی میں اس کے دوسرے بھائی بہنوں کی تو تعریف کی جاتی لیکن اُسے اس کا باپ ہمیشہ یہی کہا کرتا۔ کہ "خدا جانے تم زندگی میں کیا کرو گے تم تو محض نکمے ہو۔ تمھیں تو کوئی ایک پیسہ کی ملازمت بھی نہ دے گا"۔ چنانچہ لڑکپن میں ہی ایک رات گھر کے لوگوں نے اُسے اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے سسکیاں بھرتے دیکھا کسی نے پوچھا "لڑکے روتے کیوں ہو؟" تو اس نے جواب دیا: "اس لئے کہ مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ مجھ سے کوئی پیار سے بات نہیں کرتا"۔ گھر والوں نے اسے مکاری پر محمول کیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آہستہ آہستہ اُسے خود اپنے آپ پر بھی اعتماد نہ رہا۔

فالتو اور مکروہ بچے کی ٹریجڈی کا یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ ایسے بچوں کے دماغ میں احساس کمتری پیدا ہو کر بڑھتا رہتا ہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی نشوونما پاتا ہے۔ اور آخر کار وہ ایسے شخص کو دنیا میں رہنے کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جرأت، امید اور تعاون کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ اور یہی جوہر ایسے شخص میں مفقود ہوتے ہیں۔ فالتو اور مکروہ بچے تو یہ یقین لے کر جوان ہوتے ہیں کہ سوسائٹی کو اُن کی ضرورت نہیں۔ اس لئے دنیا میں انھیں رہنے کا حق بھی نہیں۔

ایسے بدقسمت لوگوں کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں خود ایسی صفات پیدا کریں۔ کہ دوسرے اُن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اُن کی عزت ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُن میں عزتِ نفس کا جذبہ ترقی پائے گا۔ اگر بچپن میں اُنھیں ایک بیکار چیز سمجھا گیا تو جوانی میں وہ "باکار" بن کر دکھائیں

اور یہ اُسی صورت میں ہو سکے گا کہ وہ خود زندگی کا مقابلہ جرأت، استقلال اور سعی بلیغ سے کریں. گو ایسا کرنے میں اُنھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا. لیکن آخر کار ان کی محنت اور خدمت رنگ لائیگی. وہ پھر سماج میں ایک مفید اور قابل عزت فرد کی حیثیت سے دیکھے جائیں گے. ہما رے بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے. کہ اپنے آپ کو کھو کر ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں۔

احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ہماری طبیعت کا رجحان کس طرف ہے اور ہم نے اپنے ذہن میں آئندہ کے لئے کیا سوچ رکھا ہے. کیا ہمارا تخیل قابل عمل ہے کیا وہ ممکن ہے؟ کیا یہ محض نمود غرضانہ ناموری کے لئے ہے؟ کیا ہماری کامیاب زندگی سے سماج اور سوسائٹی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا ہماری نظری ودیعتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر ہمارا نقطۂ نظر درست بھی ہے. اور یہ نتیجہ ہماری زندگی کے لئے مفید ہوگا یا غیر مفید؟

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے. کہ بعض افراد ناممکن الحصول نظریات زندگی مقرر کر لیتے ہیں. اور بعض خود غرضانہ باتوں کے لئے سعیٔ لاحاصل کرتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ سوائے مایوسی کے انھیں اور کچھ نہیں ملتا. اور یہ مایوسی اُنھیں زندگی سے بیزار کر دیتی ہے. لیکن جب کسی اعلیٰ اور صحیح مقصد کے لئے کوشش کی جائے. تو اس کوشش میں ایک راحت محسوس ہوتی ہے. اور یہ کوشش ہی آپ اپنا صلہ ہوتی ہے خواہ اصل مقصد حاصل نہ بھی ہو سکے. لیکن اس کے برخلاف جو سعی محض ذاتی نمائش اور بے فائدہ باتوں کے لئے کی جائے اس کا نتیجہ آخر کار ناامیدی ہوتا ہے. جس کی وجہ سے وہ شخص چڑچڑا مایوس اور صحت میں کمزور ہو جاتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ زندگی کو غلط زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا لیکن اب کسی اچھے اور صحت مند ماحول کو محسوس کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نگاہ تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا احساس کمتری بھی کم ہوتا جاتا ہے. دماغی صحت کے دو دشمنوں. یعنی خود غرضی اور جہالت ـــــ کو ضرور مغلوب کرنا چاہیئے. اور یہ اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ ہم دوسروں کے متعلق زیادہ سوچیں اور اپنے آپ کو پہچانیں. تجزیہ نفس کے لئے ہم ذیل میں چند موٹی موٹی باتیں

لکھ رہے ہیں۔ آپ انھیں کاغذ پر لکھ دیجئے۔ اور ان کے آگے ان کے جوابات بھی لکھئے۔

اعصابی نقص:۔

کیا میں اپنے جسمانی نقص کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں؟

کیا میں دوسرے لوگوں کی رائے پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہوں؟

کیا میں نے اپنے نقص کے بدل کے طور پر کوئی اچھا جوہر اپنے اندر پیدا کر لیا ہے؟

بگڑا ہوا بچہ:۔

کیا میں ابھی تک بچپن کے جذبات اور محسوسات میں ہی زندگی بسر کر رہا ہوں؟

کیا دوسرے لوگوں سے بھی ویسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔ جو والدین مجھ سے روا رکھتے تھے؟

کیا میں اپنے تئیں یکتا اور ارفع سمجھتا ہوں۔ اور دوسروں سے خودغرضانہ مطالبات تو نہیں کرتا؟

کیا جب لوگ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے یا میری عزت نہیں کرتے تو مجھے مایوسی تو نہیں ہوتی؟

کیا میری برتری کا منتہائے نظر صحیح اور سماجی طور پر مفید ہے؟

میں کس شخص پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور کیوں؟

کیا میں زندگی کا مقابلہ جرأت اور امید سے کر رہا ہوں؟

مکروہ اور فالتو بچے:۔

کیا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ مجھے لوگ غریب سمجھتے ہیں؟

میں اپنے تئیں کس سے کمتر محسوس کرتا ہوں اور کیوں؟

کیا بچپن کے تجربات نے مجھے دوسروں سے نفرت کرنا سکھایا ہے؟

کیا میں سماجی طور پر بزدل ہوں؟

کیا میں زندگی سے بھاگتا ہوں؟

کیا میں ڈر کی وجہ سے اپنی جذباتی زندگی کو دبا رہا ہوں؟

عام:۔

کیا میں کسی کی موت کا متمنی ہوں؟

کیا میں اپنی بیوی۔ یا اپنے خاوند سے نفرت کرتا ہوں ــــ یا نفرت کرتی ہوں؟

کیا زندگی کے متعلق میرا نظریہ صحت مندانہ ہے؟

میں کس شخص کو گرا کر اپنے برابر لانا چاہتا ہوں؟

جب آپ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات لکھ لیں گے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کیا ہیں۔ اپنی زندگی کا تاریک پہلو آپ کے سامنے آجائے گا۔ پھر آپ روشن پہلوؤں پر بھی نظر ڈال سکیں گے۔ ہر ایک انسان میں بعض ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہوتیں اور وہ بعض ایسے کام کر سکتا ہے جو دوسرے نہیں کر سکتے۔ جس شخص میں احساس کمتری ہو، اُسے چاہیئے کہ وہ خاموشی سے زندگی کے روشن پہلو پر زیادہ نظر رکھے اور زندگی کی عمارت کی بنیاد اسی پر استوار کرے۔ ایسے تمام نقائص جن سے آپ میں احساس کمتری پیدا ہو اُن کو دور کیجیئے اور اپنی استعداد کے مطابق ــــ خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اپنی صلاحیت اور قابلیت کو زیادہ کرنے کی کوشش کیجیئے۔

ایک ڈاکٹر چند نرسوں کو لیکچر دے رہا تھا لیکچر ختم کرنے کے بعد اس نے چند سوال کرنے شروع کر دیئے۔ پہلی نرس نے نامکمل سا جواب دیا۔ دوسری نرس کے جواب پر ڈاکٹر ذرا جھنجلایا اور تیسری نرس کا جواب بھی کچھ یونہی سا تھا اس پر ڈاکٹر نے اس کا مذاق اڑایا۔ ان تینوں کے جوابات اور ڈاکٹر کے رویے نے چوتھی نرس پر جسے اپنی فروتری کا زیادہ احساس تھا بہت بُرا اثر کیا جب اُس کی باری آئی تو وہ اتنی گھبرائی کہ وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکی۔

اس واقعہ نے اس نرس کو ناخوش بنا دیا اور اُسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ رات بھر وہ بستر پر لیٹے ہوئے بھی یہی سوچتی رہی۔ کہ وہ کس طرح اپنی اس کمزوری کو دور کر سکتی ہے۔ اچانک اُسے یاد آیا۔ کہ چند دن پہلے اُس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس پر اسی ڈاکٹر نے لکھا تھا" پُر از معلومات

اور نہایت اچھا" اسے خیال آیا کہ اگر وہ اتنا اچھا مضمون لکھ سکتی ہے تو یقیناً اس کا دماغ بہت اچھا ہے۔ اس لئے اس روشن پہلو پر زیادہ توجہ کرنی شروع کردی اور آہستہ آہستہ احساس کمتری کم ہوتا گیا۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک میں فروتری کا احساس کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مثبت احساسات بھی ہوتے ہیں۔ ان کو اگر ہم اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ ملا کر کام میں لائیں اور روشن پہلو پر زندگی کے نظریات اور تصورات کی بنیاد رکھیں اور ان صفات کی نشو و نما کرتے رہیں تو ہم میں احساس کمتری کی جگہ جد و جہد اور عزتِ نفس کا مبارک جذبہ پیدا ہوتا جائے گا۔

"نفسیات شباب"

یہ کتاب برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفہ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر ایڈورڈ اشپرانگر کی اہم تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے۔ نوجوانوں کی مجموعی نفسی سیرت، ان کی تخیلی زندگی، اُن کے عشق، ان کے تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر نفسیات شباب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، ضخامت بڑے سائز کے ۴۰۲ صفحے اور قیمت صرف تین روپے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں دفتر میں باقی ہیں۔ جلد طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی
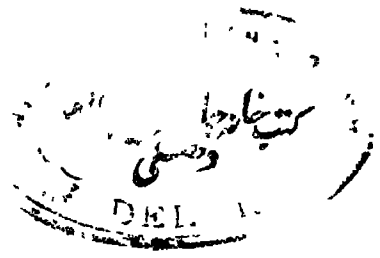
اشتمالیت

(مترجمہ برکت علی صاحب فراق)

یہ مسٹر جوڈ کی کتاب MODERN POLITICAL THEORY کے ترجمے کا ایک باب ہے۔ اس کے ایک باب "اشتراکیت" کا ترجمہ نومبر ۱۹۳۹ء کے پرچے میں چھپ چکا ہے۔ اس کی مقبولیت کے باعث یہ باب بھی ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ مدیر

لفظ "اشتمالیت" کے بے شمار مختلف معنی لئے جاتے ہیں بعض اوقات اس سے ابتدائی عیسائیوں کے نظریئے کی طرح جماعت کا وہ نظریہ مراد ہوتا ہے جس کی رو سے تمام ملکیت مشترک ہو ا بعض اوقات اشتراکیت کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہی نام ایک ایسے نظا کو بھی دیا جاتا ہے جس کے ماتحت خوراک، کپڑا، طبی امداد، اور زندگی کی دوسری ضروریات کا حسب حاجت کسی خارجی اثر سے آزاد ہو کر انتظام کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس باب میں ہم لفظ اشتمالیت کے اُس خاص مفہوم سے بحث کریں گے جو مارکس اور اینجلز کی تصنیف "اعلان اشتمالی" مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں ادا کیا گیا ہے اس لئے کہ اس لفظ کا صرف یہی وہ مفہوم ہے جو اشتمالیت کو اشتراکیت کے دوسرے مذاہب سے بہ اعتبار ایک خاص سیاسی نظریئے کے جدا اور ممتاز کرتا ہے۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اشتمالیت اصل میں طریقہ کار کا ایک نظریہ ہے۔ اس کا منتہا ایسے اصول متعین کرنا ہے جن پر عمل کرکے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام کی تکمیل کی جائے گی اس کے دو بنیادی نظریئے ہیں طبقاتی جنگ اور انقلابی ــــ یعنی تشدد آمیز ــــ ذرائع سے طاقت کو سرمایہ داروں سے لے کر محروم الملک یعنی پرولتاری طبقے کے ہاتھ میں دے دینا۔

(الف) مارکسی اشتمالیت:۔ مارکس کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا خاتمہ اُن تضادات کے نتیجے کے طور پر ہوگا جو اس نظام کی سرشت میں داخل ہیں' ان تضادات میں سب سے زیادہ

اہم ایک تو یہ ہے کہ سرمایہ داری، قدر زاید کے حصول کے پیشِ نظر جو اس کی زندگی کا راز ہے، مجبور ہے
کہ ایک غریب اور فاقہ زدہ طبقے کو پیدا کرے اور اُسے منظم اور طاقتور ہونے کا موقع دے۔ یہ طبقہ
جماعت میں طبقہ وارانہ امتیازات کی وجہ سے کچھ اس طرح بیدار اور منظم ہوگا کہ آخرکار سرمایہ داری ہی کو
ختم کردے گا جس نے اُسے پیدا کیا تھا۔ دوسرا اہم تضاد یہ ہے کہ جب پیدائشِ اشیاء کی رفتار غیر معمولی
طور پر تیز ہوگی تو عوام کا بیشتر حصہ ملکیت سے محروم ہوگا اور جب تک سرمایہ داری زندہ رہے گی، یہی
حالت رہے گی۔

محروم الملک طبقہ کے لوگ چونکہ اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ صنعتی نظام کی اضافہ پذیر مصنوعات
کو خرید کر اپنے کام میں لا سکیں، اس لئے سرمایہ دار طبقہ پیدائش اشیاء اور ان کے داخلی صرف کی غیر
معمولی عدم مساوات سے مجبور ہو کر بیرونی منڈیوں کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ اور ساتھ
ہی ساتھ بڑی بڑی کمپنیوں سے اتحاد کرتا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں
کو فنا کر دیتی ہیں اور متعلقہ اشیاء تجارت کا اجارہ حاصل کر لیتی ہیں۔ جوں جوں پیدائش اشیاء میں اضافہ
ہوتا جاتا ہے، بیرونی منڈیوں کے معاملے میں باہمی مقابلہ شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ غیر ترقی
یافتہ علاقوں سے استفادہ اور نفع حاصل کرنے کی غرض سے یہ طبقہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتا ہے
اور سرمایہ داری سامراجیت کی منزل سے گذر کر اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

موجودہ دور میں حالات کا جو رُخ ہے، اُسے جدید حامیانِ اشتمالیت مارکس کی پیشینگوئیوں
کی صحت کے لئے موزوں ترین ثبوت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ موجودہ حالات کی وہ جو
تفسیر کرتے ہیں، اُن کی بنیاد مندرجہ ذیل طریقوں پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "جنگ عظیم کی ابتدا
معاشی تھی۔ پیدائشِ اشیاء کے محرکات اور موجودہ سماجی تنظیم میں کوئی ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی
تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیاء کی پیدائش کچھ اس رفتار سے ہونے لگی کہ ان کے صرف کی تنظیم جماعت
کے بس سے باہر ہوگئی۔ محروم الملک مزدوروں کی دنیا میں کاہل الوجود امیروں کے کمینہ پن اور
دنائیوں کے ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ نئی نئی منڈیوں کے لئے مقابلے

ہونے لگے۔ مقابلے کی اس افراتفری کا ناگزیر نتیجہ یہ ہونا تھا اور ہوا کہ سامراج کے بھیس میں آپس میں
ایک ہیبت ناک جنگ پھوٹ پڑی" مثال کے طور پر لینن کو لیجئے۔ وہ سامراجیت کی تعریف یوں
کرتا ہے کہ "یہ سرمایہ داری کی وہ منزلِ ارتقا ہے جس میں اجارے اور ساہوکارسے کے سرمائے کا زبردست
اثر قائم ہو جاتا ہے، سرمائے کی برآمد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، بین الاقوامی کمپنیاں دنیا
کا بٹوارہ شروع کر دیتی ہیں، اور بڑی بڑی سرمایہ دار مملکتیں پورے کرۂ ارض کو باہم تقسیم کر لیتی ہیں"۔
اس منزل پر آکر سرمایہ داری نظام کے اندر جو فطری تضادات ہیں، وہ اس کی فنا کا باعث بنتے
ہیں۔ محروم الملک طبقہ کی طاقت جو سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے، اپنے پیدا کرنے والے کو ختم
کر دیتی ہے۔ اس کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کے مطالبات کا اصرار شدید تر
اور آخر کار قطعی طور پر طے کر لیتا ہے کہ اُسے کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی تا آنکہ سرمایہ داروں کا خاتمہ
ہو جائے، جائداد پر جو اب تک ذاتی ملکیت سمجھی جاتی تھی، سماج کا قبضہ ہو جائے، اور طاقت سرمایہ
داروں کے ہاتھوں سے نکل کر جنگ آزما مزدوروں کے ہاتھوں میں آجائے۔

محروم الملک طبقے کی یہ اُٹھان تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے
میں اُس طبقے کا جسے جماعت میں اقتدار حاصل ہوا، یہی حشر ہوا ہے۔ اس کے اقتدار ہی کے ماتحت
ایسے حالات پیدا ہو گئے جن کے نتیجے کے طور پر ایک ایسا ہی مظلوم و مقہور طبقہ پیدا ہو گیا اور آخر اس نے
اس مقتدر طبقے کو فنا کر دیا مثلاً۔ اسی طریق پر جاگیرداری نظام کی پیداوار سرمایہ داروں کا طبقہ تھا
مگر اسی نے صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دے کر اس نظام کو ختم کر دیا۔ ہر چند مزدور طبقے کی
اس قسم کی بیداری کی متوازی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، مگر مزدوروں کی یہ بیداری ایک طرح سے
نئی ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں جتنے انقلابات ہوئے ان کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک طبقے کے ہاتھوں ایک
طبقہ فنا کر دیا گیا، طاقت ایک اقلیت کے ہاتھ سے نکل کر دوسری اقلیت کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر مزدور
طبقے کی فتح سے انسانیت کی نجات وابستہ ہے۔ اس انقلاب کی تکمیل ہے تو طبقاتی بنیاد پر، مگر انقلاب
کے بعد جماعت کی جو نوعیت ہو گی اُس کی بنیاد خود طبقات کی تنسیخ پر ہو گی۔ ان اصولوں کی بنا پر

اشتمالیوں کا یہ نظریہ ہے کہ باوجودیکہ سرمایہ دار طبقہ سے اُن کی جنگ ایک محروم الملک طبقے کی طرف سے ہے مگر درحقیقت یہ جنگ تمام بنی نوعِ انسان کی نجات کے لئے ہے۔ اور یہی وہ ایمان ہے ـــــ اور چونکہ یہ ایک بالکل بے غرضانہ تخیل ہے اس لئے اس ایمان میں پختگی بہت ہے ـــــ جو اس کے بظاہر خشک اور بے کیف خیالی پروگرام کی تکمیل کے لئے ایثار وعقیدت کی توفیق پیدا کرتا ہے۔

اگرچہ انسانیت کی نجات اور طبقات کے وجود کی تنسیخ ایک اشتمالی کا مقصد اساسی ہے، مگر اس کی رائے میں اس مقصد کی تکمیل زمانۂ دراز تک نہیں ہوسکتی۔ مزدوروں کا انقلاب اس خیالی مقصد کے لئے راستہ ضرور ہموار کردے گا۔ مگر تاہم یہ انقلاب یکایک اس کی تشکیل نہیں کریگا یہاں ہمارا ذہن زمانۂ انقلاب کی دوگانہ تقسیم کے تخیل کی طرف جاتا ہے۔ یہی تخیل مارکس نے پیش کیا تھا اور اشتمالی اُسی کی پابندی کرتے ہیں۔

۱۔ زمانۂ انقلاب کی عبوری منزل جس میں ریاست کو اقتدار حاصل ہوگا اور خود ریاست پر مزدوروں کا تسلط ہوگا۔

۲۔ وہ منزل جس میں طبقات کا وجود نہیں ہوگا اور جماعت خالص اشتمالی اصولوں پر مبنی ہوگی۔ اس منزل میں ریاست بہ حیثیتِ حاملِ قوت واختیار کے مفقود ہوجائے گی۔ انقلاب کی ان دونوں منزلوں کا الگ الگ مطالعہ ہمارے لئے سہولت بخش ہوگا۔

(۱) انقلابی یا عبوری منزل — حامئین اشتمالیت ارتقائی اشتراکیت کے نظریوں سے خاص طور سے اختلاف کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک ریاست میں اہم تبدیلیاں نہ کردی جائیں جماعت کے ڈھچر میں کوئی بنیادی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔ ماضی کے تجربات اور خاص طور پر ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون[1] کی ناکامی سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مزدور پیشہ طبقے کا صرف موجودہ سرمایہ دارانہ ریاست

---

[1] انقلاب فرانس کے عہد ہیبت کی وہ مزدور جماعت جو ۱۸۷۱ء میں برسرِاقتدار تھی۔

کی مشینری پر قابض ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لئے کہ اس صورت میں وہ اُسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ ریاست کی موجودہ ساخت انقلابی مقاصد کے لئے نہایت ناموزوں ہے۔ اس کے عمال بھروسے کے آدمی نہیں ہوتے۔ اس کا ضابطۂ عمل بے اثر ہوتا ہے اور اس کی فطرت اس قابل نہیں ہوتی کہ صرف اس کے چلانے والوں کے بدل جانے سے وہ خود بھی بدل جائے مزدوروں کی ایک جماعت کو اگر سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ اقتدار اس وقت تک بالکل بے حقیقت ثابت ہوتا ہے جب تک سرمایہ دار طبقہ ذرائع دولت آفرینی پر قابض ہے۔ اس قبضے کی بدولت سرمایہ دار ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب رہے گا کہ پارلیمنٹ جس پر دستوری مزدور پارٹی قابض ہے، ایسے ہی قوانین نافذ کرے، جن سے اس کی صنعتی طاقت پر آنچ نہ آسکے۔ اور اگر ایسی پارٹی کبھی ایسے قوانین نافذ کرنے کی کوشش بھی کرے جو سرمایہ داروں کو بے دخل کر کے ملکیت کو جماعت کے قبضے میں منتقل کرنے والے ہوں، تو بھی وہ ان قوانین کی زد سے بچ کر نکل جانا چاہیں گے یا پھر، آخر کار، اپنے حقوق کے لئے حکومت سے بغاوت کریں گے۔ برطانیہ عظمیٰ میں مزدور پارٹی کو طاقت حاصل ہوئی مگر اس طاقت کے زمانے میں وہ سرمایہ داروں کے اقتدار پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکی اور اس باب میں اسے نسبتاً زیادہ ناکامی ہوئی۔ اشتمالیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حقیقت ...... ارتقائی اشتراکیت کے متعلق ان کے نظریئے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

ان حقائق کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا جاتا ہے کہ دستوری ذرائع ترک کر دینے چاہئیں، موجودہ ریاست کی مشینری کو بدل دینا چاہئے، اور محروم الملک طبقے کی آمریت قائم کرنی چاہئے۔ جدید اشتمالی تو یہاں تک کہتے ہیں۔ تامل نہیں کرتے کہ انقلابی جدوجہد میں تشدد اور درشتی بھی جائز ہے جو سرمایہ دار طبقے کی فنا کا باعث ہوگی۔ مزدوروں کے طبقے کا مسلح تشدد نہ صرف سرمایہ داروں کو بے دخل کرنے کے لئے ضروری ہوگا بلکہ اشتمالی انقلاب کے جواب میں سرمایہ داری کے احیاء کے لئے جو انقلاب برپا کیا جائے گا، اسے دبانے کے لئے بھی ضروری ہے۔

اینجلز کا قول ہے "انقلاب میں جو جماعت فتحیاب ہوتی ہے، وہ ضرورت کے تقاضے سے

مجبور ہوتی ہے کہ اپنے اقتدار کو اُس خوف کے ذریعے قائم رکھے جو رجعت پسندوں کے دلوں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ اگر پیرس کا کمیون اپنی حاکمیت کی بنیاد مسلح عوام پر نہ رکھتا جو سرمایہ داروں کے مقابلے پر تھے تو کیا اس کی عمر ۲۴ گھنٹے سے زیادہ ہوتی؟"

اس سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ سرمایہ دار طبقے کو اعلیٰ تعلیم، نظم و ضبط، اور فوجی مہارت جیسے ذرائع کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سامانِ جنگ اُن کے تصرف میں ہوتا ہے اور اُسے ہر طرح سے آراستہ کرنے کے لئے روپیہ ان کے جیب میں۔ اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ اگر یکا یک کسی انقلابی ہنگامے میں وہ بے دخل بھی ہو جائیں تو ان فوائد کے استعمال سے باز آ جائیں گے۔

لینن کہتا ہے "کوئی سنجیدہ سے سنجیدہ اور شدید سے شدید انقلاب کیوں نہ ہو، سرمایہ داروں کی مدافعت میں ایک طویل، دیرپا، اور شدید جد و جہد ہی فتحیاب جماعت کے تسلط و اقتدار کی ضمانت کر سکتی ہے۔ اس طبقے کو انقلاب کے بعد بھی برسوں مظلوم طبقے کے مقابلے میں غیر معمولی فوائد حاصل رہیں گے۔ یہ طبقہ مظلوم اکثریت کے کسی فیصلے کے سامنے بغیر اپنے سابقہ فوائد کو ایک فیصلہ کن جنگ یا ایک سلسلۂ جنگ کی صورت میں استعمال کئے ہرگز نہیں جھکے گا۔" ان حقائق کے پیش نظر سرمایہ داری نظام کے بعد اشتمالی نظام کے قیام سے پہلے ایک عبوری زمانہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ کا ایک مستقل باب بنے گا۔"

اس دور میں یہ قول لینن مزدوروں کی ایک "دکھاوے کی ریاست" سرمایہ دارانہ ریاست کی جگہ لے گی۔ یہ ریاست بہ اقتضائے ضرورت ایک طبقاتی تنظیم کی حیثیت رکھے گی، مگر اس کے فرائض منصبی انقلابی مزدوروں کی ایک نمائندہ جماعت متعین کرے گی۔

مارکس کا قول ہے کہ "سرمایہ داروں کی دفاعی جد و جہد کو شکست دینے کے لئے مزدور ریاست کو ایک عارضی اور انقلابی رنگ میں رنگ دیں گے۔" اس قول سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ اس دور میں ریاست سخت گیر اور چند شخصیتوں کی ایک جماعت کا نام ہو گا۔ اُسے جابرانہ اختیارات

حاصل ہوں گے اور اس کا دستور العمل خالص جمہوری نہیں ہو گا، یعنی اس کے اجزائے ترکیبی میں ہر جماعت کا دخل نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس یہ صرف ایک جماعت کی نمایندگی کرے گی اور بس۔ وہ جماعت محرومِ الملک طبقے کی ہو گی۔ اور صرف سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے کے لئے ریاست کے اختیارات کو استعمال کرے گی۔

انجیلز ایک جگہ لکھتا ہے، "چونکہ ریاست ایک عارضی ادارہ ہو گا، اور اس کا استعمال زمانۂ انقلاب میں طاقت کے زور سے مخالفین کو دبانے کے لئے ہو گا اس لئے اس زمانے میں ایک آزاد اور مقبول ریاست کا چرچا کرنا سراسر مہمل ہے۔ محرومِ الملک طبقے کو ریاست کی ضرورت تو ہو گی ــــ وہ ضرورت جب تک بھی باقی رہے ــــ مگر اس لئے نہیں کہ آزادی کے مفاد کا تحفظ ہو، بلکہ اس لئے کہ اس کے مخالفین کا خاتمہ ہو جائے۔ اور جب آزادی کے چرچے کا امکان پیدا ہو جائے گا، تو ریاست کی یہ موجودہ نوعیت مفقود ہو جائے گی۔"

ان اقتباسات کو دینے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ یہ مسئلہ کہ اشتمالی تحریک کس حد تک جمہوری تحریک ہے، کافی بحث طلب ہو گیا ہے (جس کی طرف ہم آگے چل کر متوجہ ہوں گے) اس موقع پر اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ جہاں تک عبوری زمانے کا تعلق ہے، جمہوریت کو ــــ اس مفہوم میں جو بالعموم اس لفظ سے ادا ہوتا ہے ــــ نہ تو قابلِ عمل تصور کیا جاتا ہے اور نہ اُس کی پسندیدگی تسلیم کی جاتی ہے۔

۲۔ انقلابی زمانے کے بعد کی منزل | سرمایہ داروں کی سرکوبی کے سلسلے میں ریاست خود اپنے زوال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جس حد تک وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کا وجود بے فائدہ ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ اس کی بنا و تعمیر طبقاتی ہوتی ہے، اور اس کا مقصد طبقاتی مفادات کی توسیع و تبلیغ، اس لئے جب طبقاتی امتیاز کو مٹا چکتی ہے تو اسی کے ساتھ اس کا مقصدِ وجود بھی فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ریاست بقول لینن "پژمردہ" ہو جائے گی اور اس کی جگہ رضاکارانہ پنچایتوں سے مرکب ایک سماج لے لے گا جو امورِ عامہ کے

اہتمام و انصرام کے لئے قائم ہوں گی پہلی جماعت کا یہی وہ منتہائے نظر ہے جس کا آغاز اس بات کی دلیل ہو گا کہ اب انقلابی دور ختم ہو گیا ہے۔ اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے بھی اب یہ وہ جماعت ہو گی جس میں مکمل آزادی حاصل ہو گی، اور جس کے قیام کے لئے نراجی بھی جدوجہد کرتے ہیں۔

نظریہ اشتمالیت میں جدید رجحانات | سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ مارکس کے نظریئے کے اُن پہلوؤں کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جن پر جدید اشتمالی زور دیتے ہیں اور جن کی اُنھوں نے تحقیق و تفسیر کی ہے۔ مارکس کی تصانیف میں ایک بالکل مختلف تاویل کی بھی گنجائش ہے اور اُس کی بنیاد پر ایک بالکل مختلف فلسفۂ طریق کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ حال کے واقعات اور خصوصاً ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے جس کی بدولت اشتمالیت کی عملی حیثیت بھی نہایت اہم ہو گئی، اس کے نظری پہلو میں بہت سے نئے رجحانات پیدا ہو گئے ہیں اور یہ چیز قدرتی طور پر ہونی بھی تھی۔ یہ رجحانات اس شکل میں رونما نہیں ہوئے ہیں کہ مارکس کی تعلیم سے دست برداری کا اعلان کر دیا گیا ہو، بلکہ اس شکل میں کہ اس کے بعض پہلوؤں پر دوسرے عناصر کو قربان کر کے بے انتہا زور دیا جانے لگا ہے۔ روسی اشتمالیت نے مارکس کی تصانیف میں اس کی روح کو بدلے بغیر ایک ذرا تغیر کیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامیین اشتمالیت اِدھر جمہوریت کے مسئلے پر غیر معمولی زور دینے لگے ہیں، اس سے پہلے اُنھوں نے کبھی اس مسئلے پر اتنا زور نہیں دیا تھا۔ لینن کی بیشتر تصانیف اور خاص طور پر اُس کی وہ مشہور و معروف تصنیف جو کارل کاٹسکی[۱] کے اعتراضات کے جواب میں ہے اس مسئلے کی تحلیل و تشریح کے لئے وقف ہے کہ اشتمالیت کس حد تک اور کس مفہوم میں جمہوری النوع ہے۔

---

[۱] کاٹسکی نے ۱۹۱۹ء میں وائنا میں "مزدوروں کی آمریت" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس کتابچے میں اس نے اشتمالیت کے ان اصولوں اور طریقوں پر نہایت سخت تنقید کی تھی جو روس میں عمل پیرا تھے۔ اس کی تنقید کی بنیاد استدلال یہ تھی کہ یہ اصول و طریق مارکس کے نظریئے سے مختلف اور غیر ہم آہنگ ہیں۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس مسئلے کو کس طرح اتنی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس غرض کے لئے ہمیں گذشتہ صدی کے نصف آخر پر نظر ڈالنی چاہیئے اور اشتمالی تحریک کی اُس عہد کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اشتمالیین کی دوسری بین الاقوامی انجمن جو ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئی تھی، وہ مسلک کے اعتبار سے خالصتہ مارکس کے اصولوں پر مبنی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ طاقت اور جنگ جوئی کے لحاظ سے ان تمام جماعتوں کے مقابلے میں جنھوں نے مارکس کے اصول اختیار کئے، سب سے کمزور اور بودی تھی۔ یہ تو صحیح ہے کہ پہلی بین الاقوامی انجمن کے زمانے میں مزدوروں کی تنظیم کا جو معیار تھا اُس سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار اس (دوسری بین الاقوامی) مجلس کے دستور میں تجویز کیا گیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری تیس سال اور بیسویں صدی کے پہلے بیس سال میں مزدوروں کی انجمنوں میں تعداد اور طاقت دونوں لحاظ سے زبردست اضافہ ہوگیا تھا۔

مگر تنظیم کے اضافے کے ساتھ ساتھ انقلابی روح میں پژمردگی پیدا ہوتی گئی۔ یہ زمانہ امن کا تھا۔ صنعت و حرفت میں زبردست وسعت، اور اشیاء دولت میں پہلے سے نسبتاً بہت زیادہ فراوانی ہوگئی تھی۔ اس خوشحالی اور امن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کے لئے متعدد مراعات اس آسانی سے حاصل کرلی گئیں جن کی بدولت مارکس کی پیشین گوئیوں کے متعلق اس خیال کے قائم ہونے کا امکان ہوچلا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ناامیدی کا نتیجہ ہیں۔ اور اب یہ امید کی جانے لگی تھی کہ جماعت اشتراکی نظام میں منتقل تو بلاشبہ بتدریج ہوگی مگر بامن طریق پر، اور حلقہ ہائے انتخاب میں مزدوروں کی طاقت کے استعمال کے ذریعے سے۔ مگر یہ امیدیں فریب ثابت ہوئیں۔

جنگِ عظیم سے پہلے انجمنیوں کی جو بغاوت ہوئی تھی، وہ بھی مارکس کے اصولوں کی جنگ جویانہ تعبیر پر مبنی تھی اور خود جنگ عظیم نے دنیا کے سامنے انقلابی بین الاقوامی اشتراکیت کو ایک مرتبہ پھر ایک سرگرم اور ارتقا پذیر طاقت کی حیثیت سے پیش کیا۔ جنگ جویانہ مذہب اشتراکیت کو جنگ عظیم سے مختلف پہلوؤں سے امداد ملی۔ مگر سب سے بڑی اور نمایاں امداد یہ ملی کہ اس نے انقلابی اور ارتقائی اشتراکیوں کے درمیان ایسی گانٹھ ڈال دی کہ اب اس امر میں بھی شبہ ہے

کہ اشتراکیت کے یہ بازو پھر کبھی ایک ہی تحریک کے دو مختلف حصے کہے جا سکیں گے یا نہیں۔ جنگ کی وجہ سے لوگ مجبور ہو گئے کہ دو باتوں میں سے ایک بات پسند کر لیں یعنی یا تو مزدوروں کے طبقے کے طرف دار بن جائیں یا پوری قوم سے رشتۂ اتحاد جوڑیں۔ پھر واقعات نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ ان کے لئے ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد پھر اُس پر نظر ثانی کرنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا۔

جو لوگ قومی جوش کی رو میں بہہ گئے تھے، ملکوں کی قومی حکومتوں سے ان کے نہایت گہرے ملقات قائم ہو گئے۔ اس کے خلاف اُن کا اشتراکی اصول اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ان حکومتوں سے ترک تعلق ہی نہیں، ترکِ اعتماد کا بھی اظہار کریں۔ پھر تو ان لوگوں نے اپنے ملک کے مزدوروں [illegible] اس مقصد کے لئے بھرتی ہونے پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ دوسرے ملکوں کے مزدور موت کے [illegible]ٹ اتارے جائیں، حالانکہ بین الاقوامی مجلس نے ان کو یہ سبق پڑھایا تھا کہ کہیں کے بھی مزدور [illegible]ں، وہ انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ بہت سے اشتراکی تو اپنے ملک کی سرمایہ دار حکومتوں میں عہدوں [illegible] مامور بھی تھے۔

جن لوگوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا، وہ بھی واقعات کے تقاضے سے پہلے گروہ سے [illegible]ل مختلف سمت پر چلنے پر مجبور ہو گئے۔ قومی حکومتیں ان سے کہتی تھیں کہ اس جنگ کے زمانے [illegible] قوم دوسروں کے گستاخانہ حملے کا شکار ہو رہی ہے اور خواہ اور کچھ نہ ہو، اس حیثیت سے سب [illegible] نمائندہ ہے۔ سب کو مل کر اس کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہئے۔ مگر یہ گروہ قوموں کی اس اپیل سے [illegible] روائی کرتا تھا، جس کے خمیازے میں ان کو موت اور قید کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔ اس طرزِ عمل [illegible] تنگ آکر اُنھوں نے سرے سے ریاست کے تخیّل ہی سے صاف صاف انکار کرنا شروع کر دیا۔ [illegible]ت کے زمانے میں ایک شہری اپنی ریاست کے تحفظ کے لئے کوشش کرنے سے صرف اس [illegible] گریز کر سکتا ہے ـــــ اور اس کا یہ فعل منطقی حیثیت سے غلط نہیں ہو گا ـــــ کہ ریاست کے [illegible]ی حاکمیت سے اُسے انکار ہے۔ یا کم سے کم یہ کہ اُس کی حاکمیت کی بہ نسبت وہ کسی دوسرے ادارے [illegible] حاکمیت کو مقدم سمجھتا ہے۔ اور درحقیقت یہی راہ عمل تھی جسے انقلابی اشتراکیوں نے اختیار کیا۔

انھوں نے دیکھا کہ جنگ عظیم کی صورت میں مارکس کی پیشین گوئیوں کی تکمیل ہو رہی ہے، یہ دیکھ کر انھوں نے جنگ آزما مزدوروں کی تحریک سے اپنی وفاداری کے رشتے کا اعلان کیا، قومی نقطۂ نظر کے مطابق دنیا کی تقسیم سے انکار کیا، اور تیسری بین الاقوامی مجلس کی طرف تیزی سے رجوع کرنے لگے۔ یہ مجلس ۱۹۱۹ء میں مارکس کے ان فتحیاب پیروؤں نے ماسکو میں قائم کی جنھیں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب میں طاقت حاصل ہو چکی تھی۔ اس مجلس کے پروگرام میں سب سے اہم کام ایک جامع اعلان کی تصنیف و اشاعت تھی جس میں انقلابی اشتمالیت کے اصولوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اس اعلان میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں، وہ اپنی اصل کے اعتبار سے سب وہی ہیں جنھیں مارکس اور اینجلز نے قائم کئے تھے۔ اور جنھیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ البتہ اس کا ایک نیا پہلو یہ ہے کہ جمہوریت کے معمولی تخیل اور جنگ جو اشتمالیت کے درمیان جو بیّن فرق ہے، اُس پر اس اعلان میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اشتمالیت اور جمہوریت | اس سوال پر غور کرتے وقت ہمیں اُن امتیازات کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو سرمایہ دارانہ نظام جماعت عبوری دور کی انقلابی ریاست، اور اس انقلابی دور کے بعد اس کی جگہ لینے والے نظام جماعت کے درمیان قائم کئے گئے ہیں۔ سرمایہ دارانہ جماعتی نظام کے بارے میں اشتمالیین کا جو کچھ طرزِ عمل ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں موجودہ نوع کی جمہوریت سے بداعتمادی ہے، یا انھیں اکثریت کی حکومت کی طرف سے تنفّر ہے بلکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ حالات میں جمہوریت کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب تک عوام کی اکثریت ملکیت سے محروم ہے، اُس وقت تک انفرادی آزادی کا چرچا کرنا اور یہ کہنا کہ اپنی جماعت کے نظام کا تعین انسان کے اپنے بس کی چیز ہے ایک مہمل سی بات ہے۔ ایک فرد جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی محنت سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ بیچ دے، آزادی کی نعمت سے محروم رہتا ہے، اس لئے کہ جس قسم کی وہ زندگی گذارنا چاہتا ہے، اُسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی موثر ذریعہ موجود نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت کے ڈھچر کا تعلق ہے، حکومت خواہ شکل کے اعتبار سے کتنی ہی جمہوری النوع کیوں نہ ہو، جماعت میں اقتدار کی عنان، حکومت کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ

ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جن کے پاس ذرائع دولت آفرینی پر قبضہ رکھنے کی بدولت اقتصادی طاقت موجود ہے۔

ایک عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اب مزدوروں کو تعلیم کا موقع دیا جارہا ہے یہ چیز بجائے اس کے کہ ان کو اُن کے آقاؤں کے مساوی درجے پر پہنچا دے، معاملے کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے مزدوروں کا نیم تعلیم یافتہ ہونا سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں اُن کی غلامی کی زنجیر کو اور مضبوط کر دے گا۔ نظام تعلیم، پریس اور پلیٹ فارم سب کے سب چونکہ سرمایہ داروں کے اثر و اقتدار میں ہوتے ہیں اس لئے وہ ان ذریعوں سے نیم تعلیم یافتہ مزدوروں کے دماغوں کو ماؤف کر دیں گے اور چونکہ ان کی تھوڑی بہت تعلیم ہو چکی ہوگی، اس لئے اُن کے دماغ سرمایہ داروں کے اثر و اقتدار کو بلند تر قبول کر لیں گے۔ لہذا جب تک تبلیغ و اشاعت کے تمام ذرائع دوسروں کے ہاتھ میں ہیں، مزدوروں کے پورے طبقے کو اپنا ہم خیال بنانے کی توقع بے معنی ہوگی۔ یہی صورتِ حال ایک عرصے تک جاری رہے گی پھر ایک وہ موقع آئے گا (جیسا جنگ کی وجہ سے روس میں آیا تھا) کہ طبقہ وارانہ شعور اتنا بڑھ جائے گا کہ حکمراں اقلیت یہ محسوس کرنے لگے گی کہ وہ کوئی کام اسی وقت کر سکتی ہے جب اکثریت اُس کی تائید پر ہو۔ اور اشتمالئین ایسے ہی موقع کے انتظار میں ہیں کہ اس کے آتے ہی سرمایہ داری کے عہد کو ختم کر دیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس دوران میں سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ۔۔۔ یعنی جمہوریت جو جان بوجھ کر ایسے ہی تخیلات کی حامل ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے طبقے کے حسبِ حال ہوں۔ یہ توقع رکھنا کہ وہ سرمایہ داروں کے طبقے کے خاتمے کا ارادہ کرنے میں کامیاب ہوگی۔ بے نتیجہ ہوگا۔

جہاں تک عبوری منزل کا تعلق ہے، جس میں مزدوروں کے طبقے کی آمریت ہوگی، معاملہ کسی قدر مختلف ہے۔ یہ منزل صرف اس معنی میں جمہور النوع ہوگی اور اُسی وقت تک عمل پذیر رہے گی جب تک مزدوروں کا طبقہ اس کے وجود اور عمل پذیری کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اس معنی میں جمہوری النوع نہیں ہوگی کہ اُسے پوری آبادی کی مجموعی تائید حاصل ہے۔ ظالموں کی جمہوریت میں مظلوموں کے حقیقی ارادے کی جس قدر جھلک ہو سکتی ہے، مظلوموں کی جمہوریت

میں ظالموں کے حقیقی ارادے کی اس سے زیادہ جھلک نہیں ہو سکتی۔

غرض انقلابی دور سے پہلے صحیح جمہوریت کی عمل پیرائی مفقود ہے اور انقلابی دور میں اس کا ناقابلِ عمل ہونا مسلم ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں اشتمالئین ایک عالمگیر تائید کے امکان پر اتنا زیادہ بھروسہ نہیں کرتے جتنا چند افراد کی پختگیٔ ارادہ اور مجاہدانہ عزم پر رکھتے ہیں۔ یہ خیال بہت سی لوگوں کے نزدیک یاس انگیز اور تاریک ہوگا اور یہ تو واقعہ ہے کہ اشتمالئین بہت سے دوسرے اشتراکیوں سے اس عقیدے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے خلاف جنگ ناگزیر ہے، اور یہ جنگ تشدد پر مبنی ہوگی اور طویل ہوگی۔ وہ بہرحال اس الزام سے انکار کرتے ہیں کہ اُن کی پالیسی قطعی طور پر مایوسی کی پالیسی ہے۔ اس کے برعکس ان کا یہ خیال ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جس کا دیوالہ نکل چکا ہے، اگر امید کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی انقلابی اشتراکیت۔ جب تک سرمایہ داری کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا جائے، اس کی کوششیں دنیا کی تہذیب کو متزلزل کر دیں گی۔ جب تک جماعت بے عنان سرمایہ داری کی تہ تک نہیں پہنچ جاتی، جنگ پر جنگ ہوتی رہے گی اور وبا اور قحط کا دور دورہ رہے گا۔ باامن اشتراکیت اور آزادی خواہ محرکات کی بدولت جو تھوڑا بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ہر نئی جنگ کے ہاتھوں سوخت ہو جاتا ہے۔ خطرے کے لمحات میں اُن کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور عریاں اور شرمناک قسم کی رجعت پسندی ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تہذیب جماعت کے سلسلۂ ارتقا میں اپنا کام پورا کر چکی بلکہ اپنی طبعی عمر سے زیادہ حیات پا چکی ہے۔ اور اب اگر اُس کی لعنتوں سے دنیا کو محفوظ رکھنا ہے، تو پھر اس کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ ایک مضبوط اور راسخ العزم انقلابی جماعت بوقت آنے پر سرمایہ داری کو ختم کرنے کا پختہ ارادہ رکھتی ہو اور اس کی جگہ پر قائم کرنے کے لئے ایک مرتب و منظم نظام کا تصوّر۔

اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیادوں پر ایک تنقیدی نگاہ

از محمد مظہر الدین صدیقی، بی۔ اے

تحریک اشتراکیت اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے غیر متوازی نظام سرمایہ داری کا ردعمل
تھی۔ ابتدا میں اس کی حیثیت محض سلبی تھی یعنی اس کا دارومدار تمام تر ایک جذبۂ مخالفت پر تھا اس
کا مقصد صرف اتنا تھا کہ سرمایہ داری نظام کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا جائے اور دنیا کو دولت
مندوں کی حرص و آز اور سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی جائے لیکن جیسا
جیسا زمانہ گذرتا گیا اشتراکیت کی بنیادیں ٹھوس ہوتی گئیں اور اس کا اثباتی پہلو زیادہ نمایاں ہونے
لگا۔ پہلے یہ ایک خالص معاشی تحریک تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار
کرلی اور اس کا دائرۂ نظر زندگی کے غیر معاشی پہلوؤں پر بھی حاوی ہوگیا۔ اشتراکیت کی اس
ہمہ گیریت کی اس شخص نے بنیاد رکھی وہ کارل مارکس تھا جس نے اس خالص معاشی تحریک
کو اس کا مخصوص فلسفہ عطا کیا اور اس کو اُن مذاہب کے ہم پلّہ بنا دیا جو زندگی کے ایک مخصوص
نقطۂ نظر اور موجودات کے ایک خاص نظریے کے حامل ہیں۔

مارکس کے نظریات اور افکار میں جس چیز نے اشتراکیت کو دیرپا استحکام بخشا اور
نقطۂ نظر کی دنیا میں اس کا مرتبہ بلند تر کردیا وہ اس کا مخصوص فلسفۂ تاریخ تھا۔ اس مضمون
میں ہم زیادہ تر اسی نظریۂ تاریخ سے بحث کریں گے۔ کیونکہ یہی نظریہ اشتراکیت کی حقیقی فلسفیانہ
اساس ہے۔ یہ نظریہ جسے تاریخ کی مادی تعبیر سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو اشتراکی تحریک کے
بمنزلہ روح کے ہے، مختصراً یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جتنے عظیم الشان انقلابات
رونما ہوئے ہیں اور قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں جس قدر تغیرات رونما ہوئے ہیں ان
کا حقیقی سبب، ذرائع پیداوار کی تبدیلیاں اور معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے تھے۔

کارل مارکس کے نزدیک انسانی تاریخ کے انقلابات اور سماجی زندگی کے تغیرات کے پس پشت کسی قسم کے اخلاقی تصورات کارفرما نہ تھے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی اعمال کے محرکات میں معاشی محرک ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے تمام محرکات اسی کے تابع ہیں۔ مارکس کے نظریے کی رو سے اخلاقی یا نکوکاری کا کوئی ابدی اور کلی معیار نہیں ہے۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ اخلاق کا مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے۔ لیکن چونکہ حالات کی تبدیلی کا باعث در اصل معاشی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں اس لئے بطور نتیجہ اخلاقی تصوّرات بھی حقیقت میں معاشی حالات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں جن اخلاقی نظریات و افکار نے انسانی سیرت و کردار کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ وہ حقیقتاً اس معاشی تنظیم کا معلول و نتیجہ تھے جس پر اس دور کی سماجی زندگی کی بنیاد قائم تھی۔

،، ہم یہاں اس نظریے کے ان نتائج و اثرات سے بحث نہیں کریں گے جو فی الجملہ وہ انسان کی اخلاقی زندگی پر پیدا کرتا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم علمی معیار سے اس کی صداقت پر غور کریں۔

مارکس کے نظریے سے جیسا کہ اوپر اس کی تشریح کی گئی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں اور تمام محرکات عمل کو ضمنی یا طبعی قرار دیتا ہے اور معاشی مفاد کے تخیل کو انسان کے تمام اعمال کا مرکز و محور قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک محرکات عمل میں غالب محرک یہی تخیل ہے اور جب کبھی دوسرے محرکات الگ الگ یا مل کر اس کے مقابل یا حریف ہوتے ہیں تو بالآخر فتح معاشی محرک ہی کو ہوتی ہے اس لئے مارکس کے خیال میں تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر حکومت و سیاست کی جملہ اشکال اور انسانی روابط و تعلقات کی گوناگوں صورتوں کی تہ میں ہمیشہ سے معاشی اسباب کارفرما ہیں اور انھی اسباب کی تبدیلی سے زندگی کے تمام مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔

ہم بے شک اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک انسان کی ابتدائی ضروریات

کا جن کے بغیر بقائے حیات ناممکن ہو تعلق ہے۔ انسانی اعمال معاشی اسباب کے معلول ہوتے ہیں اور معاشی مفاد کا تخیل ہی اس کے افعال و کردار کا محور ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس دائرے سے متجاوز ہونے کے بعد بھی یہی محرک انسانی اعمال کو متعین کرتا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ تہذیب و تمدن کے جملہ مظاہر اسی وقت عالم وجود میں آتے ہیں جب کہ انسان کی ادنیٰ ترین ضروریات تکمیل پا چکی ہیں۔ کیونکہ تہذیب و تمدن نام ہے حیاتِ برتر کا اور حیات برتر کا تخیل ہی اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتا ہے جب تک حیاتِ محض کے قیام و بقا کی ضمانت نہ موجود ہو۔ لیکن کیا ادنیٰ ترین ضروریات کی سطح سے بلند ہونے کے بعد بھی یہ محرک ویسا ہی قوی رہتا ہے یا اور محرکات عمل اس کی جگہ لے لیتے ہیں؟ اس کو شخصی زندگی کی ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے زید ایک انسان ہے جو اس سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے جہاں ادنیٰ ترین ضروریات کی بھی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس کو ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل میسر آتی ہے۔ بکر اور عمر بھی اسی حالت میں مبتلا ہیں اور قوتِ لایموت کے محتاج ہیں۔ کیا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس حالت میں جو سب کے لئے یکساں ہے ان سب کا عمل بھی یکساں ہوگا؟ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر زید اس حالت سے مجبور ہو کر چوری کرنے پر آمادہ ہو جائے تو عمر اور بکر بھی اسی جرم کے مرتکب ہوں گے۔ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ عمر، بکر اور زید تینوں کی جسمانی حالت یکساں ہے اور جہاں تک جسم و ذہن کا تعلق ہے ان تینوں کی قوت برداشت مساوی ہے۔ اس تمام یکسانی کے بعد بھی ممکن ہے کہ زید کے مقابلے میں عمر اس حالت کے برداشت کرنے میں زیادہ مستقل مزاج ثابت ہو اور چندے اس مصیبت پر صبر کر لیا جائے بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کو وہ بُرا خیال کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جو چیز اس کو ارتکابِ جرم سے باز رکھتی اور صبر و استقامت پر آمادہ کرتی ہے وہ کسی فائدے کا تصور یا کسی ہونے والے نفع کی توقع نہیں ہے۔ ممکن ہے اس حالت پر عمر زیادہ مدت تک صبر نہ کر سکے اور بالآخر زید کی طرح چوری کرنے پر آمادہ ہو جائے برخلاف

اس کے برعکس کی جسمانی حالت عمر اور زید سے کسی طرح بہتر نہیں ہے آخری لمحۂ زندگی تک اس فعل شنیع کے ارتکاب پر آمادہ نہ ہو اور اپنی جان دے دینا گوارا کرے۔

اب ان تینوں کے کردار کے اختلاف کی توجیہہ کیوں کر کی جا سکتی ہے؛ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ مثال زیر بحث زندگی کے عام حالات سے کسی طرح الگ نہیں ہے روز مرہ کی زندگی میں ایسی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ پھر اس کی توجیہہ کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ تین اشخاص نے جن کی جسمی حالت یکساں تھی یکساں حالات میں مختلف طرز عمل اختیار کیا۔ معاشی محرکات ان کے طرز عمل کی تشریح کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ کیا بالآخر ہمیں تسلیم نہیں کرنا پڑتا ہے کہ مثال زیر بحث میں اخلاقی تصورات ہی کا اختلاف زید، عمر اور بکر کے کردار پر موثر ہوا اور وہی نتائج کے اس عظیم الشان فرق کا باعث ہوا؛ اس سے تو اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ادنیٰ ترین ضروریات کی سطح پر بھی اعمال و کردار پر جو چیز فیصلہ کن طریقے پر موثر ہوتی ہے وہ جنس اخلاقی ہے نہ کہ معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے۔ اسی مثال میں اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ زید، عمر اور بکر کو اس صبر آزما حالت سے نجات مل جائے اور ان کے لئے ایسے اسباب و وسائل مہیا کر دئے جائیں کہ ان کی زندگی کی معمولی ضروریات پوری ہو جائیں تو پھر کیا ان کی سیرت اور کردار میں نمایاں فرق نہ پیدا ہو جائے گا؛ ممکن ہے کہ زید معمولی ضروریات زندگی کے سامان فراہم ہو چکنے کے بعد بھی قانع نہ ہو بلکہ زیادہ سے زیادہ آسائش اور بہتر سے بہتر ساز و سامان کا طالب ہو۔ درآں حالیکہ عمر اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی سعی و طلب کا مرکز ثقل بدل جاتا ہے اور اب وہ اپنے خاندان اور اپنے عیال کے لئے بہتر زندگی کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ بکر ان دونوں سے الگ اب صرف ملک و قوم کی خدمت ہی میں مصروف ہے اور اسی جذبے میں زندگی کی تمام راحتیں اور ذہن و قلب کی تمام تسکین حاصل کر لیتا ہے تو کیا ان تینوں کے کردار کا محرک اب بھی معاشی مفاد کا تخیل ہے؟ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کی مثالیں عام طور پر ہمیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ان تینوں

اشخاص کے اعمال و روش پر معاشی زاویہ نگاہ نہیں بلکہ اخلاقی تصورات اثر انداز ہو رہے ہیں پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی اس سطح پر جہاں زندگی کی معمولی ضروریات کی تکمیل کا سامان مہیا ہو معاشی زاویہ نگاہ ویسے ہی قوی اثرات رکھتا ہے جیسے کہ اس حالت میں جبکہ انسان اپنی ادنیٰ ترین ضروریات بھی پوری نہ کر سکتا ہو پھر چونکہ تہذیب و تمدن کا تعلق اسی سطح زندگی سے ہے جہاں انسان کی اول ترین ضروریات پوری ہو چکی ہوں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ معاشی محرک ہی بالآخر تمام محرکات پر غالب آتا ہے یا یہ کہ یہی محرک انسانی اعمال کا سرچشمہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا آدمی اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے حالات سے کم و بیش ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مارکس اس عہدِ ظلمت کی پیداوار تھا جب سرمایہ داری کا نظام اپنے تمام مظالم و مفاسد کے ساتھ مغربی دنیا پر مسلط ہو چکا تھا اور مغربی اقوام خالص مادہ پرستانہ زاویہ نگاہ سے ہر شے کی قدر و قیمت متعین کرنے لگی تھیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر معاشی مفاد کا خیال غالب تھا اور معاشی محرک کے علاوہ اور کسی محرک کی گرفت افعال انسانی پر اتنی مضبوط نہ تھی۔ ایسی فضا اور ماحول میں آنکھ کھولنے کا اثر یہ ہوا کہ مارکس نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے حالات کو ایک قائم و دائم چیز خیال کر لیا اور ان حالات کے پیدا کردہ معیاروں اور قدروں کو دائمی اور ابدی متصور کیا۔

کیا تاریخی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات اور تاریخ کے اہم واقعات معاشی اسباب کے معلول تھے؟ کیا یونان کے تہذیب و تمدن، روما کی سطوت و جبروت اور پھر عیسائیت کے عروج و ارتقا میں یہی ایک محرک کارفرما تھا؟ حالانکہ یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ عیسائیت کی ساری کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے انسان کے غیر معاشی اور خالص اخلاقی محرکاتِ عمل کو ابھارا اور اپنا پیغام نفس بشری کی ان گہرائیوں تک پہنچایا جہاں معاشی مفاد کے خیال کا گذر نہ تھا اگر انسان واقعی ایک معاشی جانور ہوتا

تو عیسائیت کی اخلاقی فتوحات اور سیاسی کامیابیاں کبھی معرض ظہور میں نہ آسکتیں۔ کیونکہ عیسائیت نے سب سے پہلے معاشی مفاد کے خیال کو تزکیۂ نفس کی سند قرار دیا بلکہ اس نے تو معاشی زاویہ نگاہ رکھنے والے اشخاص پر اپنی جنت کے دروازے ہی بند کر دیے۔

کیا قوموں کے عروج تہذیب کے فروغ اور جماعتی زندگی کے ارتقاء میں شخصی عزائم کی کوئی قوت، قومی بلند حوصلگی کا کوئی منظر اور اجتماعی مقاصد اور اخلاقی تصورات کا کوئی جلوہ ہمیں نظر نہیں آتا ہے۔ جس کی بنا پر اس امر سے انکار کیا جاسکے کہ ان سب کے عقب میں ذرائع پیداوار کی تبدیلیاں اور معاشی محرکات کی قوت ہی کارفرما تھی؟ آخر وہ کیا معاشی محرکات تھے جنھوں نے چھٹی صدی عیسوی میں صحرائے عرب میں وہ عظیم الشان انقلاب برپا کیا جس نے ہمیشہ کے لئے انسانی افکار و اعمال کا رُخ بدل دیا؟ ممکن ہے اس کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ سب گذرے ہوئے واقعات ہیں لیکن اب موجودہ متمدن دنیا میں معاشی اسباب ہی حالات و واقعات کا رُخ متعین کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان حالات و اسباب کو دائمی کس بنا پر متصور کر لیا گیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ موجودہ دور زندگی ایک عبوری دور ہے جس میں معاشی محرکات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے؟ کیا اس کے باور کرنے کے کافی وجوہ نہیں ہیں کہ انسانی معاملات میں یہ دُکان دارانہ ذہنیت اور انسانی روابط کی یہ تجارتی بنیادیں غرضکہ زندگی پر معاشی زاویہ نگاہ کا تسلط بہت عرصے تک باقی رہنے والا نہیں ہے؟ انسانی معاملات کی یہ شکل جو صنعتی انقلاب کے بعد شروع ہوئی ہے اس درجہ ناپائدار، اتنی ناقص اور پر از مفاسد ہے کہ ابھی دو سو سال کا عرصہ بھی نہیں گذرا ہے اور تہذیب و تمدن کا یہ سر بفلک ایوان متزلزل نظر آرہا ہے۔ جو لوگ اس کے نقش و نگار، اس کی ظاہری آب و تاب سے مرعوب ہو گئے ہیں وہ تو بیشک اس کو پائدار اور مستحکم خیال کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہ بنیاد پر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے انہدام کا وقت قریب ہے۔

"کارل مارکس کے نظریہ تاریخ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالئے تو ایک امر اور قابل غور نظر آتا ہے
انسانی زندگی کے واقعات کا سبب معلوم کرتے ہیں مارکس نے شخصی اثرات اور افراد کی اہمیت
کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ غیر شخصی اثرات اور ان میں بھی صرف معاشی ضروریات کو واقعات
کی اصل وجہ قرار دینا اور افراد کے ارادوں اور مقاصد کو ماضی حال اور مستقبل کی تعمیر میں
بے اثر سمجھنا درحقیقت اس عقیدے پر ایمان رکھنے کے مترادف ہے کہ انسان کا جماعتی
ارتقار اندھی قوتوں کی کش مکش کا نتیجہ ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے انسانی زندگی کو بناتی
یا بگاڑتی رہتی ہیں۔ درحقیقت یہ زندگی کے متعلق وہی نقطۂ نظر ہے جس کو ڈارون نے اس
کامیابی کے ساتھ مغربی فلسفۂ حیات کی اساس و بنیاد بنا دیا ہے۔ یہ کائنات کا وہی تصوّر
ہے جس میں ارتقار حیات کو کسی مقصد کا پابند نہیں قرار دیا جاتا ہے اور اس میں کسی ذی فہم
ارادہ کی کارفرمائی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ زندگی کے بڑے بڑے
انقلابات اور تاریخ کے فیصلہ کن واقعات اس وقت صورت پذیر نہیں ہوتے ہیں جب
تک کوئی بڑی شخصیت ان واقعات کے لئے وسیلہ یا واسطہ کا کام نہ انجام دے؟ کیا
تاریخی واقعات میں شخصی اسباب کا کھوج لگانا بے سود ہے؟ کارلائل اور اس کے ہم خیال
تو فوراً یہ جواب دیں گے کہ تاریخ کی تعبیر صرف بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی ہی سے ہو سکتی
ہے۔ جو لوگ اس حد تک کارلائل کے ہم خیال نہیں ہیں ان کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شخصی
اثرات کو بالکل نظر انداز کر دینے کے بعد تاریخی واقعات کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ کیا
اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے رہنماؤں، فاتحوں، فلسفیوں اور
مفکروں نے اکثر اوقات واقعات و حالات کی رفتار پر فیصلہ کن اثرات چھوڑے ہیں؟ کیا
ہمارا گرد و پیش ہمارا ماحول اور ہمارے تمام علوم و فنون جن پر ہمارے تمدن کا دارومدار
ہے، یہ سب اسی حالت اور اسی شکل میں آج موجود ہوتے اگر تاریخ کے اسٹیج پر سقراط
افلاطون، سکندر و دارا، رومی و غزالی اور لوتھر اور مارکس جیسے اشخاص ظاہر نہ ہوتے؟

پھران لوگوں نے اور ان کی جیسی بے شمار ہستیوں نے اقوام وملل کی زندگی پر جو دیرپا
اور امٹ اثرات چھوڑے ہیں کیا ان میں شخصی حوصلوں اور تمناؤں، ذاتی خیالات و افکار
کا کوئی دخل نہ تھا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ شخصی اسباب بھی
واقعات کا رُخ متعین کرنے میں اور زندگی کو ارتقاء کی راہوں پر لگانے میں برابر کے حصہ دار
ہیں۔ پھر چونکہ معاشی اسباب، غیر شخصی اسباب کا ایک جزو ہیں اس لئے یہ بھی تسلیم
کرنا پڑتا ہے کہ واقعات وحالات کی آفرینش میں معاشی اسباب اور ضروریات بہت تھوڑا
حصہ رکھتے ہیں حالانکہ مارکس نے انھی کو مرکزی حیثیت دی ہے۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ارتقاء حیات میں شخصی اثرات کو بھی وہی اہمیت
حاصل ہے جو غیر شخصی اثرات کو ہے، اور قوموں اور جماعتوں کی قسمت کے فیصلے کرنے
میں اعلیٰ شخصیتوں اور بلند مرتبہ انسانوں کو بھی اتنا ہی دخل ہے جتنا معاشی زندگی کے ناگزیر
تقاضوں کو، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بڑی بڑی شخصیتوں کے اعمال کے کیا محرکات
تھے؟ مارکس کے نظریے کے مطابق تو ان کے حرکت و عمل کو ہیجان میں لانے والی شے کے پیچھے معاشی
ضروریات کا دباؤ اور معاشی مفاد کا تخیل ہونا چاہئے لیکن اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان
غیر معمولی ہستیوں میں جنھوں نے انسانی زندگی کے بہاؤ کو ایک جانب سے دوسری جانب
موڑ دیا اگر کوئی چیز مشترکہ نظر آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب معاشی محرک کے اثر
سے آزاد تھے اور یہی ان کی عظمت اور ان کے غیر معمولی اثر کا راز تھا کہ انھوں نے خود اپنی
مادی زندگی میں معاشی مفاد کو اپنے افعال کا محور نہیں بنایا بلکہ اُن کی ساری زندگیاں
اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ ہمیشہ غیر معاشی محرکات عمل سے متاثر ہوئے اور معاشی مفاد کے
تصور کو اپنی راہ میں نہ آنے دیا۔ انھوں نے اسی محرک کو سب سے زیادہ پس پشت ڈالا اور
اسی چیز کو سب سے زیادہ حقیر سمجھا جو مارکس کے خیال میں انسان کے تمام اعمال کا محور و مرکز
ہے۔ اگر اسی کو محرک عمل تسلیم کر لیا جائے تو نہ اُن کی عظمت اور اثر آفرینی، ان کی بزرگی اور برتری، ایک لمحہ کے لئے بھی قائم رہتی

اگر وہ معاشی مفاد کو ہر وقت پیش نظر رکھتے؟ کیا مہاتما بدھ، سقراط، گلیلیو، لینن، ٹالسٹائی اور خود مارکس کے اعمال کا محرک وہی معاشی زندگی کے ناگزیر تقاضے تھے جو مارکس کے نزدیک انسانی افعال و کردار کی بنیاد و اساس ہیں؟

کیا ان لوگوں نے زندگی بھر معاشی مفاد کو نہیں ٹھکرایا اور دولت و ثروت کی آرزوؤں اور عیش و راحت کی تمناؤں سے منہ نہیں موڑا؟ حالانکہ مارکس کے نظریے کی رو سے یہی چیزیں تمام انقلابات و تغیرات کا اصل سبب اور تمام اعمال کی حقیقی وجہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتی ہے کہ شخصی عظمت اور اس کی اثر فرمائیاں معاشی مفاد کے تخیل کے ساتھ نہیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان بلند شخصیتوں کی عظمت و برتری اور ان کی اثر آفرینی اس میں مضمر تھی کہ بالآخر اُن کی قربانیوں نے ان کی جماعت یا قوم کی خوش حالی میں اضافہ کیا اور اس کی معاشی زندگی کو بہتر بنایا تو یہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہوگا کہ غیر معاشی محرکات ہی بالآخر معاشی فلاح اور مادّی خوش حالی کا موجب ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ مان لیا جائے اور متذکرہ بالا دلائل کے بعد اس کا ماننا ناگزیر ہو جاتا ہے تو مارکس کا پورا فلسفہ بالکل بے بنیاد اور اس کے قائم کردہ اصول بالکل شکست ہو جاتے ہیں۔ اگر غیر معاشی محرکات جو مسلّمہ طور سے تاریخ کی بڑی بڑی شخصیتوں کے اعمال کا سبب تھے اپنے آخری اور بعید نتائج کے لحاظ سے مادی خوش حالی اور معاشی فراوانی پیدا کر سکتے ہیں پھر اشتراکیت اور سرمایہ داری کی آویزش کو فوراً ختم ہو جانا چاہیے جب کہ اس لحاظ سے دونوں کوئی حقیقی بنیاد نہیں رکھتی ہیں۔ کیونکہ دونوں میں معاشی محرکات ہی کو اعمال و افکار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور دونوں یکساں طور سے معاشی محرک ہی کو اپیل کرتے ہیں۔ پھر جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے اگر غیر معاشی محرکات معاشرتی فلاح اور جماعتی خوش حالی پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں تو زندگی کے وہ تمام نظامات جو اشتراکیت کی طرح معاشی مفاد پر مبنی ہیں اور معاشی مفاد ہی کو اپنے فلسفے کا سنگ بنیاد قرار

قرار دیتے ہیں اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکام ہیں اور اپنے اندر ایک ایسا گ
منطقی تضاد رکھتے ہیں جو کسی صاحب فہم کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا ہے

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ

از جناب زین العابدین احمد صاحب۔ مترجمہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی
بی اے (جامعہ) یہ رسالہ موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۴ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ

از زین العابدین احمد صاحب۔ مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب۔ اس مختصر
رسالے میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے خرچے پر
بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت

از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان
کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جارہا ہے۔ اس
کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے۔ جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی
کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

سیاسیات کی پہلی کتاب

مرتبہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے۔ اس میں اردو جاننے والے طبقے کو سیاسیات
کی مبادیات کو آسانی اور اختصار سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ قیمت ۱ر

مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی

ترکی پر ایک نظر

موجودہ جنگ میں ترکی کا معاملہ بڑا اہم اور سخت نازک ہے، برطانیہ اور فرانس چاہتے ہیں کہ وہ ان دونوں کا فعّال حلیف بنے، روس اور جرمنی اُسے اپنی طرف کھینچتے ہیں، ملک کی جغرافی حیثیت کچھ ایسی ہے کہ وہ دونوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اپنے بچاؤ کے لئے اسے ایک نہ ایک فریق کا کچھ نہ کچھ ساتھ دینا ہوگا۔ ترکوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ اس جنگ کی آگ سے اپنا دامن بچالیں۔ نئی ترکی کو امن کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ان کی قومی اور انفرادی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں اس وقت تعمیر اور ترمیم کا کام زوروں پر نہ ہو رہا ہو۔ دوسری طرف پچھلے دنوں زلزلے کی تباہ کاریوں نے ملک کے بہت بڑے حصّہ کو برباد کر دیا ہے، ترکوں کو لڑائی سے الگ رہنا چاہیئے، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں، اُن کو کسی سے کوئی بیر نہیں، وہ دولت عثمانیہ کے وسیع رقبوں سے اپنی مرضی سے ہاتھ کھینچ چکے، اُنھیں اپنی رہی سہی پونجی پر قناعت ہے اور اس کو ٹھیک کرنا اور مفید بنانا ان کی سیاست کا سب سے بڑا مقصد ہے، لیکن ارد گرد کے حالات میں ان کا کیا قابو!

ترکی جمہوریت سے پہلے دولت عثمانیہ پر چاروں طرف سے دشمنوں کا نرغہ رہتا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے ترکی ملّت کی کمزوری کے خیال سے جھگڑے کی جتنی چیزیں تھیں ان سب کو الگ کر دیا۔ نئی ترکی کی خارجی سیاست کا اصل اصول امن دوستی رہا ہے، اُنھوں نے ۱۹۲۲ء سے اب تک "جنگ جو" حکومتوں کے مقابلہ میں "امن دوست" سلطنتوں کا ساتھ دیا، لیکن اب دنیا کا نقشہ کچھ اس طرح بدلا ہے اور حریفوں، اور حلیفوں کی نئی ٹولیاں اس قسم کی بنی ہیں کہ ترکی کو اپنے لئے نئی راہ بنانی ضروری ہوگی۔

فرانس اور برطانیہ کو دولتِ عثمانیہ سے پرخاش رہا کرتی تھی، ترکی جمہوریت نے عربی ملکوں کو اُن کے حوالے کر کے ان سے اپنی جان چھڑائی۔ بلقان کی عیسائی ریاستیں ترکوں کو اپنا دشمن سمجھتی

تھیں، مصطفےٰ کمال نے تمام نزاعی مسائل کو اس خوش اسلوبی سے طے کیا کہ ترکی کی شمولیت میں بلقان اتحاد قائم ہو گیا، یونان سے ترکی جمہوریت کی بے شک سخت جنگ ہوئی تھی لیکن یونانیوں کی شکست کے بعد فاتح ترکوں نے پرانے کینوں کو دل میں جگہ نہیں دی، اور سیاسی مصلحتیں جذبات پر غالب آئیں، ترکی اور یونان میں نہ صرف سمجھوتہ ہوا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ ہٹلر سے پہلے جرمنی اپنے خانگی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ ترکوں کو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لئے ملک کے تعمیری کاموں میں انھوں نے جرمنوں سے کھلے دل سے مدد لی۔ البتہ مسولینی سے ترکوں کا دل صاف نہ تھا، اور حبش پر قبضہ کے بعد تو ترکوں کو اٹلی سے خطرہ ہونے لگا۔

جرمنی میں ہٹلر کے برسراقتدار آتے ہی بین الاقوامی سیاست کا توازن بگڑ گیا، آسٹریا، زیکوسلاویکیہ کے بعد نازی سیلاب ظاہر ہے بلقان کی طرف رخ کرتا۔ مسولینی اقتدار کے لئے عرصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اسی زمانہ میں اس نے آگے بڑھ کر البانیہ کو دبا لیا، اب ان دونوں کی زد ترکی پر پڑتی تھی، دوسری طرف روس بھی نازی خطرہ سے مطمئن نہ تھا، اور برطانیہ اور فرانس الگ پریشان تھے، ان حالات میں برطانیہ فرانس اور روس کا امن پسند محاذ بنانے کی سعی کرنا ایک فطری تقاضہ تھا، اور ترکوں کا اس محاذ میں شامل ہونا لازم

روس، اور ترکی کی دشمنی صدیوں سے چلی آتی ہے، حسن اتفاق تھا کہ روس میں اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا، زار کے ساتھ روسی، برطانی اور فرانسیسی اتحاد اور آپس کا سمجھوتہ بھی رخصت ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے ہار مان لی، برطانی اور فرانسیسی فوجیں آبنائے باسفورس پر قابض ہو گئیں، اور اشتراکی روس کو اپنی جان بچانی مشکل نظر آنے لگی، آبنائے باسفورس ترکوں کے پاس رہتی تو روس ادھر سے مامون تو تھا لیکن ان پر یورپ کی دو زبردست سلطنتوں کا قابض ہو جانا جو اشتراکی روس کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں خود روس کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گیا، ان اسباب کا یہ نتیجہ تھا کہ اشتراکی روس اور کمالی ترکی آپس میں ایک دوسرے سے قریب آ گئے، اور صدیوں کی دشمنی اور کشت و خون کے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء میں ماسکو کے مقام پر دونوں کا دوستانہ معاہدہ ہوا،

روس کی مدد ہی سے ترک آسانی سے یونانیوں کو اپنے ملک سے نکال سکے اور اسی وجہ سے

برطانی اور فرانسیسی فوجیں اور جنگی بیڑے آبنائے باسفورس سے لوٹ جانے پر مجبور ہوئیں اور روس ہی نے سب سے پہلے انگورہ کی کمالی حکومت کو تسلیم کیا، اشتراکی روس کا خیال تھا کہ ان باتوں سے ترک روس کے اثر میں کلیتہً آجائیں گے اور اس طرح سے آبنائے باسفورس پر براہ راست نہیں تو بالواسطہ روس کا اقتدار قائم ہو سکے گا۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں جب لوزان میں صلح کی گفتگو ہوئی تو ترکوں نے روس کی مرضی کے خلاف اور اس سے پوچھے بغیر یورپی سلطنتوں کے ساتھ آبنائے باسفورس کے متعلق باہم سمجھوتہ کر لیا، روس نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن ترکوں نے ایک نہ سنی، کچھ عرصہ تک آپس میں شکر رنجی رہی لیکن آخر روس نے اس سمجھوتہ پر بادل نخواستہ مہر تصدیق ثبت ہی کر دی، موصل کے مسئلہ پر ترکوں اور برطانیہ میں ان بن ہوئی اور جمعیت الاقوام کے فیصلہ کے مطابق دسمبر ۱۹۲۵ء سے ترک یورپی سلطنتوں سے بد دل سے ہو گئے، تو روس اور ترکی نے پھر آپس میں سر جوڑنا مناسب سمجھا، اور دونوں حکومتوں کی خارجی سیاست باہمی مشورے سے طے پانے لگی، اور باہر کی دنیا کو یقین آ گیا کہ روس اور ترکی دونوں حلیف اور ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔

گذشتہ سال اگست کے مہینے میں سیاسی دنیا میں بھونچال سا آ گیا، اشتراکی روس اور ان کے پرانے دشمن نازی جرمنی میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اس پر زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ پر سیلاب کی طرح پھیل گئیں، روس نے موقع پا کر چپکے سے پولینڈ کے ایک حصہ کو دبا لیا، اور بالٹکی ریاستوں کے وزیروں کو ماسکو بلا بھیجا کہ روس کے مطالبہ کو مانو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، ترکی کے وزیر خارجہ بھی ماسکو پہنچے، نئے حالات پر بحث ہوئی اور آخر ان کو روس کے مطالبوں کو رد کرنا پڑا، اور اس کے خلاف برطانیہ اور فرانس سے عہد و پیمان ہو گئے، اب ترکی آہستہ آہستہ روس سے دور کھنچ رہی ہے اور برطانیہ اور فرانس سے تعلقات استوار ہو رہے ہیں، ابھی پچھلے دنوں برطانی وزیر اعظم نے دارالعوام میں یہ بیان دیا ہے کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا تو اتحادی اس کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ترکی اور روس کا یہ اختلاف بظاہر ہوا سا بن گیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف کسی فوری حادثہ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی تہ میں مستقل محرکات اور اسباب کام کر رہے ہیں۔ ترکی کا انقلاب روس کے اشتراکی انقلاب

سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، کمال انقلابیوں کا قبلہ مقصود ماسکو نہیں بلکہ پیرس تھا، وہ اپنے ہاں اشتراکی نظام بنانے کے کبھی بھی روادار نہیں تھے، وہ شروع ہی سے اپنے لئے یورپی طرز کی جمہوریت اور یورپی رنگ کا کلچر منتخب کر چکے تھے، اور اس کی آب یاری یورپی فلسفہ زندگی اور یورپ ہی کے افکار سے کرنے کے داعی تھے، سیاسی حالات سے مجبور ہو کر وہ اشتراکی روس کے دوست بنے تھے، اور اشتراکی روس بھی یورپی سلطنتوں کے خوف سے ترکوں کا شریک تھا، سیاسی ہم رنگی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دونوں قومیں باہم شیر و شکر ہو گئیں غلط تھا، دونوں نے ایک دوسرے کا نقطۂ نظر خوب سمجھ لیا تھا اور دونوں سیاسی مصلحتوں کے تقاضے سے واقف تھے، چنانچہ آپس کی دوستی کے باوجود ترکی میں اشتراکیت کا پرچار قانوناً جرم ہی رہا، اور اشتراکی خواہ وہ روس کا باشندہ ہو یا ترکی کا، ملکی قانون اسے ملزم گردانتا رہا۔ ترکی نے پنج سالہ پروگرام کے سلسلہ میں روس سے بڑی مدد لی، اپنے ہاں سے کاریگر اور انجنیر روس بھیجے، اور زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ترکی کے سابق وزیر اعظم اور موجودہ صدر جمہوریت ماسکو گئے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اشتراکی افکار اور روسی تمدن ترکی قانون میں قابل گرفت رہا۔

ترکی اور روس کی آپس میں اتنی دوستی اور پھر اتنی بدگمانی! اس کو سمجھنے کے لئے دونوں قوموں کی پچھلی تاریخ اور جغرافی محل وقوع کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، ماسکو کے تخت پر کٹر عیسائی زار نہ ہوا، بے دین سٹالین ہو گیا لیکن ملک کی ضرورتیں تو بدل نہیں جایا کرتیں، اور اقتدار کا جذبہ تو فنا نہیں ہوا تھا، روس اور ترکی کی تو یہ مثال ہے کہ گھر تو ایک شخص کے قبضہ میں ہو، اور دروازے پر کسی دوسرے کا پہرہ ہو، گھر کے مالک اور پہریدار کی صرف اس وقت تک نبھ سکتی ہے کہ دونوں کو کسی تیسرے مشترکہ دشمن کا خوف دامن گیر رہے، سٹالین، ہٹلر اور مسولینی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کی روک تھام کے لئے ترکی کو ہر قسم مدد دے سکتا ہے لیکن اگر وہ ان دونوں سے محفوظ ہو جائے تو پھر وہ ترکی کو آبنائے باسفورس کا واحد مالک بنا کیسے گوارا کر سکتا ہے، روس بحیرہ اسود میں بند رہنے کے لئے تیار نہیں وہ بحیرہ روم تک پہنچنے کی گزرگاہ پر اقتدار چاہتا ہے، ادھر فرانس اور برطانیہ روس کی اس پیش قدمی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے، اور ترکی کو اپنا ساتھی بنانے پر مصر ہیں، تاکہ روس کو آبنائے باسفورس سے اُدھر ہی رکھا جائے کہ کہیں روسی ریچھ

کے پہنچے بحیرہ روم کو بھی اپنی پیٹ میں نہ لے لیں۔

ترکی کی حالت بہت نازک ہے، روس سے بگاڑتا ہے تو اسے اپنی خیر نظر نہیں آتی خشکی اور تری دونوں طرف سے اس پر روسی حملہ ہو سکتا ہے، اگر روس کی مان کر برطانیہ اور فرانس سے رشتہ نہ جوڑے تو ان دو زبردست سلطنتوں کا بحری بیڑہ اور فوجیں دوسری طرف سے چڑھ دوڑیں گی، بہر حال وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گرفتار ہے، روس کا مطالبہ یہ ہے کہ آبنائے باسفورس میں ہمارے جہازوں کو تو گزرنے کی اجازت ہو لیکن برطانیہ اور فرانس کے جہاز ادھر نہ آسکیں، اس طرح سے روس باطمینان خاطر دنیا کو تنگ سکتا ہے، اور کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

اب تک تو ترکی نے روس پر برطانیہ اور فرانس ہی کو ترجیح دی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دونوں کی جنگی کارروائیوں سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق رکھنے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اس حکمت سے ایک طرف تو اُسے تمام اسلامی اور عربی ممالک کی ہمدردی حاصل ہو گئی، اور دوسرے وہ روس کی پیشقدمی سے بھی ایک حد تک محفوظ ہو گیا ہے، لیکن اگر روس اور جرمنی نے مل کر بلقان کا رخ کیا تو پھر ترکی کا جنگ سے بچنا مشکل ہو جائیگا اور اسے اس آگ میں کودنا ہی پڑے گا، اور شاید اسی لئے برطانیہ اور فرانس مصر اور شام میں بے شمار فوجیں جمع کر رہے ہیں تاکہ بوقت ضرورت روس کے خلاف فوری کارروائی کی جا سکے۔

ترکی اور برطانیہ اور فرانس میں تو جنگ کا کوئی امکان نہیں، ترکی کو خدشہ اگر ہے تو روس کی طرف سے ہے، اور اس سلسلہ میں افواہوں کا بھی بڑا زور ہے۔ کبھی ایران کی طرف سے حملہ کی خبر پھیلتی ہے اور کبھی کاکیشیا اور بلغاریہ کی سمت سے، بہر حال یہ یاد رہے کہ روس کے لئے ترکی پر حملہ کرنا آسان نہیں، برطانیہ اور فرانس اس کی مدد کو فوراً پہنچ جائیں گے، کیونکہ ترکی کی فوری مدد میں ان دونوں کی سلامتی ہے۔

"س"

غزل

(جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ)

— مبارک ہو دُکھتے دلوں کو مٹانا
تمھاری جوانی تمھارا زمانا

محبت تو کرتی ہے دنیا زمانا
محبت کو تو نے نہ جانا نہ مانا

بدلتا ہے جس طرح پہلو زمانا
یونہی بھول جانا یونہی یاد آنا

لگا کر کہیں آگ سی بھول جانا
شرارت شرارت بہانا بہانا

ہر اک کا سہارا ہر اک کا ٹھکانا
ترا آستانا، ترا آستانا

— عجب صحبتیں ہیں محبت زدوں کی
نہ بیگانہ کوئی، نہ کوئی یگانا

فسوں پھونک رکھا ہے ایسا کسی نے
بدلتا چلا جا رہا ہے زمانا

اُدھر خود نما حُسن رشکِ قیامت
اِدھر چہرہ رین گردوں میں سمانا

تبسم بھی شبنم سے ہو نرم جس کا
قیامت ہے اس آنکھ کا ڈبڈبانا

یہ کر کے بھی تو عشق ناشاد سا ہے
کرم یاد رکھنا ستم بھول جانا

کئی بجلیاں بے گرے گر پڑی ہیں
اُن آنکھوں کو اب آ گیا مسکرانا

وہ پنہاں خلش کون تھی جس کی خاطر
عدم کو پڑا نازِ ہستی اُٹھانا

— جوانی کی راتیں محبت کی باتیں
کہانی کہانی۔ فسانا فسانا

وہی تم وہی ہم وہی در ولیکن
محبت محبت! زمانا زمانا

ترے گم شدوں کو وہ منزل ملی ہے
نہ چلنا نہ پھرنا نہ آنا نہ جانا

بنا جا رہا ہے، ہوا جا رہا ہے — خوشی کا زمانہ بھی غم کا زمانا

حقیقت بھی تجھ پر کبھی کھل رہے گی — تجھے خیر آ جائے دھوکا ہی کھانا

سے چلے جا رہے ہیں سے چلے جانے والے — نہ کوئی سہارا نہ کوئی ٹھکانا

یہ دردِ نہاں کیا، یہ عشقِ بتاں کیا — محبت کا دھوکا نظر کا بہانا

الم کیا خوشی کیا کہ دیکھا ہے ہم نے — الم کا ہنسانا، خوشی کا رُلانا

غنیمت ہے اے عشق تھوڑے دنوں تک — یہ ہنسنا ہنسانا یہ رونا رُلانا

یہ کہہ کر میں کرتا ہوں عرضِ تمنا — نگاہِ محبت کے دھوکے نہ کھانا

بدلنے کا تیرے پتہ دے رہا ہے — تجھے آج پا کر تری یاد آنا

غمِ ہجر سہتا ہوں اور سوچتا ہوں — تری مہربانی ہے تیرا نہ آنا

اِسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں — کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

فراقؔ اُن نگاہوں کو سوا کریگا
یہ انگڑائی پر آج انگڑائی آنا

مارچ کے رسالہ جامعہ میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ براہِ مہربانی انھیں درست کر لیجئے۔

صفحہ	سطر	غلط	بجائے	صحیح
۲۲۳	۷	جامع الحیثیتں	بجائے	جامع الحقیقتیں
۲۲۵	۱۴ اور ۱۵	شاعری	″	شاعر و ماہیت بجائے ہیئت
۲۲۷	۱	اساطین	″	اساتین
۲۳۸	۱	بساطِ ہوائے دل	″	ہوائے بساطِ دل
″	۱۱	تجرید	″	تجدید
نام مضمون نگار (احساس کمتری)		شبیر محمد اختر صاحب	″	سیّد محمد اختر صاحب

فن لینڈ
استالین
میری جدوجہد ہٹلر
میری جدوجہد
میری جدوجہد
میری جدوجہد
مولوٹف

فرق صرف اتنا ہے

نیا اُفق؟
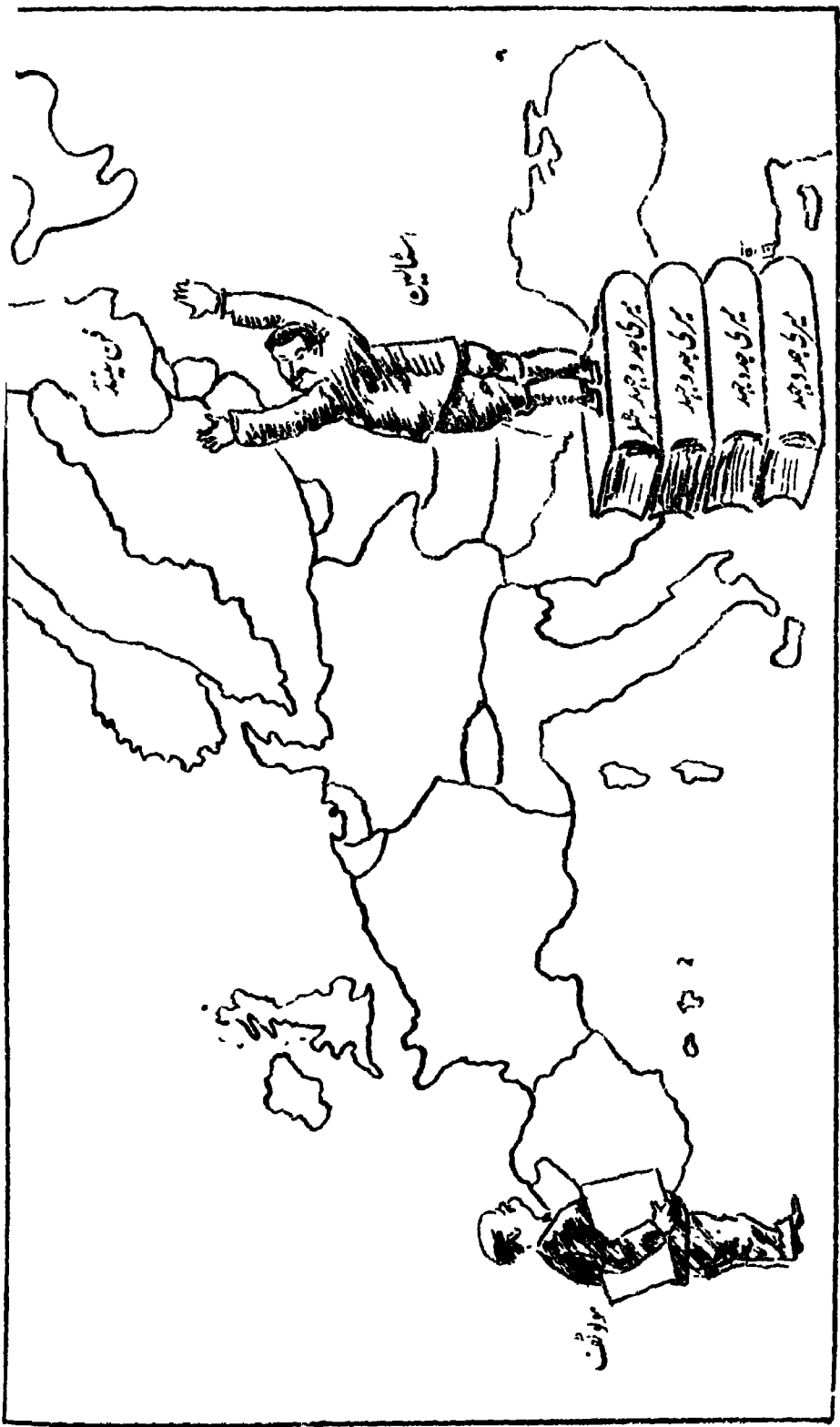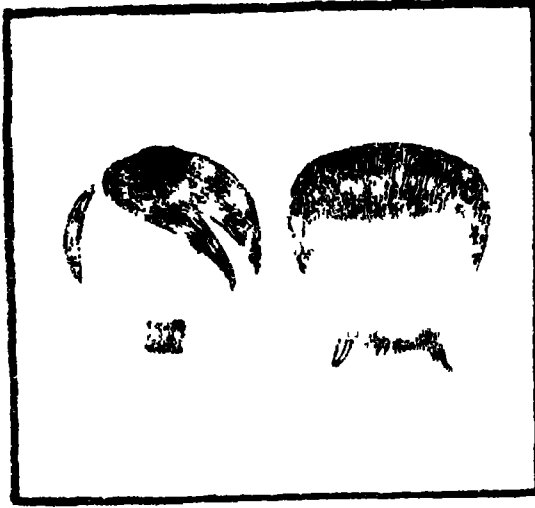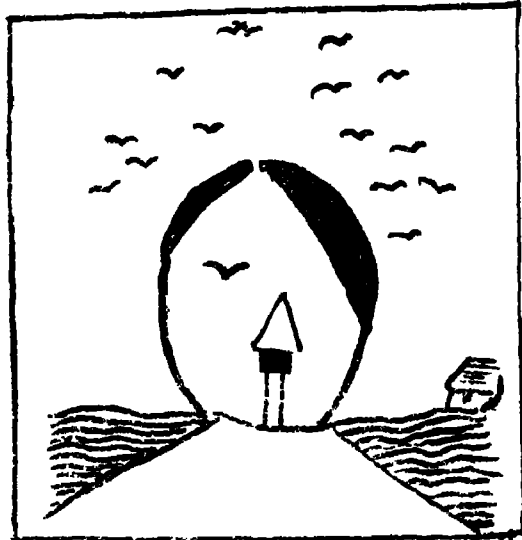
دنیائے ادب

نئی کتابیں | انگریزی :- دنیا کبھی ایک سی نہیں رہتی۔ جو کل تھی وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگی انھیں نت نئی تبدیلیوں کا نام زندگی ہے۔ روز نئی تبدیلیاں ہوتی ہیں، دنیا اپنے آپ کو ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرتی رہتی ہے۔ اور جتنی جلدی یہ ہم آہنگی ظہور میں آتی ہے، اتنی ہی تیزی سے دُنیا نئی تبدیلیوں کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی آگے کو چلتی رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کی چلت پھرت بند ہو جائے، زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی تعلیم میں مشرق میں اقبالؔ اور مغرب میں ایچ۔ جی ولز سے زیادہ کسی اور نے نہیں کی۔

ولز کی قریب قریب ساری تصانیف کی روح یہی ایک خیال ہے۔ اپنی تاریخی، اجتماعی اور ادبی سب کتابوں میں ولز نے اسی خیال کی تبلیغ کی ہے۔ اُس کے ناول ہمیں بتاتے ہیں کہ سائنس کی جدید ترقی اور مشینوں کے پھیلے ہوئے جال نے ہماری اجتماعی زندگی میں کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس سے ہماری اخلاقی قدروں میں کیسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے، ہمارے طرز تخیل نے کیا انداز اختیار کر لیا ہے اُس کی تاریخی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ انسان نے کس طرح ترقی کرتے کرتے تہذیب کی لاتعداد منزلیں طے کرکے موجودہ حیثیت اختیار کی ہے۔ یہی خیالات ہیں جن کی بنا پر اپنی ہر تصنیف میں اشارتاً، کنایتاً اور کبھی کبھی صاف صاف لفظوں میں ولز نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نئی ضرورتوں کے پیش نظر ہمیں برابر اپنی اجتماعی اور سماجی زندگی کے نظام میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنی چاہیئے۔

ولز کی ان متعدد تصانیف کی تازہ ترین کڑی اُن کی کتاب "دنیا کا نیا نظام" ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ سے ولز نے دنیا کے ہر حصے کو ایک عالمگیر اور پُرامن نظام کی تحت میں لانے کی تجویز پیش کی ہے ولز کا خیال ہے کہ دنیا اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے، جہاں اُس میں ایک زبردست انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ تبدیلی ظہور میں نہ آئی تو انسان کی پُرامن زندگی ایک زبردست خطرے میں

پڑ جائے گی۔ انسان کو فطرت کی طرف سے کچھ حقوق ملے ہیں، حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اِن حقوق کی حفاظت کرے۔ موجودہ حکومتوں کی پالیسی انسان کے ان فطری حقوق کو پامال کر رہی ہے۔ اس لئے ولز کے نزدیک ایسے شدید انقلاب کی ضرورت ہے جو حکومتوں کے موجودہ انفرادی طریقوں کو بدل کر دُنیا میں ایک متحدہ نظام پیدا کر سکے۔ ولز کی سمجھ میں خود نہیں آیا کہ یہ نظام کیا ہوگا، اور یہ نظام جس قسم کے انقلاب کا نتیجہ ہوگا، اُس کی نوعیت کیا ہوگی۔ اسی لئے اُنھوں نے اس خیال کو ایک بحث کی شکل دے دی ہے۔ دو دنیا کے تمام مفکرین کو دعوت دی ہے کہ وہ اس بحث میں شریک ہوکر اپنے اپنے مشورے دیں۔ اور سب مل کر کوئی ایسا نظام مرتب کریں جس سے انسانی حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ دُنیا اب سے زیادہ پُرامن اور پُرسکون بن جائے۔ اور نسل انسانی جس خونریز تباہی اور بربادی کا شکار ہو رہی ہے، اُس سے بچ سکے۔

ولز کی اس بحث میں اب تک یورپ کے بہت سے مفکرین نے حصہ لیا ہے جس میں برنارڈ شا، جارج لینس بری، جے۔ بی۔ پرلیٹلی، پروفیسر ہالڈین وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان مفکرین نے ولز کی پیش کی ہوئی تجویزوں کو جس نظر سے دیکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں بہت زیادہ ترمیم کی گنجائش ہے اور اس کے بعد بھی یہ یقین نہیں کہ یہ بحث کوئی مفید عملی پہلو اختیار کر سکے۔

گجراتی:۔ (۱) بھارت نو تنکر (ہندوستان کی آواز)

اے۔ ایف۔ خبردار گجراتی زبان کے بہت مشہور شاعر ہیں اور اُن کا شمار ہندوستان کے بہت اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب آپ کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے، پہلا اڈیشن یورپ کی لڑائی سے کچھ پہلے شائع ہوا تھا اب دوسرا اڈیشن چھپا ہے۔ نظموں میں شاعر نے قربانی اور ایثار کی تعلیم دی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں مادرِ وطن کے قدموں پر اپنا تن، من، دھن سب کچھ تج دینا چاہئے۔ آزادی کی فضا کے موجودہ دور میں اس طرح کی نظمیں ملک اور قوم کے لئے بے حد مفید ہیں۔ اگر اس قسم کی نظموں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو سکے تو یہ ایک بڑی قومی خدمت ہو

(۲) جیون آنند، گجراتی کے مشہور مصنف شری کالیلکر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف

گجراتی زبان کے سنجیدہ اور شگفتہ لکھنے والے ہیں۔ انھیں زبان پر فنّی قدرت حاصل ہے۔ اور اس لئے ہر قسم کے مضامین کو دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی خوشیوں میں ڈوب کر لکھتے ہیں اور دوسروں کو اس کی لذتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی جمالیاتی دلکشیوں کا احساس حد سے زیادہ ہے، چاہتے ہیں دوسرے بھی سرور سرمدی سے محروم نہ رہیں۔

ہماری زبان میں اس طرح کے مضامین لکھنے کا رواج کچھ تو شروع ہی سے بہت کم تھا اور اب تو بالکل ہی نہیں رہا۔ اس لئے ایسے ادارے جو اردو کے خزانے نئے موتیوں سے بھرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ایسی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرائیں۔

کناری:۔ ہتو ورشا، کناری زبان کے مشہور مصنف شری اجی۔ پی راجارتنام کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ راجارتنام کو کرناٹک والے اپنی زبان کا عمر خیام سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ یہ مصنف کے تمام ادبی کارناموں کے بہت اچھے پس منظر کا کام دے سکتی ہے۔ ہمارے ادب نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے پھر بھی اس میں اب تک خود نوشتہ سوانح عمریوں کا رواج نہیں ہوا۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے مشاہیر اہل قلم حالات نویسی کی ذمہ داری دوسروں پر چھوڑنے کے بجائے اسے اپنے سر لیں۔ اور سوانح نگار ہیں اکثر اوقات جو نقوش بے آب و رنگ رہ جاتے ہیں انھیں خود ابھارنے کی کوشش کریں۔

مالایالم:۔ ڈاکٹر جانسن کا ناول ریسلاز (RASSELAS) انگریزی ادب میں بعض لحاظ سے بہت مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ اب سے کوئی ایک سال پہلے مالایالم کے مشہور مصنف ٹی۔ کنارن نے کیا تھا۔ اب وہی کتاب دوبارہ نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

دوسری خبریں | ڈاکٹر مادھو سٹر بک پٹ وردھن مرہٹی زبان کے بہت بڑے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا انتقال ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو پونا میں ہوگیا۔ مہاراشٹر کے لوگ عام طور پر ایسے ادیب کی قبل از وقت موت کا جتنا ماتم کریں تھوڑا ہے۔ لیکن وہ تمام ادبی حلقے جن میں علوم مشرقی کا چرچا ہے ایسے ادیب کی موت کو ملک اور قوم کا بڑا نقصان خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پٹ وردھن ۱۸۹۴ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کرنے بعد ۱۹۱۸ء میں ان کا تقرر فرگسن کالج میں انگریزی اور فارسی کے پروفیسری پر ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں راجارام کالج، کولھاپور میں ملازمت کرلی اور آخر تک وہیں رہے۔

ڈاکٹر پٹ وردھن نے اپنی شاعری کے ذریعہ سب سے پہلے مرہٹی میں فارسی کی بحریں داخل کیں اور مرہٹی کو فارسی کے تخیل سے روشناس کرایا۔ پٹ وردھن کے متعلق نقادوں کا خیال ہے کہ بعض حیثیتوں سے ان کی شاعری کا تخیل کالیداس سے بھی بلند ہے۔ پٹ وردھن نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ مرہٹی نظم میں کیا ہے۔

پٹ وردھن کا ایک اور بڑا علمی کارنامہ انکی فارسی، عربی، مرہٹی ڈکشنری ہے، جو دیوناگری رسم الخط میں چھپ چکی ہے۔ لیکن ان کا ادبی شاہکار حقیقت میں ان کی وہ شاعری ہے جو انھوں نے مرہٹی زبان میں کی ہے۔ اور یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی اگر پٹ وردھن کی شاعری کو کوئی صاحب ذوق اردو میں منتقل کر سکے۔

تامل اور تلگو زبانوں کا نام سن کر اب تک بھی ہمارا تصور کسی ایسی زبان کی زبان طرف جاتا ہے جس نے ابھی اپنے گہوارہ سے بھی پاؤں نہیں نکالے، چہ جائے کہ اس کا ادبی تصور۔ لیکن تامل اور تلگو میں جس قسم کی کتابیں شائع ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کے ادب نے بھی اچھی خاصی ادبی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ تامل میں ابھی حال ہی میں بنکم چندر چٹرجی کے اول رادھارانی کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اور تلگو میں بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ۔

جنگ کی وجہ سے کتابوں کے بازار بھی کافی متاثر ہوئے۔ انگریزی میں ۱۹۳۸ء میں جتنی کتابیں شائع ئی تھیں، ۱۹۳۹ء میں ان سے ۱۲۱۵ کتابیں کم شائع ہوئیں۔ پھر بھی صرف ناول جو شائع شدہ کتابوں ۷.۲۸ فی صدی ہیں، ۲۲۲۴ شائع ہوئے۔ سیاسی کتابیں پچھلے سال ۱۰۴۳ چھپی تھیں۔ اور اس سال ۷۰۰، اس کے علاوہ باقی ہر قسم کی کتابوں کا بازار سرد رہا۔ (و — ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تاریخ اسلام (حصہ اول):۔ مرتبہ شاہ معین الدین صاحب ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ۔ قیمت سے ر

ابھی حال میں دار المصنفین نے "ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کی تالیف کا کام شروع کیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ پورا سلسلہ دس بارہ حصوں میں پورا اور مسلمانوں کی علمی و عملی تاریخ کا ذریعہ ہوگا۔"

زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس کے مصنف دار المصنفین کے قابل اور مشہور رفیق جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ہیں۔ کتاب کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ آغازِ اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے۔

کتاب کا دیباچہ قبلہ سید سلیمان صاحب ندوی نے لکھا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف فرماتے ہیں، کہ

"یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اس قسم کی کتابیں یورپ کی زبانوں میں تو موجود ہوں مگر خود آٹھ کرور مسلمانوں کی زبان میں نہ ہوں، گو اس قسم کی تاریخ اس لحاظ سے نہایت آسان ہے کہ کسی عربی، فارسی پرانی تاریخ کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ زمانہ کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ مذاق نو کا تقاضہ کچھ اور ہے، تمدنی اور علمی حالات جو اُس زمانہ میں بہت کم لکھے جاتے تھے، اب اُن کے بغیر کسی دور کی تاریخ، تاریخ نہیں کہی جاسکتی۔"

سید صاحب سے زیادہ نئے زمانے کے تقاضوں سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ مغربی طرز کی تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل مسلمان نوجوان بادشاہوں کے افسانوں اور دل خوش کرنے والے قصوں سے جسے عرف عام میں مسلمان تاریخ کہتے چلے آتے ہیں دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ روایات کے

انبار میں سے اپنے مطلب کی باتیں نکال لینا اور پھر ان کو جاذب نظر عنوانوں کے تحت ترتیب دے کر کتاب لکھ ڈالنا ممکن ہے عقیدتمند حلقوں کے لئے باعث تسکین ہو لیکن نوجوان جن کے ہاتھ میں کل قوم کی زمام قیادت ہوگی اِن "علمی کاوشوں" سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔

جنگ عظیم کے بعد تو ذہنی ہیجان اور فکری اضطراب اور بھی بڑھ گیا ہے اور اشتراکی خیالات کا چرچا کچھ اس رغبت سے ہندوستان کے نوجوانوں میں ہو رہا ہے کہ ڈر یہ ہے اگر مسلمان اہل قلم اپنے عہد ماضی کی داستانیں اس اندھی عقیدت کے نشہ میں سرمست ہو کر لکھتے چلے گئے تو ہماری تاریخ کا وہ حصہ جو واقعی زندہ جاوید ہے اور انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک باعث فخر ہے، وہ بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اور خدانخواستہ اسلام کے کارنامے جو سرتاسر سلاطین اسلام کے کارنامے ہو کر رہ گئے ہیں، قومی تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔

سید صاحب قبلہ اس نازک صورت حال کا احساس رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں

> "پھر ہندوستان میں مسلمان جس راستہ پر چل رہے ہیں اور محفل کا رنگ جس طرح بدل رہا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ امید بھی نہیں ہوتی کہ آئندہ مسلمان قوم اپنی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے گی۔ بہر حال جن کے دلوں میں احساس ہے وہ اس کے لئے بے تاب ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے اُن کی تاریخ کا ایک ایسا آئینہ رکھ دیا جائے جس میں ان کے چہرے کا ہر خد و خال نمایاں ہو جائے"!!

ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ بے راہ روی محض سیاسی نہیں بلکہ اس کی تہ میں جو اصل سبب کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا سارا دار و مدار مذہب پر ہے۔ اپنی ہر ضرورت میں جو کہ انھیں پیش آتی ہے وہ مذہب کی سند کے متقاضی رہتے ہیں۔ اگر وہ مذہب کو سمجھتے تو یہ بے حد مفید تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں مذہب سے عقیدت ضرور ہے لیکن اس کی اصل روح کو سمجھنے سے وہ کوسوں دور ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ مذہبی روایات سے کہیں اشتراکیت ثابت ہو رہی ہے اور کہیں بادشاہت، کہیں کانگریس میں شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے اور کہیں لیگ میں شمولیت کا فرض عین ہونا۔ جب

تک ہم اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کے حقیقی اصولوں اور اس کی اصل روح کو اپنی زندگی کی موجودہ کشمکش میں مشعل راہ نہ بنائیں گے ہماری سیاسی گمراہی اور جماعتی پراگندگی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔

ضرورت تھی کہ ہم اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ کی مدد سے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور دیکھتے کہ عروج و زوال اور اقبال و نکبت کے اُس اتار چڑھاؤ میں کہاں تک مذہبی اصولوں سے دوری اور ان کے اتباع کا دخل ہے تاریخ نگاری کا یہ مذاق ہے جو ہر نوع کے انسانوں کو خواہ وہ مغرب زدہ" ہی کیوں نہ ہوں مطمئن کر سکتا ہے، ورنہ اگر "اہل بصیرت علماء" کے نزدیک "مغرب زدگی" قابل گردن زدنی ہے، تو "مشرق زدگی" بھی کچھ کم جرم نہیں ہے۔ اور اس "مشرق زدگی" کی سزا زمانہ کے ہاتھوں جو مل چکی ہے وہ اب بھی مل رہی ہے ذرا سی سمجھ رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

اگر تاریخ اسلام اُس ڈھنگ سے لکھی جاتی رہی جس کی شکایت خود قبلہ سید صاحب کو ہے اور جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ ایسی کتابوں کی اردو زبان میں کمی نہیں ہے تو ظاہر ہے اس آئینہ میں "اسلام کے چہرہ کے خد و خال" جو اُجاگر ہوں گے وہ عشق پیشگی کے مدعیوں کو تو حسین نظر آئیں گے لیکن قدرے عقل و خرد سے کام لینے والوں کو ان سے نعوذ باللہ تسلی نہ ہوگی۔

زیر نظر کتاب میں تاریخ اسلام پر دوسری کتابوں کے مقابلہ میں ہمیں کوئی خاص امتیاز نظر نہیں آیا۔ یہ بھی اسی طرز کی کتاب ہے جو اس سے پہلے اردو میں بہت کافی لکھی گئی ہیں، زمانہ کے بدلتے ہوئے رنگ کا اس میں کہیں بھی خیال نہیں رکھا گیا، اور نہ مذاق نو کے تقاضوں کو کہیں بار پانی کی اجازت ملی ہے۔ روایات کے انبار میں سے مصنف کو جو اپنے مطلب کی بات ملی ہے وہ دبانِ قلم سے کہہ دی ہے اور بس۔ روایات میں درایت کا کیا کام، اور اگر درایت مقصود بھی ہو تو بڑی بڑی کتابوں کے حوالوں سے اس تشنگی کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا اتنے بڑے بڑے ناموں کے سامنے ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اور اگرچہ قائل نہ ہو لیکن مرعوب ضرور ہو جاتا ہے۔

رونا تو یہ ہے کہ یورپ والے اسلام کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ پہلے ہی سے مسلمانوں کو اچھے رجحانات سے معرّا قرار دے لیتے ہیں اور پھر ہر واقعے کی تشریح انسانی خودغرضی اور ہوس رانی

کی نظر سے کرتے ہیں، اس طرح ان کی تاریخ عقل و منطق کی پیاس تو ضرور بجھا دیتی ہے لیکن اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والوں کی نظر میں اسلام اور مسلمانوں کی وقعت گر جاتی ہے، دوسری طرف ہمارے "اسلاف پرستوں" کا گروہ ہے کہ وہ روایات کے دفتر تو ضرور کھنگال ڈالتے ہیں لیکن بیس روایات میں جس روایت کو ترجیح دیتے ہیں اس میں کبھی اس امر کی کوشش نہیں کرتے کہ ہمیں یہ بتائیں کہ اس وقت کے معاشی، سیاسی اور جماعتی ماحول میں باقی انیس راویتوں کا جاننا خلاف عقل اور مہمل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی یہ بدر کی جنگ کو دفاعی ثابت کرتے ہیں اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس کو جارحانہ قرار دے لیتے ہیں۔ اگر تاریخ نویسی کا یہی حال رہا اور ہمارے ارباب بصیرت علماء بھی اس لکیر کو پیٹتے رہے تو وہ یقین رکھیں کہ ان کا یہ شک کہ "آئندہ مسلمان قوم اپنی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش نہ کرے" ٹھیک ثابت ہو کر رہے گا۔

مصنف سے دوسری شکایت ہمیں یہ ہے کہ کتاب کی زبان تاریخ کی زبان نہیں، جن یورپ میں لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب پیش کی گئی ہے اگر ان کے طرز بیان اور ترتیب واقعات کو مطالعہ کرنے کی زحمت کیجائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ نوجوان کیوں "مغرب زدگی" کا شکار ہو رہے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی حالت کو بیان کرنے میں جس انشاپردازی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ایک ادیب کا شاہکار ہو سکتا ہے لیکن تاریخ کے ٹھوس حقائق کا خواہشمند کسی اور چیز کا طالب ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے بتایا جائے کہ ایران اور روم کی سلطنتیں کیوں اسلام کی ٹکر سے چشم زدن میں زیر و زبر ہو گئیں، ان کا جماعتی نظام، ان کے دینی عقائد، ان کی قومی عصبیتیں کیوں اس سیلاب میں بہہ گئیں، اسی طرح اسلام سے قبل عرب کی حالت، اسلام کا ظہور، رسول اکرم صلعم کی سیرت کے واقعات، ارتداد کے اسباب اور پھر حضرت عمرؓ کے بعد خانہ جنگیوں کا زور، اور خلافت راشدہ کا صرف ایک مختصر عرصہ تک قائم رہنا، ان کے ذکر میں طبعی حالات کے اثرات کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے، کہیں کہیں مصنف سے تاریخی واقعات کے ذکر میں بھی فروگزاشتیں ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی پہلی کتابوں کے انداز میں جو ظاہر ہے صرف روایتی حیثیت

رکھتی ہیں یہ نئی کتاب لکھی ہے جو تاریخی ہے اور مذاق نو کی تشنگی دور کرنے کی مدعی۔

دار المصنفین کے علمی کارناموں سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ اس ادارہ نے اسلام او اس کے علوم کے متعلق جو ذخیرۂ معلومات اب تک صرف عربی میں تھا اس سے ہماری زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔ اور اب عربی نہ پڑھا ہوا مسلمان بھی اپنے مذہب اور اس کے علوم کے بارے میں پوری معلومات اردو سے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اب یہ ادارہ نئے میدان میں قدم رکھ رہا ہے اور مذاق نو کی خود ہی تشخیص کرتا ہے اور خود ہی اس کا علاج پیش کرتا ہے۔ ہم نیاز مندوں کی صرف یہ عرض ہے کہ نہ تو مذاق نو کی یہ تشخیص صحیح ہے، اور نہ اس کا علاج ہی ٹھیک ہے، اس کا جواب اگر ہمیں یہ دیا جائے کہ یہ "تفریح" ہے اور "مغرب زدگی" تو ہم عرض کریں گے کہ ہماری نظر میں "تشرق" اور "مشرق زدگی" بھی قابل تعریف نہیں، اور ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ "للہ المشرق والمغرب"

مصنف نے حضرت عثمان اور حضرت علی کے دور کی خانہ جنگیوں کو بیان کرتے ہوئے بعض ایسی روایات بھی نقل کی ہیں جن میں بعد میں ہونے والے واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں جو رسول اللہ صلعم نے کی تھیں، مصنف لکھنے کو تو لکھ گئے لیکن اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچتے کہ ان پیشینگوئیوں سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں تو شاید جس طرح انھوں نے معجزات اور کرامات کی روایتوں کو اس کتاب میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی وہ ان کو بھی مرفوع القلم قرار دیتے "علم غیب" کا حصہ اگر "کتب مناقب" تک رہے تو زیادہ حرج نہیں لیکن تاریخ کی کتابوں میں جو مذاق نو کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھی جائیں اس قسم کی روایات کا اندراج شاید بڑھتے ہوئے زمانے کے پسند خاطر نہ ہو۔

خانہ جنگیوں کے ذکر میں مصنف نے اس امر کا ضرور التزام کیا ہے کہ معرکہ کشت وخون میں اپنے ہاتھ رنگین کرنے والوں میں سے کسی کو بھی آنچ نہ آنے پائے صفین کی جنگ میں بقول مصنف ۷۰ ہزار مسلمان شہید ہوئے لیکن انھوں نے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہمیں بتاتے کہ یہ "خون دو عالم" کس کی گردن پر رہا۔ تاکہ یہ واقعہ ہمارے لئے عبرت کا سامان بنتا۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعات جن کا ذکر ہو رہا ہے ہونے ہی تھے، رسول اللہ صلعم کی پیشینگوئیاں موجود تھیں، مسلمانوں

آپس میں لڑنا تھا، وہ لڑے، نہ امیر معاویہ قصور وار تھے اور نہ حضرت علی۔ ان پر بحث فضول ہے، اگر
ریخ نویسی کا یہ نمونہ ہے تو آئندہ نسلیں اس سے فائدہ اٹھا چکیں، (ضیا،)

ولت عثمانیہ:۔ مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔ قیمت ۔ ے ر
دار المصنفین کے "ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کے سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے، جو ناظم دار المصنفین
بلہ سید صاحب کے الفاظ میں

"جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیر صاحب ایم۔ اے نے تقریباً سات برس کے
مطالعہ اور محنت کے بعد لکھا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ
پہلی تاریخ ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان میں اس کے
متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے"

اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک دولت عثمانیہ پر جو کچھ سرمایہ اردو میں ہے وہ نقل و ترجمہ
ترتیب سے آگے نہیں بڑھا، ہندوستان کے مسلمانوں کو غدر کے بعد سے ترکوں سے بے حد شغف رہا ہے
بلکہ یہ شغف اکثر تو عشق کی حد تک پہنچ گیا۔ سر سید کے زمانہ میں ہم نے ترکوں سے اپنا "اسلامی لباس" لیا، پھر
علامہ شبلی کے سفر نامہ سے ترکوں کا تعارف ہوا، اور آخر میں توطرابلس اور بلقان کی جنگوں نے ہم ہندی
سلمانوں کو "فنا فی الترک" ہی کر دیا، اور ہماری وطنی سیاست بھی ترکوں کی سیاست کا دم چھلا ہو کر رہ
گئی، یعنی ملک انگریز نے لے لیا، دھن دولت ہندو نے ہتھیا یا اور دل و دماغ ترکوں کی نذر ہوا، اب
جبکہ ترکوں کی "لادینی سیاست" سے ہماری آنکھیں کھلیں اور ہمیں مصطفےٰ کمال اور ان کی جماعت کی بیوفائی
کا تلخ تجربہ ہوا، اور خود ترکی زعماء سے ہمیں یہ سننا پڑا کہ تم ہمارے معاملات میں کیوں دخیل ہوتے ہو،
پہلے خود تو آزاد ہو لو، اس وقت بقول غالب ہماری یہ حالت ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ترکوں سے محبت ہمارا فرض تھا۔ وہ ہمارے دینی بھائی تھے۔ ان کے دکھ میں شرکت ہمارے مسلمان ہونے کی ایک نشانی تھی، لیکن اس تمام عرصہ میں ترکوں کو جو کچھ ہم نے سمجھا، اور جس طرح ہماری کتابوں رسالوں اور جرائد نے ہندی مسلمانوں کو سمجھایا وہ ایک مغالطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم نہایت خلوص سے اس مغالطے کے شکار ہوئے اور اس سے ہندوستان کی اسلامی سیاست کو وہ زخم کاری لگا جس کا گھاؤ ابھی تک نہیں بھر سکا، ہماری اس "فریب زدگی" کی وجہ یہ تھی کہ ترکوں کے متعلق ہمارا تمام سرمایۂ علم سید صاحب قبلہ کے الفاظ میں "محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے" شکر ہے کہ دارالمصنفین کے ایک قابل رفیق نے تقریباً سات برس کے مطالعہ اور محنت کے بعد "ترکوں کی ایک ایسی تاریخ لکھنے کی ہمت کی جو بقول سید صاحب کے سات برس کے مطالعہ اور محنت کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے۔

ہم نے بڑے شوق سے اس کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا، اور اتفاق سے اس دور کی دو تین انگریزی کتابیں اور ایک آدھ عربی اور اردو کی کتاب بھی نظر سے گزر چکی تھی اس لئے زیر نظر کتاب کے حسن و قبح کے اندازہ کرنے میں قدرے آسانی ہوئی، اس میں شک نہیں کہ دولت عثمانیہ میں اس سے جامع کتاب شاید ہی اردو میں ہو، ہمیں اس کتاب کی جامعیت سے تو انکار نہیں، لیکن یہ جامعیت محض واقعات کی تفصیل تک ہے۔ واقعات کے اسباب و نتائج کی بحث کا پہلو اس کتاب میں بھی تشنہ ہی ہے۔ ہاں تاریخ اسلام جلد اوّل کے مقابلہ میں "دولت عثمانیہ" میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ زبان سادہ ہے، واقعات کی ترتیب بھی مناسب ہے، اور کہیں کہیں نظام سلطنت پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اوّل الذکر کتاب کے مصنف کو تو صرف روایات کی کتابوں سے مدد مل سکتی تھی لیکن دولت عثمانیہ کے مصنف نے یورپی زبان کی تاریخوں سے بھی استفادہ فرمایا۔

ممکن ہے، ہمارے اس اعتراض کے جواب میں کہا جائے کہ ابھی کتاب ختم کہاں ہوئی، کتاب کے آخر میں یہ سب باتیں زیر بحث آئیں گی، ہمیں اس طرز بیان سے اختلاف ہے جو ایک شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، پہلے اس کے حالات زندگی بیان کر دیئے جاتے ہیں، اور پھر اس کے محاسن و مناقب، اب تک اردو کے سوانح نگار اور تاریخ نویس اس ڈھرے پر چل رہے ہیں،

یہ طریقہ توصیفی اور تمجیدی ضرور ہے لیکن تنقیدی اور تاریخی نہیں؛

دولت عثمانیہ کے مصنف نے "شاہوں کی" تاریخ لکھی ہے لیکن عثمانیوں کی نہیں لکھی، ۵۰۰ صفحے کی کتاب سلاطین عظام کی اولوالعزمیوں اور ان کی بے راہ رویوں سے بھری ہوئی ہے۔ مصنف جنگوں کے ذکر میں بیسیوں مقامات کے نام گناتے چلے گئے ہیں جو ممکن ہے، یورپین مصنف کی کتاب کا پڑھنے والا بآسانی سمجھ جائے لیکن ہمارے لئے وہ صفحات گورکھ دھندا بن کر رہ گئے ہیں، مصنف نے واقعات تو کم وبیش یورپی کتابوں سے لئے ہیں لیکن جہاں یورپی اہل قلم عیوب کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں دولت عثمانیہ کے مصنف نے ان سے اپنا پہلو بچایا ہے۔

مثلاً پہلے باب کا عنوان "ترک" ہے۔ ترکوں کا عالم اسلام پر غلبہ چند عباسی خلفا، کی "ترک نوازی" کا نتیجہ ثابت کیا ہے، مصنف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ کے اہم واقعات کو معدودے چند اشخاص کی خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں مرضی و پسند کا نتیجہ قرار دینا ٹھیک نہیں رہا۔ مامون اور معتصم اتنے بے عقل نہ تھے کہ وہ "ترک نوازی" کے انجام کو نہ سمجھ سکتے جسے آج ہم اتنی آسانی سے جان لیتے ہیں بات یہ ہے کہ عرب قوم اپنی سپاہیانہ حیثیت کھو چکی تھی، ایرانی سپاہی نہ تھے، منتظم اور مدبر اور وزیر ضرور تھے۔ عباسی سلطنت کو جس کے ڈانڈے سندھ اور مراکش سے ملے ہوئے تھے شمشیر زن بازوؤں کی ضرورت تھی اور اس کی کمی ترکوں نے پوری کی۔ اس طرح عثمان کے بے خانماں خاندان کے چند افراد کا بڑھتے بڑھتے دنیا کے سب براعظموں میں پھیل جانا، اور تین چار سو برس تک نہایت شان وشوکت سے اتنی بڑی دنیا کو قبضہ میں رکھنا بیان تو ضرور کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے اسباب تھے کہ عثمانؑ اور خاں اور مراد اوّل اپنے ترکی حریفوں، اور بازنطینی اور بلقانی دشمنوں کے مقابلہ میں جمے رہے، اور چند ہزار افراد نے لاکھوں کو اپنا لیا۔ اور عثمانی قومیت کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا۔ الغرض تمام کتاب میں اس قسم کی بحثوں کی سخت ضرورت تھی، جو افسوس ہے کہ نہیں ہیں۔

"دولت عثمانیہ" صرف سلاطین عثمانیہ کی تاریخ ہے، اس کا بانی عثمان خاں ۱۲۸۸ء میں تخت پر بیٹھتا ہے اور ۱۸۰۸ء میں سلطان مصطفےٰ معزول ہوتا ہے، زیر کتاب کے ۵۰۰ صفحے کم وبیش اس

۵۵۰ سال کی تاریخ کا آئینہ ہے۔ اس میں مصنف نے جس خد وخال کے دکھانے کی کوشش کی ہے، کیا اس قسم کے خد وخال دکھانا اس "مکمل اور مفصل تاریخ اسلام" کا کام ہے، اور کیا اسلام کے یہی احسانات ہیں جن کو نمایاں کرکے آپ دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ "مسلمانوں نے علم وفن کی کیا خدمت کی اور انسانی تہذیب وتمدن کا قدم کہاں سے کہاں پہنچایا؟"

اس کتاب کو تو پڑھ کر دل میں خواہ مخواہ یہ خیال اٹھتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ دولت ختم ہوگئی، اس نکے ہاتھ سے نہ اپنوں کو اطمینان نصیب تھا اور نہ ہمسائیوں کو امن۔ دوسروں پر لاکھوں کی تعداد میں چڑھ دوڑنا ان کا کام تھا۔ اور آس پاس کے ملکوں کی آزادی چھیننا اور آزادی پر جان دینے والوں کی لاشوں پر استبداد اور جور وجفا کی بساط بچھانا ان کا شیوہ۔ ("ضیاء")

تاریخ اخلاق اسلامی (حصہ اول)، مرتبہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی از دار المصنفین اعظم گڈھ قیمت ۱۲ر

تاریخ اخلاق اسلامی کے مصنف جناب عبدالسلام صاحب ندوی ہیں، سرورق پر کتاب کا تعارف نامہ ہے، جس میں درج ہے:

> "اولاً بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے اخلاق کی تفصیل کی گئی ہے اس کے بعد دورِ نبوت میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، ان کے اسباب ومحرکات، ان کے انواع واصناف اور ان کی عملی تشکیل وتکمیل کے تمام مظاہر قرآن وحدیث سے اخذ کرکے بیان کئے گئے ہیں۔"

زیر نظر کتاب میں بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے اخلاق کی تفصیل تو ضرور ہے اور دور نبوت میں جن نئے اخلاق کو رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ بھی ایک حد تک قرآن وحدیث سے اخذ کرکے مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن تعارف نامہ کے اس دعوے "اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، ان کے اسباب ومحرکات، ان کے انواع واصناف اور ان کی عملی تشکیل وتکمیل کے تمام مظاہر" کا جواب ہمیں کتاب میں نظر نہیں آیا۔ اور نہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کتاب کا نام

تاریخ اخلاق اسلامی کیوں رکھا گیا ہے؟

جاہل عربوں کے کسی شاعر کے ایک آدھ شعر سے عربوں کے اخلاق کا استدلال، اور آیات، اور احادیث کے جزوی ٹکڑوں سے "اسلامی اخلاق کے اسباب و محرکات اور ان کے انواع و اصناف اور ان کی عملی تکمیل و تشکیل" کا نقشہ تیار کرنا اخلاق اسلام کی تاریخ نہیں کہلا سکتی، مصنف نے بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے جو اخلاق بیان کئے ہیں، اور اشعار کو ان کی تائید میں پیش کیا ہے، ان اخلاق کے بالکل برعکس اخلاق دوسرے اشعار سے پیش کئے جا سکتے ہیں، مصنف علام کو معلوم ہے کہ عباسی دور میں عرب دشمن (شعوبیت) تحریک کے حامی جاہل شعراء کے شعروں سے عربوں کی کتنی بھیانک تصویریں کھینچتے تھے اور آج مستشرقین انہی شعراء کے کلام سے عرب جاہلیت کو اخلاق انسانی کا نمونہ کمال دکھاتے ہیں، اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام نے عربوں کو پستی سے بلند نہیں کیا بلکہ بلندی سے نیچے گرایا۔

اسی طرح اسلامی روایات سے عجیب و غریب چیزیں ثابت کی جا سکتی ہیں ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق کو انفرادی شکل میں نہ لیں، اور عبداللہ بن عمر اور ابوذر غفاری جیسے نیکوکاروں یا ان کے خلاف دوسرے لوگوں کے واقعات سے متاثر ہو کر اس عہد کے سب لوگوں کو اس رنگ میں رنگ نہ دیں۔

اگر اخلاق اسلامی کی تاریخ لکھنا مقصود ہو تو ہمیں افراد کے شعوری و غیر شعوری رجحانات جماعتوں کی حسیات اور تاثرات، طبعی ماحول کے اثرات اور تاریخی حوادث کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور اس تجزیہ کے عمل میں آیات و احادیث اور تاریخ کے ذخیروں سے مدد لے کر ہم صحیح معنوں میں تاریخ اخلاق اسلامی لکھ سکتے ہیں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو زیر نظر کتاب کسی طرح بھی تاریخ نہیں کہلا سکتی۔ اسباب و علل اور اثرات اور تاثرات کے عالمگیر قانون سے الگ ہو کر کسی قوم کے اخلاق کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

"تاریخ اخلاق اسلامی" کا مواد بتمام دار المصنفین کی اور متعدد کتابوں میں موجود ہے۔ تعجب ہے کہ اس نئے نام سے اسی مواد کو پیش کرنے کی کیا خاص ضرورت پیش آئی۔ (ضیاء)

تاریخ جنوبی ہند:۔ مصنف، محمود خاں صاحب محمود، سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۴۲۰ صفحات قیمت سے ر
ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الدین، بک سیلرز ڈکنسن روڈ، بنگلور

محمود خاں صاحب محمود اس سے پہلے "تاریخ سلطنت خداداد" جیسی قابل قدر تصنیف شائع کر کے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کی تاریخ دانی اور اس فن میں ان کا شغف کامل اور ان کا ذوق صحیح مسلم ہے۔ اب انھوں نے تاریخ کے طلبہ کے لئے یہ جدید کارنامہ پیش کیا ہے۔ اسے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ جناب محمود نے اسے بڑی عرق ریزی اور کاوش سے مرتب کیا ہے، اردو تو اردو جنوبی ہند پر انگریزی میں بھی کم کتابیں ایسی مفصل و مبسوط معتبر و مربوط ملیں گی۔ علیحدہ علیحدہ حصص ملک پر تاریخوں کی ترتیب ازبس ضروری ہے۔ خصوصاً جنوبی ہند پر۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب مصنف نے اس فرض کو پوری دیانت داحتیاط اور خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے، ہم سب کی طرف سے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی و خارجی اسناد و کاغذات سے مواد مرتب کر کے یکجا کیا ہے۔ اردو، فارسی، اور انگریزی کی تیس مستند کتابوں کو کھنگالنے کے بعد یہ نخفہ تیار ہو سکا ہے۔ مختلف ماخذوں سے مختلف واقعات انتخاب کر کے یکجا کر دینے کے بعد مصنف نے ان پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ نتائج پیدا کئے ہیں اور ان کی روشنی میں صحیح واقعات پیش کئے ہیں۔

شروع میں جغرافیائی حالت پھر جنوبی ہند کی معاشرتی اور تمدنی حالت، زبان اور ایرین اور ڈریویڈین قوموں کے اتصال پر نظر ڈالی ہے۔ پھر وہاں کے قدیم طرز حکومت، مسلمانوں کی آمد اور ان کے طرز حکومت پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ سلاطین بہمنی و خاندان وجیا نگر کے حالات اور یورپین اقوام کی آمد سے لے کر موجودہ دور تک کے واقعات پر معتبر شہادتوں کے حوالے سے سیر حاصل تنقید کی ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی قابل قدر اور عام طور پر توجہ کے لائق ہے کہ اس میں اس دور کے ہندو مسلم تعلقات پر بہت سی کام کی چیزیں ملتی ہیں۔ آج بھی ان دونوں قوموں میں

افسوس ناک کشمکش اور اختلاف ہے وہ ملک کی آزادی میں سنگِ راہ بنا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ اربابِ نظر کو اس کی روشنی میں اس کٹھن مسئلہ کے حل سوچنے کی راہیں بکثرت ملیں گی۔
جگہ جگہ تشریحی نقشے اور فوٹو بلاک کی بکثرت تصویریں دی گئی ہیں۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔

(ا ــــ م)

فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں:۔ مولفہ۔ مولوی ظفرالرحمان صاحب دہلوی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب انجمن ترقی اردو نے بہت مفید شائع کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل زمانہ مشین اور سائنس کا ماہر ہے، ہمارے یہاں انجنیروں کی زبان پر عموماً انگریزی اصطلاحات چڑھے ہوتے ہیں، اور وہی اصطلاحات مسخ شدہ حالات میں معمولی مزدوروں کی زبان پر بھی چڑھنے لگے ہیں، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مختلف فنون جن میں ہندوستانی کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے اب دوسروں کے الفاظ و ہنر کے پابند ہوگئے ہیں۔

اصطلاحات کے مرتب کرنے میں مولوی ظفرالرحمان صاحب نے واقعی بڑی محنت اٹھائی ہے۔ حصۂ اوّل میں نجاری، سنگ تراشی، معماری، چھپر بندی وغیرہ یعنی تیاری مکانات اور پھر تہذیب و آرائش عمارات کے سلسلے میں دوسرے پیشے مثلاً رنگ کاری، گھڑی سازی، آرائش سازی، وغیرہ کی اصطلاحات جمع کی ہیں۔ دوسرے حصے میں دیگر فنون کی اصطلاحات جمع کیجائیں گی۔
اگر اس سلسلے میں دہلی و آگرہ، جے پور کے ساتھ لکھنؤ اور لاہور کے کاریگروں سے بھی مشورہ لیا جاتا تو میرے خیال میں ظفر صاحب کو اور آسانی ہوتی۔

حیاتِ جاوید:۔ مولفہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم (نیا اڈیشن)۔ ۵۹۴ صفحات، ضمیمہ جات ۸۰ صفحات قیمت درج نہیں، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

انجمن ترقی اردو نے ابھی حال میں حیات جاوید کا یہ نیا اڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حیات جاوید کمیاب ہو گئی تھی اور جتنے پرانے نسخے تھے وہ بھی بوسیدہ ہو چلے تھے۔ لیکن مانگ برابر جاری تھی۔ نیز اس لحاظ سے بھی اس کی اشاعت ضروری تھی کہ اردو کی سوانح عمریوں میں اس کا پایہ بہت بلند ہے گو بعضوں کی نگاہوں میں یہ "مدلل مداحی" یا "کتاب المناقب" ہی ٹھہرے لیکن اس کی مزید اشاعت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مفید ضمیمہ جات، مثلاً سرسید کا نسب نامہ، سرسید کی تصانیف کی فہرست، رسالہ اسباب بغاوت ہند، حالی کا مضمون متعلق بہ تفسیر القرآن، بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں، شروع میں سرسید کی تصویر بھی ہے اور آخر میں انڈکس دیکر کتاب کو مکمل کر دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بہت خوب ہے۔

تاریخ ادبیات ایران:- در عہد جدید (۱۵۰۰ء – ۱۹۲۴ء) مصنفہ پروفیسر ایڈورڈ۔ جی۔ براؤن مترجمہ سید وہاج الدین احمد کنتوری مطبوعہ انجمن ترقی اردو قیمت درج نہیں،

انجمن ترقی اردو اس سے پیشتر براؤن کی مشہور تصنیف ادبیات ایران کی دیگر جلدوں کا ترجمہ کرا چکی ہے۔ یہ ترجمہ اس کی آخری جلد کا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر مرحوم نے ایران کی آخری چار صدیوں کی ادبیات کا تذکرہ کیا ہے اور عہدِ جدید تک اسے مکمل کر دیا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے برا نہیں ہے اور اُن طلبا فارسی کے لئے یہ جلد بیحد مفید ہوگی جنھیں انگریزی کا دست نگر ہونا پڑتا تھا۔ نیز یوں بھی بہت خوشی کی بات ہے کہ ایسی مفید کتاب اردو داں حضرات کی آسانی کے لئے خود انھیں کی زبان میں منتقل ہو گئی۔ ہندوستان میں ابھی تک ادبیات ایران سے کافی دلچسپی باقی ہے۔ یقین ہے کہ فارسی سے ذوق رکھنے والے حضرات اپنی تشنگی اس جلد سے کما حقہٗ بجھا سکیں گے۔

خمسہ کیفی :۔ مصنفۂ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، قیمت ۴؍
یہ کیفی صاحب کی دو نظموں، اور تین مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ دو مضمون اردو لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات سے۔
کیفی صاحب نے یہ مقالے حالانکہ مختصر لکھے ہیں لیکن بہت جامع ہیں۔ آج کل اردو ہندی کے متعلق جو تنازعات چل رہے ہیں اس میں یہ مختصر مضامین لسانیاتی حیثیت سے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ کیفی صاحب محترم خود ہندو مسلم کلچر کے خوشگوار اتحاد کا نمونہ ہیں، ان سے بہتر کوئی اس موضوع پر کم لکھ سکتا تھا۔
یہ مقالے اردو لسانیات کے طلبا کے لئے بھی کچھ کم مفید نہیں۔

تقویم ہجری و عیسوی :۔ مرتبہ ابو النصر محمد خالدی صاحب، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، قیمت درج نہیں۔
اس تقویم کو چھاپ کر انجمن ترقی اردو نے ایک بڑے دشوار مرحلے کو حل کر دیا ہے عموماً ہجری سے عیسوی اور عیسوی سے ہجری سنین کا حساب لگانا ناظرین کیلئے نہ صرف دقت طلب بلکہ مفت درد سر ثابت ہوتا تھا، دیگر یورپین زبانوں میں تو اس قسم کی تقویمیں موجود تھیں جن سے ہجری سے عیسوی سنین کا حساب آسانی سے ملجاتا تھا، لیکن اردو میں کوئی اس قسم کی تقویم موجود نہ تھی۔ اردو داں پبلک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ایسی تقویم اردو میں منتقل ہو گئی۔
اس تقویم میں سنہ ۱ھ سے لے کر سنہ ۱۳۵۰ھ تک ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دکھائی گئی ہے۔

انجمن ترقی اردو کی کہانی :۔ مرتبہ مولوی غلام ربانی صاحب، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، قیمت ۴؍
یہ رسالہ مولوی غلام ربانی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی بست و پنجسالہ کارگذاریوں کے متعلق مرتب کیا ہے۔
انجمن ترقی اردو کی ضرورت کے متعلق کس کو شبہ ہو سکتا ہے اور اس کے کارناموں سے

کس کو انکار۔ اب تک جو کچھ اور جتنا کچھ اس نے کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب پر بڑا احسان ہے اور ہر ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، انجمن کے ان گراں قدر احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، خصوصاً جب سے مولوی عبدالحق صاحب کی جان سپارانہ تندہی اس کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ تب سے اس انجمن میں جس شد و مد سے کام ہوتا رہا ہے وہ واقعی اردو کی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ مولوی صاحب کی اس جاں سپاری پر کسی قدرداں شاعر نے خوب کہا ہے کہ مولوی صاحب کا ایک تخلص ہے جو باوجود تخلص ہونے کے نظم نہیں ہو سکتا، یعنی "انجمن ترقی اردو"

انجمن کا کام اب تک جیسا ہوتا رہا ہے وہ واقعی بے حد کامیاب رہا ہے۔ اور ہماری تہ دل سے دعا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو خدا ابھی بہت دنوں تک زندہ رکھے تاکہ ملک میں جو روڑے اردو کی راہ میں اٹکائے جا رہے ہیں ان کا مولوی صاحب قطعی طور پر سد باب کر کے اٹھیں اور ہماری دعا ہے کہ انجمن ہمیشہ ان ہی جیسے بے غرض اور جاں سپار اردو کے عاشقوں کے سپرد رہے، جو انجمن اور انجمن کے ساتھ اردو کی بقا کے لئے مجنوں نہیں بلکہ فرہاد ثابت ہوں۔ ورنہ اگر انجمن ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جن میں یہ خوبیاں نہیں ہیں تو ہمیں ڈر ہے کہ یہ واقعہ قوم کے لئے باعث ماتم ہوگا اور اردو کے لئے ایک رجعت قہقہری۔

رسید کتب:۔

۱۔ ہندو ادیب	مرتبہ ناظر کاکوروی، مطبوعہ انوار بکڈپو لکھنؤ، قیمت عہ
۲۔ طوطی نامہ	مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے قیمت سہ سب درس کتاب گھر، خیریت آباد، (حیدرآباد دکن)
۳۔ پھول بن	مرتبہ عبدالقادر سروری۔ قیمت سے ر

سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

۴۔ سیف الملوک و بدیع الجمال — مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ قیمت ۱۲/؏

۵۔ قصۂ بے نظیر — مرتبہ عبد القادر سروری۔ قیمت ۱۲/؏

سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

۶۔ کلام الملوک — مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ قیمت سے

سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

۷۔ مجاہد الخلفا یعنی مناقب خلفائے راشدین — مرتبہ حافظ اخلاق احمد صدیقی و سجاد حسین صدیقی۔ قیمت ۲/ مجلد ۸/

اشاعت گاہ۔ مکتبہ قصر الادب۔ آگرہ

رسالہ جات:۔

سیاست۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی ادارت میں حیدر آباد دکن سے یہ مفید رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں اس قسم کے رسالوں کی بڑی قلت ہے سوائے رسالہ جامعہ کے اور کوئی ایسا رسالہ نظر نہیں آتا جو سیاسی و معاشی مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہو۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کمی کو محسوس کیا اور حیدر آباد سے اس نئے رسالے کو جاری فرمایا۔

زیر نظر نمبر ۶۵ صفحات کا ہے۔ اس میں برطانوی دستور کی خصوصیات، جنگ یورپ، ترکی اور ممالک بلقان کا نیا محاذ، ہندوستان کا سیاسی مستقبل وغیرہ بہت اہم اور مفید مضامین ہیں۔ امید ہے اردو داں طبقہ اس رسالہ کی ضرور قدر کرے گا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب سے درخواست ہے کہ اگر اسے ماہوار کردیں تو ملک کے لئے اور بھی زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ چندہ سالانہ صہ ہے۔

البیان :- اقبال نمبر قیمت ۸ر۔ منیجر "البیان" امرتسر

موقر رسالہ البیان نے ابھی حال میں ایک اقبال نمبر شائع کیا ہے حالانکہ صفحات کے لحاظ سے یہ مختصر ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے اقبال سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ناگزیر ہے، مضامین حالانکہ کم ہیں لیکن بعض بہت پر از معلومات اور مفید ہیں۔ علامہ اقبال کی صحبت میں، مکتوبات اقبال، یاد ماضی، اقبال، وصنف لطیف، اقبال اور قرآن، یہ سب مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبالیات میں یہ نمبر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کیلئے جہاز

بمبئی اور کراچی سے جدہ کو تھوڑے تھوڑے وقفہ پر

روانگیاں

جہاز	ٹن
ایس ایس اکبر	۲۰۴۳
ایس ایس علوی	۳۵۶۶
ایس ایس اسلامی	۵۸۷۹
ایس ایس جہانگیر	۲۵۶۶
ایس ایس خسرو	۴۰۴۵
ایس ایس رحمانی	۵۳۶۳
ایس ایس رضوانی	۵۴۵۰

بمبئی اور کراچی سے عدن جدہ اور بحراحمر کے بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہاز

بمبئی اور کراچی سے بندرگاہ لوی مارشیس کو بھی

جہازوں کی روانگی اور روانگی کی تاریخیں بغیر پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہے

تفصیلی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجیے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار شدہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے
مخفی نہیں کہ کارخانے نے [illegible] سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص
چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روزافزوں ترقی جن لوگوں سے نہ
دیکھی گئی انہوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور
کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار
کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔
اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے
عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس
کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں
اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کیجئے
کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو دوا انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے
آپ نے ہمارے اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی

ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر خانہ بلڈنگ لکھنؤ

زیرادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس بیان کے ذریعہ اردو دان طبقے میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا ہے اسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور معاملہ کے امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد دکن کو لکھنا چاہیے

سالانہ صہ ر

مشرقی صحافت کا نادر شاہکار

صدق

جو گذشتہ پانچ سال سے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی

زیر ادارت

نہایت آب و تاب سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ زمانے کی ناقدری اور مذہبی حسیات سے بے تعلقی کے باعث مالی مشکلات کے بھنور میں پھنس گیا ہے جس سے اس کو نکالنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلم پبلک زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کے خریدار ہو کر اسے ابتلا و آزمائش کے چکر سے نکالیں۔ سالانہ للعہ ششماہی عہ

ملنے کا پتہ

مینجر "صدق" مرشد آباد پیلس گولہ گنج لکھنؤ

مشرقی ہندوستان کا واحد آزاد خیال اخبار

الہلال

جس میں

ملکی رہنماؤں کے بیانات، دنیائے اسلام کے اہم حالات اور ہندوستانی سیاسیات پر بے لاگ تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں

سالانہ تین روپیہ ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے سہ ماہی ایک روپیہ

مینجر اخبار "الہلال" بانکی پور پٹنہ

سرحد کا سب سے پرانا اور حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد

(۱) ۱۹۲۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے
زیر ادارت ملک میر عالم خاں اعوان ہزاروی (جامعی) شائع ہوتا ہے۔

(۲) آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔

(۳) صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔

(۴) سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی بہت کچھ ترجمان سر
کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا حا
ارگن رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد
کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد، علاقہ آزاد
افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں کے
تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

چندہ رعایتی سالانہ للعہ
" " ششماہی عہ

المشتہر

مینجر ترجمان سرحد پشاور

مطبوعات امیریہ

دیوان ثاقب ۔ یہ دیوان مرزا ذاکرحسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی غزلیں قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے۔ تصاویر بھی ہیں حجم پانچسو صفحات قیمت للعہ ۔ غیر مجلد ہے (علاوہ محصولڈاک)

انیس اخلاق ۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و تالیفات نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک

ہیں کا دفاع ۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیری جنگ کا شروع ہوجانا یقینی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لیے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ہر علاوہ محصولڈاک۔

مفتاح البیان ۔ حصہ اول و دوم مؤلفہ عمدۃ الواعظین زبدۃ الذاکرین ابو البیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروَلی مؤلف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر عجیب کتاب

قیمت ہر حصہ ایک روپیہ

ملنے کا پتہ ۔ دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

ندوۃ المصنفین کی دو اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت:- غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے اب تک کسی زبان میں اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لئے جن حربوں سے کام لیا ہے ان میں غلامی کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے ترقی یافتہ ملکوں میں اسلامی تبلیغ کے لئے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے بلکہ مذہبی قہر و غلبہ کے سبب ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے اثر پذیر ہے۔ "غلامی" جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں دلچسپ مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت، طباعت، کاغذ اس قدر اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ قیمت مجلد سے ر غیر مجلد عہ

اسلام کا اقتصادی نظام:- اس کتاب میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح نظام قائم کرکے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے "وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کرکے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔" اگر آپ اسلام کی اقتصادی وسعتوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ کتابت طباعت اعلیٰ ولائتی کاغذ۔

مینجر ندوۃ المصنفین قرول باغ
نئی دہلی

ہر علم و فن اور ہر ذوق کی اور ہر ضرورت کی کتابیں عمدہ کاغذ عمدہ طباعت اور عمدہ کتابت کی خوبیوں سے آراستہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے منگایا کیجیے جو اردو کتابوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
مضامین محمد علی مجلد	قیمت سے ر	دو بھائی	قیمت ۲ر
رحمۃ للعالمین "	" ۱۲ر	قومی نظمیں	" ۲ر
محاسن اسلام "	" ۱ر	صحیفۂ چین	مجلد " ۱۲ر
یورپ کی حکومتیں "	" ۸ر	معاہدہ عمرانی	" " ۶
گئودان "	" سے ر	بیان	" " ۱۲ر
حرف و حکایت	" ۱۲ر	دلی کا سنبھالا	" " عہ ر
سریلی بانسری	" عار	بنی اسرائیل کا چاند	" " ۱۲ر
جوش و عمل	" ۱۲ر	میری کہانی دو حصے	" " للعہ ر
کیمیاگر مجلد	" عہ ر	تلاش حق "	" " سے ر
دلی کی آوازیں	" ۱ر	قوم کی آواز	" " عہ ر
مرقع عالم	" ۱۲ر	سیرۃ نبوی اور مستشرقین	" " عہ ر
تاریخی اٹلس	" ۶ر	ہرور رپورٹ مکمل	" " عہ ر
مصور جیبی اٹلس	۱ر	مصور جیبی اٹلس دوسرا ایڈیشن ارزاں	" ۳ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جامعہ طبیہ دہلی کا واحد ترجمان

مسیح الملک

علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب شیخ الجامعہ جامعہ طبیہ دہلی کی سرپرستی اور حکیم محمد منظر الدین صاحب اجملی بادس، غریشن پروفیسر جامعہ طبیہ و صدر مجلس اطباء دہلی کی ادارت میں نہایت اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ اطباء میں عروج و ارتقاء کا ہمہ گیر جذبہ پیدا کرنا اور طبی دنیا کے جمود و سکون کو حرکت اور زندگی میں تبدیل کرنا اس رسالہ کا اساسی مقصد ہے۔ اس میں طبی دنیا کے مسائل حاضرہ پر ناقدانہ بحث کی جاتی ہے۔ اطباء کو اغیار کے حملوں کی مدافعت کے وسائل بتائے جاتے ہیں۔ طب قدیم و جدید کے مختلف فیہ مسائل پر نتیجہ خیز مضامین شائع کئے جاتے ہیں اور امراض و معالجات پر بہترین محققانہ مقالات مشہور اطباء کے رموز مطب اور قابل اعتماد مجربات کی اشاعت کا ہر ماہ خیال رکھا جاتا ہے۔ قیمت سالانہ عہ نمونہ مفت

پتہ:- مینیجر رسالہ مسیح الملک قرولباغ دہلی

روزنامہ **جدت** مراد آباد

جدت ہندوستان کا بہترین سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے

اس کی خریداری کے لئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال، آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپیلیں کی ہیں۔

جدت دل کش نظموں، بہترین جنگی تبصروں، بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ، اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔ جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ بجائے چھ روپیے کے صرف عہ روپیہ سالانہ اور ؏ ششماہی اور عہ سہ ماہی مقرر ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرا لیں۔ ایجنٹ صاحبان کو ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کثیر الاشاعت ہے اس لئے مشتہرین کے لئے بے حد منفعت بخش ہے۔

مینیجر اخبار جدت مراد آباد چیمبرس روڈ

پیامِ نسواں لکھنؤ

کا

شاندار سالگرہ نمبر ۱۹۴۰ء شائع ہوگیا

پیام نسوان لکھنؤ کا ایک قدیم بلند پایہ زنانہ رسالہ ہے جو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ گھرانوں میں نہایت شوق سے خریدا اور پڑھا جاتا ہے۔ پیام نسواں کے متعلق ہندوستان کے مشہور لوگوں کی یہ رائے ہے۔

پیام نسواں کے مضامین نہایت مفید اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ شہزادی عشرت جہاں لکھنؤ
پیام نسواں کے معاشرتی اور مزاحیہ افسانے مجھے اور میری بچیوں کو بیحد پسند ہیں۔ بیگم سر زبیر حسین ایم ایل سی
پیام نسواں میں نجوم اور قیافے پر مضامین نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ بیگم اعزاز رسول ایم ایل سی
پیام نسواں میں بچیوں کا اپنا ورق میرے بچوں کو بہت پسند ہے۔ بیگم شاہ نواز ایم ایل اے
پیام نسواں میں کشیدہ کاری کے نمونے دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ بیگم نصرت یار جنگ بہادر
پیام نسواں میں علمی سوالات نے رسالے کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ بیگم نواب فرخ جہاں
پیام نسواں۔ ہندوستان کے تمام زنانہ رسالوں سے بہتر او کم قیمت ہے۔ مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار
پیام نسواں کی کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ ہے۔ آپ بھی خریدئے۔ شمیم آرا۔ مدیرہ پیام نسواں

المشتہر

منیجر "پیام نسواں" حلقہ اشاعت لکھنؤ

مضامین محمد علی حصہ دوم

مرتبہ محمد سرور صاحب استاذ جامعہ

یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی پوری تاریخ ہے جو [illegible] سے شروع ہو کر [illegible] پر ختم ہوتا ہے۔ سر سید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں کو تمام سیاسی تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے؟ اسلامی سیاست کا یہ مسلک وفاداری آخر میں کیا رنگ لایا؟ مسلم لیگ کا قیام کہاں اور کیسے عمل میں آیا؟ لیگ انگریز دوستی سے ہٹتے ہٹتے کیوں کانگریس سے ہمنوا ہونے پر مجبور ہوئی وغیرہ مسائل پر نہایت مفصل بحث ہے۔

قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مومن گزٹ ہفتہ وار کانپور کا

گورکھپور مقدمہ نمبر

جس میں گورکھپور کا مشہور مقدمہ "جولاہے شریف ہیں یا رذیل" کے مفصل حالات اور دشمنان اسلام دعیان شرافت کے عدالتی بیانات اور منصفوں کے فیصلے ہوں گے۔

اپریل سنہ [illegible] میں

ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہو رہا ہے

قیمت صرف [illegible] لیکن مستقل خریداروں کو مفت دیا جائے گا

منیجر "مومن گزٹ" اسٹیشن روڈ کانپور

رسالہ غنچہ ہفتہ وار

بچوں اور بچیوں کا بہترین استاد

رسالہ غنچہ میں بچوں اور بچیوں کے لئے دلچسپ اور نہایت مفید مضامین اور کہانیاں ہوتی ہیں۔ جو اُن کی تعلیم میں مُمد ہوتی ہیں اور ان کے اخلاق کو سنوارتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم قومیت کی تعمیر ہے۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

منیجر رسالہ "غنچہ" بجنور۔ یو۔ پی

ممالک غیر سے

چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے (للعہ)

ہندوستان سے

چندہ سالانہ تین روپے (سعہ)

ایجوکیشنل گزٹ

تعلیمی، ادبی، تاریخی، طبی، تمدنی اور زراعتی مضامین کا ماہوار رسالہ جو ۱۹۲۳ء سے بڑی کامیابی اور آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر نہایت آزادانہ طریق پر تنقید و تبصرے اور رائے زنی کرتا ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ "معلمین کا" بہی خواہ اور سچا رہبر ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ متعلمین کے لئے ہر قسم کی علمی واقفیت اور معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچاتا ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد کا حقیقی خیرخواہ ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ مدرسین کو نئے نئے طریق تعلیم اور نئی تعلیمی تحریکوں سے روشناس کراتا ہے۔

ایجوکیشنل گزٹ محکمہ تعلیم پنجاب، یو پی، سی پی، بہار، اڑیسہ، برار، بمبئی پریذیڈنسی، حیدرآباد دکن، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، ریاست کپورتھلہ، پٹیالہ، فریدکوٹ، جنید اور انڈسٹریل سکولز پنجاب کی طرف سے منظور شدہ ہے۔

اپنے اسکولوں کے لئے اس کی خریداری منظور فرمائیے سالانہ چندہ صرف ہے، طلبا سے ؏

المشتہر۔ منیجر رسالہ ایجوکیشنل گزٹ۔ یوسف دہ جالندھر شہر

اخبار اہلحدیث امرتسر

امرتسر سے ہر جمعہ کے دن ۲۲×۱۸/۴ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ جس میں مذہبی، ملکی اور اخلاقی مضامین کے علاوہ شرعی مسائل، فتوے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات بھی شائع ہوتے ہیں۔ شرک و بدعت کی تردید اور کتاب و سنت کی تائید اس کا اولین مقصد ہے۔ ایک دو صفحوں پر دنیا کی چیدہ چیدہ خبریں بھی درج ہوتی ہیں۔

سالانہ قیمت عہ ششماہی ۱ر۔ نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہے۔

پتہ :- منیجر اخبار اہلحدیث کٹڑہ بھائی سنت سنگھ امرتسر

رفیق باغباں

کاشتکاری اور باغبانی کے فن میں یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کا حسین و جمیل ٹائٹل پیج جنت نظیر ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی نہایت درجہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہوتا ہے۔ اس کے بلند پایہ مضامین بیکار نوجوانوں کو باکار بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ زمین دار اور کاشت کار دونوں کی فنی خدمت اس کا خاص شعار ہے۔ قیمت بہت کم یعنی صرف عہ روپیہ سالانہ۔ یہ رسالہ ۲۲×۱۸/۱۶ کی تقطیع کے ۴۴ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ اردو زبان میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اس بے بہا رسالے کو حاصل کرنے کے لئے بہت جلدی کیجئے تاکہ دیہات کی نحوست بھی فوراً ہی دور ہو جائے۔ یہ رسالہ اپنے مضامین کی بہتری کے باعث تمام حکومتوں کا منظور شدہ ہے۔

منیجر رسالہ رفیق باغباں مین نرسری سہارنپور

صوبہ بہار کے مشہور ماہنامہ سہیل گیا کا

خاص نمبر

اپریل سنہ ۴۸ء کے پہلے ہفتہ میں آسمان صحافت پر جلوہ گر ہوگا

ملک کے پچاس نامور ادبا اور شعرا نے اسکی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ لہٰذا اسکی

موجودگی آپکی لائبریری میں ایک گراں قدر اضافہ کا باعث ہوگی

خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہوگی

مگر مستقل خریداروں سے علحدہ قیمت نہیں لیجائیگی۔ آپ بھی اسے

مفت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو آج ہی مبلغ تین روپیہ ارسال فرماکر

مستقل خریدار بن جائیں۔

منیجر رسالہ سہیل شمسی پریس گیا

کتب خانہ جامعہ اسلامیہ دہلی
DELHI.

ہفت وار مسلم دہلی

اسلامی، اصلاحی، تنظیمی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تاریخی مضامین کا مرقع۔ فرقہ پرستی اور جماعت بندی سے بے نیاز۔ ملت اسلامیہ کا صحیح علمبردار اور مسلمانوں کا حقیقی بہی خواہ۔

بفضل ایزدی، مستحکم اور مستقل بنیادوں کے ساتھ وقت کی پابندی سے ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں روح، تر و تازگی اور بیداری پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی دوسرا اخبار نہیں۔ ملک کے مشہور علماء اور زعمائے ملت اور رہنمایان قوم نے اپنی جن پرخلوص اور بے لوث آراء کا اظہار فرمایا ہے وہ حقیقتاً "مسلم" کی صفات اور خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔

گذشتہ سال "مسلم" نے "خلیل نمبر" پیش کیا ہے۔ ملک کے مقتدر حضرات نے اسے ایک مستقل تاریخی اور اسلامی کتاب کی حیثیت دی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ماہ ربیع الاول میں "رسول نمبر" پیش کیا جائے گا جو اپنی ضخامت، مضامین اور نوعیت کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہوگا۔

مستقل خریداران مسلم کو خاص نمبر بغیر اضافی قیمت پیش کئے جاتے ہیں۔ اس اخبار کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ہر گھر میں اس کا پڑھا جانا فلاح دارین حاصل کرتا ہے۔

قیمت سالانہ سے ر فی پرچہ ار

ملنے کا پتہ

دفتر اخبار مسلم، عظمت منزل باڑہ ہندو راؤ دہلی

MUSLIM UNIV...
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۳ - نمبر ۵ | مئی سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۴ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے۔ آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

آپ کی کتابوں کی طباعت

آپ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہمارے سپرد فرماکر مندرجہ ذیل باتوں سے بالکل مطمئن ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ کتاب صحیح چھپے گی۔

۲۔ دیدہ زیب کتابت ہوگی۔

۳۔ اچھا دبیز کاغذ استعمال کیا جائے گا۔

۴۔ نفیس طباعت ہوگی۔

۵۔ نہایت خوشنما اور مضبوط جلد سازی کی جائے گی۔

۶۔ بہت خوب صورت گرد پوش دیا جائے گا۔

غرضکہ

آپ کی کتاب جملہ لوازم طباعت سے آراستہ ہوگی

لیکن

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب

(۱) آپ اپنی کتاب کی طباعت کا انتظام ہمارے سپرد فرمائیں۔

(۲) سستے خراب کام کے مقابلے میں اچھے نفیس کام کے لئے نسبتاً زیادہ خرچ کریں۔

مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ دہلی

یہودی

(۲)

(از پروفیسر بنواری لال ایم۔اے جالندھر

(اس مضمون کی پہلی قسط رسالہ "جامعہ" ماہ نومبر ۱۹۳۹ء میں نکل چکی ہے)

ایک جرمن یہودیوں کی سودخواری کے متعلق یوں لکھتا ہے "بھیگے ہوئے اسفنج کو بھینچا جاوے اس میں سے جو پانی نکلتا ہے۔ یہ وہی پانی ہے جو اس نے پہلے کہیں سے چوسا تھا، یہودی بھی ایسے ہی اسفنج ہیں، جو کچھ بھی وہ عیسائیوں کو دیتے ہیں، سودخواری کے ذریعے اُن ہی سے لیا ہوا ہوتا ہے۔" "مکڑی اپنے جالے میں مکھیوں کو پھنساتی ہے اور ست چوس لینے کے بعد اُن کے اردگرد پھر جالا تن دیتی ہے۔ اور اُن کو حفاظت سے رکھتی ہے۔ وہ مردہ مکھیاں ایسے ہی جالے میں لٹکتی رہتی ہیں، یہودی بعینہ ایسی مکڑیاں ہیں، اور عیسائی مکھیاں، جو روپیہ یہودی دکھاوے کے لئے رفاہِ عام میں دیتے ہیں، عیسائیوں ہی کا چوسا ہوا خون ہوتا ہے، اسی روپیہ سے یہودی مکڑی رفاہِ عام کا جالا تنتی ہے۔ جس میں بےخبر عیسائی مردہ مکھیوں کی طرح جھولا جھو لتے ہیں" یہ الفاظ اگرچہ سخت ہیں مگر اتنی بات ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ کہ جرمن بھی بُری طرح یہودیوں کے دام میں پھنس گئے تھے۔ اور وہاں بھی وہی جال تھا جو کبھی ٹوڈیلا، قسطنطنیہ و فارس میں تھا۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کو اجازت تھی کہ جرمنی میں جہاں دل چاہے چلے جائیں اور آباد ہو جائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو جرمنوں کے برابر حقوق حاصل تھے۔ اُن پر صرف یہودی عدالتوں میں مقدمات چل سکتے تھے، سب سے پرانی دستاویز جو یہ ظاہر کرتی ہے، کہ یہ حقوق اُن کو پرانے وقتوں سے حاصل تھے سنہ ۱۰۲۲ء کی ہے۔ کوئی عیسائی جب تک کہ اس کے

پاس کم از کم ایک یہودی گواہ نہ ہو کسی یہودی پر مقدمہ نہیں چلا سکتا تھا۔ یہودی عدالتوں کے اجلاس، یہودیوں کی مجلس میں ہوتے تھے، حتیٰ کہ اگر کوئی تنازعہ ہوتا تھا تو رومن کیتھولک پادریوں کو بھی یہودیوں کی ہی عدالت میں جانا پڑتا تھا، مگر یہاں بھی یہودیوں نے پرانی قومی عادت کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جرمنی میں بھی وہ سود، لین دین، اور صرّافی کا کام وسیع پیمانے پر کرتے تھے، اگر کسی یہودی کے پاس چوری کا مال نکل آتا، اور وہ قسم کھا کر کہہ دیتا کہ میں نے یہ مال ایمانداری سے خریدا ہے تو حکم تھا کہ اُس کو چھوڑ دیا جائے۔ اصلی مالک کو اپنی شئے واپس لینے کے لئے یہودی کو منہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی، قانون گوسلر کی رُو سے صرف یہودیوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ دیدہ دانستہ چوری کے مال کو گروی رکھ سکتے تھے، اگر کسی جرمن کے پاس کوئی ایسی شئے ہوتی جس کو ایک یہودی کہہ دیتا کہ میری ہے، چاہے دراصل وہ اُس کی نہ بھی ہو، تو جرمن کو وہ چیز صحیح سلامت واپس کرنی پڑتی تھی، یا اُس کی قیمت ادا کرنی ہوتی تھی، یہودیوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو اپنا ساہوکارہ قائم رکھا جائے۔ قانون کی رو سے شرح سود ۳۳ فی صدی سے لے کر ایک سو بیس فی صدی تک مقرر تھی، مگر حقیقت میں یہودی اس سے بھی زیادہ سود لیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہ وگدا، شہری و دیہاتی سب کی جان یہودیوں کی مٹھی میں رہتی تھی، تحریرات کے ڈھیروں کے ڈھیر اس کے ثبوت میں موجود ہیں، ذوائی بَرکَن کا ایک نواب والرم سترہ یہودیوں کا مقروض تھا، او بروینرل جیسے چھوٹے سے قصبے میں یہودیوں کے ۲۱۷ اشخاص مقروض تھے، اٹنگن کے جاگیر دار نے اُن کے پاس اپنا تاج بھی رہن رکھ دیا تھا، اسی طرح بالتھانزر فریدرک اور دِلہلم وغیرہ تعلقہ دار یہودیوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے، ایک یہودی اسحٰق نامی میونک سے بھاگ نکلا جب پکڑا گیا تو اس کے قبضہ سے شہریوں کی زینت و آرائش کی چیزیں، جاگیر داروں اور رئیسوں کے جواہرات و زیورات اور شاہی خاندان کے

آلات سیم وزر برآمد ہوئے، اسی ساہوکارے کے طفیل یہودی بادشاہوں اور اسقفوں کے دربار میں پہنچے، اور مشیران مالیات واجارہ دارانِ محصولات بن گئے۔ یہودی افسروں کو ایک ایک محرر ملا تھا، جو اپنا حساب کتاب عبرانی زبان میں رکھتا تھا، چنانچہ صرف یہودی ہی اُس کے حسابات کی جانچ پڑتال کرسکتے تھے، جس نسبت سے یہودیوں کی طاقت دن بدن بڑھتی گئی، اسی نسبت سے لوگوں کی مصیبتوں اور بیچارگیوں میں اضافہ ہوتا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے خلاف فسادات رونما ہونے لگے۔ بنی اسرائیل اور سودخواری، اس زمانے میں ہم معنی الفاظ ہو گئے تھے، اور اس پیشے کے لئے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت تھی حق بجانب تھی، ایک پرانے گیت کا ترجمہ ہے "یہودیوں سے کبھی محبت نہ کرو، نہ ان پر اعتماد کرو، وہ تمہاری روح کے چور ہیں، اور تمہاری عورتوں کی بے عزتی کرنے والے ہیں" یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی ہوتی رہی، ایک دفعہ ایک یہودی نے مریم معصومہ کا منہ چڑایا۔ تو اُس کو محض دس گوار جرمانہ کرکے چھوڑ دیا گیا، ۱۹۲۰ء میں ریگنس برگ کے مقام پر ایک پادری کو دو یہودیوں کے خوف سے بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ کیونکہ وہ اُس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جب بنی اسرائیل کی مجلس نے ملزمان کو سزا دینے سے انکار کیا، تو عیسائیوں نے ان سے مقاطعہ کیا، وہ بھی عارضی اور نامکمل طور پر، اور اسی پر اکتفا کی۔ اشتراس برگ کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی اسرائیلی کے لئے باعث آزار ہوتا تھا تو اُس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اسرائیلیوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو عیسائیوں کے ساتھ، اشتراس برگ میں بھی یہودی پرانے زمانے سے ساہوکارہ کرتے چلے آتے تھے، بلدیہ اور حکومت کو قرض دیتے تھے، ایسی مقتدر قوم کے خلاف تو لوگ اسی صورت میں آمادۂ فساد ہو سکتے ہیں جب کہ ان کے لئے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ جہاں جہاں یہودیوں کا اقبال ہوا لوگوں میں ادبار پھیلا۔ اور جہاں جہاں سے یہودی خارج کئے گئے لوگ اقبال مند ہو گئے۔ دوسری صلیبی جنگ کے بعد جب

کہ "مرگ اسود" سے بہت تباہی پھیلی (یعنی چودھویں صدی کے وسط میں) اور جرمنی کی حالت نہایت ابتر ہوگئی پے در پے مصائب کی وجہ سے تو اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، اور اُس نے اِن خون آشام اسرائیلیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ارادہ کیا، لوگوں نے بھی غم و غصہ میں مظاہرے کئے مگر اس سے کیا بنتا تھا، کچھ برس بعد پھر وہی حالت ہوگئی، شرح سود اور بھی تیز ہوگئی، جنگ کی وجہ سے ملک تباہ ہوا تب بھی یہودیوں نے اپنے ہاتھ رنگے۔ آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی یہ حالت تھی کہ "سارے کمیشن ایجنٹ یہودی تھے اور سارے یہودی کمیشن ایجنٹ" ان کا اصول صرف ایک تھا اور وہ تھا جھوٹ اور فریب، لیبے کہتا ہے؛ "ہم دیکھتے ہیں کہ ابتری کے زمانوں میں جب کہ ملک کی مالی حالت نہایت خستہ ہوگئی ہو بے رحم و دولت پرست لوگ بہت خوش رہتے ہیں کیونکہ ایسے زمانوں میں اُن کی بے ایمانی کا بازار خوب رونق پر ہوتا ہے" اس سلسلہ میں جو فسادات ہوئے، اُن کو مستثنیات میں سے شمار کرنا چاہئے۔ کیونکہ کسی زمانے کی خصوصیات اُس کی معمولی، روزمرہ زندگی سے معلوم ہوتی ہیں، مگر اس دَور کی روزمرہ زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ یہودی مورخ ان فسادات کو "قتلِ یہود" وغیرہ مبالغہ آمیز ناموں سے موسوم کرتے ہیں دراصل دیکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ ایک فساد اور دوسرے فساد کے درمیان کتنا عرصہ گذرا اور اس عرصہ میں بنی اسرائیل نے کتنے خاناں برباد کئے؟ لوگوں کی حالت کیا تھی؟ فساد کی وجوہات کیا تھیں؟ ان ہی گاہِ گاہی فسادات کی وجہ سے رفتہ رفتہ عوام کے دل میں بنی اسرائیل کے خلاف نفرت جاگزیں ہوگئی۔ وہ پیشے اور کام جن سے بنی اسرائیل کو تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں عار تھا، اب قانوناً ان کے لئے بند کردیئے گئے۔ پہلے وہ عوام میں مل جل کے رہنا پسند نہیں کرتے تھے، اب اُن کو اصولاً اور مصلحتاً علیحدہ "غتو" میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹر آرتھر رپن کہتا ہے "پہلے یہودی ہر جگہ اپنی مرضی سے علیحدہ رہتے تھے پھر اُن کو حکماً علیحدہ رہنا پڑا" اور اُن کی نشانی مقرر کردی گئی ایک نوکدار ٹوپی اور ایک خاص زرد رنگ کا رومال، پھر رفتہ رفتہ ان کے ساتھ

عدم تعاون بھی ہونے لگا ان ساری باتوں کے باوجود یہودیوں کے علیحدہ کرنے میں کوئی سختی یا ظلم مد نظر نہیں ہوتا تھا، مگر مصلحتاً یہ ضروری تھا۔ یہودی طبقے اراذل میں شمار نہیں ہوتے تھے، بلکہ فرانک فرٹ کی ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کو بھی دیگر عوام کی طرح خطابات کے ذریعے سے امتیاز بخشا جاتا تھا۔ ایبٹ ترت ہائیم ۱۵۱۶ء میں لکھتا ہے" چھوٹے بڑے۔ پڑھے لکھے ان پڑھ سب کے دل میں ان سود خوار یہودی ساہوکاروں کے خلاف نفرت کا جذبہ جاگزیں ہو چکا ہے، عوام کو ان کے پنجے سے بچانے کے لئے قوانین بننے چاہئیں ورنہ ایک اجنبی قوم، زور و حوصلہ مندی اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ محض دولتمندی کی وجہ سے ہم پر حکمراں ہو جائے گی۔ لوٹ مار اور تہدید و تخویف تو ہم کو ان کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتے، اس کا طریقہ تو بس یہ ہے کہ ان کو جبراً سود خواری اور ہیر پھیر سے باز رکھا جائے اور ان کو ایماندارانہ پیشوں میں، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجا جائے" مگر ان قراردادوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تاریخ نورن برگ اٹھا کر اس سوال کا جواب دیکھئے کہ لوگوں نے ۱۴۹۹ء میں نورن برگ سے یہودیوں کو نکال دینے کی کوشش کیوں کی۔ لکھا ہے" نورن برگ میں آباد اور جاگزیں یہودی اس کے سزاوار تھے۔ وہ بہت مغرور اور سرکش ہو گئے تھے، ان کی حد سے بڑھی ہوئی شرح سود، ان کی ناقابلِ تسکین طمع، اور عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے قرضے نے بلدیہ کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ اس قسم کے خون آشام مہمانوں کو جن کی کرتوتیں تجارت کے لئے باعثِ شرم ہیں شہر میں زیادہ دیر پناہ نہ دے" پہلے بھی مختلف اوقات پر انھیں اقتصادی اور مذہبی جھگڑوں کی بنا پر فسادات برپا ہوئے تھے حکومت نے دیکھا کہ اس طرح سے تو یہ مسائل حل نہیں ہوتے، اس لئے انھوں نے فوج کی پناہ میں (تاکہ کسی قسم کا نقصان وغیرہ نہ ہو) ان کو ۱۴۹۹ء میں شہر سے خارج کر دیا" اس شہر میں وہ مدت سے آباد ہونے کی وجہ سے بہت امیر ہو گئے تھے، "۱۳۱۰ء میں قیصر ہائنرک ہفتم نے اہالیانِ شہر نورن برگ کو ایک رعایت دی تھی اور وہ رعایت یہ تھی کہ اس جگہ

یہودیوں کو ہالیان شہر سے ½ ۴۳ فی صدی فی ہفتہ سے زیادہ، اور اجنبیوں سے ۵۵ فی صدی فی ہفتہ سے زیادہ سود لینے سے منع کر دیا تھا" سارے جرمنی میں یہی حال تھا جہاں کہیں سے یہودیوں کو خارج کیا جاتا تھا، لوگوں کی جان میں جان پڑ جاتی تھی۔ آوگزبرگ سے یہودیوں کے اخراج کے موقع پر پادری ہارتت مان کرائیدسیں کہتا ہے" یہ شہر والوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہودیوں کو نکالا جا رہا ہے کیونکہ وہ سود و ساہوکارے اور دیگر بیوپار وغیرہ سے غریب عیسائیوں کا خون چوستے تھے، بہت سے لوگ روٹی روٹی کے لئے محتاج ہو چکے تھے۔ کئی شہری بیوی بچوں سمیت تباہ ہو کر گداگر بن گئے تھے وغیرہ" غرضیکہ ہر جگہ یہی حال تھا، ۱۵۳۹ء میں سارے جرمنی میں اعلان کیا گیا جس کی رو سے یہودیوں کو ساہوکارے سے روک دیا گیا۔ اور اُن کو دستکاری میں لگایا گیا تاکہ اپنا عرقِ جبیں بہائیں تو ان کو پتہ لگے کہ عیسائی روزی کس طرح کماتے ہیں۔ مگر یہ بھی بے سود رہا۔ ازمنہ وسطیٰ کے حالات پڑھے جائیں تو یہودیوں کی تجارتی فریب کاریاں اور عجیب وغریب چالاکیاں حیران کر دیتی ہیں داؤ پھیر میں روپیہ مارنا، مال رکھ کر دیوالہ نکال دینا۔ ناتجربہ کار لوگوں، اور امیروں کے بچوں کو گمراہ کرنا۔ انھیں فضول خرچی اور عیاشی سکھانا، جھوٹی دستاویزیں بنا لینا جو عبرانی زبان میں لکھی ہوں، جن پر اعتبار کر کے روپیہ ادا کر دیا جاتا مگر جب ترجمہ کروایا جاتا تو انھیں سوائے چند ایک لغو فقرات کے اور کچھ نہ حاصل ہوتا۔ خرید و فروخت میں اشیاء کا ادل بدل کر دینا کہ بجائے اشیائے خریدہ کے گھر جا کر خریدار کے بنڈل میں سے پتھر یا گھاس پھوس برآمد ہو وغیرہ اس قسم کی جعل سازیاں ان میں عام تھیں اس زمانے کا ایک مصنف ظریفانہ انداز میں لکھتا ہے" وہ حکمران جو اپنی رعایا میں یہودیوں کو بساتا ہے۔ اُس شخص کی طرح ہے جو اپنے جوہڑ میں افزائش نسل کے لئے ننھی ننھی مچھلیاں چھوڑتا ہے، اور اُن کے ساتھ ہی چند بڑے بڑے ماہی خور جانوروں کو بھی چھوڑ دیتا ہے، جو گھنٹے بھر میں سب کو چٹ کر جائیں" "ایک مینڈھے کو باغ کا مالی کون بناتا ہے؟" "کسی نے بطخوں اور مرغیوں کی رکھوالی کے

لئے بلیوں اور لومڑیوں کو بھی رکھا ہے؟" اے حکمرانو! اگر تمھیں اپنی رعایا کو سزا دینی ہے، تو ان میں چند یہودی لاکر بسا دو" وغیرہ قصہ مختصر یہ کہ جس جس جگہ یہودی آباد ہوئے ایک ہی قسم کے نتائج ظہور پذیر ہوئے لوگ ہر جگہ ان کی سود خواری سے تنگ آکر داد و فریاد کرنے لگے عیسائیوں میں بھی چوروں مکاروں اور دغا بازوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر یہودی تو معلوم ہوتا ہے ان فنوں کے اجارہ دار ہیں۔

۳۔ یہودیوں کی عادات و رسوم و رواج | یہودیوں کے نزدیک نیکی وہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ کی جائے، اور بدی یہ کہ جو غیر یہودیوں سے نیکی کی جائے، حالانکہ وہ خود تو اپنے آپ کو شرافت و انسانیت کے مجسمے خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم بنی اسرائیل کے ماضی کو بھی اسی اخلاقی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس سے کہ دیگر اقوام کے ماضی کو۔ اس وجہ سے ہمارے اذہان میں ہر وقت چند ایسی صفات کا خیال موجود ہوتا ہے، جن کو ہم دیگر اقوام کی طرح یہودیوں سے بھی منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ یہودی ان صفات سے قطعاً محروم ہیں، مثلاً جب ہم "احباب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو س سے ہر قوم و مذہب کا شخص مراد لے لیتے ہیں، مگر یہودی اس لفظ سے صرف "یہودی" ی مراد لے گا، عہد نامہ قدیم میں چند احکام ہیں جو ہمیں تالمود کے ریگستان میں بھی نخلستانوں کی طرح نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ر یہودی اور غیر یہودی کے امتیاز کی وجہ سے ان کا بھی ذائقہ تلخ ہو گیا ہے۔ بابا کما کے مقالے صفحہ ۱۱۳ ب پر لکھا ہے "جز ۲۲ : ۳ کے مطابق، تیرے سارے، بے وطن، بھائیوں کو ب بات بتائی جائے گی، واجب ہے کہ تو اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے ہی کرے اور دوسروں سے نہ کرے" ربی غانیتا نے کہا ہے یہ جو لوائٹ ۲۵ : ۱۷ میں لکھا ہے، اپنے احباب کو دھوکا ت دو، اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب ـــــ احباب، کا مطلب ہے وہ لوگ جن کے اتھ شرح یہود نے تجھ سے ملایا، ایسے احباب کو دھوکا مت دو"، ایک مقام پر چوری کے

خلاف جو ممانعت ہے اس کی یوں تشریح کی گئی ہے " یہ چوری سے جو روکا گیا ہے، تو وہ یہودیوں کو ایک دوسرے کی چوری سے روکا گیا ہے، یا یہ امتناعی حکم محض آدمی کی چوری (بردہ فروشی) سے روکتا ہے، تالمود میں یعقوب اور راخل کا مکالمہ یوں درج ہے " یعقوب نے راخل سے کہا " کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گی ؟ " اس نے جواب دیا " ہاں " مگر میرا باپ ایک دھوکا باز شخص ہے۔ تمھاری اور اُس کی طبیعت نہیں ملے گی، " یعقوب نے کہا " دھوکا بازی میں میں بھی اس کا بھائی ہی ہوں " راخل نے پوچھا " کیا اس بات کی اجازت ہے، کہ کوئی ایماندار شخص دھوکا بازی بھی کرلے ؟ " یعقوب نے جواب دیا " کیوں نہیں، پاک دامنوں کے ساتھ پاک دامن رہو اور بے ایمانوں کے ساتھ بے ایمان، دیکھو گیت " نمبر ۱۱، ۲ " بنی اسرائیل کو اپنے بزرگ کے اس مقولے میں تعجب کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، وہ اس کی کئی کئی تاویلیں کرکے حسب منشار اور حسب ضرورت مطلب نکال لیتے ہیں، دوسرے لوگوں کی طرح ان کا ضمیر کچھ بہت ذکی الحس نہیں جب ہیاں مارد وخائی سے کہتا ہے " کسی کو دشمن کے زوال یا نقصان پر خوش نہیں ہونا چاہیئے تو وہ جواب دیتا ہے " ہاں یہ تو صرف اسرائیلی دشمنوں کے متعلق ہے، تیرے متعلق تو صاف لکھا ہے " اِن کو بلندیوں سے نیچے گرادو " اسرائیلی قوم کی شرعی و اخلاقی ذہنیت مندرجہ بالا بیانات وعقائد سے ایسی اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جیسے کہ مندرجہ ذیل ٹھوس واقعہ سے، جس کو صریحًا بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: " ربی شِلاّ نے ایک شخص سے کسی مصری عورت کے ساتھ زناکاری کرنے کے جرم میں، آئندہ کے لئے ضمانتِ نیک چلنی طلب کی۔ وہ شخص بادشاہ مصر کے دربار میں جاکر ربّی شلاّ کے خلاف فریادی ہوا کہ حضور یہودیوں میں ایک شخص ہے، جو بغیر شاہی اجازت کے سزائیں دیتا ہے " بادشاہ نے فورًا کسی کو بھیجا کہ اُسے بُلا لائے۔ جب وہ حاضر ہوا تو منصفوں نے کہا " تم نے اُس شخص کو سزا کس لئے دی " ربّی نے جواب دیا " کیونکہ اُس نے ایک گدھی کے ساتھ مباشرت کی ہے " اُنھوں نے پوچھا " کیا تمھارے پاس کوئی شہادت ہے " جواب دیا " ہاں جناب " پھر ایلیا انسان کی صورت میں ظاہر ہوا اور اُس نے

شہادت دی، قاضیوں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو وہ گردن مارنے کے لائق ہے" ربّی نے کہا حضور جس روز سے ہم "آوارہ وطن" ہوئے ہیں، ہمیں کسی کو مارنے کا اختیار نہیں ہے، "آپ جو چاہیں کرسکتے ہیں" قاضی ابھی اس معاملہ پر غور ہی کر رہے تھے کہ ربّی نے یوں بولنا شروع کیا "اے یہووا (خدائے یہود) سب بزرگی اور طاقت تیری ہے" قاضیوں نے اس سے پوچھا "کیا کہا؟" اُس نے جواب دیا "مبارک ہے وہ ارحم الراحمین، جس نے دنیا و آسمان پر اپنی بادشاہت قائم کی اور تمھیں اپنا عادل اور رحم دل نائب مقرر کیا" قاضیوں نے سوچا کہ یہ شخص تو سلطنت کی آن و عزت کا حامی و محافظ معلوم ہوتا ہے، اس لئے انھوں نے اسے ایک سونٹا دیتے ہوئے کہا "یہ لو۔ تم ٹھیک کہتے ہو"

جب رَبّی ٹہلا باہر نکلا تو مجرم نے اُس سے کہا "کیا خدائے رحم دل جھوٹوں کی حمایت کرتا ہے؟ حیرت ہے!" ربّی نے کہا "بدذات! کیا مصری لوگوں کو گدھے نہیں کہتے؟ عزاخیل ۲۳ : ۲۰ میں صاف لکھا ہے کہ ان کی کھال گدھوں کی کھال کی طرح ہے" جب یہ سن کر اس شخص نے چاہا کہ پھر اندر جا کر کہے کہ ربّی، تم مصر کے لوگوں کو گدھا کہتا ہے، تو ربّی نے یہ سوچ کر کہ یہ شخص "ناحق ستانے والا ہے" اور مجھے ضرور برباد کرکے چھوڑے گا۔ لہذا اب تو اس کو مار دینا چاہیئے" اُس نے سونٹا لیا اور اُس شخص کو وہیں مار دیا اور کہا "کتاب مقدس کی ایک آیت نے آج معجزہ دکھایا، میں پھر کہتا ہوں" اے یہووا ساری بزرگی اور طاقت تیری ہے" یہ چھوٹا سا نہایت سہل الفہم واقعہ کسی شرح کا محتاج نہیں، اسرائیلیوں کی غیر اسرائیلیوں سے بے وجہ نفرت، ایلیا نبی کی حمایتِ کذب وافترا، تالمود میں قتلِ ناحق کی اجازت، اسی میں سب کچھ موجود ہے، اور اگر ہم ۵۔ کتاب موسیٰ ۲۳ : ۲۰ کا مقولہ "تم غیر اسرائیلیوں سے سود لو۔ مگر اپنے بھائیوں سے نہ لو" بھی اس کے ضمن میں یاد رکھیں تو سب کچھ صاف ہو جاتا ہے ۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں کے پرآشوب زمانے میں، جب کہ ایران پر ارغون خان کی حکومت تھی، یہودیوں کو بہت اقتدار حاصل تھا شاہ موصوف کی حکومت کے آخری

حصہ میں ایک یہودی سعدالدولہ وزیر تھا۔ اس کو اس قدر طاقت اور اقتدار حاصل تھا کہ جو چاہتا سو کرتا، جس کو چاہتا اُٹھاتا جس کو چاہتا بٹھا دیتا تھا۔ مسلمان اس سے نفرت کرتے تھے۔ مگر چونکہ ارغون خان اس پر بہت مہربان تھا اس لئے اس کا بگاڑ کچھ نہیں سکتے تھے۔ یہ شخص طبیب بھی تھا۔ اور ساہوکار بھی۔ ساری سلطنت کے مالی نظم ونسق کا واحد اجارہ دار بے حد طمّاع و ممسک ہونے کی وجہ سے نت نئی تدبیریں خزانوں کو بھرنے کی نکالتا تھا۔ اس وجہ سے ایلخان اس پر بہت خوش تھا۔ اس زمانہ کے کسی شاعر نے لکھا ہے۔

یھود ھذا الزمان قد بلغوا ۔۔۔ مرتبۃً لاینا لھا فلک

الملک فیھم والمال عندھم ۔۔۔ ومنھم المستشار والملک

یامعشرالناس قد نصحت لکم ۔۔۔ تھوّدوا قد تھوّد الفلک

بالآخر اس افسون طراز یہودی نے ارغون کو کچھ ایسا بدھو بنایا۔ کہ مسلمانوں کو تمام ملکی ومالی وفوجی عہدوں سے برطرف کروا دیا۔ اور یہاں تک کوشش کی کہ ان کے مذہب کو ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس نے ارغون کو اس بات کا یقین دلایا کہ نبوت عربوں کے بعد اب مغلوں میں آگئی ہے۔ اور خدا نے انھیں محمدؐ کے گمراہ پیرووں کو سزا دینے کے لئے بھیجا ہے اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ خانۂ کعبہ کو پھر سے بت کدہ بنا دیا جائے۔ بغداد کے مقام پر اس شخص نے ایک بحری بیڑا تیار کرایا تاکہ بحیرۂ قلزم میں سے جاکر مکہ پر حملہ آور ہو۔ خواجہ نجیب الدین کحال کو جو اس کا ہم مذہب تھا اس نے خراسان بھیجا اور اس کو قریبًا ۲۰۰ برگزیدہ مسلمانوں کی فہرست دی کہ ان کو تباہ کر دیا جائے۔ اسی طرح شیراز میں بھی اس نے کسی کو ایسی فہرست دے کر بھیجا۔ مورخ کہتے ہیں کہ ارغون خان پہلے بہت رحم دل تھا اور خونریزی سے بہت پرہیز کرتا تھا۔ سعداللہ کی صحبت بد اور پیہم انگیخت کی وجہ سے بالآخر یہی بادشاہ اس قدر ظالم اور سنگ دل ہوگیا کہ ذرا سے شبہ پر بڑے سے بڑے عہدہ دار کو قتل کر دیتا تھا۔ مگر پیشتر اس سے کہ اس وزیر کی ظالمانہ تدبیریں تکمیل کو پہنچیں۔ ارغون بیمار ہوگیا۔ اور لوگوں نے بادشاہ کی وفات

سے چند روز پہلے ہی اسے مار دیا۔ حوالہ جات بڑھانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں، اس لئے ایک مسلمہ قابلیت کے یہود دوست 'مفکر' کے الفاظ پر کفایت کی جاتی ہے "جب یہودی ربّی' عیسائیوں کے سامنے اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم یہودی تمام انسانوں کو ایک سا خیال کرتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ایک سا اخلاقی رشتہ رکھتے ہیں، اور ہمارا مذہب دوسروں سے محبت کرنا سکھاتا ہے، تو اس سے زیادہ صریح جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے"۔ مندرجہ بالا حقائق سے نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں، یوروپین عیسائی چاہے کتنا بھی گمراہ ہو جائے، چاہے یہودیوں سے بھی گر جائے، اس کے اخلاق میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور باقی رہتی ہے جو اس کو نیکی کی طرف راغب کرے، یورپ کے سماج کے تحریری یا غیر تحریری روائتی اخلاقی معیار بھی ایسے ہیں کہ اسے بہت حد تک چوری اور دغا فریب سے باز رکھتے ہیں۔ انسان کا جو خود غرضی اور خود پرستی کی طرف فطری رجحان ہے ان اخلاقی روائتوں کی وجہ سے رُکا رہتا ہے برعکس اس کے یہودی کی فطری خودغرضی کو اس کے عقائد و اخلاق سے تقویت پہونچتی ہے، اُس کے تعصب اور نسلی میلانات جن کا آئندہ ذکر کیا جائے گا اسے اور بھی قوی بنا دیتے ہیں۔

یہودی، غیر یہودی کی جائداد کو پیدائشی طور پر اپنا حق تصور کرتا ہے، غیر یہودیوں کی ملک ان کے نزدیک کسی کی ملک نہیں، جو یہودی اس پر قبضہ کر لے اس کا جائز مالک ہے، غیر یہودی کے ساتھ ایفائے عہد و پیمان ضروری نہیں، غیر یہودیوں کا اپنی جائز بیویوں پر بھی کوئی حق نہیں ہے، وہ درحقیقت ان کی بیویاں ہی نہیں ہیں، اس طرح ہر غیر اسرائیلی قوم کو لوٹنا ان کا گویا جائز حق ہے، یہودی کی طرف سے اقوام عالم پر جو جو فریب کئے گئے ہیں، جس جس طرح سود کے ذریعے سے ان کا خون نچوڑا گیا ہے، ان کو ہم اخلاقی لغزشیں خیال نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے وہ تو شریعتِ یہود اور احکام تالمود کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ لوتھر نے اسی تلخ حقیقت کے خلاف آواز اٹھائی تھی، گوئٹے نے بھی اعتذار کے طور پر کہا تھا "ان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر یہودیوں کو لوٹا جائے" اور اسی وجہ سے فختے نے ناامید ہو کر کہا "یہودی چاہے عیسیٰ پر ایمان نہ ہی لاتے

چاہے وہ خالق پر بھی ایمان نہ لاتے، کوئی ہرج نہیں تھا۔ غضب تو یہ ہے کہ وہ دو متضاد اخلاقی معیاروں، اور ایک "انسان دشمن" خدا میں اعتقاد رکھتے ہیں"۔ یہودیوں کے خلاف اس طرح آواز اُٹھانے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے، کہ آزادی خیال کا گلا دبایا جائے۔ ہمارا مقصد تو محض اس قانون کی مخالفت کرنا ہے جو تمام دیگر قوانین کے برعکس و منافی ہے۔ اس بات پر تو پختہ یقین کر لینا چاہیئے کہ ایسے قوانین شرعی کی علمبردار قوم دیگر اقوام کے ساتھ کبھی بھی منصفانہ برتاؤ یا برادرانہ میل جول نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے اس بات سے محتاط رہنا چاہیئے، کہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو کر کہیں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ کیونکہ ایک اسرائیلی اگر منصف بھی ہو گا تو پرانے تعصبات، اور نسلی رجحانات کی وجہ سے، سوائے یہود کے دوسروں کے حقوق کا محافظ و نگہبان نہیں بنے گا۔ سادہ لوح لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ زمانے میں شرح موسوی تو محض ایک متروک الاستعمال شے ہے، مگر یہ بات غلط ہے برعکس اس کے حقیقت یوں ہے کہ دنیا کے دو تہائی یعنی نوے لاکھ یہودی اب بھی شرع تالمودی کے کٹر پابند ہیں۔ چنانچہ، دیگر ممالک کے قوانین، اسرائیلیوں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کانٹوں کی طرح کھٹکتے رہے ہیں، اور انھوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے، کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کی جائے، یا مخصوص طالمودی گریز ی، و دلیل بازی سے، موڑ توڑ کر، ان کو حسب منشا استعمال کیا جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ دوسرے شہریوں کے پہلو بہ پہلو مروجہ پیشے اختیار کریں، وہ ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہے ہیں کہ اپنے لئے مخصوص اسامیاں اور مخصوص قوانین و مراعات حاصل کریں، بادی النظر سے دیکھا جائے تو غیر ممالک کے قوانین یہودیوں کو اس امر سے کسی حد تک باز رکھتے تھے، کہ وہ اپنے مشاغل بے روک ٹوک جاری رکھ سکیں۔ مگر جہاں کہیں بھی ان قوانین کی عملدرآمد میں ذرا اہمال ہو جاتا تھا۔ یہودی اسے جگہ جگہ سے توڑ کر اُس کے اندر رخنے پیدا کر لیتے تھے، آج کل روس میں یہی ہو رہا ہے، اور ۱۹۳۳ء تک جرمنی میں بھی یہی حالت تھی، اب یہ کہنا بھی کچھ بجا معلوم نہیں

ہوتا کہ بڑے بڑے شہروں کے یہودیوں کو احکام طالمودی سے کچھ زیادہ سروکار نہ تھا، کیونکہ "طالمود نے یہودی نہیں بنائے بلکہ یہودیوں نے طالمود کو بنایا" ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب بھی دو ہزار برس سے یہودیوں کی روحانی و اخلاقی زندگی پر مسلط ہے، ۶ برس کی عمر کے بعد سے ہر روز یہودی بچوں کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اسرائیلیوں کے اخلاق کو چاہے وہ لامذہب زر پرست ہوں، مذہبی جنونی ہوں یا کٹر طالمودی ہوں، اسی کتاب نے ایک خاص شکل میں ڈھالا اور مستحکم کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیسائیوں میں بھی بہت سے زر پرست اور گنہگار ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے اوسط اخلاقی معیار میں کوئی رذالت واقع نہیں ہوتی۔ اگر کسی قوم میں کچھ بدکار ہوں بھی تو وہ ان کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ مگر جب کوئی فریب کار سود پیشہ اور مال و زر سے بھرپور قوم، پریشان کن دلیل بازی، اور منطقیانہ کر یزی کی باقاعدہ تربیت پا کر، بڑی مستعدی اور استقلال سے آمادۂ فساد و شر ہوتی ہے، تو لوگوں کے لئے بہت خطرہ ہو جاتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کسی کی روک ٹوک نہ ہو اخوت و مساوات کے زبانی نعروں سے کوئی تاریخی یا نسلی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بین الاقوامی مسلک کے لوگوں کا خیال ہے، وقت آ گیا ہے جب کہ یہودیوں کے اندازِ تخیل و میلانِ طبع کا جائزہ لینا ضروری ہے، مگر ہمارا زمانہ محض زبانی شور و شر کا زمانہ ہے، اخلاقی صفات کی بہت کمی ہے۔

(ترجمہ)

سزا

(عبدالغفور صاحب۔ ایم اے)

آپ نے دریا میں اکثر بھنور پڑتے دیکھے ہوں گے۔ بھنور کے اندر چھوٹے بھنور یا بھنوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ہندو کے عقیدے کے مطابق پوری کائنات آواگون کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہے سزا اور جزا۔ جزا اور سزا۔ کبھی جزا۔ کبھی سزا۔ اگر غور سے دیکھیں تو یہ بھنور ہی نہیں اس میں بھنوریاں بھی ہیں۔ یہ ایک جنجال ہی نہیں اس میں چھوٹے جال بھی ہیں۔ آواگون کا چکر بڑھاپے کے خاتمے پر شروع ہوتا ہے اور مدرسے کا چکر شیر خوارگی کی موت کے بعد۔ آواگون میں پچھلے جنم کے کشٹوں کا بدلہ اگلے جنم میں ملتا ہے مگر اسکولی کائنات میں اسی جنم کا بدلہ اسی میں ملتا ہے۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ جہاں تک سزا کا تعلق ہے یہ سودا تو لفظاً اور معناً ہاتھوں ہاتھ ہی جاتا ہے۔ استادوں نے یہ تحفہ اپنے استادوں سے ہاتھوں پہ لیا اور ہاتھوں ہاتھ نئی پود کو پہنچا دیا۔ جنھوں نے تعلیم کی تعریف یہ کی کہ تعلیم، تمدنی اور معاشی ورثہ کو ایک نسل سے دوسری میں منتقل کرنا ہے اُنھوں نے اس انتقال کے سزائی پہلو کو بالکل فروگزاشت کر دیا اور اس حد تک ان کی تعریف جامع قرار نہیں دی جا سکتی۔

بہر حال اگر ہمارا آواگون پر اٹل اعتقاد ہو تو مدرسے میں سزا کا مسئلہ یوں صاف ہو جاتا ہے جیسے کسی پیر روشن ضمیر کا ڈنڈا پڑنے سے مرید پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں جب ماں باپ یہ کہہ کر بچے کو استاد کے ساتھ سونپ دیتے ہیں کہ "ہڈی ہماری اور مانس تمھارا" تو اس کا مطلب خدا نخواستہ یہ نہیں ہوتا کہ گوروجی بچوں کا مانس کھاتے ہیں اور ہڈیاں چچوڑ چچوڑ کر الگ پھینکتے جاتے ہیں، والدین کو تو خواب میں بھی خیال نہیں آ سکتا کہ گوروجی کا کسی مردم خور نسل سے کبھی دور کا بھی رشتہ رہا ہو گا۔ ایسا شبہ تو کسی ماہر معاشریات یا نفسیات کو ہی گزر سکتا ہے،

عقیدت مند والدین کا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ گوروجی کے فیضانِ روحانی سے بچے کی مادی کثافتیں یوں پگھل جائیں گی جیسے سردیوں کے سورج کے سامنے پانی کے اوپر جما ہوا پالا۔ مگر اس عمل کو پورا کرنے میں گوروجی بھی ایک حد تک خارجی ذرائع کی امداد لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مادی کثافتوں کو دور کرنے سے پہلے جسمانی ثقالتوں کو کم کرنا بھی تو ضروری ہے۔ اور بعض بچوں کی ثقالت تو الہٰی توبہ! کسی کی کھال اتنی دبیز ہوتی ہے کسی کے دماغ پر اتنی چربی چڑھی ہوتی ہے کہ گوروجی کی نگاہِ تیز تو کیا ایکسرے کو بھی اس میں سے گزرنے میں ایک مرتبہ تو کشمکش کرنا ہوگی اور پہنچنا بھی تو ہڈیوں تک ہوتا ہے۔ اسی لئے انہیں اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے کے لئے ضرور مقدس تیج بھل کے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور پھر اسی مسئلہ کا ایک آواگونی پہلو بھی ہے۔ جب گوروجی کسی چیلے کو مرغا بنا کر اس کی پشت پر ایک پانی کا مٹکا ٹکانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت خدانخواستہ اس سے کوئی ذاتی انتقام نہیں لیتے اس وقت وہ اس آواگونی تیندوا کی ایک تانت ہیں جس نے اس غریب چیلے کو اپنے عالمگیر رشتوں میں جکڑ لیا ہے۔ وہ تو محض آلۂ انتقام ہیں ان گناہوں کے جو اس نے کسی پہلے جنم میں کئے ہوں گے جب وہ کسی ودیارتھی کے کان اینٹھتے ہیں تو انھیں کس قدر روحانی مسرت ہوتی ہوگی۔ "ہے پربھو تیری لیلا نیاری ہے تو نے گوروجی کو اپنا خاص جمدوت بنایا!"

گوروجی نے یہ کام ہزاروں سال سے جاری رکھا ہے اس لئے ان کا سزا کا نظریہ تو اچھا خاصہ فلسفہ بن گیا۔ مگر مولوی صاحب بھی ان سے کچھ پیچھے نہیں رہے "گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں" آخر قبر میں بھی تو فرشتے گرز لے کر پہنچیں گے ہی۔ کیوں نہ بچے کو ابھی سے ایسی سزا کے لئے تیار کیا جائے۔

ہمارے اکثر گیت، ہمارا مذہبی ادب ایک غمگینی لئے ہوئے ہے۔ یہ ادب بالغوں کا ادب ہے یہ ادب ان زندگیوں کا ادب ہے جن پر مصیبتوں کے سائے گہرا ہونا شروع ہو گئے ہیں یہ ادب صبح کے سہانے وقت کی راگنی نہیں۔ یہ جھٹپٹے کے درد بھرے الاپ ہیں۔ مجھے ابھی

تک دوپہر کے وہ جھکڑ یاد ہیں جب باہر دوزخ کا منہ کھلا ہوتا تھا۔گرم لوئیں دنیا کو بھسم کرنے پر تلی معلوم ہوتی تھیں اور ہم بند دروازوں کے اندر اماں جان کے پاس لیٹے ہوتے تھے دوپہر کی روشنی چھنتی ہوئی کانپتی ہوئی اندر آیا کرتی تھی اس جھٹپٹے کے عالم میں اماں جان ایک گیت گایا کرتی تھیں۔

چھپ جا چھپ جا تو میری جان اب گرزوں والے آئے ری

ہم بچے اکثر آپس میں بیٹھ کر عذاب قبر اور منکر نکیر کے گہرے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے زندگی کی ابھی ابھی پھوٹتی ہوئی دھارا میں عجب تلخی سی ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔اور اس کے بعد مدرسے کی مار دھاڑ! ضرور یہ ایک تربیت تھی اسی آنے والے عذاب کے لئے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے تعلیمی ضبط اور روحانی تربیت کا تو بنیادی اصول ہی ازلی گناہ کا عقیدہ تھا۔حضرت آدم نے پہلے گناہ کا خمیازہ خود تو بھگتا ہی تھا مگر اس کا بار اولادِ آدم پر بھی پڑا۔ان کے شانوں پر نہیں بلکہ اسکولی زبان میں بچوں کی ہتھیلیوں پر اور مکوں کی شکل میں پشت پر۔اس عقیدے کے مطابق انسان میں ابھی تک شیطان حلول کئے ہوئے ہے۔اس زمانے کے راہب استادوں کا منطق کچھ اس قسم کا تھا اور یہ یاد رہے کہ ان کی منطقیانہ روایات بالواسطہ ارسطوئے یونان کے منطق سے وابستہ تھیں اس لئے اس میں زیادہ شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔مار کے آگے بھوت بھی ناچتا ہے۔شیطان بھوت پریت کی برادری کا شاہکار ہے اس لئے شیطان مار کے آگے ضرور ناچے گا۔اس لئے اگر بچے کو پٹائی کے ایک باقاعدہ کورس سے گزار دیا جائے۔ایک روحانی منضج و مسہل کے مکمل نظام سے تو اس پر سے اس ازلی دھبے کا نشان مٹ سکے گا۔اس عقیدے کے سب سے بڑے حامی سینٹ آگسٹین کی سب سے پہلی دعا مدرسے میں پٹائی کے متعلق ہے اپنے اعترافات میں لکھتا ہے "خدایا۔تو ہی میرا مددگار اور محافظ ہے۔تجھی سے میں نے بچپن میں دعائیں مانگی ہیں۔اور ایسی گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں کہ ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کہیں زبان کے ریشے تانت کی طرح ٹوٹ نہ جائیں۔ابھی میں بہت چھوٹا سا تھا جب میں نے بڑی ہی الحاج و زاری

سے دعا مانگی تھی کہ خدایا مجھے مدرسے کی مار سے بچانا۔" "اور جب تو نے میری التجاؤں اور میری گریہ وزاری کو نہ سنا تو میری پٹائی پر جو میرے لئے دنیا بھر کی سب مصیبتوں سے بڑھ کر تھی۔ میرے بزرگ میری ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ ہاں۔ ہاں۔ میرے ماں باپ بھی مذاق کرتے تھے"

ہاں تو ان عیسائی ولیوں کو استادوں نے جی بھر کر پیٹا ہے۔ اور ممکن ہے اسی پٹائی کی وجہ سے ہی وہ اتنے اونچے روحانی درجے طے کر گئے۔ مگر تھے قسمت کے ولی۔ مار سبھی نے ایک جیسی کھائی۔ معمولی بچے اسکولی درجوں میں مارک ٹائم کرتے رہے اور یہ لوگ ولایت کے درجے طے کر گئے۔

البتہ بعض بعض ولیوں کو یہ سودا کافی مہنگا پڑا۔ ایک ولی کو اُستاد روزانہ پیٹتا تھا قصور ہو نہ ہو سزا روزانہ ملتی تھی۔ بچہ پٹائی کے لحاظ سے اچھا خاصہ سرمایہ دار ہوتا جا رہا تھا خرچ نہ ہو تو روزانہ کی آمدنی پونجی میں شامل ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح بے قصور سزا اکٹھا ہوتی رہتی تھی جب کبھی ضرورت پڑی تو حساب اس میں سے چکا دیا۔ اُدھر استاد بھی کل کی سزا کے قرض سے آج ہی سبکدوش ہو جاتا تھا اسے کہتے ہیں معاملے کی صفائی۔

اور ولیوں کے ساتھ تو معاملے ایسے ہی صاف ہونا چاہئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اگرچہ یہ فلسفہ ازلی گناہ کے بلند پایہ عقیدہ پر استوار کیا گیا تھا تاہم بعض ولیوں کے دل بچپن کی کمزوری کی وجہ سے اکثر اس عقیدے سے ڈگمگا جاتے تھے۔ آگسٹین لکھتا ہے " خداوندا۔ بچپن میں تیرے فضل وکرم سے مجھ میں قوت حافظہ یا ذکاوت کی کوئی کمی نہ تھی۔ تو نے میری بساط کے موافق مجھے یہ نعمت فراوانی سے عطا کی تھی۔ مگر ہم بچوں کے دل تو بالکل کھیل پر لگے رہتے تھے۔ اس قصور پر ہمیں وہ استاد مارتے تھے جو خود بھی کھیل کم پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ بالغوں کی بیکاری بھی مصروفیت ہی اور جب بچے ان کی پیروی کرتے ہیں تو وہی بالغ اُنھیں پیٹتے ہیں۔ خدایا ان بچوں کے لئے کسی کے دل میں رحم نہیں آتا۔ اور نہ ان لوگوں ہی پر جن کی ایسی ذہنیت ہی"

بہر حال یہ تو تعلیم کے مذہبی نظریہ کے شاخشانے ہیں۔ ان کا مقصد بچے کو آخرت کے لئے تیار کرنا ہے اس کے عذاب و ثواب کے لئے روحانی اور جسمانی طور پر تربیت دینا اس لحاظ سے اسکولی سزا و جزا ایک ٹکڑا ہے اس عالمگیر فلم کا جو کائنات کے اسٹیج پر کھیلی جا رہی ہے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ تعلیم کا یہ نظریہ ہمیشہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ہر ملک ہر قوم میں مقبول نہیں رہا۔ اور پچھلی صدی سے تو پرانے قسم کی تعلیم کی بنیادوں میں پانی مر رہا ہے۔ نئے مقاصد، نئے طریق ایجاد ہو رہے ہیں۔ مگر ایک حد تک ہمارے مدرسوں میں ابھی تک خوف اور استبداد۔ جبر و اکراہ کا دور دورہ رہا ہے۔ اور ہے۔ ہمارے نا تجربہ کار نئے بھرتی ہوئے استاد جنھوں نے ابھی تعلیمی کوڈ میں سزا کے متعلق احکامات نہیں پڑھے، ہاتھ کے ڈر میں یقین رکھتے ہیں اور تجربہ کار استاد آنکھ کے ڈر، پر ایمان لا چکے ہیں۔ اور کچھ غور و فکر کرنے والے لوگ تو استاد کے پورے جسم کو ایک گھومتی گھماتی۔ چلتی پھرتی، مجسم آنکھ، دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُستاد کہیں ہو مگر بچے کو ہمیشہ احساس ہونا چاہیئے کہ استاد کی آنکھ اسی پر ہے۔ اگر بچے کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے تو اُستاد کی بوٹی بوٹی دیکھتی ہے یا دیکھ سکتی ہے یہ تجویز ضرور اُستادوں کے کسی بالغ نگاہ پیر و مرشد نے پیش کی ہے یہ صفت اُستاد کو روحانی طاقتوں کے کتنا قریب لے جاتی ہے!

اس وحشت پسندی اور خوف کی وجہ کیا ہے! شاید ہم بچے کو ایسی سماج کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں جہاں ایسی اقدار کا ہی راج ہے۔ جہاں کا نظام فاتح اور مفتوح۔ ظالم اور مظلوم۔ ضارب اور مضروب کی طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے۔ تو گویا اسکولی زندگی زندگی نہ ہوئی زندگی کے لئے تیاری ہوئی۔ اس کا بچپن کا زمانہ اپج اور اُٹھان کا زمانہ ہے۔ خوشی اور مسرت کا زمانہ ہے۔ ہم اسے آئندہ زندگی کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ ایک کلولیں کرنے والے معصوم کو کالی دیوی کے مندر پر قربان کر رہے ہیں کیا آئندہ زندگی اتنی مسرت انگیز ہے کہ اس کے لئے بچپن کے عزیز لمحوں کو تلخ کر دیا

جائے۔ ہم زندگی کے اُبلتے ہوئے شیریں چشمے میں زہر گھول رہے ہیں۔ ہم زندگی کے دلفریب ساز کے تاروں کو برابر کسے جا رہے ہیں۔ اس امید پر کہ کبھی یہ بس تریاق بن جائے گا۔ اور کبھی ان تاروں سے ایک روح بخش نغمہ نکلے گا۔ مگر کیا کبھی زہر بھی تریاق بنا ہے؟ کیا کبھی ٹوٹے ہوئے تاروں سے بھی راگنیاں نکلی ہیں؟ ایک سخت گیر زمیندار کی طرح جو کسان کے بھرے ہوئے کھلیان کو آگ دیدے اور اسے بے دخل کر کے دوسری زمینوں کی طرف دھکیل دے۔ ہم نے بچپن کے لہلہاتے باغ کو اجاڑ دیا اور اس کے بعد بچے کو اس سماجی صحرا کا راستہ دکھا دیا جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔ ہم موجودہ مسرتوں کو آئندہ منفعتوں کے لئے سستے داموں بیچ رہے ہیں۔ اور اگر اس بچے کے لئے کوئی آئندہ ہی نہ ہو۔ اگر وہ کل اللہ کو پیارا ہو جائے (آپ کو تو شاید پیارا نہیں) تو آپ کی اس دور اندیشی کا کیا نتیجہ ہوا۔ آپ نے ایک موہوم اُدھار کی امید میں ہاتھ کی نقدی کو بھی کھو دیا۔ آپ نے موجودہ حقیقتوں کو مستقبل کے خواب پر نچھاور کر دیا۔

تشدد اور سخت گیری کا یہ دور ہمارے ہاں ہی نہیں اور ملکوں میں بھی خاص طور پر ولایت کے اسکولوں میں جاری تھا اور اب بھی ہے۔ ولایت میں تو ابھی پچھلی صدی میں ہر جماعت کے انچارج دو استاد ہوتے تھے۔ ایک پڑھاتا تھا اور دوسرا بید لئے پچھلی طرف تعلیمی پہرا دیا کرتا تھا گویا بچے کوئی مجرم تھے جو اس تعلیمی عدالت میں جبراً پیش کئے گئے تھے۔ آج کل تو استادوں میں مداری کی سی چابک دستی آ گئی ہے، بہ یک وقت ہانک بھی سکتے ہیں اور چارہ بھی کھلاتے جاتے ہیں۔ اُن دنوں یہ کام آسان نہ تھا۔ صنعتی انقلاب ابھی ابھی ہوا تھا۔ مشین کی برکات۔ میکانکی پیداوار۔ کارخانہ داری، حساب سے پیداوار، میں عقیدہ زور پکڑ رہا تھا۔ انفرادی طور پر پیداوار خلاف سائنس تھی پس انفرادی طریق پر تعلیم بھی خلاف اصول قرار دی گئی۔ بچوں کی تعلیمی پیداوار، بھی میکانکی پیمانہ پر ہونا چاہیے اس لئے یہ بھیڑوں کا گلہ یعنی جماعت کے سکشن کئی کئی سو کے ہوتے تھے۔ اور آپ خوب

جانتے ہیں کہ جب مال کی کھپت کارخانہ داری کے اصول پر تیار کی جاتی ہے تو تقسیم کار کا اصول لازمی نہیں لابدی ہو جاتا ہے لیکن میکانکی نظام کے بد نتائج یہاں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جوں جوں "تعلیمی مقدار" بڑھتی گئی معیار گھٹتا گیا۔ سزائیں زیادہ ہوتی گئیں اور ضبط کم ہوتا گیا۔

یہ تو نئی طرز کے ابتدائی مدارس کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ولایت کے مشہور و معروف پبلک اسکول ہیں۔ ان کی تعلیمی دھاک تو شاید ساری دنیا میں نہ بیٹھی ہو لیکن ان کی مار کی دھاک ولایتی طلبار کی پیٹھ پر کیا ایک دنیا کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب ایک کھلنڈرے بچے نے شرارت کی تو ایک ولایت کے پڑھے ہوئے اُستاد نے آنکھیں نکال کر کہا تھا کہ میں تمھیں عین ولایتی پبلک اسکول کی شاندار پُرانی روایات کے مطابق بید لگاؤں گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ولایتی اور شاندار کی جھنکار سُن کر بچے نے سر ورِ پشتِ تسلیم ایک دفعہ تو خم کر دی ہو گی۔

ان ہی شاندار ولایتی روایات کے مطابق آرنلڈ رگبی کا مشہور ہیڈ ماسٹر اپنے طلبار کو سزا دیا کرتا تھا۔ اور ان میں عیسائیت کے ایک سچے پیرو کا عجز اور انکساری ٹھونک ٹھونک کر بھرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ بقول برٹرنڈ رسل ایسے روحانی لحاظ سے تربیت یافتہ طلبا جب فوج یا سول سروس میں بھرتی ہو کر ہندوستان آئے تھے تو پبلک اسکول کی شاندار روایات کے مطابق ہندوستانیوں کے بھی بید لگاتے تھے۔ آرنلڈ کے عمل کا ردِ عمل پنجاب میں نہایت کامیابی سے کیا گیا۔ اسی لئے شاید وہاں کے چند قائدین نے پچھلے سال ولایتی پبلک اسکولوں کے نمونے پر چند ادارے کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

سچ پوچھیئے تو آرنلڈ کے شاگردوں کا ایسا کچھ قصور بھی نہ تھا۔ وہ اپنے دبے ہوئے اور مجروح رجحانات کا اس طرح کھلے بندوں مظاہرہ کرتے تھے۔ سچ ہے پانی

رجحان کی طرف مڑتا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے۔ اور کمہار کا جب کمہاری پر زور نہیں چلتا تو گدھے کے کان اینٹھنے لگتا ہے اور بالخصوص جب گدھا ایسا ہو کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور کوئی دولتی بھی نہ جھاڑ سکتا ہو۔ آپ اخلاقی طور پر لاکھ اس کی مذمت کریں عالم نفسیات جس سے بڑا فیلسوف شاید ہی آج تک دُنیا نے پیدا کیا ہو فوراً اس کے دلائل و براہین دینے کی کوشش کرے گا کہ صاحب یہ تو اس کے دبے ہوئے رجحانات کا مظاہرہ ہے۔ یہ اس کے کاٹنے چیرنے پھاڑنے کی فطری جبلت کا کرشمہ ہے (اور پھر ذرا غور سے گدھے کے کانوں کو بہ نظر غائر مطالعہ کرکے اور اپنی دو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اور پھر گھن کھا کر چھوڑ دینے پر) مجھے تو اس میں رجحان صاف نظر آتا ہے یعنی مار کھانے کا رجحان۔ مثلاً اس کے کان تو دیکھو۔ ارتقائی لحاظ سے ان کو سریحاً کھینچنے کے لئے بنایا گیا ہے اور پیٹھ تو دیکھو کس قدر چوڑی چکلی۔ یہ ہے ہی لٹھ بجانے کے واسطے۔ گدھا کیا ہے مار کھانے کی نشانی ہے۔ بس اب تو معاملہ خوب صاف ہو گیا۔ ایک طرف فطرت کا ودیعت کیا ہوا رجحان ہے مارنے کا اور دوسرے میں مار کھانے کا۔ بھئی جب دونوں راضی تو تم بیچ میں قاضی بننے والے کون۔ لیکن اگر کوئی گدھے کے دل سے پوچھے اور دل تو شاید اس کا بھی ہوتا ہوگا۔ شاید اس ڈراما میں وہ اپنا پارٹ بدل لینا چاہے۔ اگر آقا کو ہاتھ پاؤں باندھ کر میدان میں پھینک دیا جائے اور گدھے کو کھلے بندوں اجازت ہو تب؟ بہت سے اساتذہ سزا کے اسی نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں

اگرچہ یہ نفسیاتی موشگافیاں اسی صدی سے شروع ہوئی ہیں اور خدا جانے اس نے دنیائے تعلیم میں کتنی شرانگیزیاں کی ہوں گی۔ مگر شکر ہے کہ ہنوز ہندوستانی اساتذہ کے کانوں تک یہ بات نہیں پہنچی کہ مغربی علما نے ان کے جذبات اور رجحانات پر صاد کر دیا ہے ویسے عملی طور پر تو وہ ایک زمانے سے اِس استاد کے دل کو لگنے والے اور بچے کے دل کو آگ لگانے والے نظریئے پر ایمان لاتے چلے آئے ہیں۔

مطالعۂ لغت

(از جناب لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی)

اگر کہا جائے کہ کتاب کا مطالعہ مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا بلکہ شاید یہ کہا جائے کہ اس میں بتانے کی کونسی بات تھی سبھی جانتے ہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ لغت کا مطالعہ بہت زیادہ مفید اور بہت زیادہ دلچسپ مصروفیت ہے، تو اسے کم سے کم ایک مذاق ضرور سمجھا جائے گا، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ لغت کا مطالعہ ایک نہایت ہی مفید اور بے حد دلچسپ شغل ہے اور تصنیف و تالیف سے لگاؤ رکھنے والے کے لئے تو ناگزیر ہے

سوچئے گا تو دنیا کی سب سے پہلی تصنیف لغت ہی کو قرار دینا پڑے گا۔ آدم جس طرح سب سے پہلے انسان تھے اسی طرح سب سے پہلے لغت نویس بھی تھے، توراۃ میں مذکور ہے کہ آدم جب جنت سے دنیا میں پھینکے گئے تو سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ جانوروں کے نام رکھنا تھا، قرآن میں آیا ہے کہ ہم نے آدم کو اسمار کا علم دیا۔ لیکن آدم کی لغت نویسی کو اپنے طریقۂ تحریر پر قیاس نہ فرمائیے، یہ طریقہ تو فنون کے وجود میں آچکنے کے بعد کی چیز ہے۔

الفاظ کا استعمال ہر شخص کرتا ہے، لیکن جو شخص الفاظ سے جتنا واقف ہوتا ہے، اُن سے اتنا ہی کام لے سکتا ہے۔ ہر زبان میں ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ اور مختلف اسلوب ہوتے ہیں، لیکن کوئی شخص اگر موقع پر موقعے کا لفظ نہیں بولتا تو اپنا مطلب فوت کر سکتا ہے، ایک وکیل مقدمہ ہار سکتا ہے، ایک دوکاندار گاہک کھو سکتا ہے اور ایک لیڈر لی تجویز گر سکتی ہے، وغیرہ۔ چنانچہ میرا عقیدہ ہے کہ لفظوں کو صحیح طور پر جاننا ہر خاص و عام کی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔

رسکن نے کہا ہے کہ تم الفاظ کو صحیح استعمال پر اسوقت تک قادر نہیں ہو سکتے جب تک
تم ان کی رُوح سے آشنا نہ ہو۔ بنا بریں الفاظ کو جاننا ایک بات ہے اور انکی روح
سے آشنا ہونا دوسری۔ اور ایک انشا کے باب میں میرا خیال ہے کہ الفاظ کے صحیح استعمال پر قادر
گویا لفظوں سے محبت کرنا ہے۔

کتاب کے الفاظ کو ہم ان کی محدود حیثیت میں جان سکتے ہیں کیونکہ کتاب کے اندر
لفظ پوشش و لباس میں لپٹا ہوتا ہے، الفاظ کی روح سے آشنا ہونے کے لئے لغت
کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، لغت کے اندر الفاظ کے جملہ معانی اور اُسکے مفہوم کے
تمام پہلو ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم ان کی روح معانی کو عریاں دیکھ سکتے ہیں
لغت کے اندر جتنے لفظ درج ہوتے ہیں تمام اچھے اور برے، وہ سب محبت کئے
جانے کی چیز ہیں۔ بالخصوص کوئی اہل قلم اور صاحب مطالعہ ان سے الفت کئے بغیر نہیں
رہ سکتا۔ اس ذخیرۂ الفاظ سے اسے جتنی کم محبت ہوگی وہ اسی قدر اپنی زبان و ادب
کی روح سے بیگانہ رہے گا، اور اسی طرح اپنے مقصد انشا کے ساتھ اتنا ہی غیر مخلص۔

ایک طالبعلم کے اسکول سے غوطہ لگا جانے کی طرح اگر ہم کبھی کبھی تھوڑا سا وقت
نکال کر کتب لغت کا مطالعہ کریں تو اس تھوڑے سے وقفے میں بھی ہم بڑے بڑے
طلسمات کی سیر کر سکتے ہیں۔ اپنی فرہنگ کا مطالعہ طلسم ہوشربا کے مطالعہ سے زیادہ دلچسپ
تمدن عرب کے مطالعہ سے زیادہ سبق آموز، فلسفۂ جذبات کے مطالعہ سے زیادہ علم
آفریں ہو سکتا ہے، جواہر کی یہ ردیف دار فرہنگ ایک متحرک کر دینے والا رومان ہوتا
جیسے معدنی اشیا کی میوزیم کی فہرست کسی سفرنامے سے بہتر معلم ثابت ہوتی ہے۔

لغت کو اگر دیکھئے تو ایک ردیف دار کائنات کے سوا کیا ہے؟ تمام کتابوں سے
اعلیٰ اور بڑی کتاب ہے کہ پچھلی تمام کتابیں اسی میں سے نکلیں اور آئندہ کی بے شمار کتابیں
بھی اسی کے اندر سے نکالی جائیں گی۔ لغت میں مندرج ردیف وار الفاظ حقیقت میں قوی

زندگی و ذہنیت کی وہ تصویر ہے جیسی کہ ڈاکٹروں کے مطب میں انسانی بدن کی تشریحی تصویر
ڈھانچہ ٹنگا رہتا ہے۔ لغت میں درج الفاظ کے اندر اس زبان کو بولنے والی قوم، اسلاف
و اخلاف کی اور ایک حد تک دوسر قوموں کی بھی، ذکاوت ذہانت اور طبیعت و فطرت
جلوہ گر نظر آتی ہے۔ لغت میں پوری قوم کی نسلوں کے عہدے اور مشقیں، رنج اور راحتیں
محفوظ ہوتی ہیں، کسی زبان کی لغت اس زبان کو بولنے والی قوم کی اجتماعی اور انفرادی
ذطانت (جینیس) کا خزانہ کہا گیا ہے۔

لغت کا مطالعہ دو جہت سے کیا جا سکتا ہے، ایک تو الفاظ کے اندر معنی و مفہوم
پیدا ہونے کی طلسم آفرینی کے پہلو سے دوسرے اس کے غیر محدود علمی و تاریخی افادے
کے رُخ سے۔ ایک میں ہم کھو جا سکتے ہیں اور دوسرے سے بے اندازہ مستفید ہو سکتے ہیں۔

ہماری زبان کی عمر زبان کی حیثیت سے زیادہ نہیں، اور اسی لئے ہماری فرہنگ بھی
مختصر ہے، اور جس قوم کی فرہنگ مختصر ہو وہ مسلمہ طور پر حصول علم میں پیچھے رہتی ہے، او
معاملات زندگی میں اسی حد تک سوچ سکتی ہے جس حد تک اس کی لغت کے الفاظ ساتھ د
سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک قدرتی طریقہ ہے کہ کم مایہ زبانیں کسی دوسری متمول زبان سے استفا
کر کے متمول بنتی رہتی ہیں، جس طرح آج انگریزی سے استفادہ کر کے ہندوستانی زبانیں متمول
بن رہی ہیں اور گذشتہ عہد میں فارسی سے مستفید ہو چکی ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس وقت
ہم علمی فنی اور سیاسی مسائل میں جو کچھ سوچ رہے ہیں اسے ہمارا قومی ذہن دراصل انگریزی
میں سوچتا ہے۔ ہم نے اگر انگریزی حاصل نہ کی ہوتی تو یقیناً غور و فکر بھی اس سطح پر نہ ہوتے جہاں
آج نظر آ رہے ہیں۔

لیکن کم مایہ زبان کی لغت میں بھی اس کی بولنے والی قوم کی زندگی زندہ ہوتی ہے، او
کہیں کہیں دوسری مرز و بوم کی زندگی بھی بولتی چالتی دکھائی دیجاتی ہے۔

جس وقت ہم اپنی زبان کی لغت کا مطالعہ کرنے بیٹھیں گے تو نظر آئے گا کہ ہر لفظ

کسی عندیے یا خیال کی تصویر یا کسی احساس کا نقش ہے، ایک ایسے احساس کا جو پہلے ایک عندیہ تھا اور پھر بے شمار انسانوں کا احساس بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔ عندیات اور احساس کا یہ خزانہ ہمارے اسلاف کے اور ہمارے جسم و جان ، بلکہ کسی حد تک انسانیت کے جسم و جان کی مشقتوں کا ماحصل اور عطر ہے۔ اپنی لغت کے اندر ہم اس زندگی کے پورے سلسلے کو زندہ دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے مقدس وطن کی پاک ہوا میں سانس لے چکی ہے اور لے رہی ہے۔

دوسری قوموں اور مرز و بوم کی زندگی ایک زبان کے اندر کس طرح جھلکتی ہے اس کا نقشہ دیکھنے کے لئے ان دو لفظوں کی حقیقت پر توجہ کرنا کافی ہوگا۔

ہماری زبان میں ایک لفظ ہے " شاخسانہ" یہ فارسی زبان کا لفظ ہے، صحیح " ساخسانہ" تھا مگر ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی " شاخسانہ" بن چکا تھا۔ ایران میں اس کے معنی دھونس دے کر وصول کرنے والا اور دھونس دے کر وصول کرنا تھے۔ اس لفظ کے وجہ دیگر نے کی وجہ یہ ہوئی کہ ایران میں فقیروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے ہاتوں میں شاخ یعنی سینگ اور شانے کی ہڈی ہوتی تھی اور بھیک لئے بغیر ٹلتے نہ تھے۔ اس گروہ کا مثنیٰ ہمارے یہاں بھی چمڑوں کی جماعت ہے۔ اب یہ لفظ جب ہماری زبان میں آیا تو نہ معلوم کس پراسرار طریق پر خواہ مخواہ اس کا مفہوم عیب، خرابی، اور تکرار وغیرہ ہوگیا۔

دوسرا لفظ کوتوال ہے یہ خالص ہندی لفظ ہے اور کوتہ یعنی وہ جگہ جہاں اسلحہ اور بندوقیں اکٹھا کر دیتے ہیں اور وال، دو لفظوں سے مرکب ہے۔ بعض کے نزدیک کوتہ نہیں بلکہ کوٹ بمعنی حصار یا قلعہ ہے۔ وال کے ہندی معنی صاحب کے معلوم ہی ہیں۔ بہرحال یہ ہندی لفظ ایران جا پہنچا اور اس کے وہاں پہنچ جانے کا راستہ و طریق بھی یقیناً دلچسپ ہوگا

مقامات کے نام اپنے اندر ایک پوری تاریخ لئے ہوتے ہیں جس سے بہت سے معاشری حقائق کا استنباط کیا جاتا ہے اور ایک اچھے لغت میں یہ خزانہ ہمارے سامنے

بکھرا ہوتا ہے۔ چند ناموں کی وجہ تسمیہ پر غور فرمایئے۔

گیا اگر آپ نے دیکھا نہیں تو نام ضرور سنا ہوگا کہ صوبہ بہار میں ایک قدیم شہر ہے جو بودھ مت والوں کی نظر میں بہت مقدس جگہ ہے اور ہندوؤں کا بھی بڑا تیرتھ ہے، صرف ہندو نقطۂ نظر سے گیا کی وجہ تسمیہ کے متعلق دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ راج رشی گوئی نے یگّ کرکے بہت سی گائیں برہمنوں کو پن کیں، اور اس سے دیوتا خوش ہوئے تو گیا کا اُن کے نام سے منسوب ہونا مقدر کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس شہر کو گیاسُر سے نسبت ہے جو وشنو بھگوان کے بہت بڑے بھگت گزرے ہیں۔ یما یعنے موت کے دیوتا نے وشنو بھگوان کو گیاسُر سے اتنا خوش دیکھا تو اس خیال سے کہ گیاسُر کی روح قبض کرنا دشوار ہوگا، وشنو بھگوان کو توجہ دلائی، اور وشنو بھگوان نے ایک چٹان پھینک کر گیاسُر کو ختم کر دیا۔ مگر چونکہ گیاسُر کی بھگتی زبردست تھی اس کی بنا پر وشنو بھگوان نے گیا کو تمام دیوتاؤں کا استھان قرار دے دیا۔ اور اس مقام کو یہ فوقیت بخشی جو شخص وہاں تیرتھ کو آئے گا اور شرادھ یا پنڈ دان کرے گا اس کے اسلاف کی آتما کو وشنو پد میں جگہ ملے گی۔ بعد میں اہلیا بائی نے گیا میں وشنو پد کا مشہور مندر تعمیر کرایا۔

خاندیس کا نام سن کر آپ کا خیال اس طرف ضرور جائے گا کہ یہ پٹھانوں کی یا ان کی بسائی ہوئی بستی ہوگی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک بڑا اور بھیلوں کا علاقہ ہے۔ جسے بھیلوں کے ایک قبیلے سے جس کا نام کھاندھا نسبت ہے، ظاہر ہے کہ یہ قبیلہ بھیل قوم میں مقتدر اور با اثر ہوگا کہ اس کے نام سے سارا علاقہ موسوم ہوا۔ بعد میں تلفظ کی آسانی کے خیال سے مسلمانوں نے اُسے خاندیس کہا اور اب اسی نام سے معروف ہے۔

پنجاب کا پرانا نام برھماورت ہے، کیونکہ شروع میں آریا نسل کے پروہت یعنی برہمن وہیں رہے تھے اور ہندوستان کا پرانا نام آریاورت ہے، اس لئے کہ آریا نسل سارے شمالی ہند میں پھیل گئی۔ اس کے بعد پورا ہندوستان بھارت ورش کہلایا، کیونکہ بھرت بہت

مشہور راجہ گزرا ہے۔ جس کا راج بہت بڑا تھا۔ اب پرانا نام زیادہ لوگوں کو یاد ہے
اب چند ایسے الفاظ پر بھی نظر ڈالئے، جن کو ہماری تاریخ معاشرت سے تعلق ہے
اور جن کے مفہوم سے ہندوستانی کی دو بڑی جماعتوں کے باہمی میل جول اور تعلقات
پر روشنی پڑجاتی ہے۔

کتھک سے ہماری مراد مرد ناچنے والے سے ہوتی ہے جو اپنے فن میں کامل سمجھا جاتا
ہے اس لفظ میں یہ مفہوم کس طرح پیدا ہوا۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ ہندی میں ایک لفظ ہے کتھا
جس کے معنی وعظ و بیان کے ہیں۔ ہندی زبان میں مغل کے ساتھ حرف کاف بڑھا دینے سے
اسم فاعل بن جاتا ہے۔ چنانچہ کتھک کے اصل معنی ہیں کتھا کہنے والا، مدح کرنے والا۔
اب چونکہ فن وعقل کا مقصود اظہار ہے، اور ہندو مذہب میں شوالوں کی مورتیوں کے سامنے
رقص کے ذریعے بندگی وعبودیت کے جذبات کا اظہار و بیان ہوتا ہے، اس لئے رقاص
کو کتھک کہا گیا۔ لیکن اب اس لفظ میں بندگی وعبودیت کے اظہار کا مفہوم نہیں رہا۔ اب ہم
صرف ناچنے والے مرد کو کتھک کہتے ہیں، حالانکہ رقص عبودیت مندروں میں اب بھی برابر
ہوتا اور کتھک آج بھی رقص کرتا ہے۔

آپ اکثر بولتے اور سنتے ہیں "میاں ہٹاؤ اس کھٹراگ کو" اور "کہاں کا کھٹراگ لے
آئے"۔ یہ لفظ کھٹراگ ہر ایسی بات کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے ہمیں الجھن ہوتی
ہو، جو ہماری سمجھ میں نہ آئے، جو اصل معاملے سے متعلق نہ ہو وغیرہ۔ اصل لفظ غور کیجئے تو
معلوم ہوگا کہ کھٹ سنسکرت میں چھے کے عدد کو کہتے ہیں اور راگ کے معنی معلوم ہیں۔
یعنی چھے راگ۔ کھٹراگ ایک راگ کا نام تھا جو چھے راگوں یعنی بھیرَوں، مالکوس، سری
میگھ، ہندول اور دیپک کو ملا کر گایا جاتا تھا۔ پھر بعد میں سری راگ کے پانچویں پتر کو
کو بھی یہی نام دیا گیا اب معلوم نہیں کہ بہادر شاہ ظفر اس مخلوط راگ کے شیدا تھے، یا سری راگ
کے پانچویں پتر کے، یا یہ دونوں اصل میں ایک ہی تھے۔ مگر ظفر کے شوق کو دیکھ کر کہا جا سکتا

ہے کہ یہ راگ بہت اعلیٰ و پسندیدہ تھا۔ ظفرؔ کا مصرعہ ہے " نیک سن کر ہی تیرا کھڑاگ آئے ہم تو ہیں۔ اس لفظ میں جھنجھٹ اور جھمیلے کا مفہوم پیدا ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ علم موسیقی میں اعلیٰ مہارت نہ رکھنے والوں کے لئے ایک ملے جلے راگ کی قدر کرنا مشکل تھا، اس لئے ان کم فہموں نے مذاق یا طنز کے طور پر ہر ایسی بات کو کھڑاگ کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس میں بکھیڑے اور تکرار کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا اور وہ بھی کئی محاورے بن گئے، راگ کی حیثیت سے تو اس کا اب نام بھی نہیں سنا جاتا، گانا تو رہا ایک طرف، مگر یہ لفظ عام و خاص کی زبان پر ہے۔

ہم میں بہت ایسے ہوں گے جنھوں نے خاص کر دوالی کے تہوار پر صابونی نام کی ایک مٹھائی کھائی یا دیکھی ہوگی، اس مٹھائی کا سفید رنگ اور گول شکل دیکھ لامحالہ صابن کی طرف خیال جاتا ہے۔ کیونکہ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک کپڑے دھونے کا صابن گول اور سفید ہی بنتا تھا، اس نام پر توجہ کیجئے گا تو یہ چیز ضرور سامنے آئے گی کہ صابن مسلمانوں کے ساتھ آیا، جیسا اس کے نام سے ثابت ہے۔ اس لئے یہ مٹھائی مسلم عہد کی یادگار ہے، اگرچہ بنتی ایک ہندو تہوار پر ہے۔ پھر شاید ہمارا ذہن خود صابن کے متعلق سوچنے لگے گا کہ صابن سے ہم نہانے کا کام نہ لیتے تھے اس کام کے لئے ہم ابٹن استعمال کرتے تھے اس کا یہ استعمال انگریزی عہد کی چیز ہے، اور اس کا غسل میں استعمال ہونا اس کی شکل اور رنگ و بو میں نفاست پیدا ہونے کا ذمہ دار ہے۔

لفظ کوتوال پر آپ اوپر نظر ڈال آئے ہیں۔ کوتوال کی نسبت سے کوتوالی بنا اور در کوتوالی کے ساتھ چبوترے کا لفظ شامل ہوا، اور پھر چبوترہ خود کوتوالی کے معنی میں مستعمل ہو کر چبوترہ چڑھنا محاورہ بن گیا۔ جس کا مفہوم رپٹ لکھانا رہتی ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ پچھلے زمانے میں کوتوالی کی عمارت میں چبوترہ خاص چیز تھا۔ شاید کوتوال چبوترے بیٹھ کر ہی فرض منصبی ادا کرتا ہو۔ اس لئے لفظ چبوترہ اور انصاف یعنی پولیس کا انتظام

مترادف لفظ ہوگئے تھے۔ میز کرسی آجانے اور نئی عمارتیں بن جانے سے یہ چبوترہ غائب ہورہا ہے، لیکن پرانے تھانوں میں خاصکر مفصلات میں دیوان جی آج بھی چبوتری پر اپنا ڈیکس لے کر بیٹھتے ہیں۔

"کھرا کھیل فرخ آبادی" ایسا جملہ نہیں جو کسی نے نہ سُنا ہو۔ اس کی ترکیب پر نظر کرکے یہی سمجھا جائے گا کہ کھرا کھیل فرخ آباد میں کھیلا جاتا ہوگا۔ لیکن ہم اس جملے کو جس مفہوم میں سنتے بولتے آئے ہیں اس میں کھیل کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ اس سے خوش معاملگی مراد لیتے ہیں۔ اب دیکھئے کس مخفی طریق پر اس کے اندر "اس ہات دے اس بات لے" کا مفہوم آیا کسی زمانے میں فرخ آباد میں ٹکسال تھی اور وہاں کا سکہ سب سے زیادہ کھرا سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج انگلستان میں "ہال مارک" چاندی سب سے زیادہ کھری سمجھی جاتی ہے، اور ہر کھری چیز کے لئے یہ لفظ بولا سکتا ہے۔

شاہنشاہ اورنگ زیب دکن پر فوج کشی کرتا ہے اور اس کی مدت غیر معمولی طور پر طویل ہوجاتی ہے۔ جس کے سبب سے فوج میں ایک بیماری رونما ہوجاتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ایک پھوڑا نکلتا ہے۔ اس کا نام اورنگ زیبی پھوڑا پڑجاتا ہے۔ یہ لفظ آپ کے سامنے اس سارے واقعے کی تاریخ دہرا دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں گے تو یہ نفسیاتی حقیقت ظاہر ہوگی کہ اورنگ زیب کی اس فوج کشی میں عرصے تک گھر اور وطن سے دور رہنے کے باعث لوگ عام طور پر بادشاہ سے بددل ہوگئے تھے، اور اس بیماری کو لوگوں نے اورنگ زیب کی عنایت باور کرکے اُس سے منسوب کردیا۔

محمّد شاہ کے عہد میں کوئی داؤد خاں صاحب حج کو جاتے اور وہاں سے مصری گیہوں بطور سوغات لاتے ہیں، اس بیج سے یہاں زراعت ہوتی اور بڑھتی ہے، وہ گیہوں داؤد خانی نام پاتا ہے

لفظ کناگت پر غور کیجئے تو نظر آتا ہے کہ صحیح کرناگت تھا، اور کرن اور گت سے مرکب

ہے، اکرن نام کا ایک راجہ گزرا ہے اور راگت کے معنی ہیں سامنے آنا۔ شرآدھ کی رسم کسی خصوصیت کے ساتھ ادا کرنے کے باعث اُسے راجہ کرن سے منسوب کیا گیا اور کثرت استعمال سے کناگت بن گیا

لغت کے اندر آپ کی نظر لفظ سابقہ پر بھی پڑے گی۔ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے عربی معنی ہیں پہلا یعنی اگلے زمانے کا۔ اردو میں اس کا مفہوم ہوا اگلی جان پہچان اور اس سے نکلا واسطہ و معاملہ، پھر سابقہ پڑنا وجود میں آگیا۔ اب دیکھئے اس مفہوم کو اصل معنے سے کیا مناسبت رہی۔

عورتوں کی زبان کا ایک محاورہ ہے "شہر شملہ" اسے دیکھ کر ہمارا ذہن فوراً اس پہاڑ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں وائسرائے گرمیاں بسر کرنے جاتے ہیں اور ان کے جلو میں ہمارے بہت سے غمگساروں کو بھی مجبوراً چڑھنا پڑتا ہے۔ مگر اس سے مراد وہ مقام ہے، جہاں "مروت و محبت" مفقود ہو۔ اب آپ اس جستجو پر مجبور رہیں کہ آیا شملے کے لوگ بے مروت ہوتے ہیں یا یہ ایک استعارہ ہے وہاں کی سردی اور برف سے۔

زبان کا زبان کی طرح مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ عام زبان اور اس کی لغت و قواعد سے باہر مقامی طور پر کچھ الفاظ، محاورے، اور مثلیں ہر جگہ کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، اور اس سے بھی ناواقف نہیں کہ جو الفاظ ادب کے اندر داخل ہو جاتے ہیں وہ پھیل بھی جاتے ہیں۔ ہماری زبان میں مقامی تاریخیں اور سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئی گئیں اس لئے یہ مقامی سرمایہ لغت و زبان زبان کا جزو نہ بن سکا، حالانکہ اس کے اندر ہماری تاریخ و معاشرت کے بہت سے نکتے محفوظ تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری لغت نویسی افراد کی توجہ کا نتیجہ ہے جن کی نظر نہ تو سارے ادبی ذخیرے پر محیط ہو سکتی ہے اور نہ ان کو اتنے ذرایعئے حاصل ہوتے ہیں۔ لغت نویسی کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں۔ ایک تو بہت سے لوگوں کا تعاون اور امداد دوسرے پلان یا نقشہ

مثالاً دو لفظ پیش کرتا ہوں۔

"مفتی تحریک" کا لفظ حافظ رحمت خاں کی سوانح عمری میں چند سطروں کے ایک بیان میں آیا ہے یہ تحریک حکومت کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی، اور پرانے اثرات اور اس وقت کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ مگر حیلہ ہاؤس ٹیکس کی مخالفت بن گیا۔ یہ تحریک اپنوں کے ہات سے ٹھنڈی بھی ہو گئی۔

دوسرا لفظ "ولسن گردی" ہے جو ابھی تک کسی حوالے میں بھی نہیں آیا۔ اس لفظ کے وجود میں آنے کی داستان عجیب ہے، مدراس علاقے کے کسی نواب خاندان کے فرد دلاور جنگ احمد اللہ امارت ترک کرکے سیاحت کے لئے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ حج کرتے اور رستے رماتے گوالیار پہنچتے ہیں۔ وہاں محراب شاہ صاحب سے بیعت کرتے ہیں۔ ڈنکا شاہ لقب ملتا اور خرقۂ خلافت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ جہاد کی تحریک لے کر آگرے آتے ہیں اور تمام عمائد شہر معتقد ہو جاتے ہیں، اس وقت ہائیکورٹ آگرے میں تھا اور صدر نظامت میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ وکلاء کے طبقے میں بھی مسلمان مقتدر تھے۔ مسٹر ولسن جج تھی حکومت بدظن ہو گئی اور شاہ صاحب کے چلے جانے کے بعد تمام مسلمان حکام، وکلاء اور عمائد شہر رشوت ستانی کے مقدمے میں ماخوذ ہوتے ہیں اس کا نام "ولسن گردی" پڑتا ہے۔ یہ سب لوگ بالآخر بری ہو گئے۔ لیکن یہ لفظ ایک مدت تک آگرے میں جاری رہا۔

ان چند مثالوں کے مطالعے میں آپ نے اپنی زندگی کی صراحت کے بعض دلچسپ مرقعے دیکھے، اپنی تاریخ کے بعض نکتوں کو ایک ایک لفظ میں محفوظ پایا اور الفاظ کے طلسم زار معانی کی بھی خاصی سیر کر لی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مطالعۂ لغت کے سلسلے میں علم الحروف کا ایک دلچسپ پہلو بھی دیکھ لیں

ہائے مخلوط یا دو چشمی (ھ) دراصل ہم نے ہندی سے لی ہے جو اپنی ذات سے کالعدم ہے۔ مگر دوسرے حروف کے ساتھ مل کر آواز دیتی ہے۔ یہ ہائے مخلوط (یعنی ہا ھ کی مفرد

آواز) سنسکرت میں یا تو وزن کی خاطر زائد آتا ہے یا کبھی ندا یا ظہور کے معنی دیتا ہے اور اس کے ترکیبی معنی آواز کو پرگھٹ یعنی ظاہر کرنے والا یا گانے والے کی آواز کو جانے کے ہو گئے۔

یہ ہائے مخلوط جب حرف گاف کے ساتھ ملتی ہے تو اس کی آواز گھ घ ہوتی ہے جو ناگری حروف میں چوتھا حرف صحیح ہے۔ سنسکرت لغت حرف گھر کا پہلا مفہوم اس آواز سے ہے جو "گھر گھر" کی طرح ہو۔ اور "گھر گھراہٹ" (مطلق آواز) کے معنے جس کے اندر گھنٹے کی آواز کا پہلو بھی ہے اسی سے نکلے۔ اس کے دوسرے معنی گھٹ یعنی لبطون کے ہیں، جس سے "گھڑا" اور پھر "دور" کی مناسبت سے "گھاگرا" وغیرہ بنے۔ گ ग اور ہا ह یہ دو آوازیں مل کر گھ घ کی آوازیں دیتی ہیں۔ گہ کے لغوی معنی گانا اور جانا یعنی روانی کے ہیں۔ پھر اسی سے اصلاحی مفہوم گانے والا یا دیوتاؤں کے گیت گانیوالا پیدا ہو گیا؛ اسی طرح جیسے اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے بیسیوں مفہوم معجزے کی طرح وجود میں آگئے۔ گمن، گم، گونا، جانا، جاترا، وغیرہ کی اصل یہی حرکت ہے، کیونکہ گاف اور جیم ہر زبان میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ مصدر جانا سے گیا ماضی مطلق کا صیغہ اسی قاعدے سے بنا ہے۔ دریا کا چڑھنا اترنا گانے کے اتار چڑھاؤ کا مفہوم اور بال الجھا یا اجڑ جانا کے معنی بھی اسی حرف کا اعجاز ہے۔ گنگا کی اصل بھی یہی حرف مانا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں روانی ہے اور گرہ یا گانٹھ سے سلسلہ جڑ جانے کے مفہوم کا ذمہ دار بھی یہی حرف ہے، اس لئے کہ اس میں تسلسل و روانی پائی جاتی ہے۔

بنابریں، حرف گاف سے جتنے لفظ بنیں اور ان میں روانی یا سُر کی کیفیت کا مفہوم ہو تو وہ اسی اصل پر تصور کئے جائیں گے اور اس سے بنے ہوئے تمام الفاظ میں اصل معنی مفہوم سے نسبت باقی رہے گی۔ مثلاً گج (ہاتھی)، گجر، گدگدی، گرنا، گڑنا، گنڈاسا وغیرہ میں حرکت و روانی موجود ہے؛ اور گیت، گنگری، گرجا، گڑگڑاہٹ وغیرہ میں صدا یا

گانے کی مناسبت باقی ہے؛ اور دریا کے بہنے ہیں چونکہ تری کا مفہوم ہے اس لئے گیلا، گارا وغیرہ بھی اصل سے جدا نہیں ہیں۔

گر ग اور گھ घ معزد دمرکب حرف کے لغوی معنی کی یہ مثالیں اور تصریح یقیناً غیر دلچسپ نہ تھی اب صوتیات کے اس کے مخرج پر بھی غور فرمائیے۔

سنسکرت مخارج کے اعتبار سے یہ دونوں آوازیں کنٹھی یعنی حلقی حروف ہیں لیکن حساً دیکھئے تو گ کے مقابلے میں گھ کھائی میں پڑا محسوس ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے جتنے لفظ بنے یا محاورے پیدا ہوئے ان کے اندر معناً اس حرکت کے خاصے کا مفہوم موجود ہے۔ مثلاً گہرائی نشیب اور ڈھلاؤ کا مفہوم جیسے گھاٹ، گھاٹی، گھاؤ، گھائل گھالنا، اور گھائی وغیرہ میں یا چکر، گولائی اور دور کا مفہوم جیسے گھونگا، گھونگھٹ، گھیر گھنڈی، گھنگرو، گھماؤ، گھونٹنا، گھونسا وغیرہ میں۔ یا گھر گھر (خراٹوں کی آواز) گھڑ گھڑ (مطلق آواز) کا مفہوم جیسے گھٹنا، گھگی وغیرہ میں، یا رگڑ اور خراش کا مفہوم جیسے گھِسنا گھسٹنا، گھیتلا وغیرہ میں، یا زیادتی اور بہتات کا مفہوم جیسے گھنا، گھمسان، گھان، گھمبیر، گھنگھور وغیرہ میں، یا قلت و تنگی کا مفہوم جیسے گھاٹا، گھڑی وغیرہ میں۔ یا لستگی وغفلت کا مفہوم جیسے (دل اور دم) گھٹنا گھمس، گھوراگھن، گھونٹ وغیرہ۔ یا تحدید وانحصار کا مفہوم جیسے گھر، گھٹنا وغیرہ میں۔ یا اخفا، دنیہانی کا مفہوم جیسے گھٹ، گھات، گھن، گھنا وغیرہ میں۔ یا میل اور آمیزش کا مفہوم جیسے گھولنا، گھولوا، گھیچ پچ وغیرہ میں یا ضرب اور چوٹ لگانے کا مفہوم جیسے گھڑنا، گھڑیا وغیرہ میں۔

مثالیں اس کی بے حد ہیں، اور اگر آپ غور اور کچھ توجہ سے دیکھیں گے تو اس حرف سے بنے ہوئے ہر لفظ سے واضح ہوگا کہ ایک حرف اپنی اصل اور مادے اور لغوی مفہوم سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا اور اپنی ہیئت اولیٰ برابر ظاہر کرتا رہتا ہے سی ایک حرف کا طلسم معانی اوپر دی ہوئی مثالوں سے پورا کھل جاتا ہے مثالیں ابھی کثرت

سے ہیں۔ مگر ان مثالوں کے علاوہ ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر سوچئے گا کہ انسانی ذہن و خیال میں یہ حرف آیا کیونکر تو قیاس کیجئے گا کہ یا تو جانور کو ذبح کرتے وقت یا جنگ میں کٹے ہوئے گلے کی گھر گھر کی آواز سن کر آیا، یا آبشار کے گرنے اور اس کی آواز نے سمجھایا یا نرغے میں گھر جانے کے باعث خیال نے اُسے ایجاد کیا کیونکہ اس کے مفہوم میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

میرا یہ مدعا کہ لغت کا مطالعہ نہایت دلچسپ مشغلہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان مثالوں سے واضح اور روشن ہو گیا ہوگا۔ ہرچند استفادے کا پہلو ان مثالوں میں بھی موجود ہے لیکن واقعی علمی افادے کے اعتبار سے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری کتب لغت بہت مایوس کن ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ علم کی انتہا نہیں، اور حصول علم کے لئے ایک انسانی عمر ناکافی ہے۔ ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ جوان رہتی بلکہ جوان تر ہوتی رہتی ہے۔ پھر یہ کہ اس زمانے میں علوم و فنون کے اندر جس تیزی سے ترقیاں اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ہم اس سے بھی بے خبر نہیں۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ علمی معلومات کو عام اور آسان کرنے کے لئے یورپ کی قومیں کس مستعدی سے دقت کا ساتھ دے رہی ہیں اور وہاں کی ہر زبان میں لغت نویسی کا کام برابر اور کثرت سے ہوتا رہتا ہے اور نئے نئے نقشوں پر لغت لکھی جا رہی ہیں، انگلستان کا سب سے بڑا مفکر ایچ جی ویلس اب ایک آفاقی علوم کی انسائیکلو پیڈیا کی تیاری پر آمادہ ہے، ان حالات کے مقابلے میں ہماری لغت نویسی کی ناگفتہ بہ حالت پر اظہار خیال فضول سی بات ہوگی، ہماری لغات واقعی علمی معلومات بہم پہنچانے سے قاصر ہیں۔

پچیس سال پہلے جب کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جن کو ہم بے حقیقت سمجھتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا وجود میں آگئی تو ہمیں بھی توجہ ہوئی تھی، لیکن وہ خیال آج تک خیال ہی کی صورت میں ہے۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے اسٹینڈرڈ ڈکشنری شائع کر کے بہت

بڑا کام اور ایک اہم ضرورت ہی پوری نہیں کی بلکہ اردو زبان کو بہت آگے بڑھا دیا ہے
اور اس سے زیادہ بڑا اور قابل قدر کام ایک مکمل لغت کی تیاری ہے جس میں انجمن اس
وقت مصروف ہے، اس موقع پر میں ارباب انجمن کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی لغت
کی اسکیم میں مختلف علوم پر غیر فنی زبان میں چھوٹے چھوٹے مقالے ترجمے کے ذریعے سے شامل
کر دیں؛ اور اس طرح اس لغت کو لغت اور انسائیکلو پیڈیا کے درمیان کی کڑی بنا دیں
ہماری قومی زبان کی موجودہ ضرورت یہی ہے کہ ہمارے سامنے ایسے علمی مضامین آ جائیں
کہ قبل تاریخ کے آثار یات اور فوسلیات کو پڑھے بغیر ہم یہ جان لیں کہ انسان کی ابتدا ر
کتنی حقیر تھی اور اس کے ارتقا ر دبڑ و ز میں کتنا زمانہ لگا ہے ۔ ہم سمجھ لیں کہ علم زبان مکمل
ہو کر کس طرح علوم فطرت سے متعلق ہو گیا اور اس کے اندر علوم فطرت ہی کی سی قطعیت آ گئی
ہے ۔ ہمیں معلوم ہو سکے تاریخ نویسی کے اصول اور طریقے کس نہج سے مستحکم ہو سکے ہیں اور
علم الاعضاء کی ترقی نے جراحی کے بیرحمانہ فن کو کس طرح راحت آفریں بنا دیا ہے، ہم
دیکھ سکیں کہ اعصاب کا علم اعجاز کی حد تک کیونکر مرتب و منظم ہوا ہے ۔ ہم واقف ہو جائیں
کہ صنعت و حرفت یعنی مشینی ترقی نے انسان کی زندگی میں کتنی اور کیسی عجیب تبدیلیاں کر دی
ہیں ہم باخبر ہوں کہ موٹر، موٹر کشتی، اور ہوائی جہاز کی تیز رانی کس حد تک پہنچ گئی اور
کس نے پہنچائی ہے ۔ ہماری معلومات میں یہ بھی ہو کہ مختلف زبانوں کے مشہور مصنف کون
تھے اور کس کی کونسی کتاب اعلیٰ اور مستند ہے ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عام علمی معلومات بڑھانے اور الفاظ کی تہ تک پہنچنے کے لئے
لغت کا مطالعہ بے حد دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے ۔ اور ہماری کتب لغت میں جو کمی ہے
ہمارا قومی و علمی فرض ہے کہ اس کمی کو جلد سے جلد پورا کر دیں تاکہ اس طرح افراد قوم میں
علم کی اشاعت ہو اور علم کا ذوق بڑھے ۔

تعلیم اور مسئلہ معاش

(سلامت اللہ صاحب ایم اے بی ٹی علیگ)

آج کل مختلف پلیٹ فارموں سے یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ موجودہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ یونیورسٹیوں کے کنووکیشن اڈریس، کالجوں اور اسکولوں کے سالانہ جلسوں کی رپورٹیں ہی نہیں بلکہ خالص سیاسی انجمنوں کے سالانہ جلسوں کی روداد یں بھی اس بات کو پُرزور طریقے سے پیش کرتی ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم بالکل ناکارہ اور نکمے افراد پیدا کرتا ہے۔ اس بدحالی کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہماری تعلیم محض نظری ہے، جسے تعلیمی اصطلاح میں لبرل تعلیم کہا جاتا ہے اور اسے مسئلہ معاش سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ صرف ایسے اشخاص پیدا کرتی ہے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کوئی عملی کام نہیں کرسکتے اور بے روزگار ادھر ادھر مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے یہ کہنا کچھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نام نہاد لبرل تعلیم تنگ معنوں میں محض معاشی تعلیم ہے۔ کیونکہ تعلیم پاتے کے بعد ہر شخص ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ تعلیم ملازمت کے علاوہ اور کسی کام کے کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ ہر تعلیم یافتہ کو ملازمت نہیں ملتی کیونکہ ملازمتوں کا میدان محدود ہے اور امیدواروں کی تعداد دن بدن بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ بے روزگار رہتے ہیں اور بڑی مصیبت میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

اس کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ اب کچھ لوگ بڑی شدت سے یہ تجویز پیش کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ بچوں کو صرف وہ تعلیم دینی چاہئے جو انھیں بعدازاں براہ راست روزی کمانے میں مدد دے۔ نظری اور کتابی تعلیم کو بالکل ختم کردیا جائے۔ صنعت وحرفت کے مدرسے قائم کئے جائیں

اور اُن میں لکھنا، پڑھنا اور حساب محض اس قدر سکھایا جائے جتنا کہ اُس کام کے کرنے اور سیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ تجویز تنگ نظری پر مبنی ہے۔ تعلیم کے مقصد کو روٹی کمانے تک محدود کردینا اعلیٰ تعلیم کے مقصد کو گرانا ہے۔

روزی یا پیشہ کے لئے تیاری بحیثیت تعلیمی مقصد کے بہت ناقص نظریہ ہے۔ اس کے کئی ایک سبب ہیں اولاً جمہوری حکومت میں کسی بچے کو پہلے ہی سے کسی خاص پیشہ کے لئے تیار کرنا نہ صرف اس بچے کے حق میں بڑی ناانصافی ہے بلکہ اُس سے قومی کارکردگی کو بھی بہت بڑا صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ ایسا نظام تعلیم کبھی موجد، محقق، یا نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں کرسکتا۔ کوئی کام جو میکانکی طریقے سے کیا جاتا ہے، کرنے والے کی شخصیت کے اظہار اور اُبھارنے کے لئے نہ صرف ناموزوں ہے بلکہ مضر ہے۔ لہذا یہ طریقہ کار انفرادی اور سماجی دونوں طرح سے خراب ہے۔ دوم یہ ضرب المثل ہے کہ "بچہ صرف زمانہ حال میں رہتا ہے" اُس کی تمامتر دلچسپیاں "حال" سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اُس کے نزدیک "مستقبل" محض مستقبل کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لہذا اُس کے سر کوئی ایسا کام منڈھ دینا جس کا تعلق صرف مستقبل سے ہے بڑا ظلم ہے۔ چاہئے یہ کہ بچے کی موجودہ ضرورتوں کے مطابق اُسے تعلیم دی جائے۔ اگر آپ حال کا خیال رکھیں تو مستقبل خود بخود اپنا خیال رکھے گا، اس لئے وسیع معنوں میں یہ تعلیم بھی آئندہ آنے والی زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔ سوم یہ کہ انسان محض کھانے کے لئے زندہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی قائم رکھنے کے لئے کھاتا ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد بہت اعلیٰ ہے دنیا کی موجودہ تہذیب و تمدن سب اُس کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جسے قائم رکھنا اور ترقی دینا اُس کا عین فرض ہے۔ لہذا تعلیم کے مقصد کو روزی کمانے تک محدود کردینا انسانیت کے حق میں بڑا گناہ ہے۔

اب جمہوری خیالات کے پرچار کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ان دونوں راستوں کے بین بین ایک تیسرا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ تعلیم کے لبرل اور معاشی مقاصد میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے ایک نہایت مضحکہ خیز نظام تعلیم عالم وجود میں آگیا ہے جس میں

دونوں قسم کے مضامین۔ کلچرل اور افادی ایک اٹل جوڑ کی شکل میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ اس میں نہ تو اول الذکر قوت تخیل اور عقل کے سوتے جاری کرتے ہیں، اور نہ موخرالذکر سماجی اعتبار سے کارآمد ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے یہ مثال کافی ہوگی ۔۔ زبان اور علم ادب کو نصاب تعلیم میں کلچرل نقطۂ نظر سے داخل کیا گیا ہے لیکن اُن سے کلچرل مقصد حل نہیں ہوتا۔ ہاں وہ افادیت کے نقطۂ نظر سے البتہ کسی حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں یعنی یہ کہ زبان سیکھ کر ہم ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور بس۔ اس کا کلچرل پہلو عمل میں قریب قریب نظرانداز سا کر دیا گیا ہے۔ سائنس کی تعلیم افادی مقصد سے شروع کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس کے ذریعہ تجربات کرنے کی عادت پڑے گی اور اُس کی معلومات سے ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں عملی فائدہ اُٹھائیں گے کیونکہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ اب سائنس کی دنیا بن گئی ہے۔ لیکن نتائج اس بات کے شاہد ہیں کہ سائنس کی تعلیم سے یہ مقصد بالکل پورا نہیں ہوا۔ کسی سائنس کے گریجویٹ کو لے لیجئے وہ ضرورت پڑنے پر اپنے کرہ میں فیوز وائر نہیں لگا سکتا، گھر کے پنکھے کے معمولی نقص کو خود درست نہیں کر سکتا، اپنے ہیٹر کی ذراسی خرابی کو خود ٹھیک نہیں کر سکتا وغیرہ، اگرچہ وہ بجلی کی حرکت کے متعلق جتنے نظریہ پیش کئے گئے ہیں سب سے بخوبی واقف ہے اور ضرورت پڑنے پر بجلی کے کسی موضوع پر ایک اچھی خاصی تقریر کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے متعلق معمولی عملی کام خود انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے وہ بجلی کے عملی ماہر کا ہمیشہ دست نگر رہتا ہے۔ پس سائنس کی تعلیم سے کوئی عملی فائدہ مشکل سے ہوا ہے۔ ہاں اگر کوئی ہوا ہے تو تنگ معنوں میں اسی کلچرل کہا جا سکتا ہے کہ چند معلومات زیور کی طرح ذہنی زندگی کو زینت دے رہے ہیں۔ اس بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہمارے مقصد اور حاصل میں بین تضاد ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے ۔۔ اور وہ بڑی اہم ہے ۔۔ کہ مختلف مضامین میں اس قسم کی تفریق اور امتیاز مصنوعی ہے۔ جس طرح انسان کی زندگی ایک منظم وحدت ہے اسی طرح تمام انسانی معلومات ایک مربوط کُل ہے۔ لہٰذا مختلف مضامین کی طرف مختلف خواص منسوب

کرنا سخت غلطی ہے۔ ہر مضمون میں کم وبیش دو نوں پہلو ہوتے ہیں۔ افادی اور کلچرل۔ جن میں سے کسی ایک کو کلیتہً نظر انداز کر دینا "وحدت" کے منتشر کر دینے کے مرادف ہے۔

مضامین کے اس باہمی فرق کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کے تاریخی پس منظر کو دیکھنا چاہیئے۔

یہ بین تضاد جو خالص نظری اور عملی مضامین میں پایا جاتا ہے اُس سماجی حالت کی پیداوار ہے جو قدیم یونان میں تھی۔ یونان کے مختلف شہروں میں رسم ورواج اور روایات جداگانہ تھے۔ اگرچیکہ وہ تجربہ کی بناپر قائم ہونے کی وجہ سے محض داخلی حیثیت رکھتے تھے، لیکن ان کو معیار سمجھ کر افراد اور جماعتوں کے کردار جانچے جاتے تھے۔ اس بے اصولی اور استبدادیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ اور سمجھدار لوگ اس ضرورت کو محسوس کرنے لگے کہ کوئی ایسا خارجی معیار قائم کیا جائے جو ہر چیز کی قدر کو صحیح طور سے معلوم کر سکے۔ اتھینس کے فلسفیوں نے ان معیاروں پہ شدت سے نکتہ چینی کی۔ اُنھوں نے آخر کار یہ بات طے کی کہ صرف عقل ہی تمام عقائد اور کاموں میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ لہذا عقل کو تجربہ پر فوقیت دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی مضامین کو عملی مضامین پر ترجیح دی جانے لگی۔ ہر وہ کام جو ہاتھ سے کیا جاتا ہے ذلیل اور ہیچ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صنائع ــــ موسیقی، مصوری، علم طب وغیرہ ــــ کو بھی نظری علوم فلسفہ، منطق، ریاضی وغیرہ سے کم گردانا جانے لگا، محض اس وجہ سے کہ اول الذکر علوم عملی ہونے کی وجہ سے جسمانی اعضا کے استعمال سے متعلق ہیں اگرچیکہ ان میں بھی معمولی عقل سے کام نہیں چل سکتا۔ افلاطون کا یہ قول کہ فلسفی کو بادشاہ ہونا چاہیئے، یعنی امور حکومت فلسفی کے ذمہ ہونے چاہیئے، صاف طور سے اس رجحان کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن نئی تعلیم کے بہتر طریقوں نے ثابت کر دیا ہے کہ نظری اور عملی مشاغل بجائے ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے معاون ہیں یعنی یہ کہ عملی کام کے ذریعہ نظری مضامین کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور عملی کام میں عقلی طریقے استعمال کرکے اُس کے حُسن اور زینت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے "کوئی کام، فن یا مضمون میکانکی کہلانے کا مستحق ہے، اگر وہ آزاد

انسان کے جسم، روح یا عقل کو اپنے کام میں حسن پیدا کرنے میں مانع ہے" اس لئے ہر عملی کام کی سائنٹفک بنیاد کا جاننا اور اس کے کرنے کے عقلی طریقے سے واقف ہونا ازحد ضروری ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے مختلف مضامین کے مقاصد میں بُعد اور فرق سماجی حالات کا رہین منت ہے۔ اگر روزی کمانے، اور فرصت کے اوقات کو مہذبانہ انداز میں استعمال کرنے کے مواقع سماج کے مختلف افراد میں برابر برابر تقسیم ہوتے، تو یہ بات کسی کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ تعلیمی وسائل اور مقاصد کے درمیان کوئی تصادم یا کشمکش ہوسکتی ہے۔ اگر ایک مزدور اور حکومت کے ایک رُکن کے درمیان ریاست کی طرف سے، جہاں تک کہ اُن کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، کوئی امتیاز نہ ہو، تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مزدور کے کام کو ذلیل اور حاکم کے عہدہ کو باعظمت سمجھا جائے کیونکہ اس قسم کے نظام حکومت میں ہر فرد کے کام کی اہمیت ہے۔ یہاں ریاست ایک انجن کے مانند ہے جس کے تمام پُرزے چھوٹے اور بڑے۔ ایک دوسرے کے اشتراک عمل سے چلتے ہیں۔ اگر چھوٹا پرزہ اپنا کام ٹھیک طرح سے کرنا بند کردے تو بڑا پرزہ بھی بیکار ہو جائے گا اور انجن کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

تعلیم کی کسی جمہوری اسکیم میں وہ مواد جو تعلیم کے ایک پہلو کو اُجاگر کرتا ہے، اُسے بالواسطہ دوسرے پہلو کو بھی ترقی دینا چاہئے۔ توقع کی جاتی ہے کہ موجودہ مشین کے دور میں مزدور کے پاس بھی فرصت کا کافی وقت ہوگا کیونکہ مزدور جو کام کئی دن میں کرے گا وہ مشین چند گھنٹوں میں کردے گی۔ لہذا فرصت کے اس وقت کے صحیح استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے تاکہ سماجی کارکردگی کو نقصان نہ پہونچے۔ اس لئے ہمیں اپنے افراد کو نہ صرف کام کرنے کے عمدہ طریقے بتانے ہیں بلکہ فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال بھی سکھانا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے دونوں پہلوؤں۔ کلچرل اور افادی۔ پر برابر توجہ دی جائے۔ بعض ممالک میں اس سلسلہ میں عملی جدوجہد کی گئی ہے اور اُس کے نتائج بہت ہمت افزا ثابت ہوئے ہیں۔ روس میں جہاں اس قسم کی کوشش بڑے پیمانے پر کی گئی ہے، ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ایک معمولی

مزدور کچھ عرصے بعد ایک قابل انجنیئر، یا یونیورسٹی کا پروفیسر بن گیا۔

ہاں تو اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم میں معاشی مسئلہ کا کیا حال ہونا چاہیئے؟ ظاہر ہے اس کا حل موجودہ معاشرہ کے مطالعہ کے بغیر سوچنا بے معنی ہے۔ اب ذہنی اور سماجی حالات میں بڑی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔ اب ہر صنعت اور پیشہ کی وہ چیزیں جو محض میکانکی حیثیت رکھتی ہیں دوسرے درجہ کی تصور کی جاتی ہیں۔ اب ہر کام سائنٹفک طریقوں کے ماتحت انجام دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح وقت اور طاقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ صنعت کے عقلی امکانات میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے کے باوجود صنعتی حالات اس قدر مایوس کن ہیں کہ عوام کے لئے صنعت میں بہ مقابلہ قدیم زمانہ کے تعلیمی امکانات بہت کم رہ گئے ہیں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ ہاتھ سے کام ہوتا تھا کاریگر اور عوام دستکاری کی ماہیت سے واقف ہوتے تھے۔ اُن کی بنائی ہوئی چیزوں میں ان کی اپنی شخصیت کا رنگ وروپ موجود ہوتا تھا۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ صنعتوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہوگئے ہیں جہاں تمام کام مشینوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جس شخص کے ذمہ مشین چلانے کا کام ہوتا ہے اُسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ مشین کیونکر چلتی ہے۔ وہ محض اتنا جانتا ہے کہ فلاں بٹن کے دبانے یا فلاں پرزے کو حرکت دینے سے مشین چلنے لگتی ہے اور بس۔ گویا کہ وہ خود بھی مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے۔ اس صورت میں بھلا اُس کی شخصیت کا مظاہرہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لہذا۔ اُس کام کے ذریعہ وہ فقط اپنی روزی کماتا ہے، کامیاب زندگی بسر نہیں کرتا۔ اُس کے کام میں اُس کی شخصیت کی جھلک نہیں ہوتی۔ لہذا اُس کی نشوونما کے لئے یہ اُس کا کام محض بیکار ہے۔

اب ذرا تعلیم کی طرف آیئے۔ قدیم زمانے میں بچہ اپنے گھر اور باہر کی زندگی سے متعلق تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے گھر میں روشنی کیونکر ہوتی ہے؟ چراغ کس چیز سے بنتا ہے؟ اُسے کون بناتا ہے؟ اُس میں کیا جلتا ہے؟ تیل کہاں سے آتا ہے؟ کیسے بنتا ہے وغیرہ۔ موجودہ زمانہ کا نام نہاد متمدن بچہ جو بجلی کی روشنی میں پڑھتا ہے،

اُس کے متعلق صرف اس قدر جانتا ہے۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اتنا جاننا کافی ہے! ۔ کہ وہ بٹن دباتا ہے اور لیمپ روشن ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے زمانہ قدیم کا بچہ موجودہ زمانہ کے بچہ سے کہیں زیادہ سمجھ بوجھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔

اس صورتِ حال میں مدرسہ کا فرض ہے کہ "وہ مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرائے اور تمام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لئے طلباء کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کرکے اُنھیں اُن کی نظر میں معنی خیز بنائے۔ اُنھیں اُن کی عظمت سے روشناس کرائے۔" اُن کے دِل میں موچی کی وقعت اس لئے ہونی چاہئے کہ اگر وہ اپنا کام انجام نہ دے تو بڑے سے بڑا آدمی ننگے پیر چلنے پر مجبور رہو گا۔ نہیں بچوں میں یہ بات بھی پیدا کرنی چاہئے کہ "وہ پیشہ کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد اور عین پسندی کو ہاتھ سے نہ دیں" اور محض مشین بن کر نہ رہ جائیں۔

ہماری تعلیم نے ہمیں معاشی نظام سے بالکل ناواقف رکھا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے سماج کے مختلف طبقوں میں منافرت پھیلی ہوئی ہے جو سماج کی ترقی کے لئے مُضر ہے۔ مدرسے اس سلسلہ میں بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس باہمی منافرت کی بیخ کنی کر سکتے ہیں بلکہ ان مستقل طبقوں کی وجہ سے جو عام جمود طاری ہے اُسے بھی ختم کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

معاشی تعلیم کی کوئی اسکیم جو موجودہ صنعتی دور کے خواص کو نظر انداز کرکے بنائی جائے گی وہ موجودہ تفرقات اور کمزوریوں کو قائم رکھے گی اور اس طرح سماجی قضا و قدر کے جاگیری تحکم کو مسلط رکھنے کی آلہ کار بنے گی۔ یعنی یہ کہ سماج کے مختلف طبقے اپنے تمام برباد کُن اثرات کے ساتھ موجود رہیں گے اور سماجی توازن کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔

اس مختصر مقالہ سے یہ بات واضح ہے کہ تعلیم کے معاشی اور لبرل مقاصد میں کوئی لازمی تناقص نہیں ہے۔ مدرسہ میں معاشرے کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ لیکن اُسے

کارخانہ یا صنعتی مدرسہ میں تبدیل کر دینا بڑی غلطی ہوگی۔ یہاں کسی مخصوص پیشہ کی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل کی غرض بچوں کی آرزوئے تخلیق اور خواہش عمل کی تشفی ہونی چاہیئے۔ ہندوستان میں "بنیادی تعلیم" کا اجرا بھی اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اس میں بنیادی حرفہ کی نہ صرف یہ اہمیت ہے کہ وہ بچوں میں جسمانی یا دستی کام کی عظمت پیدا کرے گا بلکہ وہ سیکھنے کا ایک دلچسپ اور عملی طریقہ بھی پیش کرتا ہے۔ حرفہ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم بچوں کو کاریگر یا مزدور بنانا چاہتے ہیں بلکہ اس کے ذریعہ بچہ کی شخصیت کی ہم آہنگ نشوونما مقصد ہے لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہم کسی لڑکے کو جُلاہا، بڑھئی یا مالی بنانا چاہتے ہیں ہاں یہ بات اور ہے کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسے کے سیکھے ہوئے حرفوں میں سے کسی ایک کو اپنی زندگی کا مشغلہ قرار دے لے اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں ہے۔

ثانوی مدرسوں میں مختلف پیشوں کی عام تعلیم ہونی چاہیئے جس کی غرض بچوں کو اظہار خودی کا موقع دینا ہو نہ کہ کسی مخصوص پیشہ کے لئے تیاری۔ اس طرح سے وہ معاشی نظام سے واقف ہو جائیں گے نیز ہمارے سماج میں جو "مزدوری" اور "فرصت" کی دوعملی ہے وہ بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔

ثانوی تعلیم کے آخری دو ایک سال کسی ایک پیشہ میں خاص تعلیم کے لئے وقف کئے جا سکتے ہیں۔ پیشہ بچے کے طبعی رجحانات اور صلاحیتوں کے مطابق منتخب کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں "معاشی جانچ" جس کی بنیاد سائنٹفک اصول پر ہے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کام بہت اہم بھی ہے اس لئے کہ موجودہ زمانہ میں شاید انسان کو غربت و افلاس سے اس قدر تکلیف نہیں پہونچتی ہے جس قدر اس بات سے کہ بہت سے لوگ مجبوراً وہ پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں اُن کے لئے کوئی اپیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ اُن سے پیٹ بھرنے کے لئے روٹی ملتی ہے۔

اردو کا ایک جوانمرگ شاعر

(از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے)

کیا عجیب بات ہے کہ جو شاعر جوانی میں ہی دنیائے ناپائدار کو الوداع کہہ کر آخرت کو سدھار جاتا ہے، اس کے کلام میں ایک عجیب طرح کا جوش۔ امنگ اور ولولہ پایا جاتا ہے ان خصوصیات کلام کی وجہ سے جریدۂ عالم پر اس کی شہرت کا نقش اس طرح مرتسم کیا ہوجاتا ہے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کو وہ بات نصیب نہیں ہوتی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کے شاعروں کا حد سے زیادہ ذکی الحس، سریع الانفعال۔ اور جذبات پر در ہونا ہی ان کی جوانمرگی کا باعث ہوتا ہے تو شاید ناموزوں نہ ہوگا۔ عربی کے مشہور شاعر ابوتمام کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مجلس میں اس نے اپنا ایک قصیدہ پڑھا تو سامعین پر ایک حیرت انگیز کیفیت وجد و رقص طاری ہوگئی محفل ابھی جاری تھی کہ ایک تجربہ کار سن رسیدہ شاعر نے پیشن گوئی کی کہ یہ نوجوان جلد مرجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ابوتمام ابھی تیس برس کا ہی تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے اس کے ساز زندگی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ اسی نوع کا ایک واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ایک نوعمر لڑکے کا لکھا ہے، جس نے مشاعرہ میں اپنی غزل کا یہ شعر

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سُنا کر کہنہ مشق استادان سخن کو بھی بے ساختہ داد پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اسی شعر کو سن کر بتت کے ایک بڑے استاد نے اس لڑکے کی جوانمرگی کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

عربی میں طرفہ اور ابوتمام، فارسی میں عرفی۔ انگریزی میں کیٹس اور اردو میں

چکبست اسی قبیل کے حسرت نصیب شاعر تھے۔ سجاد انصاری بھی اسی قسم کے تھے۔ ان شاعروں
کی ترنم ریزیوں نے شہرت و مقبولیت عام کے دربار میں خصوصی شرف باریابی حاصل کیا ہی
تھا کہ دست اجل نے ان کے جسم و روح کے اتصال کو یکایک توڑ دیا اور وہ ایک گوشہ
قبر میں پہنچکر آسودۂ سکون ہوگئے، ان کا وجود گویا شبنم کی طرح تھا جو رات کے تاریک پردوں
میں گلشن کی جاں فزا آب و ہوا میں سانس لیتی رہتی ہے اور صبح ہونے پر خورشید کی ایک
نظر عنایت کے ساتھ فنا ہوجاتی ہے، بہ قول مرزا غالب :-

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

سطور ذیل میں اردو کے جس جوانمرگ شاعر سے میں آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں وہ بھی
اسی صف کا ایک فرد تھا۔ بدنصیبی سے اس کو ایسے مواقع میسر نہ آئے کہ چکبست وغیرہ کی
طرح اسکی شہرت عام ہوتی، لیکن نمونۂ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس شاعر
کی سرشت حیات میں حسن فکر، صفائی کلام، بلندیٔ تخیل، اور موزونیت طبع کے ایسے جوہر پنہاں تھے
کہ اگر اس کو کچھ دنوں اور مشق تمرین کے دامن سے ہوا کھانے کا موقع مل جاتا تو یقیناً آج وہ
شعرا عصر کی صف اول میں ایک نمایاں مقام کا مالک ہوتا۔

نام و نسب اور خاندانی حالات | ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ دیوبند جس طرح اپنی
مرکزی تعلیم و دینی درسگاہ کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے، اسی طرح اس قصبہ
کا عثمانی خاندان بھی اپنے علم و فضل، شعر و ادب اور ذہانت و فطانت کے لحاظ سے تمام ضلعوں
کا نہایت ممتاز خاندان ہے۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی مرحوم سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد
دکن، اور حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی مفتی اعظم ہند اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے
اور آج کل مولانا شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند و پرنسپل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
و مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی اسی خانوادہ کے چشم و چراغ
اپنے زمانے کے عالم اندار ۔ جمیل الحمدیہ تھا۔ جمیل تخلص کرتے تھے اور اسی عثمانی خاندان سے

تعلق رکھتے تھے، ان کے والد کا نام مولوی خلیل الرحمٰن تھا جو حضرت مولانا عزیز الرحمٰن اور مولا
حبیب الرحمٰن کے حقیقی بھائی تھے، جنوری ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی گھرانے میں پ
ہونے کی وجہ سے شعر و ادب کا مذاق بچپن سے ہی تھا۔ ابتدائی فارسی کی تعلیم مدرسہ دیوبند میں
پائی۔ اس کے بعد مولوی خلیل الرحمٰن صاحب چونکہ ایک سرکاری عہدہ دار تھے، اس لئے انھو
نے جمیل کو عربی تعلیم دینے کے بجائے انگریزی تعلیم دلائی۔ مرحوم نہایت ذہین اور طباع۔
تمام انگریزی امتحانات نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کرتے چلے گئے۔ اور آخیر میں بی۔اے
کا امتحان آگرہ کالج آگرہ سے پاس کیا۔

اخلاق وعادات | مرحوم بچپن سے ہی نہایت ذہین ہونے کے باوجود متین اور سنجیدہ تھے۔
بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت، اور دوستوں کے لئے فداکاری ان کی طبیعت
کا خاص جوہر تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ضلع سہارنپور میں نائب تحصیلدار ہو گئے
ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی جوں توں کرکے اسی میں گذر بسر کرتے تھے، رشوت ستا
سے انتہا درجہ نفرت تھی۔ شطرنج کے بڑے دھنی تھے، بعض اوقات کامل ایک ایک د
ہو جاتا تھا کہ معمولی ضروریات کے لئے اُٹھ گئے اور پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔

شادی | شادی ان کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی دونوں میں دلی تعلق تھا۔ بیوی شوہ
کی دماغی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی قدر کرتی تھیں، صد افسوس کہ یہ تعلق زیادہ پائدار ثابت
نہ ہو سکا، مرحوم دق میں دو سال مبتلا رہنے کے بعد جنوری ۱۹۲۱ء میں تیس سال کی عمر
میں نوجوان و قدردان بیوی کو داغ مفارقت دے کر عالم باقی کو سدھار گئے۔ اور
اس طرح ازدواجی زندگی کے پُرمسرت و ابتہاج قہقہے ایک نالۂ غم اور رنج و الم کی ایک
درد بھری کراہ میں تبدیل ہو گئے، مرحوم کے والد متمول تھے، فرزند کے علاج پر ہزاروں
روپے بے دریغ اٹھا دیئے۔ لیکن جب مشیت الٰہی نہ ہو تو دوا دارو اور علاج معالجے
اُلٹے اثر دکھاتے ہیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور لڑکی

بیٹی چھوڑے، لڑکا بہت ہونہار تھا۔ تین سال ہوئے اس کا بھی انتقال ہوگیا، اب صرف ایک دختر مرحوم کی جسمانی یادگار اور ایک ماتم گسار بیوہ حیات ہیں، خدا ان کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔

شعر و ادب شعر و ادب کا مذاق بالکل فطری تھا۔ اردو تو خیر ان کی مادری زبان تھی۔ وہ انگریزی میں بھی بے تکلف شعر کہتے تھے۔ سہارنپور کے کلکٹر کی مداح میں انھوں نے ایک انگریزی نظم لکھکر پیش کی تو کلکٹر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔

ان کی شاعری کی خصوصیات عموماً دیکھا گیا ہے جن شاعروں کی تقدیر میں جوانمرگی لکھی ہوتی ہے ان کے کلام میں حزن و یاس، رنج و غم اور محرومی و ناکامی کے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جمیل مرحوم بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھے، ان کے مقطعے تو بسا اوقات اپنے موت کے ذکر سے پُر ہوتے تھے۔ مثلاً

کیا بات ہے کہ بزم حسیناں ہے بے نمک — شاید جمیل سوختہ ساماں نہیں رہا

ایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔

شاید خبر جمیل کے مرنے کی چھپ گئی — کچھ چپ سے ہوگئے ہیں وہ اخبار دیکھ کر

زبان کی سادگی اور صفائی اور حزنیہ مضامین کی بھرمار کے اعتبار سے ان کا کلام میر کے ڈھنگ پر ہے، اشعار ذیل ملاحظہ فرمایئے۔

کب تجھ کو شوق قتل غریباں نہیں رہا — جلاد کب تو جان کا خواہاں نہیں رہا

اک میرے دم کی روک تھی بندش تھی ٹوک تھی — اب اُن کے در پہ دیکھئے درباں نہیں رہا

دست جنوں نے ہوش کے ٹکڑے اُڑا دیئے — اب کوئی دستگیر گریباں نہیں رہا

سودائے سر بخیر! کہ سر پر کلہ نہیں — عمر جنوں دراز کہ داماں نہیں رہا

دل میں خلش تو ہے دلے کچھ بدمزہ سی ہے — کیا دل میں تیرہ گیا پیکاں نہیں رہا؟

اپنے زمانے کے عام انداز شاعری کے مطابق جمیل نے کثرت سے غزلیں بھی لکھی ہیں مسدس

اور مخمس اور بعض ترکیب بند بھی لکھے ہیں مگر کم، اور اس عہد کے عام رجحان خاطر کے تتبع میں ان کے کلام میں لفظی صنائع بدائع کا بھی اہتمام پایا جاتا ہے۔ مثلاً اشعار ذیل ہیں۔

بری کے پر جلیں تو ان کا پانی گرم ہوتا ہے — کھلی پڑتی ہے ان کے سر میں روئے حور کی تل کی
غروب ہونیکو ہے شاید ہمارا آفتاب دل — شفق بے جا نہیں پھولی ہوئی قاتل کی گالوں میں
روتے جاتے ہیں جمیل باوفا کی یاد میں — چن رہے ہیں پھول تربت پر چڑھانے کے لئے

ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

الفتِ چاہ ذقن میں ہوئے بدنام جمیل — آبرو ڈوب گئی مشفقِ من پانی میں

اسی لفظی صناعی کے شوق میں انھوں نے بعض بعض غزلیں اول سے آخر تک صنعت ترجیع میں لکھی ہیں۔ مثلاً حمد میں کہتے ہیں۔

باغ جہاں کا مالی مولا تو سب کا رکھوالی — تیری ثنا سے کب خالی بوٹہ بوٹہ ڈالی ڈالی
تو نے چمن میں اے باری کیسی کیسی کی گلکاری — نرگس کو دی بیداری لالہ میں پیدا کی لالی
مالک تو ہے تو مختار، عاصی ہم ہیں تو غفار — سب کے عیبوں کا ستار سب کا وارث سب کا والی
دونوں جہاں کا تو خلاق۔ جن و بشر کا تو رزاق — جلوۂ قدرت کل آفاق۔ ذات ہی تیری سب سے عالی

لیکن لفظی آرائش و زیبائش کے باوجود زبان کی صفائی اور بے ساختگی کا برابر خیال رکھتے تھے۔ نامانوس ترکیبوں اور ثقیل لفظوں سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے، زبان کی صفائی اور بے ساختگی کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہاتھ سینہ پہ جو رکھو تو قرار آجائے — دم نہ نکلے ملک الموت ہزار آجائے
پھر تو پھولا نہ سماؤں جو میرے پہلوؤں میں — گلبدن پہنے ہوئے پھولوں کا ہار آجائے
کروٹیں لیتے ہی گذری کبھی راحت نہ ملی — کسی پہلو مجھے کل دل کی بدولت نہ ملی
ضبط کرنے سے تڑپنے کا مزہ کب ملتا — یہ بھی اچھا ہے مجھے صبر کی عادت نہ ملی
معلوم نہیں مجھے اس طرح زمیں نے پیسا — آسماں ڈھونڈھنے نکلا مری تربت نہ ملی

بدیہہ گوئی | جمیل فطری شاعر تھے۔ اس لئے جب چاہتے فی البدیہہ اشعار کہہ دیتے تھے۔
مرضِ دق میں دو سال سے مبتلا ہونے کی وجہ سے تمام بدن نحیف و زار ہو گیا تھا، گوشت
برائے نام باقی تھا، اسی حالت میں وفات سے چند روز پیشتر انھیں معلوم ہوا کہ دیوبند میں
ایک مشاعرہ ہو رہا ہے جس کا مصرع طرح یہ ہے۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

مصرع کو سنتے ہی اپنے ایک عزیز سے کہا قلم دوات لے کر بیٹھ جاؤ اور اسی وقت ایک
طویل غزل لکھا دی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

پھینکے جاتے ہیں ترے سوختہ تن پانی میں | ڈر ہے مجھ کو کہ نہ پیدا ہو جلن پانی میں
تیری چوٹی کی جو مو باف ہے گنگا جمنی | شرم سے ڈوب گئی گنگ و جمن پانی میں
زلف لہرائی جو ہنگام شنا سب سمجھے | سانپ جاتا ہے اٹھائے ہوئے پھن پانی میں
اشک گلگوں تہ دریا میں جمے پھولے پھلے | آؤ دکھلائیں تمہیں تازہ چمن پانی میں
منتظر بحر کی رہتی ہے سدا چشم حباب | اس سے ظاہر ہوا ہے شوق وطن پانی میں
مچھلیاں لینے کو سورج کی شعاعیں آئیں | جب کہ عریاں ہوا وہ سیم بدن پانی میں
فکر سے چھوٹ گئے چاہ ذقن کے ڈوبے | چادر آب میں کائی ہے کفن پانی میں

تضمین | مرحوم کو تضمین میں خاص کمال تھا جس شاعر کی غزل یا نظم پر تضمین کرتے تھے اسے
بالکل اپنا لیتے تھے، غازی آباد کے پرانے استاد سخن حضرت بدر کی غزل پر تضمین کی
ہے، نمونتہً اس کے چند بند درج ذیل ہیں اس مخمس کے تین مصرعے تضمین کے اور آخر کے
دو مصرعے جناب بدر کے ہیں۔ کہتے ہیں۔

نگاہِ ناز یونہی فتنہ زا پھر سرنگیں ہوتی | غضب ہی ہو گیا تھا گر یہ آمادہ کہیں ہوتی
حیا آڑے ہوئی ورنہ قیامت بالیقیں ہوتی | تری نیچی نظر اونچی جو اے شوخ حسیں ہوتی

فلک زیر و زبر ہوتا تہ و بالا زمیں ہوتی

پسِ مردن جفا ہوتی تو خوش روح حزیں ہوتی ۔ میسر پھر وہی آشفتگی زیر زمیں ہوتی
دلِ ایذا طلب کو موت سے تسکیں نہیں ہوتی بھلا اتنی تو گردش تیری اے چرخ بریں ہوتی
مرا لاشہ کہیں ہوتا مری تربت کہیں ہوتی

کوئی کس طرح سینہ چیر کر اب ان کو دکھلائے خبر ہمدم کو ہے لیکن وہ ہی کیا خاک سمجھائے
خبر آمد کی سنتے ہی جو رنگ رخ نکھر آئے شب فرقت تڑپنے کا انہیں کیونکر یقین آئے
وہ جب تشریف لاتے ہیں تو بیتابی نہیں ہوتی

ترجمہ | تضمین کے علاوہ متعدد فارسی غزلوں کا اردو غزل میں کامیاب ترجمہ بھی کیا ہے، امیر خسرو علیہ الرحمتہ کی مشہور غزل ہے۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

جمیلؔ مرحوم نے اس کا کس قدر بے ساختہ اور عمدہ ترجمہ کیا ہے کہتے ہیں۔

عشق نے کافر کیا اسلام ہو درکار کیا میری رگ رگ تار ہے پھر حاجتِ زنار کیا
ہم غریبوں کو تماشائے چمن درکار کیا داغ سینہ سے ہمارے بڑھ کے ہے گلزار کیا؟
چارہ گر نادان ہوا ہے اٹھ مری بالیں سے جا عشق کے بیمار کی دارو بجز دیدار کیا
شاد ہو اے عاشق غمگیں کہ کل محشر کے دن قتل کا وعدہ تو ہے پھر وعدۂ دیدار کیا
ناخدا کشتی میں اپنی گر نہیں ہے تو نہ ہو ہم خدا رکھتے ہیں ہم کو ناخدا درکار کیا
لوگ کہتے ہیں کہ خسروؔ ہو گیا کافر جمیلؔ خیر جی یوں ہی سہی دنیا سے ہم کو کار کیا

فارسی کے مشہور شاعر مرزا قتیل کی مشہور غزل ہے جس کا ایک مصرع ہے۔

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت

جمیلؔ نے اس غزل کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے، کہتے ہیں۔

مارا ادا سے اور قضا کا بہانہ ہے خود تو نظر بچائی حیا کا بہانہ ہے
مسجد گیا کہ دیکھ لوں جلوہ مگر وہاں ہاتھوں سے منہ چھپا کے دعا کا بہانہ ہے

رکھتا ہے ہاتھ پیار سے دوش رقیب پر — دیکھا ہمیں تو لغزش پا کا بہانہ ہے
آواز میری سن کے وہ گھر سے نکل پڑے — ٹکڑا ہے ہاتھ میں کہ گدا کا بہانہ ہے
زاہد کو تاب تھی نہ حسینوں کے دید کی — کونے میں چھپ کے یاد خدا کا بہانہ ہے

ہاتھوں میں خوں ملا ہے قتیل غریب کا
پھر اس پر اے جمیلؔ حنا کا بہانہ ہے

فارسی شاعری | زیادہ تو نہیں۔ لیکن کبھی کبھی انھوں نے فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ جن کو زبان کے اعتبار سے اگرچہ کچھ زیادہ بلند نہیں کہا جا سکتا، لیکن شاعر کے فارسی ذوق شعری کی خوبی پر اس سے استدلال ہو سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

یادا یامیکہ اندر سر ہوائے داشتیم — در دل خود عشق آں کافر ادائے داشتیم
گرچہ حالا چاک دامانیم اے دست جنوں — یاد باد آں روز کاندر بر قبائے داشتیم
از نگاہ زہر آگیں وز لب جاں بخش تو — گہ فنائے داشتیم و گہ بقائے داشتیم

ایک غزل فارسی متصوفانہ رنگ میں لکھی ہے اس میں کیا خوب فرماتے ہیں

ہمے اقرب وگا ہے لن ترانی — عجب ایں ناز معشوقانہ دیدم
عبث کردم تلاش در بہ دریا — بہ صدر خویش ایں دردانہ دیدم
چو افگندی بہ من وزیدہ نظرے — بہ سوئے سینہ بیتابانہ دیدم
حسینان جہاں را در مجالس — بہ شمع روئے تو پروانہ دیدم

ہزلیات | جمیل فطرتاً بڑے متین اور سنجیدہ تھے۔ لیکن ہزل گوئی شاید کمال شاعری کے خاصہ میں ہے کہ حضرت شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو ایسے ثقات شعرا اس سے نہیں بچے۔

جمیلؔ نے بھی بعض بعض غزلوں میں ایسے شعر کہے ہیں جن سے ان کی شوخی طبع کی بو آتی ہے۔ مثلاً

حیرت ہے مجھ کو دیکھ کے پستان یار کو
کہتے ہیں لوگ سرو پہ آتا ثمر نہیں
مائل ہوا نہ وصل پہ وہ شوخ حیلہ گر
دل نے کہا کہ حیلہ سے سامان وصل کر
دیکھا پلنگ پر پڑا سوتا ہے بے خبر
بیخود سمجھ کے ہاتھ بڑھایا تھا یار پر
غش آگیا مجھے اسے ہشیار دیکھ کر

لیکن اس نوع کے شعر خال خال ہی ہیں جو شاعر کی سلامت روی کی دلیل ہے۔

کلام پر تبصرہ جمیل کے کلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ قدرت نے ان میں وہ تمام صلاحتیں ودیعت رکھی تھیں جو ایک شاعر کے لئے ضروری ہیں، ان کا دل عشق و محبت کے جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر عشق بھی بوالہوسانہ نہیں بلکہ روحانی و لطیف تھا۔ احساسات تیز تھے۔ اور بجائے پر امید شگفتہ اور ارمان انگیز ہونے کے یاس و حرماں سے پر اور غم و اندوہ سے مانوس تھے۔ ان کو انگریزی تعلیم کی گوناگوں مصروفیتوں اور کالج کی چند در چند مشغولیتوں پھر ملازمت کے فرائض کے باعث آزادانہ مشق سخن کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لئے ان کے کلام میں کہنہ مشق استادان سخن کی سی صفائی، روانی اور سلاست نہیں ہے، پھر ان کی شاعری کا انداز یکسر قدیمانہ ہے، حالانکہ ان کا عہد شاعری وہ تھا جبکہ اقبال کی نواسنجیوں اور حالی و آزاد کی پیدا کی ہوئی فضا نے اردو شاعری کا رخ گل و بلبل اور رخسارہ و کاکل سے ہٹا کر قومی یا نیچرل شاعری کی طرف پھیر دیا تھا وہ جو کچھ بھی کہتے تھے اس میں تصنع اور بناوٹ کو دخل نہیں تھا بلکہ اپنے ذاتی مشاہدات و محسوسات عشق کو بیان کرتے تھے، تاہم عجب نہیں کہ اگر زمانہ ان کی پر امید و ارمان جوانی پر رحم کھا کر انھیں اس عالم و آب و گل میں چند برس اور رہوا کھانے کا موقع دیتا تو وہ بھی افسانہ گل

بلبل کی کوچہ نوردی کے بعد مولانا حالی کی طرح قومی شاعری کے چمن زار میں آجاتے۔
شعر گوئی کے ملکہ کے ساتھ قدرت نے ان کو حسن آواز کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔
جس کسی مشاعرہ میں غزل پڑھتے تھے سننے والوں پر محویت و استغراق کی شراب برسا دیتے تھے اور مشاعرہ انھیں کے ہاتھ رہتا تھا۔ آہ افسوس! کہ اب نہ وہ عندلیب کی زمزمہ پیرائیاں ہیں اور نہ وہ مرغ خوش الحاں کی ترنم ریزیاں۔ تمام افسانۂ شعر و شباب کا حاصل ایک غم انگیز یاد ماضی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

بیادِ عہدِ ٹیپو

(از محوی، صدیقی)

گذشتہ سال جنوری ۱۹۳۹ء کے آخری ایام میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا عرس تھا۔ جو سالانہ گورنمنٹ میسور کے زیرِ اہتمام شان و شوکت سے ہوتا ہے۔ اور چونکہ جنوبی ہند کے مسلمان خصوصیت کے ساتھ سلطان شہیدؒ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں اس وجہ سے بہ کثرت دور دور سے لوگ آکر شریک ہوتے اور گویا اپنا ایک اہم مذہبی فریضہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر بعید قلق ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کے عرس کے موقع پر مزار کے قریب وہ سب کچھ بیہودگیاں بھی ہوتی ہیں، جو ہندوستان میں بزرگانِ دین کے مزاروں پر عرسوں میں عام ہیں۔ خصوصاً جُوا بہت ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ حکومت یا مسلمان نمایندوں نے اب تک اس کے روکنے کا کوئی معقول اہتمام نہ کیا، خدا ہی جانے کہ مسلمانوں کی غیرت کہاں جا کر سو گئی ہے!

گزشتہ سال میسور ریاست کی مسلم لیگ نے کچھ اپنی کارگزاری دکھانا چاہی اور ایک مشاعرہ بھی رکھا۔ جس کی صدارت کا قرعۂ اتفاق سوءِ مجھ غم نصیب کے نام نکلا۔ میں نے یہ طرحی مصرع تجویز کیا: "اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا"

علاقہ میسور کے تقریباً تمام شعراء نے حصہ لیا، اور اچھی اچھی غزلیں سنائیں راقمِ آثم نے صدارتی حیثیت سے ایک خمسہ پیش کیا جو درج ذیل ہے۔ شاید ناظرینِ جامعہ بھی اثر اندوز ہوں۔ محوی

عجب وہ شوکتِ مسلم کا کارخانہ تھا　　عجب وہ ہمتِ بیباک کا زمانہ تھا
عجیب عشرتِ ماضی کا وہ فسانہ تھا　　فلک بھی معترفِ سطوتِ شہانہ تھا

سرِ غرور تھا، مُسلم کا آستانہ تھا

ہمارے ہاتھ میں بھی چنگ اور چغانہ تھا　　ہمارے در پہ بھی اک روز شادیانہ تھا
ہمارے پاس بھی دولت کا اک خزانہ تھا　　ہمارا ٹھاٹ بھی اک روز فاتحانہ تھا

ہمارا رعب بھی دشمن کو تازیانہ تھا

عجب وہ دور تھا عزم و عمل کا دورِ شباب　　کہ دل تھے شاد، گلستانِ زندگی شاداب
ہجوم رزم میں ملتا تھا لطف بزم شراب　　وہ کارواں ہے مگر محوِ خواب و خانہ خراب

جو سوئے منزلِ رفعت کبھی روانہ تھا

خوشا وہ دور کہ گردش میں تھا عمل کا جام　　بغل میں شاہد آرام، اور دل خوش کام
ہر ایک موردِ الطافِ ساقی گنجامؔ[1]　　تجھے بھی یاد ہے اے دورِ گردش ایام

زبانِ دہر پہ ٹیپو کا جب ترانہ تھا

چمن تھا ہند کا آزادِ خطرۂ صیاد　　مجال تھی کہ کسی پر کوئی کرے بیداد
محال تھا کہ کوئی لب ہو مائلِ فریاد　　کمال یہ کہ ہر اک شاد، بستیاں آباد

ہر اک غریب کا گھر اک نگار خانہ تھا

سمجھ کے غیر ہمیں دکھ نہ دو چمن والو　　(۲) ہنسو نہ ہم پہ گل و لالۂ و سمن والو
قفس سے چھٹ کے ہم آئے ہیں انجمن والو　　کٹی ہے عمر اسیری میں گو وطن والو!

"اسی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا"

گئے وہ دن کہ سراپا شباب تھی دنیا　　کہاں وہ رات کہ دل چسپ خواب تھی دنیا
کہاں وہ دور کہ جام شراب تھی دنیا　　کسی حسین کا رُخ بے نقاب تھی دنیا

نصیبِ اہلِ وفا، عیشِ جاودانہ تھا

---

[1] سلطان شہیدؒ کا پایہ تخت، صحیح: گنجِ عام۔ آج کل ویرانہ سا ہے۔

تمھیں خبر بھی ہے کیا چیز داغ فرقت ہے، ہنسو نہ ہم پہ خدارا جو غیر حالت ہے
ہمارا سینہ سراپا چراغِ عبرت ہے زبان گنبدِ ٹیپو پہ یہ عبارت ہے
کبھی ہمارے موافق بھی یہ زمانہ تھا

پنھایا ہم کو غلامی کا حلقہ کیوں تو نے؟ دکھایا رنج و مصائب کا جلوہ کیوں تو نے
مٹایا آرزوؤں کا وہ نقشہ کیوں تو نے؟ بڑھایا حوصلۂ ذوق سجدہ کیوں تو نے
سرِ نیاز اگر سنگِ آستانہ تھا

اُسی کے ذکر سے ہے آج گرمئ محفل اسی کے ہجر میں ہیں آج اہلِ دل بسمل
اُسی کی یاد میں روتے ہیں نازنیں قاتل اسی کی قبر زیارت گہہ جہاں ہے جو دل
ہلاکِ شیوۂ نا قدریِ زمانہ تھا

تجھے خبر بھی ہے اے محو خواب تودۂ خاک (۱۳) کہ تیرے سوگ میں کتنوں کی آنکھ ہے نمناک
ہوئے ہیں تیری جدائی میں کتنے سینے چاک کہاں ہے آج ترا جوش و ہمت بیباک
وہ جوش، پشتِ عمل کو جو تازیانہ تھا

وفا کی راہ میں خود کو مٹا دیا تو نے جہاد و سعی کا رستہ بتا دیا تو نے
فلک کے عزم کو نیچا دکھا دیا تو نے زمیں کو زور قدم سے ہلا دیا تو نے
خدا گواہ ترا جوشش بیکرانہ تھا

بجا ہے یہ کہ ہمیں پھر جگا دیا تو نے دلوں میں جوشش تمنّا بڑھا دیا تو نے
پڑا تھا آنکھ پہ پردہ، اُٹھا دیا تو نے بتانِ خوف و تغافل کو ڈھا دیا تو نے
جو عزم تھا ترا، عزم مجاہدانہ تھا

سلام تجھ پہ ہو اے روحِ تاجدارِ دکن سلام تجھ پہ ہو اے حاصلِ بہارِ چمن
سلام تجھ پہ ہو اے نازشِ کنارِ وطن سلام تجھ پہ ہو اے حاملِ وقارِ کہن
خدا کے قہر کا مٹنا ترا بہانہ تھا

غزل

(حضرت فراقؔ گورکھپوری)

برقِ جہندہ حسنِ خراماں — فتنۂ دوراں زلزلہ ساماں
حسنِ گلستاں حیراں حیراں — غنچہ غنچہ سر بگریباں
ہستیٔ عالم لرزاں لرزاں — ساعقہ ساماں حسنِ خراماں
دل میں اُٹھا کے رکھ لے گلستاں — کر لے علاجِ تنگیٔ داماں
شبنم و شعلہ حسنِ گلستاں — پُر نم پُر نم سوزاں سوزاں
ظلمت و نور ہے عشق کی ہستی — تیرہ تیرہ تاباں تاباں
رنگِ شباب اثراتِ محبت — نکھرا نکھرا پنہاں پنہاں
ڈھونڈھ لے مجھکو گلشن گلشن — صحرا صحرا زنداں زنداں
آئے گنہگارانِ محبت — نادم نادم نازاں نازاں
دل کی کھٹک ہے دل کی خلش ہے — ناوک ناوک پیکاں پیکاں
اب ہیں دلِ بے حس کے عناصر — حسرت حسرت ارماں ارماں
کب تک عقدۂ عشق رہے گا — مشکل مشکل آساں آساں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی — کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
بختِ سیہ اور گیسوئے پُر خم — یہ بھی شبستاں وہ بھی شبستاں
گونج اُٹھی ہے رہتی دنیا — بول اُٹھا ہے شہرِ خموشاں
ذرّہ ذرّہ تارا تارا — ششدر ششدر حیراں حیراں
داغِ محبت رازِ محبت — کم کم پیدا کم کم پنہاں

بزمِ چراغاں بھی تاریکی
تاریکی بھی بزمِ چراغاں

بیداری ہے اپنے سہارے
نیند کا جھونکا گردشِ دوراں

آنچ قفس والوں تک آئی
"اب کے بہت ہی شورِ بہاراں"

حسن اور عشق میں کیونکر کہیے
کون ہے پنہاں کون نمایاں

اس کا پانا ہے وہ کرشمہ
سوچ تو مشکل دیکھ تو آساں

ہر نظارہ برق فنا ہے
دیکھ سکوگے حسنِ بہاراں؟

کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبحِ ازل سے خراماں

حسن ہوا چالاک زمانہ
عشق ہے اب تک ناداں ناداں

بے خبری ہے اہلِ جہاں کی
کون ہے گریاں کون ہے خنداں

کم نگہی بھی صدقے ہو گی
دیکھ تو میرا شوقِ فراواں

کس نے موت کی نیند اُڑا دی
جاگ اُٹھی ہے خاکِ شہیداں

کھُلتی چلی ہے عشق کی قیمت
حُسن بھی ہے اب ارزاں ارزاں

اور نظریئے بھی ہیں ممکن
ناداں عشق ہے درد نہ درماں

تھمی تھمی سی صبحِ قیامت
رُکی رُکی سی گردشِ دوراں

کس کی تمکیں وحشت زا ہے
کس کا سکوں ہے سلسلہ جنباں

دُنیا کو دنیا کرنا ہے
یہ منصوبے ساز نہ ساماں

یوں ہی فراق نے عمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

رفتارِ عالم

ہمارے زمانے میں بہت سی نئی ایجادیں ہوئی ہیں، اور اِن کے ساتھ فنِ جنگ کی بھی ایک نئی ایجاد ہوئی ہے جس کی اہمیت آہستہ آہستہ محسوس ہو رہی ہے۔ یہ جنگ کا وہ طریقہ ہے جسے جرمن زبان میں Blitzkrieg کہتے ہیں، اس کے معنی ہیں وہ جنگ جو بجلی کی طرح ہو یعنی اتنی سمتوں اتنی طاقت کے ساتھ اور ایسا اچانک حملہ کیا جائے کہ وہ بالکل بے بس ہو جائے اور اس میں مقابلہ کی طاقت نہ رہے۔ یہ فنِ جنگ کے جرمن ماہروں کی ایجاد ہے اور اس کو اب تک آسٹریا اور چیکوسلواکیا میں آزمایا جا چکا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ آسٹریا اور چیکوسلواکیا میں جرمن فوجوں کا مقابلہ کیا ہی نہ جا سکا۔ پولینڈ میں مقابلہ تو ہوا لیکن اسی Blitzkrieg نے پولینڈ کی ریاست کی ہڈیاں اس طرح توڑ دیں کہ مخالفت سے وہ اپنے ہی کو نقصان پہنچا سکتی تھی، اسی طرح نئے اصول کے مطابق ۹ را پریل کو ڈینمارک اور ناروے پر حملہ کیا گیا، ڈینمارک بارہ گھنٹہ میں فتح ہو گیا، اور ناروے میں اگرچہ مخالفت ابھی تک جاری ہے لیکن اس کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ اتحادی اپنی فوجیں وہاں اتنی تعداد میں اتنے مختلف محاذوں پر پہنچا دیں کہ وہ جرمنی کی فوج پر حاوی ہو جائیں۔

اس کا اندازہ کرنا ابھی بہت مشکل ہے کہ ہر ہٹلر نے ناروے پر حملہ کس خاص مصلحت سے کیا، یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ناروے سے مختلف قسم کا خام مال اور خاص طور سے کچا لوہا جو کہ جنگ کا سامان تیار کرنے میں بہت کام آتا ہے اس لئے اس کا جرمنی پہنچتے رہنا بہت ضروری تھا۔ اتحادی اس میں بہت سی رکاوٹیں ڈال رہے تھے اور آخر میں انگریزوں نے ناروے کے ساحل پر تین جگہ بحری بم کے گولے اس طرح بچھا دیئے تھے کہ کوئی جہاز اس تین میل کی حد کو جو ناروے کے ملک میں شامل سمجھی جاتی ہے چھوڑے بغیر شمال سے جنوب یا جنوب سے شمال کی جانب نہیں جا سکتا تھا، اور جیسے ہی وہ اس

تین میل کی حد سے نکلتا برطانوی جہاز اس کی تلاشی لیتے اور مناسب سمجھتے تو اس کا مال ضبط کر لیتے۔
غالباً اسی کارروائی کے عمل میں آنے سے پہلے ہی جرمنی کو برطانیہ کے ارادے کی خبر ہو گئی تھی اور اس کو غالباً یقین ہو گیا تھا کہ ناروے کی غیر جانبداری کی وہ حیثیت نہ رہیگی جواب تک تھی۔ اس وجہ سے جرمن حکومت نے یہ دعوےٰ کر کے کہ ناروے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ صحیح معنوں میں غیر جانب دار رہ سکے اس پر حملہ کر دینا مناسب سمجھا۔ حملے کے لئے بہت پہلے سے تیاری کی جا چکی تھی ہر تفصیل پر غور کر لیا گیا تھا، اور اب بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمن حکومت کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ اس کا سارا کام پروگرام کے مطابق ہوا۔

ناروے پر حملہ تو بے شک اچانک ہوا، لیکن ہر ہٹلر اپنی طرف سے کئی بار اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ یوروپ کی نئی تقسیم کریں گے اور روس اور اٹلی کو ان کا حق دیکر اپنا حق بھی وصول کریں گے۔ روس کو اس کا حق لیتھونیا، لیتویا، استھونیا اور جنوبی فن لینڈ دیا جا چکا ہے اور اسے بحر بالٹک کی طرف سے اب کسی حملہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ آدھا پولینڈ بھی اسے مل گیا ہے جس کی آبادی روسی یا اکرائنی ہے۔ پولینڈ کا بقیہ حصہ ہر ہٹلر جرمنی کے لئے حاصل کر چکے ہیں، شمالی یوروپ میں اُنھوں نے ڈینمارک، ناروے اور سویڈن کو اپنا حصہ سمجھا تھا اب اسے حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے اگر روس ان کے ساتھ نہ ہوتا، جیسے روس کامیاب نہ ہوتا اگر جرمنی کی سیاست اس کی پشت پر نہ ہوتی۔

اس زمانہ میں جو کہ تہذیبی عروج کا زمانہ ہے سیاست کی ایسی بیباکی جو قوتوں اور ملکوں کو آپس میں اس طرح تقسیم کرے جیسے زمیندار زمین اور مویشی کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں بہت ہی حیرت انگیز ہے، لیکن اس پر بحث کرنا بالکل بیکار ہے۔ غور تو اس پر کرنا چاہیئے تھا کہ اس نئی بیباک سیاست کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور یہی اتحادیوں نے نہیں کیا۔ آسٹریا پر ۱۹۳۸ء پر حملہ ہوا تو وہ اس کی سیاسی مخالفت پر تیار نہ تھے چیکوسلواکیا کے سڈٹین علاقے مسٹر چیمبرلین نے خود ہر ہٹلر کو دیدیئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جب ہر ہٹلر نے چیکوسلواکیا کی ریاست کو بالکل ختم کر دیا

تب کہیں جا کر برطانیہ سے مخالفت شروع کی اور وہ بھی ایسی کہ جس سے جرمنی کی بیباک سیاست کو شکایت کا ایک اور موقع مل گیا' یعنی اس کی بیباکی اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آئی بلکہ مظلومیت کی چادر اوڑھ کر۔ اس وقت اگرچہ ہر ہٹلر اپنے سیاسی ارادوں کو کئی موقعوں پر ظاہر کر چکے تھے' لیکن پہلے کی طرح یہی سمجھا گیا کہ وہ شیخی مار رہے ہیں یا دھمکی دے رہے ہیں۔ اتحادی مدبروں کو اس کا خیال نہ ہوا کہ جیسے ہر ہٹلر اپنے پہلے ارادے پورے کر چکے ہیں ویسے ہی اس مرتبہ بھی کریں گے یا تو بلقان پر ان کا حملہ ہوگا یا ڈینمارک' ناروے اور سویڈن پر۔ اتحادی جن اصولوں کے لئے لڑ رہے ہیں ان کی قدر دنیا سے مٹ گئی تو تہذیب اخلاق اور جمہوری حکومت کا بھی نام نہ رہیگا' لیکن جو طریقہ اِن بیش بہا چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس کے کارآمد ہونے میں اگر کوئی شک کرے تو بیجا نہ ہوگا۔

جرمنی نے ڈینمارک اور ناروے پر ۹ر اپریل کو حملہ کیا تھا' ڈینمارک نے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بارہ گھنٹہ کے اندر جرمنی کی ماتحتی قبول کرلی اور اتحادی بھی اس کو بچانے کی طرف سے ایسے مایوس ہو گئے کہ انہوں نے ۱۳ر اپریل کو ڈینمارک کے جو جہاز ان کی بندرگاہوں میں تھے اُن پر قبضہ کر لیا ناروے کو بچانے کے لئے اتحادی بالکل تیار نہ تھے۔ مسٹر چرچل نے اپنی ایک تقریر میں اِن لوگوں کو بہت سمجھایا اور ڈانٹا جنہوں نے برطانیہ کے بیڑے پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ناروے کی حفاظت نہیں کی اور ناروے کے ساحلوں پر اس طرح پہرہ نہیں دیا کہ جرمنی کے جنگی جہاز ناروے کی بندرگاہوں میں جا کر سپاہیوں کو وہاں اُتار نہ سکیں۔ ناروے اور برطانیہ کے درمیان بحر شمالی کے بیشتر حصّے میں بحری بم بچھے ہوئے ہیں' اور ان کے درمیان صرف چند رستے ہیں جن کی آسانی سے ناکہ بندی کی جا سکتی تھی۔ اگر برطانوی جہازوں کی وہی قدر و قیمت ہے جو مسٹر چرچل نے بیان کی ہے' اور ان سے ناکوں پر پہرہ دینے کا کام اِس واسطے نہیں لیا جا سکتا تھا کہ جرمن آبدوز انہیں ڈبو دیتے تو پھر سیاست کو اور بھی زیادہ ہشیار رہنا چاہیئے تھا اور ناروے پر جرمن حملے کی پیش بندی کے اور طریقے سوچنا چاہیئے تھا'

مسٹر چرچل نے برطانوی بیڑے کو الزام سے بری کرنے کے لئے سارا الزام برطانوی سیاست پر لے لیا ہے، لیکن اس سے بھی ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہوسکتا جو دنیا کو جرمن سیاست کی وبا سے بچانا چاہتے ہیں۔

بہرحال اس سے اب انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس وقت جرمن فوجیں ڈنمارک اور جنوبی ناروے میں داخل ہوئیں اس وقت جرمن سپاہیوں کو لے کر ناروِک کی بندرگاہ میں پہنچ گئے جو ناروے کے بالکل شمال میں ہے اور ناروے کی تمام بندرگاہوں پر جرمنی کی ایک ہی وقت میں قبضہ ہوگیا خبریں بھیجنے کے جتنے ذریعے ہوسکتے ہیں وہ سب بند تھے۔ ناروے کی حکومت دارالسلطنت آسلو سے شمال کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوئی تھی اور وہ ناروے کی فوج کو تیار ہونے کے احکامات بھی نہیں دے سکتی تھی، گویا ناروے کی ریاست کے سر پر پیچھے سے اور اچانک لاٹھی ماری گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کچھ دیر تک بالکل بیہوش رہی۔ پھر جب ہوش آیا تو جگہ جگہ پر جرمن فوجوں کی مخالفت کی جانے لگی اور قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کیا گیا لیکن اس کی اُمید رکھنی فضول ہے کہ یہ قزاقانہ جنگ جرمنی کی طاقت کا مقابلہ کرسکیگی اور منتشر فوجیں اس تنظیم کی تدبیریں اُلٹ سکیں گی کہ جس نے چند گھنٹے کے اندر ملک پر قبضہ کرلیا۔ اتحادیوں نے حملے کی خبر سُنتے ہی اس کا اعلان کیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں ناروے بھیجیں گے اور برطانیہ کے بحری اور ہوائی جہازوں نے جگہ جگہ پر جرمنوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ ناروک، برگن، اور آسلو کے قریب بڑے مقابلے ہوئے لیکن فوج بھیجنے کے ارادے پر اتحادی معلوم نہیں قائم ہیں یا نہیں۔ ۱۴ اپریل کو جو خبر آئی تھی اس میں اس فوج کی دشواری کا اشارہ کیا گیا تھا جو ایسے ساحل پر اُترنا چاہے جس پر دشمن کا قبضہ ہو۔ لیکن ہم نے اس خبر سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا کہ اتحادی اپنی فوجیں ناروے نہیں بھیجیں گے

(م، م)

بین الاقوامی سیاست

غیر جانبداروں کی گت

بین الاقوامی سیاست
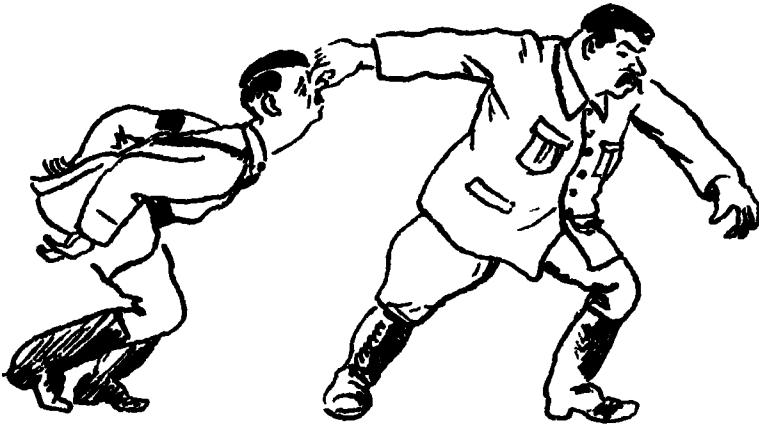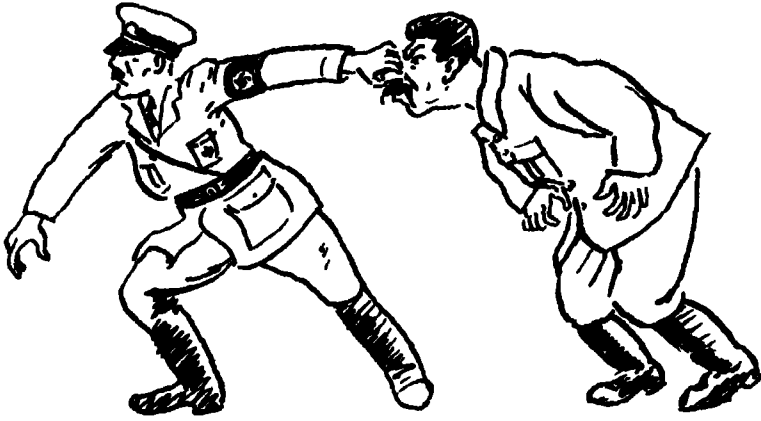
اپنا اپنا موقعہ!

عالمِ اسلام

یورپ میں پچھلے سات مہینوں سے سخت ہولناک جنگ لڑی جاری ہے۔ فریقین کے توپ وتفنگ سے بے کس عورتیں اور معصوم بچے تک محفوظ نہیں، ہر شخص کو ہر لحظہ اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب دشمن کے ہوائی جہاز آگ برسانے کے لئے فضا میں نمودار ہوتے ہیں اور اشارہ پاتے ہی انھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر زمین کے نیچے تہ خانوں میں پناہ ڈھونڈتی پڑتی ہے۔ آٹھ پہر دن میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ ان لوگوں کو دشمن کے حملے سے اطمینان نصیب ہوتا ہو۔

یورپ تو میدان کارزار بنا ہوا ہے اس لئے یورپ والوں کا خوف وہراس ایک قدرتی چیز ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مشرق وسطی اور مشرق قریب میں مراکش سے لے کر بلوچستان اور کابل تک جسے ہم دنیائے اسلام کہتے ہیں افرا تفری کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس وسعت آبادی میں اب تک ایک بندوق بھی سر نہیں ہوتی۔ لیکن ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک میدان جنگ کا پورا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ فوجیں کیل کانٹے سے آراستہ مستعد کھڑی ہیں، آئین قانون کی جگہ کم وبیش فوجی قانون کا عمل درآمد ہے، قواعد اور فوجی مشقتوں کی بھرمار ہے۔ ہر کوئی پریشاں ہے کہ دیکھئے کب اور کس طرف سے اس کے ملک پر حملہ ہوتا ہے۔

مراکش اور الجزائر نسبتاً دور ہیں اور ہٹلر اور مسولینی کی دست برد سے ایک حد تک محفوظ۔ لیکن میسولینی برسوں سے بحیرۂ روم کو کلیتہً اطالوی سمندر بنانے کے راگ الاپ رہا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرانکو کے حق میں مداخلت کا مطلب ہی یہی تھا کہ شمالی افریقہ کی فرانسیسی مقبوضات پر آسانی سے شہ

پڑسکے، ادھر طرابلس پر تو اٹلی قابض ہے اور کئی سال سے اسے فوجی اعتبار سے مستحکم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے، خیال ہے کہ فرانس اور برطانیہ نے اگر جنگ میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو طرابلس سے اٹلی کی فوجیں ایک طرف مصر پر اور دوسری طرف فرانسیسی مقبوضہ ٹیونس پر چڑھ دوڑیں گی، مسولینی گو اس وقت تک جنگ سے الگ ہے لیکن گاہے گاہے رومی شیر غراتا ضرور ہے جس سے فرانس اور برطانیہ پر دہشت چھائی ہوتی ہے اور انھیں مجبوراً مصر اور ٹیونس میں بہت بڑی تعداد میں فوجیں رکھنی پڑی ہیں۔

ترکی اس وقت جس ضغطے میں ہے اس کا ذکر اصولی طور پر پچھلے پرچے میں ہوچکا ہے، ایران کی حالت قریب قریب ترکی کی سی ہے، اور آتے دن یہ خبریں سننے میں آتی ہیں کہ روسی فوجیں ایران کی سرحد پر اکٹھی ہورہی ہیں۔ ایران سے ملی ہوئی عراق کی سرحد ہے اور روسی حملہ کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ یہ جنگ تیل کے بل پر لڑی جائے گی اور جیت اس کی ہوگی جس کے تیل کے ذخیرے کم نہ ہوں گے ایران اور عراق میں برطانوی کمپنی کا تیل کا اجارہ ہے۔ اور برطانی سامراج پر سب سے کاری اور زود اثر ضرب صرف ان نواح میں پڑسکتی ہے، افغانستان گو دنیا سے الگ تھلگ ہے لیکن ہندوستان اور روس کے بیچ میں واقع ہونے سے اس کی اہمیت ایران اور ترکی سے کم نہیں، برطانوی سامراج کے لئے دوسرا خطرہ ہندوستان پر روسی حملہ ہے جو افغانستان کے راستہ سے ہوسکتا ہے، چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ یورپ کے کسی نہ کسی پایہ تخت سے یہ تار دنیا کے طول وعرض میں گشت نہ لگاتا ہو کہ روسی سیلاب کا رخ کچھ دنوں میں افغانستان کی طرف ہوا چاہتا ہے، یمن، حجاز، فلسطین، اور شام فرانس اور برطانیہ کے دشمنوں سے جغرافی لحاظ سے کٹے ہوئے ضرور ہیں۔ لیکن ہوائی قوت کی تاخت وتاراج کے سامنے ارض وسما اور بحر وبر کی پہنائیاں

اب موہوم حیثیت رکھتی ہیں، اس لئے ان کا حال بھی کچھ کم نازک نہیں۔

وسطی ایشیا اور مشرق قریب کا مسئلہ برطانیہ اور فرانس کی شہنشاہیتوں کے لئے بہت اہم بن گیا ہے۔ ان ملکوں کی فوجی اور اخلاقی مدد ان دو سامراجی سلطنتوں کا بہت بڑا سہارا ثابت ہوسکتی ہے۔ ان کے دشمن چاہتے ہیں کہ اس محکوم، نیم آزاد ملکوں کی مسلمان آبادی کو اتحادیوں کے خلاف ابھاریں۔ اور اس طرح سامراج کی شہ رگ پر کاری ضرب لگائیں۔ اس کے برخلاف برطانیہ اور فرانس کی یہ کوشش ہے کہ مراکش سے لے کر پشاور تک اور نہ (ترکی) سے عدن تک کے مسلمانوں کو کسی نہ کسی رشتے میں پرو کر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم اس وقت فاسسٹی، نازی اور بالشویکی سیلاب کو روکنے کا کام لے، اس مقصد کے لئے ڈپلومیسی اور پروپیگنڈہ کے دوررس حربے استعمال کئے جارہے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عربوں ترکوں، ایرانیوں اور افغانوں نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اپنی پچھلی کدورتیں دلوں سے دھو دی ہیں۔ اور وہ خلوص منت سے ان کی دوستی اور حمایت کا دم بھرنے لگے ہیں۔

اس وقت تک اتحادیوں کا کھلا ہوا دشمن صرف جرمنی ہے۔ اور خوش قسمتی سے اتحادیوں کے مشرقی مقبوضات اس کی پہنچ سے باہر ہیں، لیکن روس اور اٹلی کا معاملہ اب تک صاف نہیں، اتحادیوں کو ان کی غیر جانبداری مشکوک نظر آتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک ان دونوں کی غیر جانبداری سے جرمنی ہی فائدہ میں ہے۔ اور آگے چل کر اگر حالات نے کوئی دوسری شکل اختیار کی تو غالباً روس اور اٹلی دشمنوں ہی کی صف میں نظر آئیں گے۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ آنے والے خطرات کی روک تھام پہلے ہی سے کی جائے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسٹالین، ہٹلر اور مسولینی کے ہوا خواہ اسلامی ملکوں میں خال خال نظر آئیں گے، اور وہ بھی چند سر پھرے نوجوان ہیں جن کی ہمتوں کی پستی

ان کے شوق کی بلندی کی تاب نہیں لاسکتی اور انھیں مجبوراً سب سے الگ راہ اختیار کرنا پڑتی ہے ورنہ عام جمہور، حکمراں طبقوں کے پورے طور پر اثر میں ہیں، اور یہ حکمراں کسی قسم کی انقلابی تحریک کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، مسولینی نے طرابلس کے عربوں پر جو ستم ڈھائے ان کی یاد اب تک دلوں میں تازہ ہے۔ اور آج اٹلی والے ریڈیو سے اپنی اسلامی دوستی کا لاکھ وعظ کہیں، ان کی آواز قطعاً بے اثر رہے گی، ہٹلر کو جس بھیانک شکل میں اب تک پیش کیا گیا ہے اور جس سینہ زوری سے اس نے کمزوروں کو ملیامیٹ کیا ہے، اس کو دیکھ کر اسلامی ملک جو سب کے سب ابھی کمزور ہیں کبھی بھی جرمنی کا دل سے بھلا نہیں چاہ سکتے۔ چنانچہ برلن ریڈیو اسٹیشن سے عربی، ترکی اور فارسی کا سارا پروپیگنڈا ہٹلر کی نفرت کو کم نہیں کرسکتا، روس سے اس کے اسلامی ہمسائے خائف ہیں، ان کی دوستی اس وقت تک تھی جب تک وہ فرانس اور برطانیہ کی دراز دستیوں سے نالاں تھے، اب حالات بالکل بدل گئے ہیں اس لئے ترکی، ایران اور افغانستان روس سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔

روس میں ایک انقلابی نظام چل رہا ہے۔ اور یہ نظام جارحانہ ہے جو آگے بڑھنا چاہتا ہے، نیز روس نے ایران، افغانستان اور ترکی کی سرحدوں پر ان ملکوں کی ہمجنس اور ہم زبان لوگوں کی نیم آزاد اشتراکی جمہوریتیں قائم کر رکھی ہیں، ظاہر ہے روس جوں جوں مضبوط ہوتا جائے گا، ان اشتراکی جمہوریتوں کا اثر بھی پھیلتا جائے گا، اس میں ترکی، افغانستان اور ایران کو اپنی موت نظر آتی ہے، کیونکہ اشتراکیت کے بہاؤ میں کمزور قوموں کا اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنا کسی طرح ممکن نہیں۔

یہ اسباب ہیں جنھوں نے اسلامی ملکوں کی تمام سیاسی جماعتوں کو جو جنگ سے پہلے برطانیہ اور فرانس کی سخت حریف تھیں آج ان دونوں کا ہمدرد بنا دیا ہے۔ اور ہر طرف

سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اسلام جمہوریت کا حامی ہے اور تمام مسلمان جمہوری سلطنتوں یعنی فرانس اور برطانیہ کے دل وجان سے خیر خواہ ہیں۔ اور ہر طرح ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں اتحادی اس خیر خواہی کے جذبہ کو ہر ممکن تدبیر سے تقویت پہنچا رہے ہیں۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ اگر لڑائی طول کھینچ گئی اور اتحادیوں کو دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوتا گیا تو مشرق قریب اور وسطی ایشیا کی اسلامی حکومتوں کی سیاست میں بہت بڑا تغیر ہو کر رہے گا۔

ایک صدی پہلے دنیا ئے اسلام کی ایک بری بھلی وحدت موجود تھی، عثمانی ترک اس وحدت کے بانی تھے اور اصل میں سیاسی قوت اور بظاہر مذہب کے نام سے انھوں نے اس وحدت کو ۱۹۱۴ء کی جنگ تک سنبھالے رکھا۔ ان کی شکست سے اسلامی وحدت کا شیرازہ پارہ پارہ ہوگیا، اور ایک سلطنت کی بجائے بیسیوں ریاستیں بن گئیں، تعجب یہ ہے کہ اس وحدت کو توڑنے کے ذمہ دار وہی لوگ تھے جو آج عالم اسلام کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے بہت بڑے داعی ہیں۔ یعنی برطانیہ اور فرانس۔ یہ ہیں سیاست کی نیرنگیاں! ان دونوں نے اسلامی ملت کے جسم کی اس طرح تکا بوٹیاں کیں کہ شام کے ایک مختصر سے صوبہ میں جس کی آبادی بمشکل ایک کرور ہوگی کوئی چھ سات جمہوریتیں قائم کر دیں۔ لیکن آج برطانیہ اور فرانس، وحدت عربی، وحدت اسلامی اور معلوم نہیں کس کس وحدت کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اسلامی وحدت کی یہ نئی تعمیر یورپی سیاست کا شاہکار ہے۔ قارئین "جامعہ" کے لئے اس کا ایک اجمالی خاکہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کچھ عرصہ ہوا معاہدہ سعد آباد کے ذریعہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کو ایک صف میں لایا گیا۔ اس معاہدہ پر بڑی خوشیاں منائی گئیں، اور مشرقی جمعیت الاقوام کے خواب دیکھے جانے لگے، دراصل اس معاہدہ کی تہ میں

برطانوی سیاست کام کر رہی تھی، اور یہ روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی ایک
تدبیر تھی۔ اب اس معاہدہ کو اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اور ریلوے لائن کے ذریعہ
ان چاروں ملکوں کو باہم ملانے کا کام زوروں پر جاری ہے۔ ترکی کو بہت بڑی
تعداد میں اسلحہ خریدنے کے لئے قرضہ دیا ہے۔ اِدھر ایران کو قرضہ دینے کی
گفتگو ہو رہی ہے، برطانیہ کا خیال ہے کہ اگر روس مشرق کا رُخ کرے تو
ایران ترکی اور افغانستان اتنے مضبوط ہوں کہ وہ روس کا راستہ روک لیں،
اور اسے برطانوی مقبوضات تک بڑھنے کا موقعہ نہ دیں۔

اٹلی کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے "اتحادِ عرب" کا منصوبہ مفید ثابت
ہو رہا ہے، عراق کے فوجی افسر یمنی فوجوں کو قواعد سکھانے صنعاء پہنچ گئے ہیں،
ابن سعود کا ایک بیٹا امام یمن کی زیارت کو گیا ہے۔ دوسرا بیٹا خلیج فارس
کے ساحلی شہر کویت کی سیر کر رہا ہے۔ عراق اور نجد میں پرخاش چلی آئی تھی
زیادہ دن نہیں گزرے کہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ کرا دیا۔ فلسطین کی
وجہ سے عرب خفا تھے اب عراق اور مصر کے وفد فلسطین کے تباہ و برباد عربوں
میں زرِ امداد تقسیم کر رہے ہیں، مصر تو اسی اتحادِ عرب کا مرکز ہے۔ اور برطانوی
سیاست کی رہنمائی میں یہ کام بڑے اچھے پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔

ازہر دیندار عربوں کا ذہنی مرکز ہے، اور اس کے موجودہ شیخ مصطفیٰ
المراغی برطانیہ کی اس اتحادِ عرب پالیسی کے پورے موید ہیں ان کی وساطت
سے اب سوڈان میں عربی کلچر کا احیاء ہوگا تاکہ حبش کی طرف سے اٹلی کے پروپیگنڈے
کا جواب عربی وحدت سے دیا جا سکے، شمالی افریقہ میں مراکش الجزائر اور ٹیونس
کے پڑھے لکھے طبقے عربی وحدت کے پرستار ہیں، اس انبوہ میں طرابلس سے
اٹلی کی عرب دوستی کی آواز بھلا کون سنے گا! بہرحال مشرق میں ترکی ایران

عراق اور افغانستان کی سیاسی وحدت اور مغرب میں عربوں کے اتحاد کی مدد سے برطانیہ اور فرانس روس اور اٹلی کے بالشویکی اور ناشسٹی رو کو روکنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔

اسلامی وحدت کی اس تعمیر میں نہ کسی ایک مسلمان قوم کا سیاسی غلبہ اثر انداز ہے اور نہ مذہبی جذبہ، بلکہ ملک اور وطن کی ٹھوس ضرورتیں ہیں جو ان پراگندہ قوموں کو ایک لڑی میں پرو رہی ہیں۔ البتہ یہ وحدت اور اتحاد فرانس اور برطانیہ کے جھنڈے تلے صورت پذیر ہو رہا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسلامی وحدت کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی بھی ہو سکے گی یا ہمیشہ دوسروں کا آلۂ کار بن کر رہے گی۔

(نقشہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

تاریخ مسلم لیگ

یہ نہ صرف مسلم لیگ کی تاریخ ہے بلکہ غدر کے بعد سے اب تک مسلمانوں کے سیاسی وجود کی تاریخ ہے۔ پہلے باب میں مسلم لیگ کے قیام سے پچاس سال پہلے کے حالات درج ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے دستور جدید ۱۹۳۵ء کے پاس ہونے تک کے تمام واقعات کا تفصیلی بیان اور اس کے تمام اہم پہلوؤں پر سیر حاصل بحث اس میں ملے گی۔ ہر شخص کے لئے جسے سیاست سے دلچسپی ہو خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔ ضخامت ۳۵۲ صفحات قیمت مجلد عار

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

اسلامی ریاستیں

دُنیائے ادب
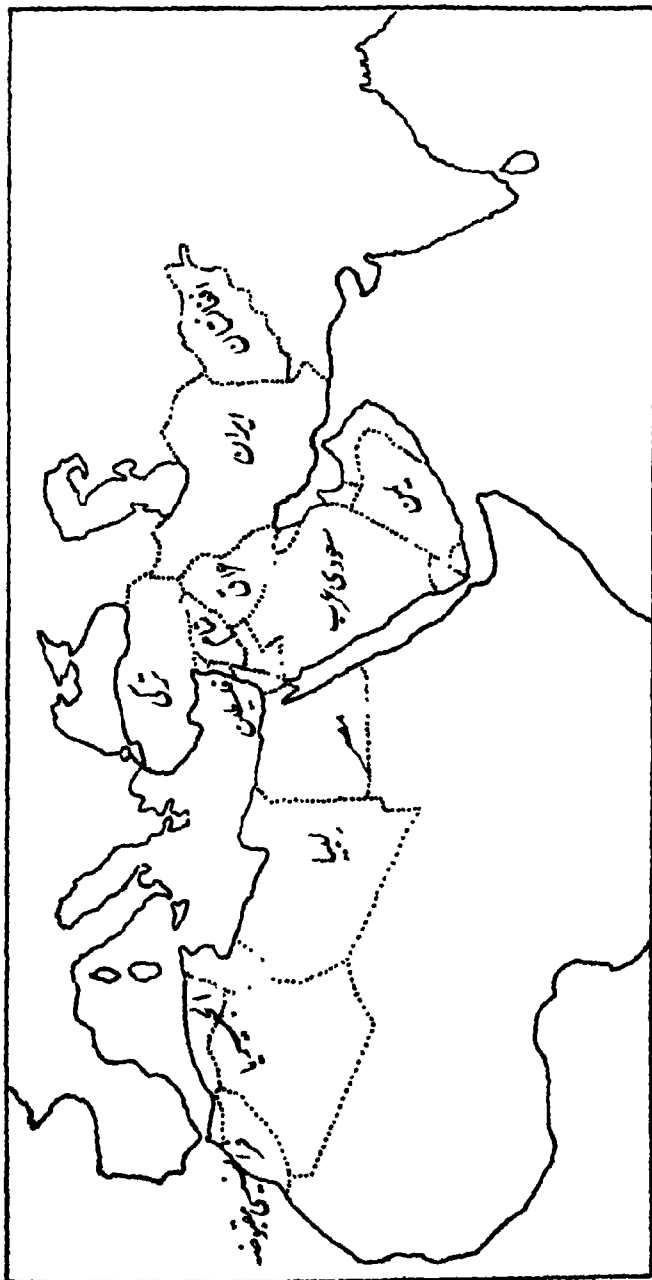
(۱) موجودہ انگریزی ڈرامہ۔ ۲۹ر فروری کو مسٹر آر ی منن نے ٹاؤن ہال بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ انگریزی کے موجودہ ڈرامے کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کے ڈرامے تو وہ ہیں جن پر ایک خاص قسم کا مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مسٹر برنارڈ شا اس قسم کے ڈرامہ نگاروں میں سب سے آگے ہیں۔

دوسری قسم کے ڈرامے وہ ہیں جن میں اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے بڑے پہلو پیش کئے جاتے ہیں، اور جنہیں دیکھ کر اوسط طبقہ کے عوام ایک خاص قسم کا سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ایسے لکھنے والوں میں مسٹر نونس ڈیل کوڈرڈ اور سومرسٹ مام کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تیسری قسم طربیہ ڈراموں کی ہے جو دوسری قسم کے ڈراموں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران میں مسٹر منن نے ترقی پسند گروہ کی ادبی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا، اور اس سلسلہ میں بتایا کہ اس گروہ نے روس کے ڈراموں سے متاثر ہو کر سنہ ۱۹۲۴ء سے نئے قسم کے ڈرامے لکھنے شروع کئے پچھلے دو تین برسوں میں انگلستان نے محسوس کیا کہ اسے کوئی بڑی لڑائی لڑنی پڑے گی، اور اس خیال کے ماتحت اس ترقی پسند گروہ نے تازہ سیاست کے اہم پہلوؤں کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنا لیا۔

اُردو میں ایک تو یونہی سرے سے ڈراموں کی کمی ہے، اور جو لکھے جاتے ہیں اُن میں اکثر زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی کشمکشوں کا آئینہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ ڈرامہ ہی ایک ایسی

صنف ہے جس کی مدد سے عوام کو ملک اور قوم کی سیاسی اور سماجی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جاسکتا ہے۔ اس نئے ڈرامہ نگاروں کو انگریزی ڈرامے کی اس ترقی پسند روش سے سبق حاصل کرکے انہیں پرانے راستوں سے ہٹاکر نئی راہوں پر لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۲) بنگالی ادب کا ایک سال:۔ ہیرندرناتھ مکرجی نے ۱۴ر اپریل کے اسٹیٹسمین میں 'بنگالی ادب کا ایک سال' کے عنوان سے ایک مضمون لکھتے ہوئے گذشتہ سال کی ادبی پیداوار کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ سال کچھ اچھا نہیں رہا۔ حالانکہ افسانے اور شاعری کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، ٹیگور کی کئی چیزیں شائع ہوئیں جن میں سے ایک اُن کے خطوں کا مجموعہ ہے اور دوسرا ایک ڈرامہ۔ اس کے علاوہ ٹیگور کے مضامین کے دو ضخیم مجموعے شائع ہوئے۔ خود ٹیگور کی زندگی اور اُن کے کام پر اس سال کئی کتابیں نکلیں۔ بنکم چندر چٹرجی کے ادبی کارناموں کا ایک مجموعہ مفصل تنقید کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایشور چندر ودیا ساگر کے مضامین نثر کو مرتب کرکے شائع کیا جارہا ہے۔

(۳) کناری کا نیا ادب:۔ کناری زبان کے نئے ادب پر پروفیسر کلکارنی نے ایک مقالہ لکھا ہے اور اور اس میں اس زبان کے ادب کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کناری زبان کے مختصر افسانے ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بیحد بلند ہیں۔ ناول اور تنقیدی ادب بھی تیزی کے ساتھ ترقی کررہا ہے۔ بچوں کے ادب اور سائینس کی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے، لیکن ان دو حیثیتوں کے علاوہ کناری ادب اور کچھ زیادہ ترقی نہیں کررہا ہے۔

(۴) ہندی کے موجودہ دور کے شاعر:۔ مارچ کے پی، ای، این میں موجودہ دور کے ہندی کے شاعروں کی ایک فہرست شائع ہوئی ہے۔ ہم اس جگہ اُسے ناظرین کی دلچسپی کے لئے شائع کرتے ہیں:۔

(۱) بھارتیندر و ہریش چندر (۱۸۵۰ - ۱۸۸۵) موجودہ طرز شاعری کا بانی، جس نے شاعری کے موضوع اور اس کی بحروں میں تنوع پیدا کیا اور شاعروں کو اٹھارویں صدی کی رسمیات

سے پاک کیا۔

(۲) ایودھیا سنگھ اپادھیا (۱۸۶۵ـ)

(۳) مہابیر پرشاد دِویدی (۱۸۶۴ - ۱۹۳۸) ہندی شاعری کو سادہ اور نیچرل بنایا۔

(۴) میتھلی سرن گپتا (۱۸۸۶) انہیں بجا طور پر ہندی کا قومی شاعر کہا جا سکتا ہے۔

(۵) رام نریش ترپاٹھی (۱۸۸۹) بہت اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نقّاد بھی ہیں۔

(۶) ویوگی ہری (۱۸۹۶ —)

(۷) ٹھاکر گوپال سرن سنگھ (۱۸۹۱ —)

(۸) جے شنکر پرشاد (۱۸۸۹ - ۱۹۳۸) موجودہ ہندی شاعری میں "مذہبی" رنگ پیدا کرنے کا بانی۔

(۹) سمترا نندن پنت (۱۹۰۱ —)

(۱۰) سوریا کانت ترپاٹھی (نرالا ۱۸۹۸ —)

(۱۱) رام کمار ورما (۱۹۰۵ —)

(۱۲) بھگوتی چرن ورما (۱۹۰۳ —)

(۹ تا ۱۲) موجودہ دور کے نوجوان شاعر جن کی شاعری پر مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

(۱۳) سیارام سرن گپتا (۱۸۹۵ —)

(۱۴) مہادیوی ورما (۱۹۰۷ —)

(۱۵) سبھدرا کماری چوہان (۱۹۰۴ —) انہوں نے بعض بہت اچھی قومی نظمیں لکھی ہیں ان میں "جھانسی کی رانی" بہت مشہور ہے۔

(۱۶) بال کرشنا شرما (۱۸۹۹ —) ان کی نظموں میں تغزّل اور قومیت کا عنصر غالب ہے۔

(۱۷) ماکھن لال چترویدی (۱۸۸۸) انہوں نے بھی بعض بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

خبریں:-

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے حال ہی میں "بمبئی کرانیکل" میں ایک مضمون "گجرات میں ہندوستانی" کے عنوان سے لکھا ہے، اور اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ اُردو ادب کی ابتدائی تصانیف یا تو دکن میں ہوئیں یا گجرات میں۔ دکن اور گجرات کے ادب کے متعلق اب تک جو تحقیقات ہو چکی ہیں، مضمون بعض حیثیتوں سے اُن پر ایک مفید اضافہ ہے۔

انگلستان میں جتنے ہندوستانی مُصنّف ہیں اُن کی تجویز ہے کہ انڈین رائیٹنگ (Indian writing) کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستانی مُصنفّوں کے خاص خاص مضامین چھاپے جائیں۔ جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے اُن میں ڈاکٹر ملک راج آنند، مسٹر اقبال سنگھ اور ڈاکٹر ششادھر سہنا کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اس رسالہ کا دفتر ۱۶ الیٹل رسل اسٹریٹ لندن (ڈبلیو، سی، ون) ہو گا اور ہندوستانی خریداروں کے لئے اُس کا چندہ تین روپے سالانہ ہو گا۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا ادب میں جو مرتبہ ہے اُس کا اعتراف دنیا کے لوگ مختلف طریقے سے کر چکے ہیں۔ حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ٹیگور کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے میں ان کی ہشتاد سالہ برسی منائی گئی ہے۔

اس سال کے شروع میں انگریزی شاعر ہمبرٹ اُلف کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال سے انگریزی ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے کہ اُلف موجودہ دور کا بہت اچھا شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا نقاد بھی تھا۔ اُس کی شاعری اور تنقید میں طنز کا عنصر اُس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(د-ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اُردو کے ہندو ادیب

اُردو زبان ہندو مسلمانوں کے آپس کے میل ملاپ کی پیداوار ہے، اور اُردو ادب کے پروان چڑھانے میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں - فرق صرف یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی فضاؤں اور زمانہ کی بدلتی ہوئی حالتوں کی وجہ سے ایک قوم کو زبان کی زیادہ خدمت کرنیکا موقع ملا اور دوسری کو کم۔ لیکن تذکرہ نویسی نے ہندو شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ حق تلفی سے کام لیا ہے، اور ادب کی خدمت میں ہندوؤں نے جو حصّہ لیا ہے اُس کا ذکر اکثر اوقات کسی قدر کمی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی موجودہ سیاسی ضروریات کا تقاضا ہے کہ ہندو مسلمان اس بات کو محسوس کریں کہ اُن کی زندگی کی تمام اہم چیزیں، جن میں زبان اور ادب خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں آپس کے اتفاق و اتحاد کا نتیجہ ہیں۔ اِس لئے ہر قوم پرست اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اُس باہمی افتراق کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے جو حکومت کی پالیسی نے ضرورتاً ہندوستان کی دو قوموں کے درمیان پیدا کر دیا۔ ادبی حلقوں میں بھی یہ کام سرگرمی سے ہو رہا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس میں اور زیادہ سرگرمی دکھائی جائے۔ جناب ناظر کاکوروی کی کتاب "اُردو کے ہندو ادیب" ان مسلسل کوششوں کی ایک کڑی ہے۔ اسے انور بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

مُصنّف نے کتاب لکھنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے، اور اُس میں زبان اور ادب کے جھگڑے کے متعلق مختلف قسم کی بیحد معلومات جمع کی ہیں۔ لیکن جہاں تک کتاب کے اصل موضوع یعنی "اُردو کے ہندو ادیبوں" کا تعلق ہے کتاب تشنہ اور غیر مکمل ہے۔ گو مُصنّف نے شروع

ہی میں کہہ دیا ہے کہ "اس رسالہ کا مقصد نقد و تبصرہ نہیں ہے محض روشناس کرانا ہے"
لیکن صرف کہہ دینے سے اُس کی ذمّہ داری کم نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ "روشناس کرانے"
لئے بھی ضروری ہے کہ کم از کم تمام خاص خاص شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کر دیا جاتا۔ پہلی ہی نظر میں بعض خاص خاص
شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جن میں برہمن سرشار، امر چند قیس جالندھری،
لکھنوی، نوبت رائے نظر، کرشن چندر، ملک راج آنند کے نام خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اُردو
ادب کی اتنی زیادہ خدمت کی ہے جتنی مصنّف کے منتخب کئے ہوئے اکثر شاعروں اور ادیبوں نے نہیں کی ہے۔

کتاب کی ترتیب ایسی ہے کہ اُسے دیکھ کر جی گھبراتا ہے۔ پوری کتاب میں ۲۵۶ صفحے ہیں
شروع میں ضیاء الحسن علوی صاحب اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے دو خط ہیں، جن میں
اُنہوں نے کتاب کو سراہا ہے۔ اُس کے بعد سر تیج بہادر کا وہ خطبہ نقل کیا گیا ہے جو موصوف
نے انجمن ترقی اُردو کے جلسہ کی صدارت کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی صاحب
کا دیباچہ ہے۔ ان سب چیزوں کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے

مختصر سی تمہید کے بعد مصنّف نے اُردو کے مختلف تذکروں کی مثالیں پیش کر کے اس اعتراض
کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر ہمارے تذکرہ نگاروں پر یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ انہوں
نے ہندوؤں کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ اس کے بعد اُردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بالکل مختصر
ذکر کر کے اُن میں سے ہر ایک کے کلام کی مختصر مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن ان میں بھی بعض اوقات توازن سے
کام نہیں لیا گیا، اور ایسے شاعروں کے کلام کی مثالیں کئی کئی صفحے میں لکھدی ہیں۔ جن کا کلام عام طور پر
لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔

تذکرہ نگاری ۱۳۳ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے، اور اُس کے بعد مصنّف اشہبِ قلم کو مختلف
میدانوں میں دوڑانے لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو اُردو ہندی کے پیچیدہ مسئلہ کے متعلق لکھنا شروع کیا ہے۔
اور اس سلسلہ میں مولانا عبد الحق، سر تیج، پنڈت وشوناتھ ورما، پیارے لال شاکر، پنڈت کشن پرشاد کول،
مسٹر فیلڈن، جواہر لال نہرو، سر سکندر کے خیالات اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا

سائمن کمیشن رپورٹ اور بعض دوسری رپورٹوں کے حوالے سے ہندوستانی زبان کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اخباروں، رسالوں کی گنتی کرکے بتایا ہے کہ ملک میں مختلف زبانوں کے کتنے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ہندوستان کے باہر اُردو بولنے والے کتنے ہیں۔ ان سب باتوں کے بعد رسم الخط کا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے، اور مختلف رپورٹوں، صدارتی تقریروں اور مختلف مُفکّرین کے اقتباسوں سے اس بات کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اور آگے چل کر ہندوستان کے اُن قدیم اور جدید ہندو پریسوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اُردو کی ترقی واشاعت میں نمایاں حصّہ لیا، اور ہر مطبع کے سلسلہ میں اُن تمام ہندو مسلمان اہلِ قلم حضرات کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے ان ہندو پریسوں کی سرپرستی میں اُردو کی خدمات انجام دیں

اس میں شبہ نہیں کہ یہ تمام مسائل بیحد اہم ہیں، اور زبان اور ادب کی تاریخ میں نہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہر چیز کی ایک جگہ ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اہم ہونے کے باوجود اس کتاب کے موضوع سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنّف نے اِن تمام چیزوں کے جمع کرنے میں بڑی کاوش اور جانفشانی سے کام لیا، لیکن اگر انہیں کسی مُرتّب شکل میں پیش کیا جاتا تو بے حد مفید خدمت ہوتی۔ اس کتاب میں یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر کسی قدر مفید ثابت ہوسکتی تھیں، اگر کتاب کے شروع میں کوئی باقاعدہ فہرست ہوتی اور پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہوسکتا کہ کتاب کے اندر کیا کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں چند مفید ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں بہت سی ایسی اُردو کتابوں کی فہرست معہ اُن کے سنہ اشاعت کے درج ہے جن کے مصنّف ہندو تھے۔ دوسرے ضمیمہ میں یوروپین مُصنّفوں کی اُردو کتابوں کے نام درج ہیں۔ اس کے بعد شاعری کے مختلف دور کرکے ہر دور کے شاعروں کے نام اس میں لکھے گئے ہیں۔ دوروں کی تقسیم بھی بہت دلچسپ اور انوکھی ہے۔ شہاب الدین غوری سے لیکر جارج ششم تک ہر بادشاہ کے عہد میں جتنے شاعر ہوئے ہیں اُن کے نام اِس بادشاہ کے نام کے نیچے لکھ دیئے گئے ہیں۔ پھر دو صدی کی اُردو ادب کی خاص خاص تاریخیں لکھی گئی ہیں، اور اُن کے آگے اُس خاص سنہ کا مشہور ادبی واقعہ۔ اس کے بعد سرمایۂ مشترک، کے عنوان کے نیچے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی

اور مولانا عبدالماجد کے خیالات زبان کے متعلق نقل کئے گئے ہیں، اور اس کے بعد ہی فوراً بغیر کسی عنوا کے کوئی چالیس صفحے میں تھوڑے سے اور شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید ان کا نام بعد میں مُصنف کے ذہن میں آیا۔ بالکل آخر میں ایک ضمیمہ میں کئی مشاہیر ملک کے وہ پیغامات شامل کئے گئے ہیں جو اُنہوں نے انجمن ترقی اُردو کی اُردو کانفرنس کے موقع پر بھیجے تھے۔ اس کے بعد کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ مُرتب کی کاوش اور محنت لائق ستائش ضرور ہے لیکن ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ اپنے مواد کی ترتیب بہتر کریں گے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ عیر میں الوار بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔ (د۔ع)

سہارا اور دوسرے افسانے

یہ کتاب شفیق بانو صاحبہ مدیرہ "خاتونِ مشرق" کے اکیس افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے جو ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے سرورق لکھا ہوا ہے "سہارا اور دوسرے رومانی افسانے" اور اس میں شبہ بھی نہیں اس مجموعے کے سارے افسانے رومانی کیفیت سے پُر ہیں۔ اکثر افسانوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات عموماً زندگی میں رُونما نہیں ہوتے۔ لیکن افسانہ نگار نے اپنے اندازِ بیان سے اُن میں رومان کی وہ کیفیت پیدا کردی ہے جہاں صداقت کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں۔

افسانوں پر جذباتی عنصر غالب ہے، اور اسی چیز نے ان افسانوں کو دلچسپ بنادیا ہے، لیکن لیکن کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کی رو میں بہنے کی عادت پڑجانے کے بعد ادبی توازن اور دلکشی کو باقی نہیں رکھا جاسکا ہے

افسانوں کے طرز میں دلکشی ہے۔ زبان بھی سادہ اور لوچدار ہے، لفظوں کے استعمال میں ایک خاص قسم کی کیفیت ہے۔ خصوصاً اکثر افسانوں کے خاتمے محض لفظوں کے رومانی استعمال ہی کی وجہ دلچسپ ہوگئے ہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ "سہارا" اس طرح ختم ہوتا ہے " ایک بے سہارے کو ایک بے سہارے کا "سہارا" مل گیا۔ اُن کے دوسرے افسانے " ملاپ" کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے "جوگی کی اُمیدوں کی صبح ہوئی لیکن تاریکیوں کے سایہ میں! پجاری کو دیوی ملی لیکن کب؟ جب کہ زندگی کی شام ہوچکی! محبت کا چاند طلوع ہوا لیکن کب؟ جب کہ حسرتوں کی گھٹاؤں میں اس کی روشنی کا عکس

بھی مدھم پڑ گیا! دنیا ختم ہو کر دنیا ملی ـــــ زندگی ختم ہو کر زندگی کا مقصد ملا۔"

افسانوں کے پلاٹ اور زبان میں کہیں کہیں ناہمواری ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے افسانے دلچسپ ہیں

کتاب عہ میں شفیق بانو صاحبہ 'نجیب آباد کے پتہ سے مل سکتی ہے۔ ر۔ ع

مجلس اشاعت دکنی مخطوطات

حال ہی میں حیدر آباد دکن میں نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں قدیم دکنی مخطوطات کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک مجلس وجود میں آئی ہے۔ اس مجلس کا مقصد قدیم شاہان دکن کے ادبی آثار اور اُردو کی قدیم کتابوں کی اشاعت ہے۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب اس کے صدر، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب نائب صدر اور مولوی سید محمد صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔ فی الحال اس مجلس نے مندرجہ ذیل پانچ کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۔ کلام الملوک۔

۲۔ مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال۔

۳۔ مثنوی طوطی نامہ۔

۴۔ مثنوی پھول بن۔

۵۔ قصہ بے نظیر۔

نواب سالار جنگ بہادر کی اس علم دوستی پر ہم انہیں مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ درحقیقت اُردو قدیم مخطوطات کی حفاظت اور اشاعت ایسا کام ہے جو اردوداں پبلک ہمیشہ نظر احسان سے دیکھے گی اور جو اُردو کی تاریخ میں ایک نہ مٹنے والے سنگِ راہ کا کام دے گا۔ موجودہ پانچ کتابوں کی اشاعت اور طباعت جس کاوش اور دریا دلی سے کی گئی ہے وہ اراکین مجلس اور نواب صاحب کے ذوق وشوق پر دال ہے۔ ہر کتاب کا کاغذ طباعت اور کتابت بہت اعلیٰ قسم کی ہے۔

جگہ جگہ متروک دکنی الفاظ کے معنی بھی دیدیئے ہیں۔ سرورق کا خاص اہتمام یہ کیا ہے کہ غالباً پُرانی کتابوں ہی کا قائم رکھا ہے تاکہ پُرانا پن محسوس ہوتا ہے۔ اب ہم ہر کتاب کا الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

کلام الملوک:-

صفحات ۱۴۲، مرتبہ میر سعادت علی رضوی قیمت تین روپے۔ اس میں سلاطین دکن بہمنیہ و قطب شاہی دونوں خاندانوں کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ مرتب نے مختلف نسخوں اور مختلف کتابوں کی چھان بین کے بعد اسے ترتیب دیا ہے۔ اور جو دقتیں انہیں پیش آئی ہیں یا جو کمیاں اس میں رہ گئی ہیں اُن کو بھی ظاہر کر دیا ہے مثلاً قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کی ایسی معتبر تاریخیں موجود نہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ان کے کلام کا تبصرہ کیا جا سکے۔ نیز کلام اس قدر مختصر دستیاب ہوا کہ اس پر مفصل تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم رضوی صاحب نے جو کچھ فراہم اور یکجا کر دیا ہے وہ اس کام کی طرف ذوق و شوق رکھنے والوں کے لئے اچھا آغاز ہے۔

ہر بادشاہ کا مختصر حال نیز ہر دو خاندان کا شجرہ نسب داخل کر دیا ہے اور تقریباً ہر بادشاہ کی تصویر آرٹ پیپر پر دیدی گئی ہے۔

قصہ بے نظیر:-

۱۶۰ صفحات، مرتبہ عبدالقادر سروری صاحب۔ قیمت ۱۲ آنہ۔ یہ قصہ در اصل عام طور پر "قصہ تمیم انصاری" کے نام سے موسوم مشہور ہے۔ اس مثنوی کا مصنف صنعتی تھا جو بیجا پور کا رہنے والا اور دل شاہی خاندان کے چھٹے حکمراں عادل شاہ (۱۰۳۷ھ و ۱۰۶۷ھ) کا ہم عصر تھا۔ یعنی اس قصہ کی اُردو تین سو ل پہلے کی اُردو کا نمونہ ہے۔

صنعتی کے اپنے حالات ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ لیکن قصہ کی داخلی شہادتوں سے اس کے کسی قدر واقعات سامنے آتے ہیں۔ پوری مثنوی میں بارہ مقامات ہیں۔ ان کے علاوہ کئی تمہیدی ابواب مثلاً حمد و نعت، منقبت شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ۔ بارہ مقامات میں سند باد جہازی کی طرح انصاری کے بارہ مہمات کا تذکرہ ہے۔ واقعات ما فوق فطری اور مہماتی ہیں۔ شاعر نے اپنے تخیل کو تمان گو کی طرح آزاد چھوڑ دیا ہے، لیکن واقعات دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی پس منظر اپنے ساتھ رکھتے دجال، دابتہ الارض، خضر، دیو، پریاں، سلیمان علیہ السلام اس قسم کے تمام افراد سے مثنوی کا ہیر

ابو تمیم انصاری دراصل ایک صحابی تھے جن کے متعلق مافوق الفطرت قصے مشہور ہیں ان کو ہیرو بنا کر اس قسم کی اور بھی کتابیں مختلف وقتوں میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً قصہ تمیم انصاری مصنفہ سید محی الدین قادری جعفری ابن سید شاہ شمس الدین قادری گنگوہی۔ یہ قصہ نثر میں ہے' یا قصہ تمیم انصاری مصنفہ غلام رسول' ساکن کھبات' منظوم تصنیف ۱۲۱۰ھ۔ مگر صنعتی کی مثنوی ان سب میں بہتر ہے اور اپنے اندر ڈرامائی خوبیاں رکھتی ہے۔

یہ مثنوی مقبول کیوں نہیں ہوئی' اس کی وجہ فاضل مرتب صاحب یہ بتاتے ہیں کہ اول تو اس وقت بیجاپور کا دربار بہت بڑے بڑے شاعروں کے نغموں سے گونج رہا تھا' اس لئے صنعتی ان کے مقابلہ میں نہ آسکا' دوسرے یہ کہ اس کی مثنوی عرصہ تک نظروں سے اوجھل رہی۔ اس کا کوئی مخطوطہ یورپ کے کسی کتبخانہ میں نہیں ہے صرف ایک جامعہ عثمانیہ میں ہے اور ایک انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں جو بہت ناقص نسخہ ہے۔ بہرحال مرتب نے اب اسے بڑی کاوش سے دیدہ زیب صورت میں پیش کر دیا ہے' اُمید ہے قدیم اُردو کے شائقین اس کی ضرور قدر کریں گے۔

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال

۲۲۶ صفحات' مرتبہ میر سعادت علی رضوی صاحب قیمت عہ۔ یہ مثنوی مشہور قدیم شاعر غواصی نے ۱۰۳۵ء میں لکھی۔ غواصی سلطان عبداللہ شاہ کے دربار میں ملک الشعراء کی حیثیت رکھتا تھا۔ قصہ دراصل الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن غواصی نے ایک فارسی نثر سے ترجمہ کیا ہے حالانکہ اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

شروع میں فاضل مرتب نے غواصی کے مختصر اور کمیاب حالات زندگی لکھے ہیں' پھر غواصی کی شاعری اور طرز بیان' قصہ کے ماخذ اور مختلف زیر نظر مخطوطات کا تذکرہ ۷۴ صفحات میں کیا ہے۔

غواصی کی روانی کلام خوب چیز ہے۔ قدردانِ سخن قدیم کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

مثنوی پھولبن:۔

صفحات ۳۰۶' مرتبہ عبدالقادر سروری قیمت تین روپے۔ پھولبن' ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ہے

جو عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گیارہویں صدی ہجری میں تصنیف کی گئی۔ سلاست اور روانی اس کا خاص حصہ

شروع میں عبدالقادر صاحب کا لکھا ہوا ۹۱ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں فاضل مرتب نے دکن میں

مثنوی کا ارتقا، مصنف کے حالات اور اس کے کارنامے کی تفسیر و تنقید بہت خوبی سے کی ہے۔

عبداللہ شاہ اور ابن نشاطی کی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ مثنوی میں پرانے دکنی الفاظ کے معانی

بھی دیدیئے گئے ہیں۔ اُردو کے مثنوی کے طالب علم کے لئے یہ جلد ناگزیر ہے۔

مثنوی طوطی نامہ:۔

۳۴۰ صفحات، مرتبہ سیر سعادت علی صاحب رضوی قیمت تین روپئے۔ یہ مثنوی بھی اسی مشہور شاعر

غواصی کی لکھی ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

شروع میں ۷۱ صفحات کا ایک مقدمہ ہے۔ جس میں رضوی صاحب نے غواصی کے حالات زندگی،

اس کی شاعری، اس کی زبان وطرز بیان، خلاصہ قصہ اور زیر نظر مخطوطوں کا ذکر کیا ہے۔ دیگر خوبیاں

مندرجہ بالا دوسری جلدوں کی طرح ہیں۔

مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی یہ تمام کتابیں سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد۔ دکن سے مل سکتی ہیں

رسید کتب و رسائل

۱۔ آزادی کی نظمیں، مرتبہ سید سبط حسن صاحب، نیا ادب حضرت گنج لکھنؤ۔

۲۔ شعرائے عثمانیہ (جلد چہارم) ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد۔ دکن

۳۔ تاریخ گولکنڈہ 〃 〃

۴۔ اُردو دانی کی کتابیں (پہلا حصہ) 〃 〃

۵۔ اُردو مثنوی کا ارتقا 〃 〃

۶۔ مسلمانان ہند کی حیات سیاسی کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

۷۔ دوشیزہ صحرا 〃 〃

۸۔ بغداد کا جوہری 〃 〃

۹۔ رسالہ ہمارا مستقبل لکھنؤ

۱۰۔ 〃 محرم کی تجلیاں سکندرآباد

۱۱۔ رسالہ جات قرآنی دنیا و مومنہ حیدرآباد۔ دکن

۱۲۔ نظام ادب حیدرآباد۔ دکن

شذرات

گذشتہ مہینے کے مضمون "مسلمان کیا کریں" میں مضمون نگار صاحب نے آخر میں یہ سوال اُٹھایا تھا کہ بہتر یہ ہو اگر پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ مُسلمان کا تمدّن کیا ہے' اس عنوان پر ہمیں ایک دوسرے صاحب کا مضمون دیر میں ملا' اس لئے افسوس ہے کہ اس ماہ وہ رسالہ میں شائع نہ کیا جا سکا۔ انشاءاللہ آیندہ مہینے میں شائع کیا جائیگا۔

ہندوستان میں مسلمان جس گو مگو کی حالت میں ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اور اس حالت کی پیچیدگی کے باعث اور بہت سے پیچیدہ سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان اسکیم نیشنلسٹ مسلمانوں کا نقطۂ خیال' ہندوؤں کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون' اور دستور ساز اسمبلی و مسلمان وغیرہ کئی بنیادی مسئلے ایسے پیدا ہو گئے ہیں' جن کی اہمیت ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ بقا یا فنا کو دیکھتے ہوئے نہایت اہم ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ رسالہ جامعہ میں آیندہ اس قسم کے مضامین خصوصیت سے جگہ پائیں' جو مسلمانوں کو اپنی قومی ہستی کی بقا کا صحیح راستہ بتائیں۔ چنانچہ رسالہ "جامعہ" کی طرف سے ہر صاحب فکر و تدبیر اور ہر ہمدرد قوم کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے مُلک کو روشناس ہونے کا موقعہ دیں۔ مقصد ہنگامہ آرائی نہیں ہے بلکہ سر جوڑ کر اپنے سیاسی مسئلوں کو حل کرنا ہے۔ ہر صاحب اپنا اپنا نقطۂ خیال پیش کر سکتے ہیں۔ مضامین مدلّل ہوں' جذباتی یا محض صحافتی نہیں۔ ہم ان حضرات کے ممنون ہوں گے جو ہمارے اس ارادے کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

دوسرا ارادہ "اپنی اصلاح آپ" کی ایک مستقل سرخی سے ایک نئے تعمیری عنوان کا کھولنا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی' ظاہر ہے' چند بنیادی خرابیوں اور غلط راہ روی کی وجہ سے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ درد و

عقل رکھنے والے حضرات جو مسلمانوں کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں اپنے مضامین کے ذریعہ
بتلائیں کہ ہندی مسلمانوں میں کونسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ان کا کیا علاج ہوسکتا ہے
جس کے ذریعہ وہ اپنی زبوں حالی، اپنی پستی اور کمزوری کو دور کرکے اقوامِ عالم میں سرخرو ہوسکتے
اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ محسوس کرسکتے ہیں۔ خرابیاں معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی سرخیوں
کے تحت میں آسکتی ہیں۔ لیکن اس امر کا اظہار کردینا ضروری ہے کہ یہ عنوان تفریحی بحث ومباحثہ
کے لئے نہیں کھولا جارہا ہے بلکہ تمامتر تعمیری مقاصد کے لئے۔ ہر شخص اپنی اپنی تشخیص اور اپنا
اپنا علاج پیش کرسکتا ہے۔ اگر کسی کو کسی کے علاج یا تشخیص سے اختلاف ہو تو وہ اپنے دلائل
دبراہین، اپنی تشخیص وعلاج پیش کرسکتا ہے، بشرطیکہ ذاتیات وجذبات سے متاثر نہ ہوجائے۔

مکرر یہ عرض ہے کہ موجودہ حالات وموجودہ زمانہ کی رفتار دیکھتے ہوئے یہ مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی زمانہ کو اپنے قابو میں لائیں، اور زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے اندر کی
اُن خرابیوں کو دور کریں جو انہیں پیچھے ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی حالت نہ بدلی
تو ظاہر ہے کہ خدا اُس قوم کی حالت نہیں سنوارتا جس میں خود اپنے سنوارنے کی فکر نہ
ہو۔ اس لئے اپنی اصلاح کی جو اسکیمیں پیش کی جائیں وہ تمامتر سنوارنے کی ہوں محض گلخپ
نہیں۔ مسلمانوں میں آج کل بیداری کے آثار ظاہر ہورہے ہیں ظاہر ہے اگر ان کے اس جوش اس
قوت کو تعمیری کاموں کی طرف مائل نہ کردیا گیا تو بیکار جائیگا۔ تعمیری کاموں کی طرف رجوع
کرنے کی یہ ذمہ داری جامعہ ملیہ خود نہیں لے رہی ہے بلکہ ہر صاحب فکر وتدبیر کو دعوت ہے
کہ مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے جو مفید اسکیمیں ذہن میں رکھتے ہوں انھیں پیش کریں
ان پر بحث ومباحثہ کریں تاکہ مفید رائیں نکھر سکیں اور مسلمان ان پر عمل کرکے جوش عمل اور
خود اعتباری کے جذبے سے معمور ہوسکیں۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کیلئے جہاز

بمبئی اور کراچی سے جدہ کو تھوڑے تھوڑے وقفہ پر روانگیاں

جہاز	ٹن
ایس، ایس، اکبر	۴۰۴۳
ایس، ایس، علوی	۳۵۶۶
ایس، ایس، اسلامی	۵۸۷۹
ایس ایس جہانگیر	۳۵۶۶
ایس، ایس خسرو	۴۰۴۵
ایس، ایس، رحمانی	۵۴۶۳
ایس، ایس، رضوی	۵۴۵۸

بمبئی اور کراچی سے عدن جدہ اور بحر احمر کے بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہاز بمبئی اور کراچی سے بندرگاہ لوی مارشس کو بھی۔

جہازوں کی روانگی اور روانگی کی تاریخیں بغیر پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہے

تفصیلی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجئے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کو لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو دان طبقے میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا ہے اسے اردو میں منتقل کیا جائے یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور معاملہ کے امور کے متعلق۔

مولوی سید عبدالوہاب صاحب سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنز چار مینار حیدرآباد دکن کو لکھنا چاہیے

سالانہ عہ

فی پرچہ ۱۰؍

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار شدہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۳۹ء سے اب تک اسو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہمارے اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔

ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

سرحد کا سب سے پرانا اور حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد

(۱) ۱۹۲۳ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے زیر ادارت ملک میر عالم خاں اعوان ہزاروی (جامعی) شائع ہوتا ہے۔

(۲) آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔

(۳) صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔

(۴) سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی بہت کچھ ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا ہمیشہ ارگن رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں کے لئے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

چندہ رعائتی سالانہ للعہ

" ششماہی ؏ر

المشتہر

منیجر ترجمان سرحد پشاور

مطبوعات امیریہ

دیوان ثاقب:۔ یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی غزلیں، قطعات، تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے۔ تصاویر بھی ہیں۔ حجم پانچسو صفحات قیمت للعہ۔ غیر مجلد ہے (علاوہ محصول ڈاک)

انیس اخلاق:۔ میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً سو رباعیاں مختصر تبصرے کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و تالیفات نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصول ڈاک

گیس کا دفاع:۔ آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیری جنگ کا شروع ہو جانا یقینی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرے کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۴ر علاوہ محصول ڈاک۔

مفتاح البیان:۔ حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین زبدۃ الذاکرین ابوالبیان مولانا سید اکبر مہدی صاحب سلیم جروی مولف جواہر البیان وغیرہ۔

فن ذاکری اور روزہ خوانی پر عجیب کتاب

قیمت ہر حصہ ایک روپیہ

دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

ندوۃ المصنفین کی دو اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت:۔ غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے ابتک کسی زبان میں اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یورپ کے ارباب تالیف وتبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لئے جن حربوں سے کام لیا ہے ان میں سلیوری کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ جدید ترقی یافتہ ملکوں میں اسلامی تبلیغ کے لئے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے بلکہ ذہنی تمرد غلبہ کے سبب ہندوستان کے جدید تعلیمیافتہ طبقہ بھی اس سے اثر پذیر ہے۔ "غلامی" جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں دلچسپ، مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے کتابت طباعت کاغذ اس قدر اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے قیمت مجلد سے؍ غیر مجلد ؏

اسلام کا اقتصادی نظام:۔ اس کتاب میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح نظام قائم کرکے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام عمل ہے جسے تیار کرکے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ اگر آپ اسلام کی اقتصادی قوتوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمایئے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ضخامت ۴۶۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد عہ کتابت طباعت اعلیٰ اور ولائتی کاغذ

منیجر ندوۃ المصنفین قرولباغ

نئی دہلی

اخبار اہلحدیث امرتسر

امرتسر سے ہر جمعہ کے دن ۲۲×۱۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے جس میں مذہبی ملکی اور اخلاقی مضامین کے علاوہ شرعی مسائل، فتوے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات بھی شائع ہوتے ہیں شرک و بدعت کی تردید اور کتاب وسنت کی تائید اس کا اولیں مقصد ہے۔ ایک دو صفحوں پر دنیا کی چیدہ چیدہ خبریں بھی درج ہوتی ہیں۔

سالانہ قیمت صہ ششماہی ۱۲/ نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہے

منیجر اخبار اہلحدیث کٹڑہ بھائی سنت سنگھ امرتسر

رفیق باغباں

کاشتکاری اور باغبانی کے فن میں یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کا حسین وجمیل ٹائٹل پیج جنت نظیر ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی نہایت درجہ دیدہ زیب اور نظیر فریب ہوتا ہے۔ اس کے بلند پایہ مضامین بیکار نوجوانوں کو باکار بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ زمین دار اور کاشتکار دونوں کی فنی خدمت اس کا خاص شعار ہے قیمت بہت کم یعنی صرف عہ روپیہ سالانہ۔ یہ رسالہ ۲۲×۱۸ کی تقطیع کے ۲۲ صفحات پر نہایت آب وتاب کے ساتھ اردو زبان میں ماہانہ شائع ہوتا ہے اس بے بہا رسالے کو حاصل کرنے کے لئے بہت جلدی لکھئے تاکہ دیہات کی نحوست بھی فوراً ہی دور ہو جائے۔ یہ رسالہ اپنے مضامین کی بہترین کے باعث تمام حکومتوں کا منظور شدہ ہے۔

منیجر رسالہ رفیق باغباں ہن مین نرسری سہارنپور

مشرقی صحافت کا نادر شاہکار

صدق

جو گذشتہ پانچسال سے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے

زیر ادارت

نہایت آب و تاب سے لکھنو سے نکل رہا ہے۔ زمانے کی ناقدری اور مذہبی حسیات سے بے تعلقی کے باعث مالی مشکلات کے بھنور میں پھنس گیا ہے جس سے اس کو نکالنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلم پبلک زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کے خریدار ہو کر اسے ابتلا و آزمائش کے چکر سے نکالیں۔ سالانہ للعہ ششماہی ع۲

ملنے کا پتہ

منیجر "صدق" مرشد آباد پیلس گولہ گنج لکھنؤ

مسلمانوں کا روشن مستقبل

اس کتاب میں ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اقتصادی اور تمدنی تعلیمی اور سیاسی حالات کی جانچ دس بنیادی حقوق کے معیار سے کر کے انھیں آئینہ کی طرح روشن کر دیا گیا ہے۔ علیگڈھ کی تعلیمی اور سیاسی تحریک کانگریس اور مسلم لیگ۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما، احرار اسلام اور خدائی خدمتگاران و نیز پولٹیکل کانفرنس کے تاریخی واقعات دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور جمہوریت انگوزہ کی تطبیق ہندوستان کے حالات سے کر کے دکھایا گیا ہے کہ مسلمانان ہند کے انحطاط کا دورہ ختم ہو رہا ہے اور ان کا مستقبل روشن ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ جلد مضبوط قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (ع۲۸) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں (یو۔ پی)

"گلبانگ آزادی"

غلامی روح کی سسکی ہے اور آزادی اسکا نغمہ!

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو روح کے لئے بجائے نغموں کے سسکیاں پسند کرتا ہے اور اس اعتبار سے گلبانگ آزادی ہر انسان کے لئے فطرتاً محبوب ترین چیز ہے۔ یہ کتاب آزادی کے موضوع پر ۱۰۶ معیاری رباعیوں کا بہترین مجموعہ ہے، جو شاعر برہان" جناب نہال سیوہاروی کی تراوش فکر ہیں! ایک انسان کی زندگی میں سب سے بڑی خلش غلامی ہے اور کسی شاعر کی تخیل میں بلند پروازیوں کے ساتھ جب یہ تڑپ شامل ہو جاتی ہے تو اسکی قوت بیان کی سحر طرازیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ گلبانگ آزادی نہال صاحب آپ کو شاعری کے اسی مقام ارفع پر نظر آئیں گے۔ غلام آباد ہند میں درحقیقت ان کے یہ روح پرور نغمے اس قابل ہیں کہ ہر شخص انھیں حرز جاں بناکر رکھے! یہ مجموعہ خوبصورت اور چھوٹے سائز پر اعلیٰ ترین کتابت و طباعت اور بہترین کاغذ کے ساتھ شائع کیا ہے جس کے شروع میں ۱۶ صفحات پر جناب مولانا سعید احمد صاحب ایم اے فاضلانہ و عالمانہ مقدمہ ہے۔ جس میں صاحب موصوف نے اردو شعر و شاعری کے ارتقائی رجحانات پر تاریخی بحث سے روشنی ڈالتے ہوئے نہال صاحب کے کلام پر بھی مختصر تنقید کی ہے۔ قیمت صرف ۸ر

مکتبہ جامعہ دہلی

دہلی	لاہور	لکھنؤ	بمبئی
مکتبہ جامعہ	مکتبہ جامعہ	مکتبہ جامعہ	مکتبہ جامعہ
متصل جامع مسجد	بیرون لوہاری دروازہ	امین آباد پارک	پرنسس بلڈنگ

تاریخ الہ آباد (باتصویر)

پہلی جلد۔ حقیقت تاریخ کڑہ اور الہ آباد کی تاریخیں، پریاگ۔ الہ آباد کی بنیاد، الہ آباد اور الہ آباد کی بحث اور تحقیق۔ مسلمان امراء و سلاطین کا شوق باغوں اور پھولوں سے شغف خسرو باغ۔ اس کا عظیم الشان پھاٹک۔ آقا رضا، مصور انجنیر۔ ابوالحسن نادر الزمانی کے حالات خسرو باغ کے مقبرے اور یادگاریں۔ ہندو اور مسلمانوں کی قرابت۔ اس کی ابتداء، جے پور کی راج کماری سے جہانگیر کی شادی۔ اہتمام ریت رسمیں۔ افیون کھا کر جان دینا۔ مقبرہ شاہ بیگم شاہزادہ خسرو۔ پیدائش سرگزشت۔ شاہ جہاں (بھائی) کے ہاتھ سے ہلاک کئے جانا نعش کھود کر لاہور سے الہ آباد بھیجی گئی۔ مقبرہ خسرو۔ خسرو کی رفیقہ زندگی۔ سلطان نثار بیگم، ہمشیرہ خسرو اس کا گنبد مقبرہ تمبولن بیگم۔ مرزا جہاں گیر کا مدفن۔ گھوڑے کی قبر۔ شاہی مسجدیں۔ خلد آباد کے پھاٹک۔ چاہ خلد آباد۔ سرائے خلد آباد۔ باؤلی۔ مقبرہ زینت النساء بیگم۔ قلعہ وغیرہ اور جس میں جہانگیر کی پہلی بی بی رانی ماں بائی شاہ بیگم۔ اور شاہزادہ خسرو کی نایاب سہ رنگی تصویریں۔ بلاک کے اور آٹھ خوش رنگ فوٹو اور قلمی نقشے بھی شامل ہیں انگریزی اور اردو رسائل و اخبارات نے بہترین تبصرے کئے ہیں۔ حجم ۲۹۹ صفحات۔ مع ۴۴ مکمل فہرستیں اور حروف وار انڈیکس کے کپڑے کی مضبوط جلد۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

ملنے کا پتہ

(۱) دفتر اخبار کائنات قنوج

(۲) سید اولاد احمد صمدنی۔ دائرہ شاہ رفیع الزمانی یحیٰ پور الہ آباد

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی چند مطبوعات

نصرتی

یعنے

گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر ملا نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات اور کلام پر

تبصرہ۔ تالیف لطیف ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)

علمی تحقیق و تفحص کا بہترین کارنامہ ہے نصرتی قدیم دکنی استادِ کامل گزرا ہے۔ رزمی اور بزمی ہر قسم کی شاعری میں کمال رکھتا تھا۔ گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ سکندری، دیوان قصائد و غزلیات اس کی مشہور تصانیف ہیں جن میں علی نامہ اور تاریخ سکندری، کو عادل شاہیوں کی تاریخ کے بہترین ماخذوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

نصرتی کی زبان چونکہ قدیم دکنی ہے اس لئے اب ان تصانیف کا سمجھنا محال ہو گیا ہے لیکن اسے محنت اور شوق تحقیقات کی کرامات سمجھنا چاہیئے کہ فاضل مؤلف نے اس متروک زبان کے تمام ادق الفاظ کے معنے دریافت کر لئے۔ کتاب میں مختلف اصناف کلام کے جو نمونے نقل کئے ہیں۔ ان کے نیچے اشعار کا مطلب صاف اردو میں تحریر فرما دیا ہے۔

اردو کی تاریخ اور قدیم زبان کی تحقیقات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے

ضخم ساڑھے تین سو صفحات

مجلد ۲؎ ۔ غیر مجلد ۲؎ روپے

المشتہر

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

چند اچھی کتابیں

یادگار نسیم:- یعنی منشی دیا شنکر نسیم کی مشہور و معروف مثنوی "گلزار نسیم" و انتخاب "دیوان نسیم" مع حواشی و تبصرہ کلام مرتبہ مولوی اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔ڈی، چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ تحریر فرماتے ہیں:-

یادگار نسیم جو مولوی اصغر صاحب نے تصحیح کے بعد شائع کی ہے مشہور و معروف شاعر نسیم کی مثنوی جسے انھوں نے مصلحتاً نامناسب اشعار کو حذف کرنے کے بعد شائع کیا ہے غزلیات میں سے جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے وہ شاعر موصوف کی بہترین غزلیں ہیں ...... حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے ...... اس کتاب کا مقدمہ بجائے خود ایک عالمانہ تصنیف ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اس کتاب کی قدر کما حقہ ہوگی جو اس کے شایان شان ہے"۔ طباعت دیدہ زیب، خوشنما جلد قیمت دو روپے ۲؎

الف بے کا کھلونا:- یہ پیاری کتاب ننھے منے بھائی کے لیے ہے کھیل ہی کھیل میں وہ حروف تہجی سے آشنا ہو جاتے ہیں ہر حروف کے لیے ایک رنگین تصویر اور ایک شعر ہے۔ زبر، زیر، اور پیش وغیرہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے چھپائی رنگین اور بہت صاف۔ ۲۲ عکسی تصویریں۔ اگر آپ کے یہاں کئی بچے ہوں تو متعدد نسخے طلب فرمایئے ورنہ آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ قیمت صرف ۲؎

انوکھی کہانیاں:- یہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے گیارہ نصیحت آموز کہانیاں اسمیں درج ہیں۔ زبان بہت آسان ہے ممکن نہیں کہ کوئی بچہ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہے۔ خوبصورت کتاب ہے، بچے اس کو دیکھتے ہی مچل جاتے ہیں۔ سرورق پر تین رنگ کی تصویر ہے۔ قیمت ۴ آنہ

مفید ایجادات کی کہانیاں:- یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھ) کی قابل قدر تصنیف ہے یہ کتاب اردو میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی تصنیف ہے اور مفید معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے، کاغذ، کتابت، طباعت اور سرورق بے انتہا نفیس ہے اس قدر اچھے اہتمام سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔ تشریح مطالب کے لئے جابجا بے شمار تصاویر دی گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک ۱؎

پتہ:- مینیجر مکڈپو انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد

بہشتی زیور مدلل و مکمل اور محشی

بالکل جدید ایڈیشن

عربی عبارتوں حوالوں اور قدیم و جدید ضمیموں کا بےمثل مجموعہ

تصدیق فرمودہ حضرات علماء دیوبند

بہشتی زیور اپنی شہرت اور عام مقبولیت کے لحاظ سے ایک ایسی کتاب ہے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں اردو کی شاید ہی کسی کتاب کو اتنا قبول عام حاصل ہوا ہو جتنا اس کتاب کو ہوا۔ بہشتی زیور ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں مختلف مقامات سے طبع ہو کر شائع ہوا اور ہو رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عظیم الشان کتاب جس درجہ میں قبول خواص و عوام ہوئی اس درجہ اور اس حیثیت کے پیش نظر اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ اس ضرورت کا احساس ہمیں بہت عرصہ سے تھا اور ہماری تمنا تھی کہ بہشتی زیور جیسی کتاب کو اس کی شان کے مطابق طبع کرایا جائے الحمد للہ کہ اب ہماری یہ تمنا پوری ہوئی۔ اور ہم دنیائے اسلام کی اس مایۂ ناز کتاب کو اپنے منشا کے موافق شائع کرنے کے قابل ہو سکے۔ جہاں تک کتاب کی تسہیل، ترتیب کی دلنشینی اور طباعت و کتابت کی عمدگی کا تعلق ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اب تک بہشتی زیور کا کوئی ایڈیشن اس پایہ کا شائع نہیں ہوا تحشیہ خاص طور پر بعض ذمہ دار حضرات علماء دیوبند سے کرایا گیا ہے۔ تصحیح کے اہتمام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تمام مسائل کے صحیح ماخذ عبارات عربی اور حضرت مولف مدظلہ العالی کے بعض نہایت ہی اہم اور جدید اضافات اور فوائد کو قابل دید کتابت کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ قیمت قسم اول لعہ اور قسم دوم صہ

مکتبہ جامعہ دہلی

انصاریان ہند کا قومی اور سیاسی روزنامچہ آزادی کا حامی

اور

سچی مساوات اسلامی کا علمبردار آل انڈیا مومن کانفرنس کا واحد آرگن

ہفتہ وار مومن گزٹ کانپور

جو ایک عرصے سے اسلامی قومی اور وطنی خدمات انجام دے رہا ہے مسلمانوں کی نیچ اونچ کو مٹا کر حقیقی اسلامی مساوات پر چلانا اس کا مقصد تعلیم اور تنظیم اس کی حقیقی آواز۔ مضامین نظم و نثر کے علاوہ اسلامی ملکی وغیر ملکی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ قیمت سالانہ (للعہ)

پتہ۔ ایم۔ ایچ ظفر منیجر مومن گزٹ کانپور

نیشنل گارڈ

کے والنٹیروں کو خوشخبری

ہندوستان میں نیشنل گارڈ مسلم لیگ اور قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کے حکم سے آٹھ لاکھ والنٹیر باوردی قواعد پریڈ سیکھنے کے لئے میدان میں آگئے ہیں۔

اسلامی سپہ گری با تصویر

ان والنٹیروں کے لئے معلومات بکڈپو آگرہ نے اسلامی سپہ گری کے نام سے لاجواب باتصویر کتاب تیار کی ہے جس میں اسلامی علم کی تاریخ لکڑی بنوٹ تلوار۔ پٹہ کا فن قومی جوشیلی نظمیں اور قرآن مجید و احادیث سے اس فن کی روایات درج ہیں قیمت ایک روپیہ مجلد

ملنے کا پتہ:- دفتر معلومات بکڈپو تاج گنج آگرہ

قرآن مجید کی مکمل ڈکشنری اردو

مولف نے یہ کتاب تقریباً تین سو صفحات پر مرتب کی ہے۔ جس میں قرآن پاک کے تمام الفاظ بہ ترتیب حروف تہجی مع معانی و تحقیق درج کئے ہیں۔ یہ کتاب اپنی امتیازی شان اور خصوصیات کے ساتھ طرز جدید پر طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ہر ہر لفظ پوری تحقیق سے درج کیا گیا ہے مثلاً اگر لفظ فعل ہے تو اس کا مادۂ اشتقاق اور صیغہ بھی بتایا ہے۔ اور اگر لفظ اسم ہے تو مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد بھی بتایا ہے اس کے علاوہ جہاں جہاں انبیاء کرام کے نام آئے ہیں وہاں ان کے مختصر حالات صحیح۔ عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس انداز پر لکھی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد صرفی نحوی مشق بخوبی ہو جاتی ہے اور جو حضرات عربی زبان سے واقف نہیں وہ باسانی کلام اللہ سمجھ سکتے ہیں اور اچھی خاصی عربی سیکھ جاتے ہیں۔ لغات قرآن پر اب تک اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

کتاب عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے علاوہ اسکول و کالج کے طلباء کے لئے بیحد مفید اور کارآمد ہے کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ دیدہ زیب۔ تقطیع بڑی۔

قیمت صرف للعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بمبئی	لکھنؤ	لاہور	دہلی
پرنسس بلڈنگ	امین آباد پارک	بیرون لوہاری دروازہ	متصل جامع مسجد

شاعروں، ادیبوں اور مشہور افسانہ نگاروں کے تازہ شاہکار دیکھنا ہوں تو ماہنامہ

جوہر

کا مطالعہ کیجئے! جو یادگار شہید حریت حضرت مولینا محمد علی جوہر ؒ اور یادگار قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین حضرت شاہ صوفی مرزا علیجاہ شاہ آزاد ابوالعلائی کرم ہر ماہ مراد آباد سے شائع ہوتا ہے جس میں آپ کے ارشادات؛ قومی خدمات کے علاوہ ہر قسم کے علمی تاریخی، اصلاحی، تمدنی، مزاحی اور سیاسی مضامین، دلچسپ کارآمد افسانے وجد آفرین نظمیں شائع ہوتی ہیں؛ ایک حصہ عورتوں اور طلبا کی تعلیم و تربیت کے کارآمد مضامین کے واسطے ہوتا ہے۔ مزید برآں ہر ماہ مستقل خریدار و مضمون نگاروں کی خدمت میں قیمتی اشیا اور نقد انعامات پیش کرتا ہے؛ قیمت سالانہ صرف ۱۲/ ع

منیجر ماہنامہ "جوہر" ایوان ادب مراد آباد

اخبار زمزم

مذہب اور سیاست کا آئینہ

اسلام کا داعی، ملت اسلامیہ کا خادم، آزادی کا علمبردار اور بلند پایہ صحافت کا اعلیٰ نمونہ ہے ◆

ہر جماعت کے اچھے کاموں کی تحسین اور غلط روی پر برہنہ شمشیر بن کر نکتہ چینی کرتا ہے ◆

عربی اخبارات کی اہم خبریں ہندوستان میں سب سے پہلے شائع کرتا ہے۔

گفتار کی تلخی۔ ذاتی مناقشات اور انفرادی جھگڑوں سے پرہیز کرتا ہے۔

ہر مسئلہ پر پُر مغز مقالات، پختہ خیالات اور لطیف نکات پیش کرتا ہے

اسکا مسلسل مطالعہ آپ کو دین کا پُر جوش حامی، اسلام کا سپاہی سیاست کا مبصر اور فہم و فراست کا مالک بنا دیگا ◆

ہفتہ میں دو بار ٹھیک وقت پر شائع ہوتا ہے

آج ہی پتہ ذیل پر ایک کارڈ لکھ کر نمونہ مفت طلب کیجئے

شرح چندہ اخبار

سالانہ چھ روپے
ششماہی ساڑھے تین روپے
سہ ماہی دو روپے

برما کیلئے

سالانہ آٹھ روپے
ششماہی ساڑھے چار روپے

نوٹ: [illegible]

منیجر اخبار زمزم بیرون موری دروازہ لاہور

"نبی عربی"

تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی

تاریخ اسلام کے ایک مختصر اور جامع نصاب کی ترتیب ندوۃ المصنفین دہلی کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد ہے۔ زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس میں متوسط استعداد کے بچوں اور بڑوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر مضامین کے ربط و تسلسل کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔

(۲) حسب موقع و ضرورت واقعات کے اسباب و علل پر بھی سہل انداز میں بحث کی گئی ہے۔

(۳) طرز ادا میں زبان کی یکسانیت، سہولت، سلاست اور سادگی و شگفتگی کا غیر معمولی طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔

(۴) تمام واقعات عربی کی قدیم و جدید سیرت کی معتبر و مستند کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

(۵) کتاب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں سیرت نبوی کے تمام واقعات مشہورہ کو تاریخ وار اور سن وار بیان کیا گیا ہے اس نقشہ سے سیرت کے تمام واقعات بیک نظر سامنے آجاتے ہیں۔

اسکولوں کے طلبار کے علاوہ اور اصحاب تھوڑے وقت میں سیرۃ طیبہ کی ان گنت برکتوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہئیے۔ یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہے کہ نبی عربی اپنی طرز کی بالکل جدید اور بے مثل کتاب ہے کتابت، طباعت، نہایت اعلیٰ ولائتی سفید چکنا کاغذ صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۲ر مجلد سنہری عمر

مکتبہ جامعہ دہلی

البیان

اُمّتِ مُسلمہ امرتسر کا ماہوار رسالہ

آج جب کہ دُنیا اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ جب تک کوئی اصول عقل و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے، قبول نہیں کیا جاتا، ایک ایسے علمی و دینی پرچہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو قرآن حکیم کی تعلیمات کو RATIONAL یعنی عقلی طور پر مغرب زدہ دماغوں کے سامنے پیش کرے۔ یہ امر تمام مسلمانانِ ہندوستان کے لیے فخر و مسرت کا موجب ہونا چاہیے کہ "البیان" اسی معیار پر کلام عزیز کی خدمت و اشاعت کا فرض سرانجام دے رہا ہے۔ یہ پرچہ تمام ہندوستان میں اپنے رنگ کا واحد پرچہ ہے۔ اہلِ تحقیق اصحاب اس کی معقول اور معتدل روش کو دیکھ کر تسکین حاصل کریں گے۔ "البیان" ہر مہینہ کے پہلے ہفتے ۲۰×۲۶ کے سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور صرف تین روپے سالانہ چندہ میں سات سو صفحات کے علمی و دینی مضامین کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ نمونہ مفت طلب کیجیے۔

ڈیڑھ ہزار صفحے کا لٹریچر مُفت

"البیان" کا سالانہ چندہ تین روپے ہے، اگر آپ اس چندے کے ساتھ مزید ایک روپیہ شامل کر کے چار روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے، تو ہم آپ کو رسالہ کے پرانے ۲۴ منتخب پرچے جن کا حجم تقریباً ۱۵۰۰ صفحے ہے اور قیمت چھ روپے مفت بھیج دیں گے اور آپ کے نام سال بھر کے لیے "البیان" بھی جاری کر دیں گے۔ یہ تمام پرچے قرآن عزیز کے حقائق و معارف، اسلامی و تاریخی معلومات اور علمی و روحانی مضامین کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ وہ تمام مسلمان جو مولویت کے دائرہ سے باہر ہو کر اسلام کو اس کے صحیح خدوخال میں پہچاننے کے آرزومند ہیں، انھیں یہ رسائل ضرور دیکھنے چاہییں۔

(نوٹ) اس عظیم الشان رعایت سے "البیان" کے نئے اور پرانے تمام خریدار فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ :

مینیجر رسالہ "البیان" امرتسر

فاؤسٹ کے بعد جرمنی کے فلسفی شاعر

گوئٹے

کا غیر فانی شاہکار ڈرامہ

افی جے نیا

جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اب پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ قیمت صرف ۱۰ر بک سیلرز کے لئے خاص رعایت

ملنے کا پتہ:۔ ابوالقلم دبیر۔ محبوب پورہ۔ حیدرآباد دکن

تاریخ جنوبی ہند

مصنف محمود خاں صاحب محمودؔ، مصنف تاریخ سلطنت خداداد اور حیدر علی"

یہ جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی و خارجی اسناد و کاغذات سے مواد مرتب کر کے یکجا کیا ہے۔ اردو فارسی اور انگریزی کی تیس مستند کتابوں کو کھنگالنے کے بعد یہ تحفہ تیار ہو سکا ہے۔ مختلف ماخذوں سے مختلف واقعات انتخاب کر کے یکجا کر دینے کے بعد مصنف نے ان پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ نتائج پیدا کئے ہیں اور ان کی روشنی میں صحیح واقعات پیش کئے ہیں

شروع میں جغرافیائی حالت پھر جنوبی ہند کی معاشرتی اور تمدنی حالت، زبان اور "آریین" اور "ڈراویڈین" قوموں کے اتصال پر نظر ڈالی ہے۔ پھر وہاں کے قدیم طرز حکومت مسلمانوں کی آمد اور ان کے طرز حکومت پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ سلاطین بہمنی و خاندان وجیانگر کے حالات اور یورپین اقوام کی آمد سے لے کر موجودہ دور تک کے واقعات پر معتبر شہادتوں کے حوالے سے سیر حاصل تنقید کی ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

مسلم یونیورسٹی گزٹ

مسلمانوں کے مرکزی قومی درسگاہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا آرگن ہے۔ ہندوستان بھر کے
بھر کے ممتاز تعلیمیافتہ طبقوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ آپ بھی اس کے خریدار بنکر
اس مقتدر برادری میں شامل ہو جائیے اور اس میں اشتہار دے کر اپنی قومی
درسگاہ کی مدد کیجئے۔ گزٹ کی تمام آمدنی مسلم یونیورسٹی میں جاتی ہے۔ ہر
انگریزی ماہ کی یکم و پندرہ کو شائع ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف دو روپیہ

نرخنامہ اجرت اشتہارات و دیگر تفصیلات کے لیے تحریر فرمائیے

المشتہر منیجر مسلم یونیورسٹی گزٹ علیگڈھ (یوپی)

رسالہ "تصویر" رامپور

ایک کم قیمت ماہنامہ رسالہ ہے لیکن اس میں ہندوستان کے مقتدر ادیبوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں
تصویر کی ضخامت ہر ماہ (۱۰۰) صفحات ہوتی ہے۔
تصویر سال میں ایک خاص نمبر مفت پیش کرتا ہے۔
تصویر کے افسانے۔ غزلیں، نظمیں اور تاریخی مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں
تصویر ہر اعتبار سے لاجواب ہے۔
تصویر کی یہ خود پرستی نہیں بلکہ حق پرستی ہے کہ (۱۰۰۰) سالانہ صفحات کے مقابلہ میں اس کا دو روپیہ
چار آنہ سالانہ چندہ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔

اگر آپ نے
اب تک بھی اس کی خریداری قبول نہیں فرمائی ہے تو اب پہلی فرصت میں خریداری کا آرڈر دیجئے
اس کے مطالعہ سے آپ مسرت انگیز کیفیات محسوس کریں گے

پتہ۔ دفتر رسالہ "تصویر" رامپور اسٹیٹ (یوپی)

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

تالیف مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مؤلف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا ہے اور تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دلائل و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرازیاں اسلامی تعلیمات ہی کے تدریجی آثار کا نتیجہ ہیں اور جنھیں قدرتی طور پر اسلام کے دور حیات ہی میں نمایاں ہونا چاہیئے تھا۔ نیز اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کی حقیقی اور دائمی حریف صرف عیسائی قومیں ہیں دور حاضر کے صورت پرستانہ تمدن اور اسلام کے حقیقت آرا تمدن کے تناسب توازن پر دل پذیر طرز ادا کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے انجام پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ کہ آج کی ترقی یافتہ مسیحی قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں۔

ان مباحث کے علاوہ بہت سے مختلف ضمنی مباحث آ گئے ہیں۔ جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ بہترین سفید چکنا کاغذ صفحات تقریباً ۲۰۰۔ قیمت غیر مجلد عہ۔ سنہری جلد ۱۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں

تاریخ ادب اردو۔ ادارہ ادبیات اردو نے طالب علموں اور عوام کے لئے اردو ادب کی یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اس کتاب سے پہلے دو چار کتابیں چھپی ہیں لیکن زبان اور ادبیات اردو کی تاریخ جیسی کہ چاہئیے اب تک نہیں لکھی گئی ہیں۔ ادارہ نے اس تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ (۱) زبان اردو کی تاریخ (۲) اردو کا ابتدائی ادب۔ دوسرا حصہ (۱) دہلی میں اردو ادب کے پہلے سو سال (۲) دکن میں اردو ادب کا احیا (۳) اردو ادب کا دبستان لکھنؤ (۴) دبستان دہلی تیسرا حصہ (۱) جدید دور۔ انفرادی کوششیں (۲) ادارے (۳) صحافت۔

ان تینوں حصوں میں انفرادی اور اجتماعی کوششیں۔ اردو ادب کے رجحانات اور ہر عہد کی خصوصیتیں وضاحت سے بیان کیگئی ہیں۔ اس میں تقریباً آٹھ سو (۸۰۰) شاعروں۔ ادیبوں اور کتب و رسائل کا ضروری تذکرہ درج ہے۔ یہ کتاب طالب علموں اور اردو سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ ۱۷۶ صفحات قیمت صرف (۱۴؍) ایک روپیہ چار آنہ۔

محمد حسین آزاد۔ اردو کے اس زبردست شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالات زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب مختلف ابواب میں تقسیم ہے۔ جن میں آزاد کی زندگی شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ معہ تصویر آزاد ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے (۲؍)

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

۱۰ اپریل ۴۰ء تک شائع ہو جائے گا

رسالہ ندیم گیا کا شہرۂ آفاق

بہار نمبر سنہ ۴۰ء

مرتبہ سید ریاست علی ندوی

سوا دیر (۱) مشہور بہاری آرٹسٹ بلن جی کے چند نادر سہ رنگی شاہکار۔

(۲) متعدد آثار قدیمہ کے عبرت انگیز اور دلچسپ ہر دو قسم کے مناظر۔

(۳) بعض نادر تاریخی دستاویزات کا عکس۔

(۴) صوبہ بہار کے نامور مشاہیر، ممتاز ادبا باکمال شعرا اور نوجوان انشا پردازوں کے افسانوں، تصاویر

اس تاریخی دلنواز مرقع بہار نمبر سنہ ۴۰ء کا دامن مالا مال ہوگا

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ادیب جلیل سید وصی احمد بلگرامی ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی۔ پروفیسر سلیم، پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر طاہر رضوی، پروفیسر ڈاکٹر عنایت اللہ پروفیسر مظفر الدین صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے رفیق دار المصنفین۔ پروفیسر اختر اورینوی مشہور مزاح نگار حضرت بے ڈھب بانپوری، نامی ادیب حضرت جمیل مظہری، حضرت آزاد عظیم آبادی، حضرت مبارک عظیم آبادی، حضرت نوح ناروی اور ایسے ہی بہ کثرت نامور ادیبوں اور شاعروں کے بلند پایہ مقالوں، افسانوں ڈراموں، نظموں اور غزلوں سے۔

بہار نمبر میں اشتہارات بھی آپ دے سکتے ہیں بہار نمبر کی قیمت ۱۲؍ ہے اگر آپ چار روپے بھیج کر رسالہ کے خریدار بن جائیں تو یہ نمبر مفت ہاتھ آ جائے گا اور سال بھر تک رسالہ ہر ماہ حاضر ہوتا رہے گا منیجر ندیم گیا

ترکی میں شرق و مغرب کی کشمکش

نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوف نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لاکر جامعہ میں پڑھے، شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کا ایک جامع اور اہم مقدمہ ہے، جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت اردو عہ، قیمت انگریزی ستے

اتاترک

از محمد مرزا صاحب دہلوی۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے واقعات اور حالات جمع کرنے کی بہت سے لوگوں نے کوشش کی ہے لیکن مصطفےٰ کمال کے سیاسی، مذہبی اور اصلاحی نظریوں اور ان کی زندگی کے مقدس مشن کی اصلی روح سے ان لوگوں نے کم سروکار رکھا ہے۔ اس کتاب نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت:۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۲۳۔ نمبر ٦	جون سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ ۵ؔ۔ فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی۔

اگر آپ

ہندوستان کی بہترین اردو کتابوں کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہوں تو اردو اکادمی کے ممبر
ہو جائیے اور کتابیں مفت پڑھئے۔ قواعد و ضوابط
ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

ترکی اور اُس کے حلیف

(محترمہ خالدہ ادیب خانم)

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ دنیا کے تمام سیدھے سادھے لوگ موجودہ نازک صورت حال کے متعلق ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں، ہاں جغرافی پوزیشن اور قومی نقطہ نظر کی وجہ سے تھوڑا بہت اختلاف ہونا ضروری ہے۔ ذیل میں ایک ترکی ملاح اور ایک ترکی روشن خیال باخبر شخص کی ایک گفتگو نمونۃً دی جاتی ہے جو آبنائے باسفورس میں کشتی رانی کے دوران میں واقع ہوئی۔ اسی روز اخباروں میں برطانوی ترکی اتحاد پر دستخط ہونے کا اعلان ہوا تھا

ملاح نے کہا اخبار کہتے ہیں کہ انگریز اب ہمارے حلیف ہیں اور فرانسیسیوں کے متعلق بھی میں نے یہی خبر سنی ہے۔ یہ تو بالکل جنگ کریمیا کے سے آثار ہیں۔

"جنگ کریمیا کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟"

"میرا دادا اس میں لڑا تھا۔"

"کیا تمہیں اس معاہدہ سے اتفاق ہے؟"

"ہاں ہے"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ جنگ ہو اور بہت بڑی جنگ ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم خطرہ میں ہوں گے اور پھر ہمیں ساتھیوں کی ضرورت ہوگی۔ ہماری حکومت نے اس معاملے میں عقلمندی سے کام لیا ہے۔"

"کیا تم بھول گئے کہ ان ملکوں نے جنگ عظیم کے بعد ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

"نہیں"۔ وہ اس کے لئے تیار نہ تھا کہ ایک وقت میں دو باتوں پر غور کرے۔ تھوڑی دیر

تک وہ خاموشی سے کشتی کھیتا رہا۔ پھر رکا اور اپنے ہاتھوں کو چپو پر ٹیک کر انا طولی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "دیکھئے ہمارے دشمن معمولی نہیں۔ ہر جنگ میں کوئی نہ کوئی ہمارے ملک کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ انگریز اور فرانسیسی ان لوگوں میں نہیں ہیں جن کے دانت اس وقت ہمارے ملک پر ہیں۔ بلکہ اب تو صورت یہ ہے کہ جو لوگ ترکی لینا چاہتے ہیں وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے بھی دشمن ہیں۔ اس لئے اس مرتبہ یہ لوگ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔"

اس نے پھر کھینا شروع کر دیا۔ "اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے تو ہم ہر وقت موجود ہی ہیں۔" اس نے ایسے سیدھے سادے انداز میں کہا کہ شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

ملاح کا یہ آخری جملہ قابل غور ہے جب کبھی عوام اپنے آپ کو کسی خطرناک اور پیچیدہ صورت حالات کے روبرو پاتے ہیں تو وہ عام طور سے اسی طرح سوچتے ہیں۔ ترک عوام جس انداز سے اپنے ملک کی خارجی پالیسی کے متعلق سوچتے ہیں اس کے نفسیاتی مطالعہ میں یہ نکتہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ترک انگریزوں کی طرح واقعات کو جان پہچان کر سمجھ بوجھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ گذری ہوئی باتوں کو بھلا دیتے ہیں خاص طور سے جب گذری ہوئی باتوں کی یاد موجودہ حالات سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں حائج ہوتی ہو۔ یونان اور ترکی کی دوستی اسی بنیاد پر قائم ہے یہ ہماری عقل سلیم ہے جس نے یونانیوں سے ہماری دوستی کرائی۔ اور یہی ہماری حقیقت بینی ہے جس نے ہمیں یہ بات سمجھائی کہ یونان کو اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ اسے خود اپنے تحفظ کے لئے ہماری دوستی کی ضرورت ہے تو پھر وہ ہمارا کتنا قابل اعتبار دوست بن سکتا ہے۔

ہماری خارجی پالیسی کو عوام کی تائید حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ آج ترکی اور جمہوری ... ایک ہی خطرہ میں مبتلا ہیں اور پھر ان کی یاد سے جنگ کریمیا کا نقشہ ابھی محو نہیں ہوا ہے ... سبب ہے کہ آج وہ اتحادیوں کی دوستی کو اپنے تحفظ کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دشمنوں کا ... پاگنڈا مرکز بڑی پابندی سے گمنام دستی اشتہاروں کے ذریعہ ہمیں بتلاتا رہتا ہے کہ ہمارے ... دوستوں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے جنگ عظیم میں ہمارے

ساتھ کیا گیا تھا، وہ ہمیں سمجھاتا ہے کہ اگر ہم اپنا محاذ بدل دیں تو ہمارے لئے کتنا بہتر ہو۔ لیکن ان سب باتوں پر ہمارے عوام شک سے سر ہلاتے ہیں اور عصمت انونو کی خارجی پالیسی پر اظہار پسندیدگی کرتے ہیں۔

ہماری خارجی پالیسی کے سلسلے میں عوام کی نفسیات کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ میں اس کو بھی ایک گفتگو کے ذریعہ واضح کروں گی جو میرے اور ایک سیدھی سادی عورت کے درمیان ہوئی۔ یہ عورت ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس کی تعلیم ساتویں آٹھویں درجہ تک کی تھی، بال بچے والی، وہ گویا پرانے اور نئے دور کی ملانے والی ایک کڑی تھی۔ اس زمانے میں اخباروں میں بڑے زور شور سے جمہوریتوں کے ساتھ ترکی کے اتحاد کی خبریں آ رہی تھیں اور عام طور سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ہماری حکومت اس کا وعدہ کر چکی ہے۔ دستخط ہونے سے چند روز پہلے یہ افواہ اڑی کہ ممکن ہے ہم اپنا محاذ بدل دیں اور انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ جب آخر کار میثاق پر دستخط ثبت ہو گئے تو اس عورت نے مجھ سے کہا "میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ پھر بھی مجھے اس افواہ سے فکر سی ہو گئی تھی۔ ہم کو دستخط کرنا ہی تھے۔ اگر ہم اس سے پھر جاتے تو یہ اچھی بات نہ ہوتی ہم ہمیشہ اپنی بات کے پکے رہے ہیں چاہے وہ لکھی ہوئی ہو یا بے لکھی"۔

بین الاقوامی معاملات میں ترکی کی تمام تاریخی حسن معاملت اس عورت کے بیان میں جھلک رہی ہے یہ ایک دستور ہے جو ہماری قوم میں پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور جس نے اس دور میں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا جب کہ ہم تمام پرانی رسموں اور دستوروں کو چھوڑ رہے ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ کچھ لوگ اس عقیدہ کے پابند رہے ہیں کہ کامیابی کا واحد ذریعہ اندرونی و بیرونی سیاست میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کو دھوکا دینے کی صلاحیت ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ اس عقیدہ کے بھی ہیں کہ آدمی کا رویہ ہر حال میں صحیح ہونا چاہئے اور اسے اپنے قول کا سچا ہونا چاہئے ہم لوگ اس دوسرے عقیدہ کے پابند ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل کے واقعات دیں گے کہ انسانوں کے آپس کے تعلقات میں، خواہ وہ کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں حقیقت

شناسی اور عقل، حسن معاملت اور بلند اخلاق کے نقیض نہیں بلکہ فطری ساتھی ہیں

ترکی کی خارجی پالیسی کو عوام میں جو مقبولیت حاصل ہے اس کے نفسیاتی اسباب میں سب سے اہم امن کی خواہش ہے میں تھوڑی دیر میں بتلاؤں گی کہ کس لئے یہ جنگ آزمودہ قوم امن اور آشتی چاہتی ہے۔ بہرکیف یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ لوگ امن کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوامی امن حاصل کرنے کی کوئی تدبیر مل جائے۔ دنیا کی اس حالت میں جبکہ ہر قوم مسلح ہے اور کسی کو اس کا پتہ نہیں کہ اب کس کی باری ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناگہانی حملہ کا شکار ہو جائے، دنیا میں کونسا طریقہ ہے کہ ترکی اپنے وجود کو قائم رکھ سکے؟ اس کا جواب بھی آسان ہے ان لوگوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جن کا مقصد اور جن کا مفاد حملہ کرنا نہیں بلکہ بچاؤ کرنا ہے۔ اگر ترک قوم کو لڑنا پڑا تو امن کے لئے اور ان تمام شائستہ قدروں کے لئے لڑے گی جنھیں دنیا کے لوگ مانتے ہیں ورنہ اسے غلام بننا پڑے گا، اور یہ غلامی قرون وسطی کی غلامی سے بھی کہیں زیادہ ذلت آمیز ہوگی۔

اسی لئے جب جمہوریتوں نے ہمارے اتحاد کے خلاف پروپاگنڈا کرنے والے ترکی امن پرستی کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔ تم اگر دوسرا راستہ اختیار کرتے تو جنگ سے بچ جاتے تو ترک قوم کی عقل جواب دیتی ہے، "چیکوسلویکیا کا کیا ہوا۔ چیک لوگوں نے سوڈیٹن علاقہ جو واقعی تمہارا تھا تمہارے حوالے کر دیا۔ پھر کیا ہوا؟" جب یہ پروپاگنڈا کرنے والے چپکے سے آکر ہمارے کان میں کہتے ہیں، "اگر تم ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم تم کو یہ دلاتے وہ دلاتے" تو ہماری حقیقت شناسی جواب دیتی ہے "ہم کچھ لینا نہیں چاہتے بلکہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کو بچانا اور قائم رکھنا چاہتے ہیں"۔

اب ان سیدھے سادے لوگوں کو چھوڑ کر ہم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے اور جو میثاقوں اور معاہدوں پر دستخط کرتے ہیں، یعنی کہ ترکی حکومت۔ راقمہ سے جو کچھ حکومت کے ذمہ دار اشخاص نے کہا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ہمارے بچوں کے علاوہ ہماری قوم کے ہر فرد کو جنگ عظیم یاد ہے اور وہ اس کی ہولناکیوں سے واقف ہے۔ جنگ عظیم میں ہم نے سخت چوٹ کھائی تھی لیکن ساتھ ہی اس دور کی کشمکش اور قربانیوں نے ہم میں ایک نئی جان ڈال دی، ایک نیا ایمان بخشا۔ اسی نے ہمیں وہ حوصلہ عطا کیا کہ سولہ سال کے قلیل عرصے میں ہم نے جنگ کے ویرانوں پر ایک نیا ملک بنا کر کھڑا کر دیا ہر ترک کو فخر ہے کہ اس نے اس تعمیر میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ یہ نسل امن کی خواہاں ہو۔ ترکی نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جس پر گامزن ہو کر وہ اپنی قوم کا حق ادا کر سکتی ہے اور عام انسانی تہذیب کا بھی۔ کیونکہ وہ امن چاہتی ہے۔ نہ صرف اپنی قوم کے لئے بلکہ اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کے لئے بھی۔ میثاق بلقان اور ترکی، افغانستان، ایران اور عراق کے درمیان میثاق سعد آباد اسی نصب العین کے خارجی مظاہر ہیں۔ ہر وہ ملک جو دوسروں کے حقوق کا احترام کرتا ہے اور امن کو محبوب رکھتا ہے ترکی جمہوریہ کا قدرتی دوست ہے۔

اسی طرح ہر وہ حکومت جو اپنے اندھے پن میں ترکی کو کسی طرح دھمکائے یا اس کے امن کو خطرے میں ڈالے اسے متنبہ ہو جانا چاہئے کہ اگر ضرورت پڑی تو ہر ترک جسے اپنے وطن سے محبت ہے لڑے گا۔

عمومی نفسیات اور ذمہ دار لوگوں کی رائے کی مندرجہ بالا ترجمانی کرنے اور یہ دکھلا دینے کے بعد کہ یہ دونوں آپس میں متحد اور متفق ہیں، میں چاہتی ہوں کہ موجودہ نازک صورت حالات کو ایک اور زاویہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کروں اور یہ بیسویں صدی کا زاویہ ہے۔ کیونکہ کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ دنیا کے موجودہ مصائب دراصل نئے دور یعنی بیسویں صدی کی پیدائش اور افزائش کی تکلیفوں کی ہی ایک شدید کیفیت ہیں۔ بیسویں صدی کی اب عمر چالیس سال کی ہو چکی لیکن پھر بھی وہ اس صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھلی ہے جو اسے چودہ سال کی عمر میں اٹھانا پڑا تھا۔

مادہ پرستی، خود پرستی، نسل پرستی، مجنونانہ امن پرستی، مجنونانہ اوہام پرستی

(عا Mysticism/Mysteries) اور پروائی وبے تعلقی، یہ سب چیزیں ایک خودرو جھاڑی کی شاخوں کی طرح ایک دم پھیل پڑی ہیں اور آپس میں الجھ گئی ہیں یہی الجھاؤ یورپ کی موجودہ تباہی کا ذمہ دار ہے

مادہ پرستی نے افراد اور اقوام دونوں کی زندگی میں غیر محدود "انانیت" پیدا کردی ہے "انا" نے اتنی جگہ گھیرلی ہے کہ دوسری قدروں کے لئے گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ چند ایسے آمروں کا برسر اقتدار آنا تھا جو اپنے آپ کو اپنی قوم کا دیوتا سمجھتے ہیں۔ ان کا حوصلہ ہے کہ ساری آباد دنیا پر اپنا سکہ جمائیں اس سے کم پر وہ راضی نہیں۔ نسل پرستی اور خدا کی

عا۔ ...ticism... جس طرح فرد کے دل میں بعض اوقات موہوم آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں جنھیں وہ خود بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا لیکن جو اسے کسی خاص حرکت پر مجبور کرتی ہیں اسی طرح جماعت کے دل میں بھی موہوم آرزوئیں پیدا ہوا کرتی ہیں کبھی کبھی زیادہ شدت اور ہیجان کے ساتھ۔ اجتماعی نفسیات کے ماہرین جماعت یا گروہ کی بہت سی حرکتوں کو اسی کیفیت کا مظہر بتلاتے ہیں۔ اگر ان آرزوں کو تنظیم اور قیادت حاصل ہو جائے تو پھر یہ بڑی خطرناک ہو جاتی ہیں۔ مسولینی کا "رومۃ الکبری" کا دیوانہ خواب۔ ہٹلر کی وسیع تر جرمنی، اور جاپان کا "مشرقی مشن" یہ سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں فاشسٹ خود اپنی بنیاد عقل وشعور پر نہیں بلکہ ارادہ اور جذبہ پر رکھتی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی اس فن سے خوب واقف ہیں کہ کس طرح لوگوں کے دل میں ایسی آرزوئیں بیدار کی جائیں، کس طرح ان کو ابھارا جائے اور پھر کس طرح ان کو ہیجانی عمل کا محرک بنایا جائے۔

بیسویں صدی میں بہت سی ایسی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں جو اس طرح کے پریشان خواب دیکھا کرتی ہیں اور پھر تشدد اور دہشت انگیزی سے ان کی تعبیر حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی توجیہ موہوم پرستی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ سوشلسٹ مفکرین اس توجیہ سے متفق نہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش کی ذمہ دار اقتصادی بدنظمی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ ان کی پرورش کرتا ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے وہ سامراج کو قوم کی دبی ہوئی آرزوں کا مظاہرہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ بتلاتے ہیں حقیقت شاید ان دونوں نظریوں کے درمیان میں ہے

"منتخبہ قوم"[1] کے تخیل نے تمام ان لوگوں کو خطرہ میں مبتلا کر دیا جنھوں نے کسی اور قوم میں جنم لیا ہو۔ جمہوری ممالک میں ایک اور مرض "مجنونانہ امن پرستی" کا ظہور ہوا ہے شدید امن پرستی امن کی سخت ترین دشمن ہے۔ جو کوئی بھی امن چاہتا ہے لیکن قیام امن کے لئے "ما تحبون" کی قربانی، بلکہ خود زندگی کی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں اسے کبھی امن چین نصیب نہیں۔ مجنونانہ موہبام پرستی ان تمام جماعتوں کی گھر کی لونڈی ہے جو اپنے خلاف عقل مقاصد کو دھونس اور دھمکی سے منوانا چاہتے ہیں لیکن وہ چیز جس نے اس سب جھاڑ جھنکاڑ کو بڑھنے کا موقع دیا، لاپروائی کی عام ہوا ہے۔ بڑے بڑے عقلا جو خطرہ سے واقف تھے وہ برقی گرم شدہ کمروں میں آرام کرسی پر بیٹھے صورت حالات پر شاعرانہ انداز میں بحث کرتے رہے کسی نے خطرہ کے تعین اور فوری اقدام کی ضرورت پر توجہ نہ کی۔ جب کسی بیمار کا بدن مرض کی مدافعت نہ کر سکے اور اس کا دماغ اپریشن کی ضرورت محسوس کرنے سے اِبا کرنے لگے تو پھر اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

۱۹۳۹ء میں مغربی تہذیب کی بالکل یہی حالت تھی۔ میں سوچتی تھی کہ بیسویں صدی انسانی تاریخ کا سب سے خوفناک باب اور انسانی دماغ کا بدترین خواب ہو کر رہے گی۔ شاید میں سوچتی تھی یہ ہمیں ایک نئے تاریک دور کی طرف لے جائے گی جو پہلے تاریک دور (یورپ کے قرون وسطیٰ) سے زیادہ منظم زیادہ سلجھا ہوا (اور اس لئے زیادہ تباہ کن) اور زیادہ دیرپا ہوگا کیونکہ بیسویں صدی کا ترقی یافتہ فن اس کی ترتیب میں شامل ہوگا۔ پھر اسی سال پیرس کے قیام کے آخری ایام میں فضا میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ خیالات میں ایک نئی اور غیر متوقع سنجیدگی ظاہر ہوئی۔

---

[1] یہ خیال غالباً سب سے پہلے یہودیوں میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی منتخبہ قوم سمجھتے تھے۔ آج وہ اکی راندۂ درگاہ قوم ہیں۔ ان کے بعد مسلمان قوم نے اپنے آپ کو امت مقبول سمجھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی دور میں وہ منتخبہ قوم تھے وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ روشنی، زندگی اور انسانیت کا پیغام لے گئے وہ جاپان اور جرمنی کی طرح اپنے آپ کو خدائی فوجدار نہیں بلکہ خدائی خدمت گار تصور کرتے تھے۔ آج جاپانی اور جرمن اقوام اپنے آپ کو منتخبہ اقوام تصور کرتی ہیں۔ (مترجم)

رفتہ رفتہ دماغ جرّاح کے نشتہ کے لئے آمادہ ہونے لگا۔ بقائے حیات کا ایک قوی جذبہ حرکت میں آیا۔ پھر کچھ امید ہوئی کہ شاید ہماری صدی تباہی سے بچ جائے۔

اب ۱۹۴۷ء میں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مغربی تہذیب بچ سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اسے پھر زندگی مل سکتی ہے کروروں مرد اور عورتیں اس یقین میں میری شریک ہیں تھکی ہاری دنیا کو سنجیدگی کے راستہ پر لگانے اور پھر اس کو امن کی منزل پر پہنچانے کی کوشش ان لوگوں نے ابھی شروع کی ہے۔ لیکن جب تک مقاصد میں وحدت باقی ہے، جب تک سخت سے سخت مصیبت کے لئے آمادہ رہنے کی کوشش جاری ہے، جب تک نتائج کا خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہوں، مقابلہ کرنے کی ہمت ہے دنیا بجا طور پر امید کر سکتی ہے کہ بیسویں صدی انسانیت کو پیچھے نہیں ہٹائے گی بلکہ آگے بڑھائے گی۔

اب میں ترکی کے دائمی مقاصد بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس مضمون کا امریکی پڑھنے والا کہہ سکتا ہے "تم نے اپنا مضمون غلط مقام سے شروع کیا اور پھر تم بیسویں صدی کی تمثیل میں آ بھٹکیں۔ اس طرح چکر میں پڑنے اور ڈالنے سے کیا فائدہ ؟ اگر تمہیں ترکی کے مقاصد میں کوئی دائمی چیز نہیں ملتی تو اس کا اعتراف کر کے بات کو ختم کیوں نہیں کر دیتیں ؟

ترکی مقاصد کی بحث میں عمومی نفسیات کو میں اس لئے سب سے پہلے لائی کہ اس کی اور سرکاری نقطہ نظر کی ہم آہنگی اس کو ایک خاص پائیداری بخشتی ہے۔ بغیر کسی تسلسل کے بیسویں صدی کی بحث میں اس لئے پڑ گئی کہ تمام مقاصد کسی نہ کسی طرح اپنی صدی سے متاثر ہوتے ہیں ترکی کے دوامی مقاصد کی بحث کو سب سے آخر کے لئے اس لئے چھوڑ رکھا تھا کہ پہلے ہمیں لفظ "دوامی" کے مفہوم کو واضح اور متعین کرنا ہے۔

کسی امریکی سے بھی ریاست ہائے متحدہ کے دوامی مقاصد کے متعلق سوال کیا جائے، ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا "جمہوریت کی حفاظت"۔ بیسویں صدی نے جمہوریت کو بہت سے

---

۱ یہ مضمون امریکہ کے جریدہ FOREIGN AFFAIRS کے لئے لکھا گیا تھا۔ (مترجم)

مختلف معنی بخشتے ہیں اس اختلاف کو لحاظ رکھتے ہوئے بھی امریکی جمہوریت کے دوام کو مانا جا سکتا ہے
کیونکہ واقعات اور شخصیتوں کے اثر نے جمہوری عقائد کو کہیں کمزور کر دیا ہے اور کہیں قوی تر کر دیا ہے
لیکن امریکہ بدستور جمہوری عقائد پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ایک کافی طویل عرصے تک امریکہ نے
اپنی جمہوریت کی حفاظت کے لئے مردانہ وار قربانیاں کی ہیں۔ ان طویل قربانیوں نے امریکی
جمہوریت کو دوام کی فضا اور عادت کا خاصہ بخش دیا ہے۔

میں اپنے ذاتی تجربہ اور تاریخی معلومات کی روشنی میں ترکی کے دوامی مقاصد کو جس طرح سمجھ
سکی ہوں وہ اپنی کتاب "ترکی کا مغرب سے مقابلہ" میں قلم بند کر چکی ہوں ترکی انیسویں صدی کے
شروع ہی سے مغرب کا مقابلہ کر رہا ہے۔ تقدیر نے اسے ایک مغربی ملک بننے پر مجبور کیا ہے۔
پرانے اور نئے نظام میں تقریباً ایک صدی تک کش مکش جاری رہی۔ ایک طرف سے جان توڑ
مقابلہ اور دوسری طرف مردانہ وار قربانیاں ہوئیں۔ اب قدامت کا خاتمہ ہو چکا۔ آج ترک کا مقصد
اور اس کا فرض قدامت سے لڑنا نہیں بلکہ نئے دور کی برائیوں اور اچھائیوں میں امتیاز کرنا ہے
ترکی میں مغربی تہذیب رائج کرنے کی سرگرم کوششیں ۱۸۲۶ء، ۱۸۳۹ء اور ۱۹۰۸ء
میں ہوئیں۔ عبدالحمید کے عہد حکومت (۱۸۷۶ تا ۱۹۰۸) کو چھوڑتے ہوئے اس پورے دور میں ترکی
باوجود دقتوں اور مخالفتوں کے بڑی جرأت کے ساتھ تغریب کے (Westernization) راستے
پر چلتی رہی۔ معاہدہ لوزان کے بعد ایک نئے ترکی ــــ ترکی جمہوریہ نے جنم لیا۔ اتاترک اور عصمت
انونو اس کے روح رواں اور راہ نما تھے۔ کچھ اس لئے کہ اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کچھ
اس لئے کہ جن لوگوں نے اس کی تشکیل کی وہ غیر معمولی جرأت اور قوت کے مالک تھے یہ جمہوریہ
اب محفوظ اور مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اتاترک آج ہم میں نہیں۔ آج نئی ترکی کی باگ ڈور
عصمت انونو کے ہاتھ میں ہے۔ اتاترک کا ایک مصلح اور حکمراں کی حیثیت سے کیا رتبہ تھا۔ اس کے
متعلق میں اپنی کتاب مذکورہ بالا میں لکھ چکی ہوں یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ترکی ہمیشہ کے
لئے مغربیت اختیار کر چکی ہے

ہر ملک کا داخلی ارتقا اس کی خاص اپنی تمدنی اور تاریخی قوتوں کے مطابق ہوتا ہے
جس طرح جمہوریت امریکی زندگی پر طاری ہے۔اسی طرح مغربیت ہماری زندگی میں ساری
ہے۔سوال ہو سکتا ہے کہ یہ مغربیت کس نوع کی ہے؟ ایک مغرب جمہوری حکومتوں کا
ہے۔ایک آمری حکومتوں کا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکی نے جمہوری طرز اختیار کر لیا
ہے۔اس لیے بڑی جمہوری حکومتوں کے ساتھ دفاع اور وسیع انسانی قدروں کے تحفظ کے
لیے ہم نے جو اتحاد کیا ہے وہ جلد ختم ہونے والا نہیں۔اگر جنگ کل ہی ختم ہو جائے تب بھی قیام
امن، معاملات میں سنجیدگی کے احیا اور وسیع انسانی قدروں کے تحفظ جن کے واسطے ہم جان
دینے کو تیار تھے ان کے لئے جمہوریتوں سے تعاون جاری رکھیں گے۔پچھلے تجربے اور
ہماری تقدیر نے ہمیں جمہوریت تک پہنچا دیا ہے اور ان قوموں سے ہم رشتہ کر دیا ہے
جو اس پر عامل ہیں۔

ترکی کے موجودہ ارباب حل وعقد کو بھی اس بات کا پورا احساس ہے۔یہ ہمارے
وزیر اعظم رفیق سیدم کی اس تاریخی تقریر سے ظاہر ہے جو انھوں نے ۸ ار جنوری ۱۹۴۰ء کو کی تھی۔
انھوں نے کہا تھا "ہماری حکومت دستوری اصولوں پر مبنی ہے۔ہم سب کی آزادی کا احترام کرتے
ہیں..... ... ایسے نظام کا چلانا جس کے پیش نظر بغیر کسی روک ٹوک کے (غیر ذمہ دارانہ
حکومت کرنا ہو بہت آسان ہوتا ہے لیکن یہ نظام ہم کو قبول نہیں ہمارا مقصد مطلق العنانی سے
حکومت کرنا نہیں بلکہ محفوظ طریقوں سے ترقی وخوشحالی حاصل کرنا ہے ہماری رائے میں محفوظ ترین
راستہ وہی ہے جو ذمہ دار جمہوری حکومت کی طرف لے جاتا ہے"

رفیق سیدم کو سولہ سال کا حکومتی تجربہ ہے وہ اس نکتہ رس فہم کے مالک ہیں جو بخوبی سمجھ
سکتی ہے کہ کون کون چیزیں ترکی کی اندرونی ترقی کے لئے مفید ہیں ان کے ان الفاظ کو ان
سولہ سالہ تجربہ اور اس فہم کا نچوڑ سمجھنا چاہئے۔ترکی اب تغیر کے راستہ کا بہت کافی حصہ طے
کر چکی ہے۔تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور دوسرے شعبہ جات زندگی میں اب تک جو کچھ اصلاحات

ہو چکی ہیں ان سب میں آخری طور سے ہم آہنگی اور تطابق پیدا کرنے کے لئے اب قوت عمل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ دانائی، دور اندیشی اور صبر کی۔ یہ ہم آہنگی زیادہ سے زیادہ جمہوری اسپرٹ میں (جس کی اجازت ملکی حالات دیں) حاصل کرنا چاہئے عصمت انونو اور رفیق سیدم دونوں اس تجربے اور قابلیت کے مالک ہیں جو اس جیسے نازک کام کو سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کسی قوم کی خارجی پالیسی کے تعین میں اس کے قومی مفاد اور تمدنی و اخلاقی رجحانات دونوں شریک ہوتے ہیں اس زاویہ نظر سے بھی ترکوں کی بیرونی پالیسی ایسے مقاصد سامنے رکھتی ہے جنھیں ہم دوامی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کسی تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں، لیکن پھر بھی ہم اس علاقے پر نظر ڈالتے چلیں تو بہتر ہے۔

بلقانی اقوام کے ساتھ اقتصادی اور دفاعی دونوں مقاصد کے لحاظ سے اتحاد ترکی کے امن کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اتحاد بلقانی اقوام کی حفاظت کے لئے بھی اہم ہے۔ ترکی جمہوریہ نے اس بات کو سمجھ لیا اور میثاق بلقان کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر بلقانی ملک آپس میں بھی خوب متحد رہیں اور ترکی کے ساتھ بھی تو وہ اپنی پوزیشن قائم رکھ سکتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے شہنشاہی منصوبوں سے بچ سکتے ہیں اور امن و خوش حالی کے ساتھ رہ سکتے ہیں ایک اور بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ اگر مستقبل قریب میں ان میں سے کوئی ملک متحدہ محاذ میں رخنہ ڈال کر جنگ کے سیلاب کو مشرق قریب میں لانے کا مرتکب ہوگا، تو وہ ترکی نہ ہوگا۔

اٹلی شاعرانہ انداز میں بحیرۂ روم کو اپنا قومی بحیرہ بتلاتا ہے ترکی کے ساحلی شہروں پر جو اس نے منصوبے باندھ رکھے ہیں وہ اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک انگلینڈ اور فرانس کی شہ اور جرمنی اور روس کی امداد اسے حاصل نہ ہو اور اب یہ چیز ناممکن ہے کہ انگلینڈ اور فرانس ترکی علاقہ پر اطالوی قبضہ ہوتے ہوئے دیکھیں اور مزاحمت نہ کریں۔ جب اٹلی سے ان کی دوستی تھی اس وقت بھی انھوں نے بحیرہ روم میں اٹلی کو بہت زیادہ طاقت حاصل کرنے سے روکا ورا طالوی اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ اس بات کو نہ سمجھتے ہوں کہ جرمنی اس وقت چاہے اسے

کتنے ہی وعدے وعید کرے وہ کبھی اٹلی کو اس علاقے میں قدم نہ جمانے دے گا جو خود اس سے LEBENSRAUM (وہ علاقہ جس کا حصول جرمنی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ لفظی معنی "رہنے کے لئے جگہ") میں شامل ہے ہم امید کرتے ہیں کہ اٹلی میں ذرا بھی سمجھ ہوگی تو بلقانی منصوبوں سے باز رہے گا لیکن مطلق العنانی حکومتوں میں سمجھ کا مادہ ذرا کم ہوتا ہے وہ بڑی بڑی چیزوں کے لئے پانسہ پھینکتے ہیں اور بھاری بھاری بازیاں لگاتے ہیں اس لئے ترکی کو برے سے برے وقت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ترکی کو اب اور آئندہ بھی انگلینڈ اور فرانس سے تعاون کرنا ہوگا تاکہ وہ مشرق قریب میں امن قائم رکھ سکے۔

پچھلے بیس سالوں میں روس سے ہمارے تعلقات نہ صرف دوستانہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ اچھے رہے ہیں۔ ہماری تاریخ کے ایک نازک دور میں نئے روس نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہم ایک دوسرے کے وفادار دوست رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی روسی حکومت کی پالیسی بہت صلح کن اور مستحسن تھی اس نے خارجی معاملات میں ایک نہایت عمدہ مثال قائم کی تھی۔ بدقسمتی سے یہ سب چیزیں نازی جرمنی سے اتحاد ہوتے ہی ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے؛ پولینڈ! فن لینڈ!! کیا سویٹ روس زاری استبداد کی طرف بازگشت کر رہا ہے؟ ہمیں اس پر اعتبار کرتے ہوئے دقت بھی محسوس ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ روس اور ترکی کے درمیان اچھے تعلقات ہونا دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے اگر روس ترکی پر حملہ کر بیٹھے تو اس کو فنی مہم سے کہیں زیادہ مصیبتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پونے دو کروڑ ترکی مرد عورتوں کو ایک ایک کرکے تہہ تیغ کرنا ہوگا۔ جرمنی جو آج روس کو ترکی پر چڑھائی کرنے کو اکسا رہا ہے۔ اس وقت موقع دیکھ کر خود روس پر ٹوٹ پڑے گا۔ یہ سب سمجھ کی باتیں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں آمریت پرست اقوام عقل کے ذریعے سے نہیں سوچتیں۔ ان کی قوت فیصلہ پر اور ہی چیزیں چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس بلا کا اگر کچھ حفظ ماتقدم ہو سکتا ہے تو وہ انگلستان اور فرانس سے اتحاد ہو سکتا ہے۔

جنگ عظیم کے زمانے سے جرمنی سے ترکی کے تعلقات دوستانہ رہے ہیں۔ ہمارے اقتصادی

مفاد جرمنی سے وابستہ تھے کیوں کہ وہ بھاری درآمد اور برآمد میں برابر کا حصہ دار تھا۔ یہ چیز
بجائے خود خوش گوار تعلقات کو استقلال بخشنے کے لئے کافی تھی لیکن بدقسمتی سے اس خطرہ
کے سامنے ہوتے ہوئے ترکی کے لئے سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ وہ فرانس اور برطانیہ
سے اتحاد کرے، کیوں کہ یہی دو طاقتیں ہیں جو مشرق قریب میں جرمنی اور روس کی سامراجی توسیع
کو روک سکتی ہیں اور جو خود اپنے بچاؤ کے لئے ان کو روکنے پر مجبور ہوں گی

اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قسمت نے ہمیں اس اتحاد کا راستہ دکھلایا
ہے اور تاریخی ضروریات اس کو دائمی بنا دیں گی۔

ترکی کی جنگ آزادی جیتنے کے بعد اتاترک کو خوش قسمتی سے بیرونی کش مکش سے نجات
مل گئی۔ اور یہ موقعہ ملا کہ جنگ کے خطرات کی فکر سے یک سو ہو کر اندرونی تبدیلی و اصلاح پر پوری
توجہ دے سکیں۔ عصمت انونو دنیا کی تاریخ کے ایک پرخطر وقت میں برسر اقتدار آئے۔ میں بالکل
سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ ترکی کو اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ نکال لے جانے کے
لئے کوئی عصمت انونو سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ سادہ
ترک کی بہترین مثال ہے۔ وہ اس انسانی مواد کی تمام کمزوریوں اور خوبیوں سے واقف ہیں
جن سے وہاں کی حکومت کی مشین بنی ہے۔ ان کی شخصیت نے قومی زندگی میں ایک اتحاد کی
فضا پیدا کر دی ہے اور خارجی امور میں ان کے تجربے اور بلند اخلاقی خوبیوں نے ان کو بین الاقوامی
محاذ امن پر ایک نمایاں پوزیشن کا مالک بنا دیا ہے۔

(مترجمہ ریاض الاسلام صاحب)
(بی۔ اے۔ علیگ)

ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن و تہذیب کیا ہے؟

(از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن)

تہذیب کا لفظ ہمارے زمانے کی عجائبات میں سے ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مہذب ہونے کا یقین رکھتا ہے ہر قوم اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنی تہذیب کی قدر کرے اور دنیا سے اس کی قدر کرائے۔ لیکن تہذیب کے معنی پوچھیے تو ہر شخص اس کی ایسی تشریح کرتا ہے کہ جس سے اس کا اپنا مذاق، اپنے خیالات، اپنا رہن سہن، تہذیب کا لب لباب معلوم ہوتا ہے۔ اور قومیں اپنی تہذیب کے گن گاتی ہیں تو اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور سیاست اور جنگ میں جتنی ان کو کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تہذیب پھیلی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو تہذیب کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی تعریف ممکن نہیں، اور یا اتنا تنگ کہ اس کے وجود ہی کا یقین نہیں رہتا۔

اسلامی تہذیب کی تعریف کرنا اور بھی مشکل ہے کہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں زور باندھا ہے، وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا تو کبھی سیاست کا، کبھی دوسروں کے اثر کو دیسے جان کر مٹایا۔ کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، کبھی انا و لا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل گئی فضا کی ایک کیفیت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ دن کا اجالا اور رات کا سکون بن کر زندگی میں گم ہو گئی لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا اتار چڑھاؤ ایسا رہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ مذہب اور تہذیب کے مفہوم پر غور کرتے رہے ہیں

اس وقت اگر ہم بیٹھ کر سوچیں تو ہم بھی اسلامی تہذیب کا ایک خاکہ تیار کر سکتے ہیں اور ممکن ہے بناتے بناتے ہم ایسا کچھ بنالیں کہ جو چاہے زبان سے بیان نہ ہوسکے، دل میں گھر ضرور کر لے گا۔

ایک بات کا خیال ہم کو خاص طور پر رکھنا ہوگا اور وہ یہ کہ اسلامی تہذیب نے کبھی اپنے اور غیر کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی۔ مسلمانوں کو کبھی نرالے اور انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جس پر فوراً نظر پڑتی اور آسانی سے بیان کر دی جاتیں۔ اس کے برعکس ہماری تہذیب کا میلان ہمیشہ پھیلنے دوسری تہذیبوں سے اثر لینے اور ان پر اپنا اثر ڈالنے کی طرف تھا اور اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح سمجھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم نے کتنا لیا اور کتنا دیا۔ ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہیں لگائی۔ بلکہ اس طرح ملے جیسے شکر اور پانی۔ یورپ والے اب صدیوں کی حجت کے بعد ماننے لگے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے علم کو بہت بڑھایا اور اور پھیلایا۔ لیکن یہ دعویٰ اب بھی شاید ہی کوئی تسلیم کرے کہ بول چال کی زبانوں کو ادبی زبانیں بنانا مسلمانوں کی ایک خاص خدمت تھی۔ ہماری تہذیب کا اثر روحانی ذہنی اور جسمانی تندرستی کی طرح تھا جو کہ خود محسوس نہیں ہوتی جس کی کیفیت بیان کیجئے تو خودستائی معلوم ہوتی ہے اور جس کے موجود نہ ہونے یا ضائع ہو جانے کا غم بھی اکثر نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کہ خود فریبی انسان کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

اسلامی تہذیب میں نمایاں ظاہری علامتیں خاص طور پر اس وجہ سے پیدا نہیں ہوسکیں کہ مذہب اسے ہمیشہ ہموار کرتا رہا۔ اسلام بجائے اس کے کہ تہذیب کی خلعت پہن کر الگ عزت کے مقام پر بیٹھ جائے۔ خود تہذیب کے مقام کو بدلتا اور اس کی حیثیت کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کبھی تہذیب کے ہم معنی یعنی تہذیب میں گرفتار نہ ہوا۔ مسلمان کبھی اتنے مہذب نہ ہوسکے کہ اسلام سے غافل ہو جائیں۔ ان کا دین ان کی دنیا کو جھنجھوڑتا رہا جیسے کوئی استاد نیند سے ماتے شاگرد کو۔
اس وقت بھی اگر آپ دیکھئے تو تہذیب ابھی انگریزی حکومت کا سہارا لے کر اور مغرب کی علمی ترقیوں

کی قسمیں کھا کر مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کر چکی ہے اور کامیاب نہیں ہوئی ہے ہم دوسری قوموں کی طرح مذہب کو چھوڑ کر تہذیب کو پکڑ نہیں سکتے اس وجہ سے ہم دوسروں سے کم سمجھے جاتے ہیں اور ہماری ہنسی بھی اڑائی جاتی ہے لیکن تہذیب کے ناعاقبت اندیش فدائیوں کی ضد میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم صرف مذہب کو جانتے ہیں تہذیب کو نہیں جانتے۔ اس لئے کہ پھر ہمیں ہر موجودہ تہذیب سے قطع تعلق کرکے بالکل صحیح قرآنی تعلیم کی بنیاد پر ایک نئی اور سب سے الگ زندگی کی طرح ڈالنا ہوگی یہ ممکن تو بیشک ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ ہماری زندگی میں آگے چل کر ایسا کوئی انقلاب ہو جو موجودہ تہذیب کی عمارت کو ڈھا کر کوئی نئی عمارت اس کی جگہ کھڑی کرے لیکن ایسا انقلاب پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لئے ہمارے واسطے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم مذہب کو تہذیب سے الگ نہ سمجھیں، مذہب کو تہذیب کی روح اور عمل کا معیار جانیں اور اس کی آرزو دل میں رکھیں کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں اس لئے اگر میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کرتے وقت عقیدوں کا ذکر جتنا کہ آپ کے خیال میں ہونا چاہیئے نہ کروں تو اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں عقیدے کی اہمیت کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ یہاں بحث صرف تہذیب سے ہے مذہب سے نہیں، اور عقیدے مشترک ہیں، یعنی تہذیب میں قریب قریب اسی شکل میں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مذہب میں انھیں میں نے تہذیب میں شامل سمجھا ہے۔

تہذیب کے مفہوم اور عالم اسلام کی وسعت اور رنگارنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب کی چھ سات خصوصیتیں سب سے پہلے میرے خیال میں آتی ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ انسانیت کے اس تصور کا ہے جو اس تہذیب کی جان ہے، وہ تصور کہ جس نے انسانیت کے امتیازات کو نسل مذہب اور مقام کا پابند نہیں رکھا جس نے مسلمان کو آزادی دیدی کہ جس ملک کو چاہے اپنا وطن بنائے جو زبان چاہے بولے، ہر نسل اور مذہب کے آدمیوں کے لئے اس کی صورت نکالی کہ وہ مسلمانوں سے مل کر رہیں۔ مسلمانوں میں آپس کی عداوتیں تھیں، لیکن یا تو سیاسی تھیں یا مذہبی، تہذیبی نہیں تھیں اور انھوں نے کسی کو انسانیت سے محروم نہیں کیا۔ ہماری تہذیب کی اس خصوصیت

کی سب سے اچھی مثال وہ رویہ ہے جو ہم نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا جنھیں کسی نسل اور کسی مذہب کے لوگ اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے، اور جن سے اب تک ایسی نفرت برتی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کے سایہ میں رہے طبیعت اور اخلاق کے لحاظ سے یورپ کے یہودیوں سے مختلف یا بہتر نہیں تھے لیکن انھیں ہمارے دین نے اہل کتاب کی حیثیت دے کر بھی رواداری کا مستحق بنایا اور ہماری تہذیب نے ان کو خدمت اور ترقی میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا۔ یہودی تو خیر سامی نسل کے اور ایک خدا کو ماننے والے تھے اسلامی تہذیب نے بت پرستوں کو بھی انسانیت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا اور ان کی گمراہی کو انھیں حقیر یا ذلیل سمجھنے کا بہانہ نہیں بنایا۔

انسانیت کے بعد اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت عقلیت ہے یعنی وہ جگہ جو اس کے معیار زندگی میں عقل سلیم کو دی گئی۔ جس طرح ہم ہر آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی مانتے رہے ویسے ہی ہمارا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کو اپنی طبیعت اور اپنے عمل میں توازن قائم رکھنا چاہئے ایسا توازن کہ جو ایمان کو قائم اور مضبوط رکھے مگر انسان کو ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست نہ بننے دے جو شوق اور مہارت کی سچی اور پوری قدر کرے مگر ضبط دبے اعتدالی اور انتہا پسندی کو فوراً پہچان لے جو انسانی زندگی کو عقیدے اور عقل کا پابند رکھے مگر رسم اور عادت کا غلام نہ ہو جانے دے تہذیب کی اس خصوصیت نے مسلمانوں کو جہاں تک کہ اخلاقاً صحیح ہے آزاد کر دیا، ان کی آمد ورفت اور میل جول پر کوئی قید نہیں لگائی، جب کبھی وہ رسم ورواج میں گرفتار اور عادت سے مجبور ہونے لگے تو ان کے سامنے رہائی کی ایک تدبیر پیش کر دی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور ذہن میں ایک لوچ پیدا کر دیا کہ جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ کر سکتے تھے۔ اسی عقلیت نے مسلمانوں کے دل میں تجربے اور احساسات کی اتنی وقعت رکھی کہ وہ منطق کے پھیر میں نہیں آئے اور اگر کبھی آئے بھی تو بہت جلد اس سے نکل بھی گئے اسی نے دینداری کو ریاضت سے روکا، دنیاداری کو بے لگامی سے اور نعمت کی قدر اور عذاب کے خوف کے دو رنگ ملا کر نہ جانے کیسی کیسی دلکش تصویریں بنائیں۔

مسلمانوں میں عقلیت پیدا نہ ہوتی نہ قائم رہتی اگر اسلام نے بہت بین طور پر میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دی ہوتی لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ دیکھئے تو علم وعقیدے کے میدان میں عقلیت ان لوگوں نے نہیں برتی جو کہ دینی علوم کے حامل تھے بلکہ ان لوگوں نے جنھیں خاص علمی شوق تھا یا وہ جن پر سیاسی ذمہ داریاں تھیں، اس کے برخلاف ہماری تہذیب کی تیسری خصوصیت مساوات ہرگز باقی نہ رہتی، اگر وہ ہمارے دین میں شامل نہ ہوتی اور اسے برتے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا۔ مساوات کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے سیاست اور دولت دونوں ہمیشہ بیزار رہی ہیں اور انھوں نے اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی مگر اتنی کامیاب نہ ہوئیں کہ مساوات کے خلاف کوئی نظیر یا سند قائم ہو جائے۔ اب بھی مساوات کا بھروسہ صرف مذہب پر ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مذہب کا حکم بہت صاف اور واضح ہے اور اسی کے ساتھ انسانیت کی قدر بھی اسی طرح ہماری تہذیب میں شامل ہو گئی ہے کہ سیاست اور دولت چاہیں جیسا نشہ پلا دیں، جذبۂ دینی کا ایک گھونٹ اس کا توڑ کر دیتا ہے، یا انسانیت کی قدر نشے کو آہستہ آہستہ اتار دیتی ہے۔

اسلام نے آدمیت کو معیار مانا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملت اور جماعت کے احساس کو بھی لازمی ٹھیرایا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طرح کا تضاد ہے، لیکن اگر آپ یہ یاد رکھئے کہ انسانیت محض ایک تصور ہے اور حقیقت میں انسانی آبادی جماعتوں پر مشتمل ہے اور ابھی تک زبان، خیالات، معاشرت اور ماحول میں ایسی یکسانی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے کہ جو دنیا کی تمام قومی حد بندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک جماعت بنا دے، تو یہ سمجھ جانا کچھ دشوار نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ملت بنے رہنے کی تاکید کیوں کی گئی۔ اسلامی تہذیب کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ملت کے احساس کو خاص تقویت پہنچائی اور سیاست تو مساوات کی طرح ملت کے تصور کو بھی ہمیشہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی رہی لیکن سیاست کا کچھ بس نہ چلا، اور تہذیب کو اس پر مطمئن ہونا پڑا کہ ملت اور انسانیت کے درمیان صلح قائم رکھے جو کہ بذات خود ایک بڑی مشکل خدمت تھی اور بہت خوبی سے انجام دی گئی۔

اسلامی تہذیب کی جو خصوصیتیں میں نے اب تک بیان کی ہیں ان میں سے عقلیت مسلمانوں میں کمیاب ہو گئی ہے اس لیے کہ مسلمان کئی سو برس سے اس کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اگر

وہ کسی حد تک موجود ہے تو صرف اس لئے کہ اسے اس کے دشمن اسلام سے خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ اس تہذیب کی دو اور خصوصیتیں ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں نہیں ملتیں، بلکہ یورپ میں ہیں اور ان کا ذکر میں صرف اس سبب سے کر رہا ہوں کہ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کو رونق انہیں سے تھی اور ہم بھی چاہیں تو یورپ کی تقلید کئے بغیر اپنی تہذیب کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو جلا کر اپنی محفل کو روشن کر سکتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی ان خصوصیتوں میں سے پہلی یہ تھی کہ علم حاصل کرنا انسانیت کا فرض ٹھہرایا گیا اور اس کا یقین دلایا گیا تھا کہ علم کی بدولت ہر طرح کی ترقی ممکن ہے۔ انسان ترقی کرتا رہا ہے اور آئندہ ترقی کرتا رہے گا یہ دعویٰ اس زمانے میں بڑا انقلاب انگیز تھا جب ساری دنیا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کامل علم اور کامل معصومیت کی حالت سے آہستہ آہستہ گرتا رہا ہے اور عیبوں کی تاریکی میں گھرتا رہا ہے۔ اب یورپی قوموں کے علمی کرشموں کو دیکھتے ہوئے اس دعویٰ میں کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جماعت میں اب بھی وہ انقلاب انگیز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اب سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن کو وہ غلاف میں بند رکھتے ہیں۔

علم کے لئے جستجو، شک، تجربہ لازمی ہے اور جس زمانے میں علم کی شمع اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں تھی، اس نے علم کو ہر طرح کی آزادی دی اور علم کے شیدائیوں نے ایسی رواداری برتی اور ایسے صدمے بھی اٹھائے کہ جس کی مثال صرف یورپ کے دور جدید کی ابتدا میں ملتی ہے۔ یورپ میں اب علم اصولاً بالکل آزاد ہے لیکن وہ سیاسی اور تہذیبی تعصبات سے خالی نہیں۔ اور اس نے دین سے ایسی سرد مہری اور عداوت برتی ہے کہ جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچا ہے اور خود علم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں دینی علوم کے نمائندے خالص علم کے نمائندوں سے جھگڑے اور ان سے اور کسی طرح بس نہ چلا تو مار پیٹ کر کے اپنی برتری تسلیم کرائی۔ یہ سمجھئے انسانی کمزوری تھی ورنہ جن علما کی پرورش اسلامی تہذیب کی گود میں ہوئی وہ خود سر اور انتشار انگیز نہ تھے۔ انہوں نے نہ عقیدے کی جڑ کاٹی نہ حق بات کہنے سے جھجکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی قائم رہی اور انسان کی صحیح نشو و نما اور ترقی کے لئے دونوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی۔

آخر میں آپ اجازت دیں تو اسلامی تہذیب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کر دوں جس کا یقین کرنا اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل ہے، وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی غیر تہذیبوں کی پرورش کی۔ صرف اس سیاسی مصلحت کے اشارے پر نہیں جو دنیا کو کاٹ کر مسلم اور غیر مسلم کے دو حصوں میں تقسیم کرنا اپنے لئے مضر سمجھتی تھی بلکہ تہذیبی باغبانی کے ایسے شوق میں کہ جس نے نفع نقصان کا حساب رکھنا اپنی توہین سمجھا اور صرف اپنے چمن کی رنگارنگی کو دیکھتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محقق جنھیں اسلامی تہذیب کی خوبیاں تسلیم کرنا منظور نہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے فروغ کا وہ زمانہ مسلمانوں کے سوا اور ہر تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا۔ اسلامی تہذیب مختلف قومی اور مقامی تہذیبوں کا ایک مجموعی نام ہے۔

اسلامی تہذیب ان تمام خصوصیات کو جو میں نے بیان کی ہیں ساتھ لے کر ہندوستان آئی وہ ساتھ میں تلوار لے کر نہیں آئی جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ تجارت کا مال یا سیاحت کا شوق یا خدمت کے حوصلے لیکر آئی اس کا پہلا مرکز جنوبی ہندوستان کی بندرگاہیں تھیں جہاں سے وہ آہستہ آہستہ ملک کے اندر پھیلی شمالی ہندوستان میں وہ شمال مغرب کی تجارتی شاہراہ سے آئی۔ مگر پھر امیر محمود غزنوی کے حملوں کی گرد و غبار میں وہ اسی طرح غائب ہوگئی جیسے کہ خوشبو کسی آندھی میں لیکن امیر محمود کے ساتھ استاد البیرونی کا بھی ہندوستان میں آنا ہوا اور غالباً تہذیب کے کسی سچے قدردان کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ ان کی کتاب الہند تہذیب کی ایسی خدمت ہے جو سلطان محمود کی پیدا کی ہوئی عداوتوں کی تلافی کر سکتی ہے بہرحال عداوتیں اور لڑائیاں تاریخ ہی میں زندہ رہیں نسل انسانی انھیں بہت جلد بھول گئی اور ہندوستان کا قریب کے ملکوں سے تعلق بڑھتا ہی رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں جب محمد غوری کی فتوحات نے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے لئے میدان صاف کر دیا تو شیخ معین الدین چشتی بھی ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے خدمت اور تبلیغ کا کام اسی شہر سے شروع کیا جو کہ سب سے ممتاز راجپوت سلطنت کا مرکز تھا اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے ہندو مسلمان دونوں اپنا خون بہا چکے تھے

مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ہندوستانیوں میں سیاسی حس بہت کم تھا مگر مذہبی حس بہت قوی تھا اور اسی وجہ سے ہم اسلام کا ردعمل سب سے پہلے ہندوستان کی مذہبی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے

اور نویں صدی میں شری شنکر آچاریہ کی اصلاحی تحریک نے مقدس کتابوں کو وہی رتبہ دیا جو کہ ہم قرآن کو دیتے ہیں یعنی ان کو الہامی مانا اور ان کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اسی تحریک نے بدھ تیوں جینیوں، جوگیوں اور برہمنوں کی تعلیمات کو بیدہ درشن یعنی حقیقت سے روشناس ہونے کے چھ مختلف مگر برابر کی قدر رکھنے والے طریقے ٹھہرا کر عقائد کے اس انتشار کو دور کیا جو اب تک پایا جاتا تھا اور دینی تعلیم میں جو یک جہتی اس طرح سے پیدا کی گئی تھی اسے بدھ تیوں سے جاترا یعنی زیارت کا رواج اور جینیوں سے اہمسا کا عقیدہ لیکر اور مضبوط کیا امیر محمود نے جب ہندوستان پر حملے کئے تو میدان جنگ میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت آزمانے کے لئے ہندو دھرم اور ہندو جاتی یعنی ملت موجود تھی اور بعد کو جو تحریکیں اٹھیں وہ انھیں کی کش مکش کا نتیجہ تھیں۔

میں یہاں پر ان اثرات پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا جو اسلامی تہذیب نے ہندوستانیوں کی ذہنیت پر ڈالے لیکن یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ انسانیت اور مساوات کے جو پختہ عقیدے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ انھوں نے ذات کے اس تصور کو جو یہاں ایک اٹل قانون بن گیا تھا فلسفے اور مذہب سے نکال باہر کیا اگرچہ رواج کو بدل نہ سکی اسنے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد عمل کی صورت پیدا کی جنھیں دونوں کے مذہب نہیں تو مذہبی منطق گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھگتی کے طریقوں کو، اپنشدوں کے فلسفے کو، ہندوستان کی موسیقی اور فنون لطیفہ کو ایسا سراہا صنعتوں کی اس طرح دل کھول کر سرپرستی کی اور ہندو معاشرت میں جو ضروری معلوم ہوا اس کو ایسی خوشی سے اختیار کیا کہ اسلامی تہذیب بہت جلد ہندوستانی تہذیب بن گئی۔ ہندوستان میں رواج کی اتنی قدر ہے کہ اسلامی تہذیب نے بہت کیا اگر معقولیت کے تصور کو قائم رکھا اور زندگی اور معاشرت میں نمایاں طور پر نہیں تو کم از کم شاعری میں اسے ہر اور مسلک پر بھاری کر دیا۔ دنیاوی علوم کا نہ یہاں شوق پھیلا نہ انھیں کوئی ترقی دی جا سکی لیکن تعلیم کا ایک نصاب اور شائستگی کا ایک ایسا معیار عام کر دیا گیا کہ جس نے تہذیب کو زوال سے بچایا اور ہر علم فن اور ہنر کی قدر قائم رکھی۔

لیکن ہندوستان کی اسلامی تہذیب کے ماننے والوں میں سے تمام ہندو اور بہت سے مسلمان اس کی شکایت کرتے رہے کہ اس تہذیب نے ہندوستان میں گھر تو بنا لیا ہے مگر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز مٹانے اور اسلام سے رشتہ توڑنے پر تیار نہیں، معمولاً پوری رواداری برتتی ہے مگر کبھی کبھی اسلام کو حقیقت کا واحد مظہر کہہ کر ہر غیر فلسفے اور عقیدے سے منھ پھیر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کے کلام میں یہ شکایت اکثر ملتی ہے اور غالباً وہی اکیلے نہیں بلکہ اور جتنے غیر مسلم مصلح ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے اگر مسلمانوں نے انسانیت اور مساوات سے عقیدت رکھنے کے باوجود مومن اور مشرک کے فرق پر زور نہ دیا ہوتا اور اگر وہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے۔ اسلام مومن اور مشرک کے فرق کو نظرانداز کرکے پھیلایا جاتا تو یقیناً اس کی کایا پلٹ ہو جاتی وہ یہاں کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا علم معقولیت اور فطرت کا سکھایا ہوا مذہب نہ رہتا بلکہ رسم و رواج اور قدامت پرستی پر بھروسا کرتا مسلمانوں کے سامنے کوئی معیار نہ رہتا اور ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوتی، اس میں نقصان صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا بلکہ ہندوستان کا بھی ہوتا اس لئے کہ انسانیت عقلیت مساوات ایسے تصور نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ دل میں جم جائیں تو پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیں تنگ نظری، جہالت، اوہام پرستی، بزرگوں کی پوجا، دولت کی پوجا اصل میں تو یہ چیزیں ہیں جو انسان کی طبیعت کو روگ کی طرح لگ جاتے ہیں یا گرد کی طرح دل کے آئینے پر جم جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے دور ہوتے ہیں، ملت اسلامی کو غیر مسلموں سے الگ رکھنے، مومن اور مشرک کے فرق کو ضد کرکے قائم رکھنے اور شرعی قانون کو برابر حکومت کے اختیار اور رسم و رواج کے اثر سے باہر اور بالاتر قرار دینے کے باوجود بھی آپ دیکھئے تو ہماری معاشرت اسلامی قانون سے بہت منحرف ہو گئی ہے ہم نے عورتوں کے سارے حق مار لئے ہیں، برادری اور ذات کو دیکھ کر شادی بیاہ کرتے ہیں، نوکروں کو اپنے ساتھ کھلاتے نہیں اپنا سا بناتے نہیں، اپنے برتنوں میں پانی نہیں پینے دیتے۔ اخلاق کو اور جو نقصان ہوا ہے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہماری معاشرت ہندو معاشرت کے رنگ میں رنگ گئی تھی لیکن قرآن کی تعلیم کا معیار موجود تھا۔ انگریزی حکومت اور اس سے بھی زیادہ انگریزی تعلیم نے ہم کو ایک ایسے

پھیر میں ڈال دیا ہے کہ جس سے نکل جائیں تو سمجھئے جان بچی، آپ مانیں یا نہ مانیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی دو بڑی خصوصیتیں، عقلیت اور علم کی پیاس ہمیں ورثے میں نہیں ملیں بلکہ یورپی قوموں کو اور اسی ورثے کی بدولت انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ساری دنیا ان کی ہو گئی ہے۔ ا یہ یورپی تہذ کے سب سے کارگر ہتھیار یہی ہیں اور ہم اسلامی تہذیب کو بچا نہیں سکتے جب تک کہ ہم اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پھر سے پیدا نہ کریں، ہمارے دیس کے بھائیوں نے جنھوں نے اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول نہیں کئے تھے اور جو اب اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا ہندوستان کی مشترک تہذیب میں کوئی حصہ تھا، یورپی تہذیب کو اپنا کر بظاہر ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں ان میں آزاد خیالی ہے جو موجودہ معیار کے لحاظ سے ہر مہذب آدمی میں ہونا چاہیے مگر مسلمانوں میں عام طور پر نہیں ہے وہ ملت اور ملت کے قانون کو چھوڑ کر جمہور بن گئے ہیں اور جمہوری طریقے پر معاشرتی قانون بناتے ہیں اور بناتے رہنا چاہتے ہیں، ہم نہ اپنے دین کو چھوڑتے ہیں نہ اپنے شرعی قانون کو نہ ملت کے خیال کو اور نہ اسلامی تہذیب کی محبت کو۔ اگر ہم نے یہ مسلک خالی ضد میں اختیار کیا ہوتا تو معاملہ بہت آسان ہوتا اور ہمارے لئے اس کی کوشش کرنا کہ تعلیم جلد پھیلے اور جہالت دور ہو کافی ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ دنیا میں اور ملک میں ہماری حیثیت کچھ بھی ہو ہماری کوئی سنے یا نہ سنے بات ہمیں ٹھیک کہتے ہیں کہ تہذیب و معاشرت کو مذہب کا سہارا چاہیئے علم کو راہ پر رکھنے کیلئے عقیدہ چاہیئے، سیاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ملت کا احساس۔ انسانیت کا معیار اور اخلاق اور مذہب کی فرماں روائی چاہیئے، ہم عقلیت کے نام سے عقل کی پرستش نہیں کرنا چاہتے، بندے سے رشتہ جوڑنے کی خاطر خدا سے رشتہ توڑنا نہیں چاہیئے، آدمی بننا چاہتے ہیں مگر ایسی تہذیب نہیں چاہتے کہ جس کا دیوتا نفس پرستی ہو۔ ہماری مشکل وہی ہے کہ جو ہمیشہ سے آدمیت کی مشکل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کا معیار میانہ روی اور اعتدال ہے۔ اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیئے اگر میں عرض کروں کہ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اپنے دل سے ضد اور غصہ بالکل نکال دیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو سلامت رکھنے کے لئے ہم کو کیا ہونا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے اسلامی تہذیب کی بقا کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کے صحیح اور اچھے ہونے کا

پورا یقین ہو ہم دل سے مانتے ہوں کہ انسانیت قوم اور نسل پرستی پر غالب آئے گی معقولیت اور اعتدال پسندی کا مسلک ایک نہ ایک دن ہمیں اوہام پرستی اور جہالت اور انتہا پسندی کی بھول بھلیوں کے باہر پہنچا دے گا۔ علم ایک طرف انسانی زندگی کو آسان کرتا اور دوسری طرف نجات کی راہ صاف دکھاتا رہے گا۔ لیکن یہ تو اسلامی تہذیب کا نصب العین ہے اسے بغیر سمجھے ان لینے اور زبانی عقیدت سے ہم حاصل نہیں کر سکتے ہم کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کن اجزا سے بنا ہے اور پھر انہیں کو اپنے عمل میں یکجا کر کے حقیقت کی کسوٹی پر رکھنا چاہئے اس لئے آپ اجازت دیں تو میں اس وقت کے چند عام رجحانات پر بحث کر کے اپنا مطلب صاف کر دوں

میں اسے بالکل صحیح اور بہت اچھا سمجھتا ہوں کہ مسلمان اس وقت اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ وہ ایک ملت اور تہذیبی جماعت ہیں، کیونکہ یہ ایک دینی اور تہذیبی آئین کو محفوظ رکھنے کے لیے لازمی ہے لیکن مجھے کسی طرف اسلامی ملت اور تہذیب کے تصور کو غیر مسلموں کیا مسلمانوں کے لئے مفید اور ان کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی ملت کا احساس مجھے چند دنوں کا مہمان ہے اگر وہ ملت کے افراد میں سچی محبت، خدمت کا شوق اور خدمت کی استعداد پیدا نہ کرے بلکہ افراد کی خود غرضیوں کے لئے ایک آڑ یا ان کے نکمہ پن کے لئے بہانہ بنا رہے۔ انسانیت کے جس معیار کو ہم مانتے ہیں وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنوں کی ہر ضرورت پوری کر کے دوسروں پر احسان کرنے کے مواقع نکالیں ہماری ملت کے افراد اپنا حق وصول کر کے اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ دوسری جماعتیں ہماری اجتماعی اغراض پر بھی ذاتی اغراض کا شبہ کرتی ہیں اور ہم اپنی ملت کا الگ وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے آداب برتنے سے انکار کرتے ہیں۔

حقیقت میں ہم جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نہ ہمیں کوئی دے سکتا ہے نہ ہم سے لے سکتا ہے ہم اگر خدمت کا وہ حق ادا کریں جسے ہمارے دین نے عبادت کا مرتبہ دیا ہے۔ علم حاصل کرنے اور پھیلانے کا فرض جیسا کہ چاہئے انجام دیں تو ہماری ملت خود بخود بنی رہے گی، اور اس کے خادموں

کے سامنے ہمارا دینی اور تہذیبی نصب العین بھی رہے گا جس کی قدر و اصل تجربہ اور انسانی جبلت اور زندگی کی اونچ نیچ سے واقفیت پیدا کرتی ہے اس زمانے میں جب کہ جہالت اور اوہام پرستی ہم گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں ڈر تھا کہ ہم اس میں گم ہو جائیں گے مومن اور مشرک کے فرق کو نظروں کے سامنے رکھنا ضروری تھا اس وقت جب کہ غیر مسلموں میں تعلیم پھیل رہی ہے وہ رسمیں توڑی جا رہی ہیں جنھوں نے زندگی کو جکڑ لیا تھا اور عقل کی اتنی قدر بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہ رہا ہے تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے ہماری تہذیب کی قابل قدر خصوصیات بڑی حد تک عام تہذیب میں شامل ہو گئی ہیں اب ہماری ملت صرف اس طرح ملت بنی رہ سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے افراد کی زندگی و عمل میں وہ فضیلت ظاہر کرے جو اسے اسلام کی بدولت حاصل ہے۔

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال کی جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے لئے مصلحت اندیش ہونا لازمی کر دیتی ہے ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی بھلائی کی فکر کریں۔ ہمارے ذمے تو اسلام کی تبلیغ کرنے یعنی اس کی تعلیم کو ہر تعلیم سے زیادہ موثر اور مفید ثابت کر کے دنیا کو نجات کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ مقصد بغض و حسد کینے اور ضد سے حاصل نہیں ہو سکتا، تنگ نظری، خود غرضی اور خوف آپ اپنے پیر پر کلہاڑی مارتا رہتا ہے، ہم میں نوع انسانی کی ایسی سچی خیر خواہی ہونی چاہئے جو دھوکا کھائے اور باز نہ آئے، جو صدمے اٹھانے سے اور پختہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کم از کم اپنوں پر اعتبار ہونا چاہئے اور ہر شخص کو جو بظاہر خلوص کے ساتھ خدمت کا ارادہ رکھتا ہو سہارا دینا چاہئے۔ وہ جہاد جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی آخری تدبیر ہے اس وقت لڑ کر نہیں کیا جا سکتا، اس وقت کا صحیح جہاد تو ایسی مصلحت اندیشی ہے جو افراد کی استعداد کو ملت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنائے اور قوم کی خدمت کو ملت کے الگ وجود کا سہارا۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے بہت ہیں لیکن اسلامی تہذیب تو خطروں میں پلی ہے اور اس کا کیا علاج ہے کہ مشیت ایزدی نے قدر اسی چیز کی بڑھائی ہے جو مشکل سے ہاتھ آئے اور آسانی سے ضائع ہو جائے اسلامی تہذیب کی بقا کا مصلحت اندیشی پر منحصر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جب قدرت کو موتی جیسی دولت رکھنے کے لئے سیپ کے نازک سینے کے سوا کچھ نہ ملا۔

قدیم ہندوستان کا نظام تعلیم

میں نے اس مضمون میں سب سے زیادہ فائدہ مسٹر این این. مزمدار کی کتاب "قدیم ہندوستان کی تاریخ تعلیم" سے اٹھایا ہے اور انہیں کے تجویز کردہ خاکے کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

(راقم)

جب آریہ قوم ہندوستان میں نئی نئی آباد ہوئی تھی اس وقت اس میں جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ رشی منی جو ویدک دھرم کے مبلغ اور نگراں تھے اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کے موقعوں پر نبرد آزمائی میں بھی اپنا امتیاز قائم رکھتے تھے۔ لیکن جب آریوں نے اپنی مخالف قوتوں پر قابو پالیا اس وقت زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کا نرم پن ان پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس وقت جبکہ یورپ کی قومیں تنازع البقا کے اصول کے ماتحت زیادہ سے زیادہ قوی اور جسور بننے کی فکر میں مادی وسائل کی تلاش و تحقیق میں مصروف تھیں۔ آریہ قوم سرسبز کھیتوں میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر فلسفہ کی دیوی کے گیسو سنوار رہی تھی۔ یہی وجہ ہے اس فرق کی جو یورپ اور ہندوستان کے علوم و فنون، سائنس اور آرٹ میں آج تک پایا جاتا ہے۔ یورپ والے زندہ رہنے کے لئے مادی دنیا اور مادی زندگی پر زور دینے کے لئے مجبور تھے۔ لیکن آریوں کے لئے بھگوان کا گیان ان کی زندگی کا سب سے بڑا اصول بن گیا۔

یورپ کی تاریخ کی طرح ہندوستان کی تاریخ بھی تین دوروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ دور قدیم (تقریباً ۲۰۰۰ ق۔م سے ۱۰ صدی عیسوی تک) دور وسطیٰ ہرش کی سلطنت کے زوال کے وقت سے انگریزوں کے تسلط کے قیام تک۔ اور دور جدید برطانوی تسلط کے بعد سے آج کی تاریخ تک۔

دور قدیم کا پہلا حصہ۔ (۲۰۰۰ ق۔م سے ۲۰۰ ق۔م تک) ادبی نشو و نما کے لئے ممتاز تھا۔ اس زمانے میں خالص مذہبی ادب پیدا کیا گیا۔ مترنم قسم کی نظمیں افراط کے ساتھ لکھی گئیں اور فلسفے

میں بے مثل ترقی ہوئی۔ چنانچہ ویدک گیت اور اپنشد اور سوترا سب اسی دور کی ملک ہیں۔ اپنشد اپنے زمانے کی ذہنی اپج کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس شاہکار کے بعض خیالات سے افلاطون اور کانٹ نے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ شوپنہار نے ان سے جو اثر لیا ہے وہ ظاہر ہے شوپنہار نے خود شہادت دی ہے :۔

"دنیا میں کوئی مطالعہ اس قدر نفع بخش اور نظر افروز نہیں ہے جس قدر اپنشدوں کا مطالعہ میرے لئے زندگی میں یہ سکون کا سرچشمہ تھے اور موت میں بھی راحت اثر ثابت ہوں گے"

تیسری صدی ق۔م نے بدھ مذہب کا عروج اور سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کا نشوونما دیکھا۔ علوم وفنون نے اس دور میں بہت ترقی کی تکسلا کے دارالعلوم میں سولہ مضمون داخل نصاب تھے۔ جن میں سے خاص خاص علم الادویہ، سنگ تراشی، مصوری اور دوسری دستکاریاں تھیں۔ ادوین علم نجوم کے لئے ممتاز تھا یہی نہیں بلکہ جانوروں کے امراض کے متعلق بھی کافی کاوش کی جاتی تھی۔ اشوک کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں مویشی خانے موجود تھے۔

دورقدیم کا دوسرا حصہ بھی علم وادب سائنس اور فلسفہ میں گوناگوں ترقیوں کے لئے یادگار ہے۔ اس میں دین کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی جگہ ملی۔ چنانچہ جذباتی شاعری، ڈرامہ، افسانہ اور رومان سب ہی کچھ اس دور میں پھلا پھولا۔ اور ان سب کو کمال تک پہونچانے کے لئے کالیداس پیدا ہوا۔ آریہ بھٹ (پیدائش ۴۷۶ء) نے ریاضی اور فلکیات کو ترقی دی اور دراہم میر (متوفی ۵۸۷ء) نے فن تعمیر، سنگ تراشی اور مصوری کو فروغ دیا۔ گپتا خاندان کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہرش نے علوم وفنون کے چراغ کو پوری آب وتاب کے ساتھ روشن رکھا۔ ہرش ہی کے زمانے میں بہار میں نالندہ کا دارالعلوم قائم ہوا تھا چینی سیاح ہوان سانگ کے قول کے مطابق دس ہزار طالب علم یہاں رہ کر مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے نصاب میں قواعد، عروض، منطق، ریاضی، اقلیدس، نجوم، موسیقی، طب، فلسفہ، سنسکرت اور پالی شامل تھے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر میکڈانل نے شہادت دی ہے کہ ہندوستانی تعلیم کے میدان میں یونانیوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس عہد میں بکرماجیت اور اس کے نورتن بھی تھے

اور یہی وہ عہد ہے جسے ہم پیریکلیز کے ایتھنز، آگسٹس کے روم اور الزبتھ کے انگلستان کے مقابلے میں لا سکتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور نہ صرف علوم و فنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے بلکہ سماجی پاکیزگی کے لئے بھی اسی قدر اعلیٰ و افضل تصور کیا جاتا ہے۔ اس دور میں قوم و قومیت کے جذبات زندہ تھے۔ اور ہندو تہذیب ان لایعنی پابندیوں سے یکسر پاک و صاف تھی جو آج اسے مملو کئے ہوتے ہیں۔ علم ہنوز برہمنوں کی اجارہ داری سے آزاد تھا اور اسی طرح کسی پیشے کے ساتھ حقارت کا سلوک روا نہ تھا۔ عورتوں کو شادی کے معاملے میں آزادی تھی۔ کم عمری کی شادی کا مطلق رواج نہ تھا۔ عورت سماج اور سماجی مشاغل سے یکسر بے خبر و بے نیاز نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کے علمی مشاغل اور ذہنی تحقیق و کاوش میں برابر کی حصہ دار تھی۔ گوتم بدھ نے ایک مرتبہ ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ظاہر کی تھی جو "لکھ سکتی ہو، اور شعر کہہ سکتی ہو۔ اچھی خصوصیات کی مالک ہو اور جو شاستروں کی تعلیم سے کما حقہ واقف ہو" یہ دور بت پرستی کی رسم سے بھی بیگانہ نہ تھا۔ بت پرستی کی رسم بعد کی تخلیق ہے اور اس کی تخلیق اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہبی تعلیم بھی مادی سے غیر مادی یا شے کی طرف اشارہ کے اصول پر دی جاتی تھی۔
عہد وسطیٰ ذات پات کی بندھن، بتوں کی پوجا، کم عمری کی شادی، سماج سے عورتوں کی علیحدگی اور ان کے تعلیمی حقوق کی پامالی کے لئے مخصوص ہے۔ اس دور کے بھی سہولت کے لئے دو حصے کر لینے چاہئیں اول نصف سنہ ۶۴۷ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک اور دوسرا سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۷۶۴ء تک

ہرش کی حکومت کے بعد گو ملک میں بدنظمی پھیل چکی تھی تاہم تعلیمی نظام اپنی جگہ قائم رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں قنوج علم کا مرکز تھا۔ نویں صدی میں بنارس کی تعلیمی حیثیت بھی قائم ہو چکی تھی شنکر آچاریہ بنارس ہی کے پروردہ تھے۔ پشاور اس دور کا تیسرا تعلیمی مرکز تھا۔ بہار میں نالندہ کے علاوہ گنگا کے کنارے وکرما سلا کی خانقاہ بارہویں صدی تک بدھ مذہب کی خاص تعلیم گاہ تھی۔ بنگال میں سین حکمرانوں کے زیر سایہ نودیپ میں ہندو تعلیم کا چراغ روشن رہا۔ لکشمن سین۔ بنگال کے آخری حکمراں کے دربار میں جے دیو نے اپنی مشہور و معروف گیتا گوبند تصنیف کی۔ گو اس دور کا علم و ادب کالیداس کے معیار کو تو

نہیں پہونچ سکا تاہم یہ زمانہ ان تفسیروں کے لئے ضرور یاد رہے گا جو مختلف ویدوں اور بھگوت گیتا پر شائع ہوئیں۔ الجبرا اور نجوم پر بھسکارا (پیدائش ۱۱۱۴ء) کی متعدد تصانیف بھی اس زمانہ کی یادگار ہیں۔

عہد متوسط کے دوسرے نصف حصے میں (۱۲۰۰ء سے ۱۷۶۵ء) مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ سنسکرت کا بھی زوال ہوا لیکن ہندی نے اسی قدر فروغ پایا۔ ودیاپتی اور چنڈی داس اور میرا بائی کے شاہکار اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ اس دور میں ادب کے مقابلے میں فن تعمیر اور سنگتراشی کا معیار بہت بڑھا چڑھا تھا۔ آٹھویں صدی سے چودھویں صدی تک ہندوستانی آرٹ اپنے شباب پر تھا۔ اور یورپ کے گوتھک آرٹ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ یہی آرٹ مغل آرٹ سے مل جل کر سترہویں صدی تک نئے رنگ روپ میں زندہ رہا۔

مذہب میں بھی تبدیلیاں ہوئیں بدھ مذہب کے رہے سہے اثرات بھی ختم ہوگئے۔ اور ان کی جگہ موجودہ ہندو مذہب نے لے لی۔ اس زمانے میں ذات کی بندشیں سخت سے سخت تر ہوگئیں اور برہمنوں کو عام طبقے کے لوگوں سے بلند و بالا سمجھا جانے لگا یہاں اگر ہندو تہذیب کو اور زیادہ ترقی کا موقعہ نہ ملا اس لئے تعلیم بھی اپنی جگہ ٹھہر گئی اور اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ رہا کہ اپنے طلبہ کو گذرا ہوا زمانہ یاد دلاتی رہے اکثر مورخین نے مسلمان حکمرانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے لیکن یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی ہر دوسری قوم کی طرح ملک گیری اور جنگ و جدل کے وقت وہ سب کیا جس پر واقعات کی منطق انھیں مجبور کر سکتی تھی حقیقت کا یہ ایک پہلو پھر بھی باقی رہجاتا ہے کہ تسلط قائم ہو جانے کے بعد انھوں نے امن و امان اور مدنی زندگی کی ہر ضرورت پورا کرنے کے لئے ہر ممکن موقع دیا۔

انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہو جانے کے بعد سے ہمارا موجودہ دور شروع ہوتا ہے شروع شروع میں اونچے خاندان کے بچوں کو پنڈت پڑھایا کرتے تھے۔ درس و تدریس میں ہنوز ایک مذہبی تعلق موجود تھا۔ نیچ قوموں کے بچوں کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ ان کے لئے کہیں کہیں گاؤں میں مدرسے موجود تھے۔ بنارس کی اہمیت ہنوز باقی تھی۔ چنانچہ بنارس کے ریزیڈنٹ

کے ایما سے ۱۷۹۲ء میں سنسکرت کالج کھلا ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ میں ایک دفعہ ایسی شامل کردی گئی جس کے ماتحت گورنر جنرل کو کم از کم ایک لاکھ روپیہ تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ کچھ عرصے تک یہ رقم مروجہ تعلیم پر وظائف کی شکل میں صرف ہوتی رہی اسی اثنا میں انگریزی دانی ذریعہ معاش بن گئی۔ لیکن یہاں ہندوستانی طریقۂ تعلیم اور مغربی طریقہ تعلیم کے درمیان تنازع تفوق پیدا ہو گیا ۱۸۲۳ء میں لارڈ میکالے کی زیر نگرانی ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ ۱۸۳۹ء میں لارڈ آکلینڈ نے اپنا فیصلہ شائع کرکے اس تنازع کو انگریزی کے حق میں ختم کر دیا۔ اس فیصلے نے ہندوستان کی تعلیم تمدن، معاشرت اور قومی زندگی پر جو اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مرتب کردہ بنیادی قومی تعلیم کا پروگرام اس زہر کے خلاف جو قریب سو سال سے ہماری رگوں میں موت کے اثرات تیز کر رہا تھا ایک تریاق ہے۔ لیکن کاش ہم متحد ہو کر اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے :

ذاتوں کا قایم ہونا اور تعلیم پر ان کا اثر:۔ جب تک آریہ قوم ستلج سے آگے نہیں بڑھی تھی ان کے یہاں رشی منی کسی الگ ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ تاہم بعض خاندان اس ابتدائی دور میں بھی مذہبی رسوم کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں اور مذہبی گیت لکھنے میں دوسروں سے زیادہ مشہور و ممتاز ہو چکے تھے۔ اسی طرح بعض خاندان مردانہ ہمت و قوت کے لئے مخصوص سمجھے جانے لگے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد جب آریہ قوم ستلج سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کے دامن میں پھیلی تو اس کے سماج اور مذہب میں جو ان کے تمدن کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اس قدر تغیر و تبدل اور الجھاؤ پیدا ہو گیا کہ بعض رشیوں کو دوسرے تمام کام چھوڑ کر صرف مذہب اور مذہبی روایات کی حفاظت و تحفظ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اسی طرح تقسیم کار کے اصول کے ماتحت چار ذاتیں وجود میں آئیں۔

ہندو مفکرین کا عقیدہ تھا کہ انسان کی افتاد طبیعت کا انحصار تین عناصر پر ہے۔ صداقت و پاکیزگی (सत्व)، جذبہ یا فعالی (रजस) اور تاریکی یا کند ذہنی (तमस)۔ مختلف انسانوں میں یہ عناصر مختلف تناسب میں موجود ہوتے ہیں اور اسی تناسب پر فرد کی طبیعت کا انحصار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ذات کی تخلیق کا محرک بھی یہی فلسفہ تھا۔

ویدک دھرم اور اس کا تعلیمی پہلو۔ ہندوؤں کی مذہبی تخیل متعدد منازل سے گذر کے تکمیل تک پہونچی ہے۔ عہد قدیم کے آریہ کا واسطہ زیادہ تر فطرت کی قوتوں سے تھا۔ اس لئے اس نے فطرت کی قوتوں ہی کو خدا بنا کر پوجنا کافی سمجھا۔ اس کے رشیوں نیوں نے حوادث فطرت کے اسباب پر غور وخوض نہیں کیا۔ اس دور میں قربانی کا تصور پیدا ہوا اور عبادت کے طریقوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا گیا۔ اس کے بعد ایک منزل آئی جہاں آریہ کو یہ تمام رسوم بے مقصد معلوم ہونے لگیں چنانچہ اس نے کائنات اور اس کی آفرینش پر غور کرتے کرتے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا ہی زندگی کا واحد سرچشمہ ہے۔ وہ ہی ہر چیز کی ابتدا اور وہ ہی انتہا، رسوم کی مذہب میں کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہئے اور خدا کے خوف اور جہنم کے لالچ سے اس کی عبادت کرنا عقل کے خلاف ہے۔ خدا کی ابدیت اور انسان کی روزمرہ زندگی میں کوئی بامعنی ربط اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب انسان ہر مادی مدعا سے درگذر رہے یہی انسان کی زندگی کی معراج ہے اور یہی اپنشدوں کی تعلیم وتلقین کا نچوڑ ہے۔

آرزو اور مدعا سے درگذرنا اس بات کا مرادف نہیں ہو سکتا کہ انسان اجتناب کی زندگی بسر کرے "نہ اجتناب انسان کے لئے آزادی کا ذریعہ ہے، اور نہ انحراف تکمیل کا باعث" (گیتا باب سوم اشلوک ۴) مقصد یہ ہے کہ انسان کام کرے اور اس کے انجام سے بے نیاز ہو کر اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان اپنے مقاصد واغراض سے زیادہ دوسروں کی بھلائی آرام اور خدمت کو اپنی بھلائی، آرام اور خدمت سمجھنے لگے۔ بہ الفاظ دیگر دوسروں کی ذات میں اپنی ذات کا فروغ اور دوسروں کی آرزو میں اپنی آرزو کی جھلک دیکھنا ہی خودشناسی ہے اور یہی تعلیم کا صحیح مقصد ہے۔

خودشناسی کی یہ منزل انسانی زندگی کی تکمیل ہے اس منزل پر پہونچنے سے پہلے ہر انسان کو تین فرض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کا فرض طالب علم بن کر ادا کیا جاتا ہے دیوتاؤں کا فرض قربانیوں سے اور ماں باپ کا فرض گرہست کی زندگی بسر کرنے سے۔ ان تینوں فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی انسان خودشناسی کی منزل پر پہونچ سکتا ہے اور اپنی عمر کا بقیہ حصہ

جنگل میں گیان دھیان میں گذار سکتا ہے لیکن کس شرط کے ساتھ ؟ — یہ مہا بھارت کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ "بھارت ! اس شخص کے جنگل میں جانے کی کیا ضرورت جسے اپنے نفس پر قابو نہیں ؟ ... نفس پر قابو رکھنے والا انسان جہاں بھی رہتا ہے وہ ہی اس کے لئے جنگل ہے"

مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عہد قدیم کے ہندوستان میں تعلیم ایک مکمل زندگی کی تیاری تھی۔ طالب علم کو ہر منزل پر پہونچنے کے لئے مخصوص تیاری کی ضرورت ہوتی تھی۔ پہلی منزل میں ذہن کی بیداری اور جسم کو ذہن کا تابع بنانا مقصود ہوتا تھا، دوسری میں ذہن کے حاصل شدہ اصولوں پر عمل اور تیسری میں خود اپنی ذات کا مطالعہ۔ گویا ابتدائی زمانے کے ہند و فلسفیوں کا تعلیم سے وہ ہی منشا رتھا جسے آگے چل کر فروبل نے ایک نئی شکل و صورت میں پیش کیا فروبل کے الفاظ میں۔ "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی زندگی میں اس قدر وسعت پیدا ہو کہ وہ اپنی ہر جہتی روحانی فعالی کے ذریعے اپنے وجود کو سمجھ سکے"، بہ الفاظ دیگر انسان عرفان ذات کے درجے کو پہونچتا ہے اپنے ہی عمل اور تجربے کے ذریعے۔ اسی لئے گیتا نے اس بات کی ممانعت کی ہے کہ کسی غیر تربیت یافتہ ذہن پر ایسی بات جبر نہ کی جائے جو ترقی یافتہ دماغ کی کدو کاوش کا نتیجہ ہو (گیتا باب ۳۔ اشلوک ۲۶) اس سے ظاہر ہے کہ قدیم ہندو نظام تعلیم میں کس حد تک فرد کی انفرادیت کے نشو و نما کا موقع تھا۔"

عہد قدیم کے ہندوؤں کا نصب العین یہ تھا کہ انسان اپنی ذات اور خدا کے وجود کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اسے سمجھنے لگے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب انسان خیال اور عمل دونوں میں یکساں طور پر آگے بڑھا ہوا ہو۔ یہاں ہم ہندوستان کے تعلیمی مقصد کو ان یونانیوں کے مقصد کے ساتھ ساتھ پیش کر سکتے ہیں جن کا مدعا تعلیم کے ذریعے عملی انسان (MAN OF ACTION) اور عقلی انسان (THE MAN OF WISDOM) دونوں پیدا کرنا تھا۔ اپنشد کے الفاظ میں۔ "وہ دونوں عمل اور علم سے واقف ہے، عمل کے ذریعے موت پر قابو پائے گا اور علم کے ذریعے ہمیشہ کی زندگی پر"

یہاں آکر واضح ہو جاتا ہے کہ "ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم میں وہ کتنی باتیں موجود تھیں جو آج نظام تعلیم کی جان بنی ہوئی ہیں۔ اول ہر شخص کو مذہبی اعتبار سے وہی منزلیں طے کرنی پڑتی تھیں اس کے آباؤ اجداد طے کر چکے تھے۔ یہ صورت وہی ہے جو Parallelism between the individual and the race development کہلاتی ہے

دوئم ہر منزل پر تربیت کا وہی سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ جو ان کے آباؤ اجداد نے استعمال کیا تھا یہ ہماری موجودہ (Culture Epoch Theory) ہے، جس کے تحت ہم اپنے تعلیمی مواد کو تربیت دیں انسانی تمدن کی تاریخی منزلوں کے مطابق اور ان منازل کو مدنظر رکھتے ہوئے جن سے نشوونما کے دوران میں نسل گذر چکی ہے۔ سوئم عمل کو خود شناسی کی شرط بنا دیا تھا (Learning by doing) کے اصول کو ترویج دیا تھا۔ چہارم فرض کو فرض کے لئے ادا کرنے کی تلقین کا مدعا یہ تھا کہ انسان بیرونی محرکات کا غلام بننے کے بجائے اپنی امنگ اور اپنے شوق سے عمل کرنا سیکھے اسی چیز کو فروبل نے (Self activity + Self Control) سے تعبیر کیا ہے۔ سب سے آخر میں یہ بھی صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس نظام تعلیم میں ایک منزل کے بعد دوسری منزل پر پہونچنے کا التزام موجودہ زمانے میں ہمارے (Principle of activity) کی بنیاد ہے۔

ابتدائی تعلیم | قدیم زمانے میں بچہ عموماً باپ کا ہی کا پیشہ اختیار کرتا تھا۔ اس لئے باپ کے کام میں عملی شرکت ہی اس کی تعلیم تھی۔ پھر ابتدائی مدرسے کے طور پر کسی ادارے کا وجود بھی نہ تھا چھٹی صدی عیسوی میں تو ابتدائی مدرسہ کے وجود کا ثبوت ملتا ہے جہاں اخلاقی تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا۔

کھلی ہوا میں کسی درخت کے نیچے کچھ بچے جمع ہو جاتے تھے اور یہی اس زمانے کا مدرسہ تھا۔ حروف تہجی سکھانے کا وہی طریقہ رائج تھا جو آج ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ حرف بتانے کے لئے اس حرف سے شروع ہونے والا پورا جملہ بچوں کو بتاتا تھا۔ جو ذرا بڑے بچے ہوتے تھے وہ اپنے چھوٹے ساتھیوں کو پڑھا دیتے تھے۔ آج کل یہ طریقہ Monitorial system کہلاتا ہے۔ اینڈریو بیل

نے یہ طریقہ ہندوستان ہی کی تقلید میں انگلستان میں بھی رائج کیا تھا۔

ثانوی تعلیم | ابتدائی دور میں مدرسے کا وجود تو تھا ہی نہیں۔ گھر کا بڑا بوڑھا رشی ہوتا تھا۔ قربانیاں اور عبادت اسی کی زیر نگرانی ہوتی تھیں اور یہی مذہبی تعلیم اپنے بچوں تک پہونچاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب مذہبی ادب میں الجھاؤ پیدا ہو گیا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بچوں کو مذہبی ادب سے صحیح طور پر واقف کرانے کے لئے کسی استاد کی مدد بھی درکار ہوگی۔ چنانچہ جنھیں شوق ہوتا تھا وہ دور دراز کے سفر کرکے مشہور برہمنوں کے پاس جاتے تھے۔ یہ عالم برہمن یا تو جنگلوں میں رہتے تھے اور یا راجوں مہاراجوں کے درباروں میں۔ رفتہ رفتہ یہی برہمن مدرسوں کے بانی ہوئے۔ ان برہمنوں کے پاس چیلے اور شاگرد جمع ہو جاتے تھے۔ یہ شاگرد علم حاصل کرنے کے ذوق و شوق میں اپنے گرو کی ہر ممکن خدمت کرتے تھے۔ بعض مرتبہ گرو اپنے چیلے کی خدمت کی ذرہ برابر بھی داد نہیں دیتا تھا۔ چھند وگیہ اپنشد میں چوتھے باب کے دسویں حصے میں ذکر ہے کہ کس طرح اُپ گوسلا بارہ سال تک اپنے گرو کی خدمت کرنے باوجود اس سے کچھ نہ سیکھ سکا۔

جس وقت تک علوم و فنون سے متعلق ادب ناکافی تھا اس وقت تک صرف ایک ہی قسم کے مدرسے یعنی ویدک مدرسے کافی تھے۔ ان ویدک مدرسوں میں تعلیم کا نصب العین خالص روحانی مقاصد کی حصول یابی تھی یعنی وہ علم سکھانا جس سے "بغیر سنی ہوئی باتیں سنی ہوئی بن جائیں، بغیر سوچی ہوئی باتیں سوچی ہوئی بن جائیں اور بغیر جانی ہوئی باتیں جانی ہوئی بن جائیں"۔ (چھند وگیہ اپنشد باب حصہ ۱) جب اس تعلیم کا مقصد یہ تھا تو اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی کچھ ایسا تھا۔ وضاحت کے لئے میں چھند وگیہ اپنشد کے ساتویں باب کے پہلے حصے سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔

> نرادا ایک طالب علم سناتا گوما کے پاس جاتا ہے۔ سناتا گوما اس طالب علم سے کہتا ہے "پہلے تم مجھے بتاؤ کہ کیا جانتے ہو پھر اس کے بعد جو باتیں ہیں وہ میں تمہیں بتا دوں گا"
>
> نرادا جواب دیتا ہے "میں جو باتیں جانتا ہوں وہ یہ ہیں ― رگ وید، یجروید

سام وید، اتھر وید، اتہاس، پران، ریاضی، دیوتاؤں کا علم، وقت کا علم، منطق، اخلاقیات، سیاسیات، علم الحرف، برہما کا علم، علم العناصر، جنگ کا علم، علم النجوم، سانپوں کے منتر اور فنونِ لطیفہ — میں ان سب سے واقف ہوں۔"

سناتا گوما کا جواب ملاحظہ ہو "تم نے جس چیز کا مطالعہ کیا ہے وہ تو صرف نام ہے۔ نام پر غور و خوض کرو پھر نطق پر، پھر قوت ارادہ پر، پھر ذہانت پر، پھر قوت فکر پر، پھر علم پر، پھر قوت پر، پھر کھانے پر، پھر پانی پر، پھر آگ پر، پھر ایتھر پر، پھر یادداشت پر پھر خواہش پر، پھر پران (روح) پر۔"[1]

لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ تعلیم کو صرف مندرجہ بالا مذہبی رنگ کے خاکے تک محدود رکھنا غلطی ہے چنانچہ علوم و فنون کے مدرسے الگ کھولے گئے اور انھیں ویدک مدرسوں کے مقابلے میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ویدک مدرسوں میں تعلیم محض سطحی ہوتی تھی۔ طلبہ بغیر سوچے سمجھے طوطے کی طرح اشلوک وغیرہ ازبر کر لیتے تھے لیکن ان نئے مدرسوں میں کوئی ایسی الجھن نہ تھی۔ طلبہ جو کچھ سیکھتے تھے وہ سمجھتے بھی تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

اس وقت سب سے اہم تعلیمی مرکز "پریشد" تھے۔ انھیں اس دور کے یورپ کے اقامتی کالج کی قسم کا سمجھنا چاہیے۔ ابتدا میں ہر پریشد کی نگرانی کے لئے تین برہمن مقرر ہوتے تھے۔ بعد ازاں نگراں برہمنوں کی تعداد ۲۱ تک پہونچ گئی۔ یہ برہمن فلسفہ، مذہب اور قانون پر پورا پورا عبور رکھتے۔ پریشد اکثر شہر سے دور ہوتے تھے۔ طلبہ کو تعلیم مفت دی جاتی اور ان کے کھانے پینے کا خرچ راجہ، مہاراجہ اور رؤسا برداشت کرتے تھے۔

نصاب ایک سال سے پانچ سال کی عمر تک بچہ کھیلنے کودنے کے لیے آزاد سمجھا جاتا تھا۔ پانچ سال یا دیر سے دیر آٹھ سال کی عمر پر بچے کی تعلیم شروع ہو جاتی تھی۔ "بسم اللہ" کی رسم بچے کی روحانی زندگی

---

[1] یہ ایک طویل تقریر کی تلخیص ہے۔

کی ابتدا بھی جاتی تھی۔ برہمنوں کے بچوں کے لئے ۸ سے ۱۶ سال کی عمر، چھتری بچوں کے لئے ۱۱ سے ۲۲ سال کی عمر اور ویش بچوں کے لئے ۱۲ سے ۲۴ سال کی عمر اسی رسم کی ادائیگی کے لئے مقرر تھی۔ اس کے بعد بچہ روحانی اور ذہنی تربیت کے لئے وکتا گرو کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ گرو کے ساتھ بچہ تمام کو روزانہ کچھ وقت مذہب، علم، اور فن پر سبق لینے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بچہ گرو کے ساتھ ساتھ ہی ہر عبادت میں شریک ہوتا تھا تاکہ مذہبی رسوم کی ادائیگی عملی طور پر سیکھ سکے۔

طالب علم کو طلوع آفتاب سے پہلے اُٹھنا پڑتا تھا اور ہر روز طلوع اور غروب کے وقت اپنی تمام توجہ کے ساتھ گیاتری کا ورد کرنا ہوتا تھا۔ ہون کے لئے لکڑیاں جمع کرتا تھا۔ کھانا اپنے اعزا سے مانگ کر لاتا تھا اور ایک نیچے بچھونے پر سوتا تھا۔ اس کا لباس سادہ ہوتا تھا اور کھانے پینے میں اعتدال سے کام لیتا تھا۔ غرض اسے وہ تمام شرائط پوری کرنا ہوتی تھیں جو ایک برہمچاری کے لئے ضروری تھیں۔ شہد، گوشت، عطر یا پھول، مشروبات، عورتوں سے ملنا جلنا۔ جانوروں کو مارنا جسم پر مالش کرنا، آنکھوں میں کاجل لگانا، جوتہ پہننا، چھاتا لگانا، سیر و تفریح، غصہ، حرص اور ناچنا گانا۔ یہ سب باتیں اس کے لئے ممنوع تھیں۔ بہر حال زندگی یکسر ضبط اور یکسر تادیب تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو مذہب کا واسطہ دراصل الفاظ سے زیادہ عمل سے تھا اور یہ کہ ہندو بچے کی تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ قوی اثر اس کے ماحول کا ہوتا تھا۔ اس تعلیم کے بعد طلبہ کو اپنے گھر واپس آکر شادی بیاہ کی اجازت ہوتی تھی۔

طریقہ تعلیم | ہر سبق کے اوّل و آخر میں شاگرد استاد کے پاؤں چھوتا تھا۔ استاد کے سوال کرنے کے بعد شاگرد سوال کو صاف صاف بلند آواز سے صحیح تلفظ کے ساتھ دہراتا تھا۔ اور اس طرح شاگرد ہر عبارت کو زبانی یاد کر لیتا تھا۔ استاد قریب نصف سال سبق دیتا تھا۔ تعلیم اکثر برسات کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی تھی۔ تعطیلات بھی کافی ہوتی تھیں

کسی مذہبی اصول کو سمجھنے کے لئے پانچ منزلیں مقرر تھیں۔ الفاظ کا سننا۔ معنی کا سمجھنا۔ اس سے کوئی عام نتیجہ اخذ کرنا۔ کسی دوست یا استاد سے اس کی تصدیق کرانا اور اس پر عمل کرنا۔ یہ طریقہ جان ڈیوی

کے تجویز کردہ اصولوں سے بہت قریب ہے۔ ڈیوی نے یہ منزلیں مقرر کی ہیں۔ اول مسئلہ کو سمجھنا۔ دوم مختلف حلوں میں سے ایک حل منتخب کرنا اور سوم اس حل کا عمل۔

ضبط و تادیب | ضبط کے سلسلے میں کوئی سخت قانون نافذ نہیں تھا۔ منو میں صاف طور سے استادوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو نرمی کے ساتھ لکھائیں پڑھائیں اور کوئی ایسی سزا نہ دیں جس سے بچوں کے چوٹ لگے۔ اگر کوئی شاگرد کسی سخت جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو اسے پیٹھ پر رسی یا کھپچی سے مارا جاتا تھا اور اس بات کی احتیاط رکھی جاتی تھی کہ سزا کہیں جرم سے نہ بڑھ جائے۔ ضبط کے متعلق چانکیا (اشوک کا دادا اور چندر گپت کا وزیر) کے الفاظ ہیں۔ "پانچ سال تک بچے کی پرورش کرنا چاہئے۔ اس کے بعد دس سال تک اس کی تربیت ہونی چاہئے اور جونہی وہ سولہ سال کا ہو جائے استاد کو اس سے دوستانہ سلوک کرنا چاہیے۔"

عام خصوصیات | عہد حاضر کے علما تعلیم دو اثرات کے قائل ہیں۔ اول بچے کے نجی رجحانات اور صلاحیتیں اور دوم وہ ماحول جس میں بچہ رہ کر دانستہ یا غیر دانستہ طور سے اثرات قبول کرتا ہے۔ ہندو نظام تعلیم میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد ان باتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ چنانچہ بچے کی افتاد طبیعت پر زور دینے کے ساتھ اس ماحول کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا جس میں وہ رہتا تھا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح شاگرد اپنے گرو کے پاس گروہی کے خاندان کا ایک فرد بن کر رہتا تھا۔ اس لئے شاگرد کی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ اس کے ماحول کا ہوتا تھا۔ آج کل کے اقامتی تعلیمی ادارے اسی قدیم اصول پر قایم کئے گئے ہیں لیکن ان اقامتی اداروں میں اس صاف ستھری فضا کا پیدا کرنا ممکن نہیں ہے جو قدیم ہندوستان میں ممکن تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے ہمارے زمانے میں تعلیم کا معاملہ بھی دنیا کے دوسرے کاموں کی طرح تجارت کا معاملہ ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان جو کڑی ہوتی ہے وہ مادی کڑی ہوتی ہے یعنی روپے پیسے کی کڑی۔ اس کے برخلاف قدیم ہندوستان میں استاد اور شاگرد کے درمیان کسی مادی تعلق کے بجائے خالص روحانی رشتہ ہوتا تھا۔ اسی لئے قدیم ہندوستان میں استاد کی ذات ہی بچے کی تعلیم کا مرکز ہوتی تھی۔ استاد کو جو تعلیم بچے کو

دینی ہوتی تھی استاد پہلے اپنی ذات کو اس تعلیم کا مظہر اور عملی نمونہ بنا لیتا تھا۔ بچہ استاد کی مثال سے متاثر ہوتا تھا اور فطری طور پر اپنے ذہن میں دائمی ارتسامات قایم کر لیتا تھا یہی باعث ہے اُس زمانے میں اخلاقی تعلیم کی کامیابی کا۔

ایک اور بات جس کا ہمیں ذکر کرنا چاہیئے یہ ہے کہ قدیم ہندوستانی مدرسے اور سماج کے درمیان وہ دیواریں موجود نہیں تھیں جن کے مضر اثرات کو محسوس کرانے کے لئے ہمارے زمانے میں جان ڈیوی پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں آج اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ وہ تعلیم ناقص ہے جو ہمیں زندگی کے لئے تیار نہیں کر سکتی۔ قدیم ہندوستانی معلم اس اصول سے باخبر تھے۔ اس زمانے کے سماج کی زندگی کا تجزیہ ان پانچ عنوانات کے ماتحت کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ویدوں کا مطالعہ (۲) آباؤ اجداد کے نام پر خیرات وغیرہ دینا (۳) دیوتاؤں کو نذر دینا (۴) جانوروں کا پیٹ بھرنا اور (۵) مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا۔ چنانچہ اس زمانے کے مدرسے میں بھی تعلیم ان مرکزوں سے ہٹ کر کسی ایسی بات سے تعلق اور واسطہ نہیں رکھتی جس کی سماج کی زندگی میں کوئی اہمیت نہ ہو۔

اس اشاعت میں آپ دو اشتہار خاص طور سے ملاحظہ فرمائیے

دی ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ صـ۲۴ـ پر

دی مغل لائن لمیٹیڈ - ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی صـ۱ـ پر

جاپانی شاعری

(مترجمہ ریاض الاسلام صاحب۔ بی۔ اے علیگ)

جاپان کے تمام فنون لطیفہ میں شاعری کا ہی وجود سب سے زیادہ قدیم ہے اور سب سے زیادہ مسلسل رہا ہے۔ ایک مشہور نظم کی عمر تو بلاشبہ پندرہ سو سال کی ہے اور بہت سی اور نظمیں زمانۂ ماقبل تاریخ سے چلی آ رہی ہیں۔

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں جو شخص بھی جاپانیوں میں مل جل کر رہے اسے بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ یہ لوگ فطرت کی خوبصورتیوں کو سمجھ کر کس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں ان کی زندگی کے ہر پہلو سے یہ چیز نمایاں ہے۔ بچوں، گاؤں، معمولی سرایوں اور نفیس ہوٹلوں کے نام اکثر بہت شاعرانہ قسم کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاپانی تباہ کن کشتیوں کے نام "گلابی سحر"، "ہلکی پھوار"، "بجلی کی چمک" "صبح کا کہر" اور اسی طرح کے دوسرے نام رکھے جاتے ہیں۔

ایک مشہور جاپانی مضمون میں آیا ہے کہ انسان کو چاند، پھول، چڑیوں، اودوں اور برف کے تودوں کے حسن سے سکون حاصل ہوتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھ کر زندگی کے خطرات، محبت اور نفرت، جوانی کی مسرتوں اور بڑھاپے کی مصیبتوں کے متعلق احساسات دل میں ابھر آتے ہیں ان کے اظہار سے بھی ایسا ہی سکون ملتا ہے، اور شعر ترتیب دینے میں انسان کے دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس خیال کا اظہار آج سے ایک ہزار سال پہلے کی تو تسورایوکی نے کیا تھا جو جاپانی شاعری کی ماہیت دریافت کرنے والا پہلا فلسفی محقق تھا۔ اس کے ایک ہزار سال بعد کے ایک دوسرے مفکر نے کہا ہے "ایک جاپانی کے لئے شاعری زندگی کا راز اور روح کی آواز ہے جو پوری قوم کے روحانی ورثہ کا لفظوں کی صورت

کے ذریعہ سے اظہار کرتی ہے۔" دراصل ان دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے۔ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ شاعر ان احساسات کا اظہار کرتا ہے جو کسی چیز کے دیکھنے یا سننے سے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک جاپانی شاعر خیالی اور بے بنیاد باتوں کے متعلق نہ کبھی لکھتا ہے اور نہ اسے لکھنا چاہیئے۔ وہ چاند، پالے اور چڑیوں کی پکار پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ کیڑوں اور گھونگوں تک کو بھی اپنی شاعری میں شامل کر لیتا ہے۔ اس کی نظموں کے موضوع حقیقی چیزیں ہوتی ہیں اور اس کے محسوسات حقیقی محسوسات، جو واقعی اس کے دل پر گذرے ہوئے ہوتے ہیں اور جنھیں وہ اپنی حسن کاری سے ہمارے دلوں تک اس طرح پہنچاتا ہے کہ ہم اس کی مسرت محسوس کرتے ہیں اور اس کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ پہلی نظر میں اس کی نظمیں موضوعی معلوم ہوتی ہیں ۔ یعنی یہ کہ ان کا اصل تعلق اشیاء سے ہے۔ لیکن ذراسی فکر اس نتیجہ پر پہنچا سکتی ہے کہ ان کا اصلی تعلق شاعر کے جذبات سے ہے۔ اگر شاعر ہمیں بھی محسوس کرا سکے جو اس نے خود محسوس کیا ہے تو اس کی شاعری اچھی شاعری ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ گنجان آبادیوں اور مشینوں کے اس دور میں ہم وہ کچھ محسوس کر سکیں جو اب سے ایک ہزار سال پہلے کیوٹو کی پُرسکون اور لطیف فضا میں ایک جاپانی شاعر کے دل پر گذرا ہوگا؟ آیئے کوشش کرکے دیکھیں۔ آزمائش کے لئے اُس عہد کی یہ نظم لیتے ہیں۔ یہ اوائل بہار کی نظم ہے۔

"سفید پھول گر رہے ہیں۔ بہت بلندی سے گر رہے ہیں۔
حالانکہ کڑا کے کا جاڑا ابھی پوری طرح سے نہیں گیا۔"
کہیں ایسا تو نہیں کہ آسمان کے اُس پار،
بہار — جس کے ہم یہاں منتظر ہیں — آن پہنچی ہے؟"

اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی شاعری کس طرح جذبات کی ترجمانی کرسکتی ہے اس نظم کا خیال دلفریب ہے اور ایسا کہ ہر کسی شخص کے دل میں گذر سکتا ہے، اور مجھے امید

ہے کہ اب جب بھی برف گرنے کا سماں ہم دیکھیں گے تو ہم میں سے ہر ایک شخص کے دل پر یہی خیال پیدا ہوگا۔ شاعر نے ہمارے لئے جادو کی کھڑکی کھول دی ہے اور آسمان سے گرتے ہوئے برف کے گالوں کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

انگریزی میں مسز شارلاٹ پیک نے مندرجہ بالا ترجمے میں صرف چار مصرعے لکھے ہیں لیکن ترجمہ پھر بھی اصل سے کافی بڑا ہے۔ بالکل ابتدائی دور کی کچھ نظمیں جو اس زمانے تک پہنچی ہیں زائد سے زائد بیس مصرعوں تک پہنچتی ہیں لیکن عام صنف پانچ مصرعے والی نظم کی ہے۔ ان میں وزنی موسیقی پانچ اور سات رکن تہجی[1] والے مصرعوں کو یکے بعد دیگرے لانے سے پیدا کی جاتی ہے۔ برف اور پھول والی اصل نظم میں صرف ۳۱ ارکان ہیں ۳۱ ارکان میں ایک پوری نظم لکھنا کس طرح ممکن ہے انگریزی زبان میں بہت سے لفظ صرف ایک رکن تہجی کے ہوتے ہیں (اور اس طرح ۳۱ ارکان میں کافی لفظ نکل سکتے ہیں) لیکن جاپانی زبان میں لمبے لمبے لفظ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹے الحاقی حرفوں کے ذریعے ملے ہوتے ہیں۔ نظم کو ۳۱ ارکان میں محدود کر دینا جاپانی شاعروں کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ الفاظ لمبے ہونے کے سبب سے ایک ایک لفظ کئی کئی ارکان تہجی پر پھیل جاتا ہے اور اس طرح بہت تھوڑے سے الفاظ استعمال کرنے کی گنجائش رہ جاتی ہے لیکن انھیں پابندیوں میں شاعر اپنی فن کاری دکھلاتا ہے۔ جاپانی شاعر اپنے کمال کے لئے شیلے کی کثرت الفاظ، سوئن برن کی ترکیبوں کی روانی اور اتار چڑھاؤ۔ اور ملٹن اور براؤننگ کی دلفریب طوالتوں کا ممنون احسان نہیں ہوتا۔ اس کا راستہ اختصار اور ضبط کا راستہ ہے۔ بہت سے شاعر ۳۱ ارکان تہجی والی نظموں کو بھی مناسب حد سے زیادہ لمبا خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چار سو سال کے اندر ہیگو کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ ہیگو تین مصرعوں کی نہایت ہی مختصر سی نظم ہوتی ہے۔ اس کے پہلے اور تیسرے مصرع میں ۷ اور درمیانی مصرع میں ۱۵ ارکان ہوتے ہیں۔

---

[1] رکن تہجی ( ) لفظ کا وہ درمیانی ٹکڑا جو ایک سانس میں ادا ہو جائے مثال کے لئے ارمان کے دو رکن ہیں "ار" اور "مان"

"اس ٹھنڈی شام کو
کیا چاند
وہاں پانی میں محوِ خواب ہے؟"

اگر الحاقی حروف کو نظر انداز کر دیا جائے، جن کے مماثل دوسری زبانوں میں لفظ کے آخری رکن کے کھنچاؤ[1] ہیں، تو اصل نظم میں صرف پانچ لفظ ہیں۔ لیکن یہ پانچ لفظوں کی نظم خاموشی، گرمیوں کی شفاف شام، سکون اور دماغی آسودگی کی کتنی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔

اس نظم سے جاپانی شاعروں، بلکہ تمام جاپانی فن کاروں، کے مافی الضمیر کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فن کار ہمارے سامنے ایک مکمل اور حسین نظارہ پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا۔ جتنا وہ دکھاتا ہے اس سے زیادہ وہ اشارہ سے سمجھاتا ہے۔ جو وہ نہیں کہتا وہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ وہ حس سے زیادہ ہمارے متخیلہ کو اپیل کرتا ہے وہ ہمارے لئے جادو کی کھڑکی کھول کر ہماری دل کی آنکھوں کو اپنے رویا میں شریک کر لیتا ہے۔ غالباً اسی لئے جاپانی شاعر طوالت سے گریز کرتا ہے۔ پانی میں چاند کی اس ننھی سی نظم کو یورپ کا شاعر ایک طویل خود کلامی (soliloquy) میں بدل دیتا، وہ شام کی خموشی، آسمان کا سکوت، پانی کی سطح لہروں سے آزاد اور اتنی ساکن کہ موسم خزاں کے پورے چاند کی درخشانی اس میں منعکس نظر آتی ہے، ان سب کا تفصیلی بیان کرتا۔ وہ شاید اپنے ساتھی کا بھی ذکر کر دیتا جس کی معیت میں وہ اس منظر کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ لیکن کیا یہ پھیلاؤ اصل نظم کے پانچ لفظوں سے زیادہ بتا سکتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی کم۔ کیونکہ اس تفصیل کے بعد سننے والے کے لئے یہ گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی داخلی دنیا میں سے بھی کوئی چیز لا کر بڑھا سکے بجائے اس کے کہ یہ جاپانی شاعر کی طرح سننے والے کو بھی شاعرانہ تخیل بخش دے۔ یہ اسے بے درد چسپ اطلاعات اور تفصیلات بہم پہنچاتی ہے اور بس۔

---

[1] caesEnding آخری رکن کا مد۔ جیسے فرانسیسی لفظ (Attaché) اٹاشے میں شے۔

چاند شاید جاپانی شاعروں کا سب سے دل پسند موضوع ہے۔ اس کے بعد شاہ دانے کے شگوفوں کا نمبر ہے سب سے پرانی نظمیں جو قلم بند ہوچکی ہیں، ان میں سے شگوفوں پر ایک نظم یہ ہے۔

"شاہ دانے کے شگوفوں کا موسم
ابھی گذرا نہیں ہے۔
لیکن اب انھیں گذر جانا چاہئے
اب جبکہ ان کے دیکھنے والوں کی محبت بہار پر ہے"

شاعر کو اس خیال سے دکھ ہوتا ہے کہ پھولوں کے حسن کو زوال ہے، کتنا اچھا ہو وہ سوچتا ہے، کہ وہ یاد آئیں تو اپنے شباب کی شان و شوکت کے ساتھ یاد آئیں۔ یہی احساس ہے جس کی بنا پر یہ شگوفے جاپان کی مسلح قوتوں کے نشان کے طور پر اختیار کئے گئے ہیں سپاہی کے بٹن اور بحری افسر کی ٹوپی پر یہی نشان ثبت ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی ان شگوفوں کی طرح عین شباب میں جان دینے اور مرنے کے لے تیار رہتے ہیں۔ خود ایک انگلستان کے شاعر نے کہا ہے۔

یہ شگوفے کبھی پرانے نہ ہوں گے
یہ ہماری طرح بڈھے ہونے کے لئے نہیں رہ جائیں گے"

ایک اور مرغوب مضمون، خاص طور سے عشقیہ نظموں کا ہوٹوٹوگی سو ہے جو ایک قسم کی کوئل ہوتی ہے۔ اس کی پکار میں شاعر ناکام محبت کی چیخ سنتا ہے۔ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جاپانی پرند کا ترجمہ پپیہا کیا جائے جس کے ساتھ ہماری شاعری میں اسی قسم کے خیالات اور واردات وابستہ ہیں جو جاپانی شاعری میں ہوٹوگی سو کے ساتھ ہیں۔

"سحر ہوگئی اور میں ابھی تک نہیں سویا ہوں
اُس کے خیال میں جس سے مجھے عشق ہے۔

پپیہے کے
مسلسل نغمے

اب برداشت نہیں ہوتے۔"

سنہ ۱۷۰۲ء کا واقعہ ہے کہ ایک نوخیز شاعرہ کو معلوم ہوا کہ اس کے شہر میں ایک نامی شاعر آکر ٹھہرا ہے وہ اس کے پاس گئی اور اس سے شاعری کے سلسلے میں ہدایات کی طالب ہوئی اس نے اسے پپیہا کا ایک مضمون باندھنے کے لئے دیا۔ ایسے فرسودہ مضمون میں جدت پیدا کرنا کس قدر کٹھن کام ہوگا، چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کی پہلی اور دوسری کوششوں کو استاد نے بالکل ناپسند کیا اور لاپروائی سے سو گیا۔ شاعرہ نے ہمت نہ ہاری اور تمام رات بیٹھی اپنے موضوع پر غور کرتی رہی شاعر کی آنکھ کھلی تو اس نے پوچھا "کیا دن نکل آیا؟" لڑکی نے جواب دیا۔

پپیہا؛
پپیہا، میں کہتی رہی
دیکھا!..... تو سویرا تھا۔

ان چار لفظوں میں (اصل جاپانی نظم میں صرف چار لفظ ہیں) اس نے شاعر کو بتلایا کہ تمام رات وہ اسی دھن میں لگی رہی یہاں تک کہ آسمان میں دوڑتی ہوئی سرخی نے اُسے بتلایا کہ اس نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے وہ سب کچھ ادا کر دیا ہے جو اس سے پیشتر کے شاعر نے اپنی مقابلتہً لمبی نظم میں پیش کیا تھا۔ استاد حیرت میں رہ گیا۔ اس نے کہا تم تو فن کی ماہرہ ہو اور تمہیں کسی سے اصلاح لینے کی ضرورت نہیں۔ ان دو نظموں میں ترجمہ کی بدنمائی کے باوجود جاپانی شاعروں کا مقصد یعنی تھوڑے لفظوں میں بہت کچھ کہنا، بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے کہ چینیوں نے خود اپنی شاعری کے متعلق کہا ہے۔ "الفاظ ختم ہو جاتے ہیں، لیکن احساس جاری رہتا ہے۔"

پپیہے پر ایک نظم اور ملاحظہ ہو۔ ایک قاتل کو موت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔ جلاد کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا کہ اوپر پپیہے کو بولتے ہوئے سنا۔ مجرم نے اوپر نظر کی اور کہا:

"بس پپیہے!
باقی میں برزخ کے راستے میں
سنوں گا۔"

کسی کو اس مجرم کا نام یا اس کی زندگی کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں لیکن جاپانی قوم اس کے ان اشعار کو کبھی نہیں بھولے گی۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتی ہے جو موت کا مقابلہ ہمت سے کرتے ہیں

ان مثالوں سے معلوم ہوگا کہ جاپانی نظم میں قافیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شعری زبان کے لئے صرف ایک چیز ضروری ہے: پانچ اور سات ارکان تہجی والے مصرعوں کی وزنی موسیقی۔ اس لئے شعر گوئی کوئی مشکل کام نہیں۔ البتہ نیا خیال اور اس کے لئے نیا انداز بیان نکالنے میں کافی دقت پڑتی ہے اور یہی چیزیں سچی شاعری کی پہچان سمجھی جاتی ہیں۔ جاپانی لوگ جن کی پرورش صدیوں سے شاعری کی فضا میں ہوئی ہے بڑی آسانی سے اپنا مطلب ہر موقعہ پر شعر کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

آج بھی شعری پیداوار بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ دیوان منتخبات اور شعری رسالے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سو سال کی مسلسل شاعری کے بعد شاہ دانتے کے شگوفے کے بارے میں کوئی نئی بات کہی جاسکے پھر بھی ہر سال پھولوں کے مشہور کنجوں میں سیکڑوں نظمیں درختوں سے لٹکی ہوئی نظر آتی ہیں حسن کی اس کثرت کے سامنے سیر کرنے والوں کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہوتا ہے۔

مرحوم شاہ میجی کو ایک غیر معمولی مرتبہ کا شاعر مانا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ساٹھ سال کی زندگی میں ایک لاکھ نظمیں لکھیں۔

اس کے آخری ایام میں روس اور جاپان کی جنگ چھڑ گئی اور اسی جنگ کے زمانے

میں اس نے یہ نظم لکھی تھی۔

"حملہ کرنے والے دشمن کو
اپنے وطن کی طرف سے
پوری قوت سے جواب دے
لیکن وار کرتے دم بھی
اس سے محبت کرنا نہ بھول"

(آسوالڈ ٹک۔ ایشیاٹک ریویو)

اردو میں بھی

مناظر قدرت کے جلوے عجیب عجیب انداز میں آپ کے شاعروں نے دکھلائے ہیں۔ تمام شعرا کے کلام سے منتخب کی ہوئی نظمیں

مناظر فطرت

میں ملاحظہ فرمائیے۔ جلد اوّل عہ دوم عہ، سوم عہ، چہارم عہ

مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی۔

کچھ کلام انیس پر

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری)

ہر ملک کی آب و ہوا اور طرز زندگی کے ماتحت رفتار زمانہ کا ایک مخصوص رویہ ہوا کرتا ہے۔ جو اپنی چند ہمہ گیر خصوصیات کی بنا پر ایک امتیازی معیار کا پابند ہے اس معیار کو بعض قوموں کی نسبت سے ایسا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ اسے قوم کا مخصوص کیریکٹر سمجھنا چاہیئے اسی قیاس پر ہر قوم کی برائی بھلائی کو ایک معیاری عینک سے دیکھا جا سکتا ہے اور اگر سچ پوچھئے تو اس قسم کی معیاری عینک مورخ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی کہی ہوئی کہانی پر وقتاً فوقتاً دنیا کی ہر فاتح قوم نے اپنا اثر ڈالا ہے البتہ شاعری حقیقی معنی میں قوم کی عینک ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ چند الہامی نظموں اور شاعرانہ خیال آرائیوں پر منحصر ہے۔ یہاں شاعری کے مقابلہ میں تاریخ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ہومر، فردوسی، والمیک، تلسی داس اور انیس قسم کے شاعر ہی دنیا کی تاریخ کا مواد بہم پہونچانے والے ہوئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ ملک اودھ کے ہر دلعزیز شاعر انیس کے کلام پر اپنی استعداد کے موافق اظہار خیال کریں۔

چونکہ ہندوستانی سوسائٹی میں مذہب کا عنصر ابھی تک بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے زبان و بیان کی خوبیاں جب تک مذہبی جذبات سے شیر و شکر نہ ہوں مقبول عام نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ انیس کے کلام کو وہ لوگ بھی پسند کرتے ہیں جو ان کے مذہب ہی سے نہیں بلکہ ان کی معاشرت سے اور ان کے ماتمی پیام سے بھی بیر رکھتے ہیں

ذیل میں چند مخصوص عنوانات کے ماتحت ہم انیس کے کلام کا مقابلہ دوسرے شعرار کے کلام سے کرتے ہیں تاکہ انیس کو صحیح معنی میں ہم سمجھ سکیں۔ یہاں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں

کہ انیس کی بابت حالی نے کیا کہا یا شبلی کے کیا خیالات ہیں۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انیس دراصل ہماری نگاہ میں کیا ہیں اور ہم نے ان کو کہاں تک سمجھا۔

انگریزی زبان نے ہمیں دنیا بھر کے علم و ادب سے تھوڑا بہت واقف کر دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہومر، شکسپیر اور گوئٹے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ اور ان کا مرتبہ ہمارے فردوسی اور تلسی داس کی طرح لٹریچر میں اعلیٰ ہے۔ لیکن انگریزی زبان میں ایک شکسپیر ہی بڑا شاعر نہیں۔ ملٹن شاعر ہونے کے علاوہ عالم اور فقیہہ بھی تھا، لیکن اس کے مقابلہ میں شکسپیر کی ہمہ گیری ہر جگہ مسلمہ ہے۔ اسی قسم کا تفاوت اور اختلاف اردو زبان کے شعراء میں بھی ہے۔ بعض شعراء اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کی طرف لوگوں کا خود ساختہ کلام بھی منسوب ہو گیا۔ گویا بیربل کا لطیفہ ہیں۔ جو چانڈوں خانوں میں تصنیف ہو کر بیربل کی طرف منسوب ہوئے۔ میر صاحب کے بہتر نشتروں کی یہی قطع ہے۔ کوئی چبھتا ہوا شعر سنا گیا میر صاحب کا نشتر ہو گیا اور اب تو اکبر مرحوم بھی اس اعتبار سے شہرت عام کے حقدار نظر آتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اکبر کا سنجیدہ کلام بھی ایک زندہ دل تنقید ہونے کے علاوہ اخلاقی افادیت کا دلفریب ریکارڈ ہے۔ اور مسلمان ہی نہیں بلکہ ہنود بھی اور انگریز بھی ان کو بہترین شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

خیالات کی محض وہ بلندی جہاں تک عوام الناس نہ پہنچ سکیں معیار کو محدود کر دیتی ہے انگریزی زبان کے شاعر براؤننگ کی مثال موجود ہے، خود ہماری زبان کے غالب اور اقبال کو لیجئے۔ لیکن انیس اگر صرف مرثیوں اور ماتمی مضامین پر اپنی استعداد نہ صرف کر دیتے تو غالباً وہ شکسپیر، تلسی داس اور فردوسی سے کم شہرت نہ حاصل کرتے کیونکہ ان کے ہمہ گیر ہم عصر میر سلامت علی دبیر بھی زبان فصاحت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے تھے۔ اردو زبان اگر اپنے محدود دائرے میں کوئی اہمیت رکھتی ہے تو اس مطابقت سے ہم انیس کو ہومر، شکسپیر، دانتے، فردوسی اور تلسی داس سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ راقم الحروف کا سابقہ پرستاران انیس سے بہت بھ رہا۔ ان کے نزدیک انیس ماورائے انسان سمجھے جاتے ہیں اور ان کے مرثیوں کی حیثیت

وہی ہے جو ہنود میں رامائن کی اور بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ واقعہ کربلا، مہا بھارت اور رامائن میں بہت کچھ مطابقت ہے، مہابھارت کے کورو اور پانڈو معرکۂ کربلا کے فریقین کی طرح ایک دوسرے کے عزیز تھے۔ رامائن کے رام اور لکشمن ایک طرف اور بھرت کی رقابت ایک طرف مسئلہ خلافت اور بنو امیہ کی خاندانی عداوت سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ غرض پلاٹ ایک ہی ہے گو مقاصد دوسرے ہیں۔ اس طرح مراثی انیس اردو زبان کی مہا بھارت، رامائن یا شاہنامہ سب کچھ ہیں لیکن اردو زبان کی کم مائگی کو دیکھتے ہوئے ان زبردست رزمیہ مضمونوں سے بے ترتیب مرثیوں کا مقابلہ کرنا بے محل سا ہے۔ تاہم بفرض محال اگر کسی قسم کا مقابلہ ممکن ہے تو صرف یہ جو کیا گیا۔ اگر مراثی انیس کے واقعات کی ترتیب وہی ہوتی جو رامائن یا شاہنامہ میں ہے تو اس صورت میں غالباً مراثی انیس بھی دنیا کی بڑی رزمیہ نظموں میں شمار ہوتے۔ لوگوں نے اس قسم کی کوشش اپنے طور پر کی ہے مگر وہ بات کہاں جو خود شاعر سے ممکن ہو سکتی تھی۔

تبصرہ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ شاعر کے خیالات ہمیشہ نئے نہیں ہوا کرتے۔ نوعیت محض اظہار خیال کی خوبی اور طرز ادا کا جادو ہے۔ چنانچہ موزانہ مقابلہ یا در اصل خیالات کا نہیں ہوتا بلکہ طرز ادا کا کہ کس طرح ظاہر کئے گئے اور وہ کونسی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ نئے معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً "معرفت حق" سے متعلق مضامین پر ہماری زبان کے شعرا نے خیال ایک ہی ظاہر کیا ہے، مگر طرز ادا مختلف ہے۔ چنانچہ میر صاحب کہتے ہیں ؎

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا — مری آہ نے برچھیاں ماریاں

یعنی انساں کی آہ فلک قدس سے بھی پرے منزل "لا احصی" تک پہنچ گئی۔ شعر کیا گویا ارجزہے۔ غالب؎ اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

محاورہ "دوچار ہونا" سے جو تبصرہ ماخوذ ہے وہ احدانیت کی بالکل اچھوتی توجیہ ہے۔

الفاظ یگانہ اور یکتا بھی قابل غور ہیں۔ لفظ "یگانہ" ہر قسم کے تعلق اور رشتہ کی نفی کرتا ہے اور لفظ "یکتا" قائم بالذات ہے یعنی لفظ "ایک" کے بعد "دو" کا خیال ہونا ضروری ہے مگر "یکتا" اپنے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اکبر؎ عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

عقل محدود ہے اور خالق عقل لامحدود۔ سمجھ میں تو وہی شے آسکتی ہے جس کی تمثیل ممکن ہو اور جو سمجھ کے دائرے سے باہر نہ ہو۔ غالب اور اکبر کے ان دو اشعار کا مقابلہ گویا زبان و بیان کا مقابلہ ہے۔ اگر غالب کا شعر صرف زبان ہی زبان ہے تو اکبر کا شعر بیان ہی بیان ہے اور دونوں میں نغز کی خوبی بھی ہے۔

حالی؎ ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

حالی نے وہی بات معاشرتی اور سماجی دلائل سے پیش کی ہے۔

اقبال؎ کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اس شعر میں مرحوم گویا اپنے کو "صنم آشنا" ثابت کر رہے ہیں۔ حقیقت کل لامحدود ہے اور مجاز محدود۔ مجاز میں حقیقت کا مشاہدہ خیال باطل ہے۔ لہذا "ارنی" کا جواب "لن ترانی" کے سوائے کیا ہو سکتا ہے۔

بہر؎ اس کی حسرت ہے جسے دل سے بھلا بھی نہ سکوں
ڈھونڈھنے اسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

"اقرار نارسائی" شریعت کے حدود کے اندر ہے۔

ں؎ بجلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو

ہے قرب رگ جاں پر بھی اس پر یہ بعد
اللہ! اللہ! کس قدر دور ہے تو!!!

ماف شرط ہے۔ اس رباعی میں غالب کی زبان، اکبر کا بیان، حالی کا اعتقاد اور اقبال ذبۂ عبودیت سب کچھ ہیں اور مندرجہ بالا ہر مثال کا خلاصہ یہ رباعی ہے۔ یعنی یہ نغز بھی ہے

حسنِ تعلیل بھی، تفسیر قرآن بھی، رمز توحید بھی اور زبان تو اس قدر سلیس ہے کہ ہر کس و ناکس بھی سُن کر وجد کرنے لگے۔

موازنہ اس مختصر تبصرے کے بعد ہم انیس کے کلام کا موازنہ دوسرے شعراء سے کرتے ہیں۔

انیس کے ہر مرثیے یکساں ہیں سب کا انجام ٹریجڈی ہے۔ ہر مرثیہ مظلومیت، صبر، شجاعت وضع داری، تسلیم و رضا وغیرہ جذبات کے جداگانہ اور مجموعی پہلوؤں کا ریکارڈ ہے۔ اور معاشرت کا ہر پہلو اِن میں نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دودمانِ حسین علیہ السلام کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اردو ہی تھی۔

ٹریجڈی کی بنیاد حزن و ملال ہی پر ہے اور یہی مرثیہ کا بنیادی عنصر ہے تاہم اس مایوس کن زمین میں انیس نے جو گلزار سخن لگایا ہے اس کا لگانا شاداب زمین میں بھی مشکل تھا۔ کم و بیش دنیا کے دانا ترین فلسفی اور غیور طبع لوگ طبعی طور پر حزن و ملال کا شکار ہوتے ہیں۔

غالب نے لکھا ہے۔ ع "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

اقبال کہتے ہیں۔ ع "دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب"

انگریزی زبان کے شاعر شیلی نے لکھا ہے۔ ع

"ہماری ہنسی میں بھی کچھ دکھ ملا ہے"

میر درد اس سب کا خلاصہ اس طرح لکھتے ہیں ؎

"جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا"

انیس نے اپنے روزمرہ میں اس کو عام بات ظاہر کی ہے اور لکھا ہے کہ ؎

دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال — ادبار ہے انساں کا کبھی اور کبھی اقبال"

اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ؎

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے
کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے
غنچے بہت ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے
بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

انیس شاعر غم ہیں۔ ان کے کلام میں مسرت و بہجت سے متعلق مواد نہیں ہے اور یہ کمی ایسی ہے کہ ان کو ہمہ گیری کے مرتبہ تک نہیں پہنچنے دیتی بعض مغربی اہل قلم بھی حزن و ملال ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً ٹامس ہارڈی اپنے ایک ناول میں دنیا کی ستم ظریفیوں کا ایک تمثیلی خاکہ اس طرح پیش کرتا ہے :۔

نیچر کی اس سہانی شام کا تصور کیجئے جب گلابی شفق سے نورانی گلال سورج کی کرنوں کے عبیر سے مل کر عالم لاہوت کی ہولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی سماں میں ان قزاقوں کا بھی تصور کیجئے جو چند دہات کے ٹکڑوں کے لئے ایک مسافر کی گردن پر چھری ریت ریت کر سرخ لہو کی ندی بہاتے ہیں۔"

دونوں مناظر ایک ہی ہیں مگر پہلا سین دوسرے کی حالت پر مسکرا رہا ہے اور دوسرا پہلے کی بجسی پر خون اگل رہا ہے، مراثی انیس کی عام روش اسی قسم کے مناظر لیے ہوئے ہے یہاں ہم صرف ایک بند پر اکتفا کرتے ہیں ؎

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم
دلچسپ صدا نوبت و شہنائی کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی افق چرخ پہ کم کم
وہ گل کے کٹوروں پہ دُر افشانی شبنم
خنکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالک گلزار جہاں تشنہ دہاں تھا

اسی قسم کی ایک حالت شکسپیر نے بنی آزاد نظم میں اس طرح پیش کی ہے جو محض بی اور تنقیدی پہلو کو مدنظر رکھ کر یہاں لکھی جاتی ہے، ایک عیش و نعم میں دن گذارنے والا

بادشاہ نیند کی خوشامد اس طرح کرتا ہے سے ترجمہ۔

اے نیند پیاری پیاری
تو دائیۂ فطرت ہے
کیوں مجھ سے خوف کھایا
کیوں میری تھکی پلکوں پر بار نہیں آیا۔
اے کاش خودی سے میں دم بھر کو گذر جاتا
اور خواب فراموشی میں ڈوب کے مر جاتا!
ان کوٹھریوں میں تو گھٹتا ہے دھواں جن میں
مچھر کی نفیری میں اچھتے ہوئے ڈھیلوں پہ
دہقان کو سلاتی ہے۔
اور میری خوابگاہیں خوشبو سے معطر ہیں
اور میرے شامیانے شمعوں سے منور ہیں
اور میٹھی لوریوں کی آواز گونجتی ہے ....
اے پیاری نیند یہ سب مرغوب نہیں تجھ کو"

انیس کے زیادہ تر کلام کو رزمیہ شاعری کہا جا سکتا ہے، اور چونکہ رزمیہ پہلو پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس لئے ہم اس بحث کو یہاں قلم انداز کریں گے، البتہ انیس کی بزم پر ابھی تک کوئی دلچسپ اشارہ نظر نہیں آیا۔ انیس کی بزم در فردوسی کی بزم میں بہت زیادہ فرق نہیں، جس طرح نظامی نے فردوسی کے مقابلہ میں بزم پر زیادہ زور دیا ہے، ار دبیر نے انیس سے زیادہ بزم پر زور دیا۔ لیکن بزم کے پہلو پر مولانا کاکوری سب میں پیش پیش ہیں یہاں انیس اور محسن کے کلام سے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مولانا محسن نے پیغمبر السلام صلعم

کی پیدائش سے متعلق نغمۂ نشاط اس طرح لکھا ہے ؎

سامانِ ظہور کی ہے تمہید | قدرت پہ یہ ہو رہی ہے تاکید
فیض روح القدس عیاں ہو | افشائے رموز کن فکاں ہو
اللہ! اللہ! کیا سماں ہے | ہر شے کو حیات جاوداں ہے
ہستی و عدم میں ایک لے ہے | لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی | بندے کے لباس میں خدائی
اس وقت دیارِ عرب کے | مطلع سے تجلیاتِ رب کے
برجِ شرفِ قریشیاں میں | اور ہاشمیوں کے خانداں میں
اسلام کا آفتاب چمکا | بے پردہ بے نقاب چمکا

انیس کے بند ملاحظہ ہوں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق ہیں ؎

ہاں اے فلک پیر نئے سر سے جواں ہو | اے ماہ شبِ چار دہم نور فشاں ہو
اے ظلمت غم دیدۂ عالم سے نہاں ہو | اے روشنی صبح شب عید عیاں ہو
شادی ہے ولادت کی یداللہ کے گھر میں | خورشید اُترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

اے کعبۂ ایماں تری حرمت کے دن آئے | اے رکن یمانی تری شوکت کے دن آئے
اے بیت مقدس تری عزت کے دن آئے | اے چشمۂ زمزم تری چاہت کے دن آئے
اے سنگ حرم جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں | اے کوہ صفا اور صفائی ہوئی تجھ میں

اے ختم رسل گوہر مقصود مبارک | یا نور خدا رحمت معبود مبارک
یا شاہ نجف شادی مولود مبارک | یا خیر ام اختر مسعود مبارک
رونق ہو سدا نور دو بالا رہے گھر میں | اس ماہ دو ہفتہ کا اجالا رہے گھر میں

اے ماہِ معظم ترے اقبال کے صدقے
شوکت کے فدا عظمت و اجلال کے صدقے

اتری بُرکت فاطمہ کے لال کے صدقے
جس سال یہ پیدا ہوئے اس سال کے صدقے

اسپند کرو فاطمہؓ کے ماہ جبیں پر
فرزند نہیں چاند اتر آیا ہے زمیں پر

ماتھے پہ چمکتا ہے جلالت کا ستارا
نقشہ ہے محمد سے شہنشاہ کا پیارا

تصویر رسول عربی دیکھ رہے ہیں
آنکھوں کی گردش کہ بنی دیکھ رہے ہیں

گلستان عالم کی چمن آرائی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ بزم عالم ہمیشہ سے دلہن بنی رہی ہے اور رہے گی اس موضوع سے متعلق ہم ہندوستان کے شکسپیر آغا حشر کاشمیری کا ایک نغمہ یہاں لکھتے ہیں ؎

جگ مالی، تہاری، کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

نیاری نیاری گلکاری
قدرت کی سگرو جگ میں

جگ مالی، تہاری، کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

شجر حجر، برگ و بار
پھول پات ڈار ڈار
کوئی نہ پایو تھرو پار
حشر جگت دہاری

جگ مالی، تہاری کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

رام جھرو کے بیٹھ کے سب کا مجرا دیکھت
جاکی جیسی چاکری تاکو نیسا دیت

تو ماتا، تو پتا، تو داتا نیارا
تو ہی پار لگا دن ہارا

جگ مالی، تہاری کرتاری کے واری
قائم کی سرداری، کیا پھولی پھلواری

یہ ترانہ محض ڈراما وغیرہ کے لئے ہے۔ اس کو ادبی معیار سے کوئی واسطہ نہیں تاہم خیالات وہی ہیں جو عموماً ہوا کرتے ہیں، انیسؔ کے مندرجہ ذیل اشعار گویا اس نغمہ کی جان ہیں مثلاً :-

گرمی صحرا اور وہ پھولوں کا مہکنا — مرغان چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا — وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
مہتاب ہوا گم فلکِ نیلو فری کا — پھولا گل خورشید نسیم سحری کا
اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے — خورشید کو پہلو میں دبانے لگے ذرّے
اس دشت میں روتی ہے جو شبنم شہ دیں پر — ہیں موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو — بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

مقابلہ :- اس عنوان کے ماتحت اردو زبان اور دیگر زبانوں کے مستند شعرا کے چند اشعار سے انیس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ مرثیہ ایسی خشک زمین پر انیس نے کیا کیا پھول کھلائے

حسرتؔ ہے یہی شرط وفاداری کہ بے چون وچرا — وہ مجھے چاہے نہ چاہے میں اُسے چاہا کروں
انیسؔ عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے — معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے
کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے — ہر زخم میں بو الفتِ اللہ کی نکلے

مومنؔ بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا — شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا
ریاضؔ صبا آتشی گل ہو یا داغِ بلبل — یہ سب آگ انھیں کی لگائی ہوئی ہے
داغؔ جنبش میں یوں ہیں وہ لب نازک نفس کے ساتھ — جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی
انیسؔ چن کے اختاں جو نظر یار نے کی تاروں پر — آسماں رات کو لوٹا کیا انگاروں پر

تلسی داسؔ رگھو کل ریت سدا چلی آئی — پران جہین ارو بچن نہ جائی
(ترجمہ :- یہ دستور رگھو کے گھر ہی میں پایا — نکل جائے جی بات رہ جائے لیکن)

جو کہتے ہیں منہ سے وہی کرتے ہیں بہادر   انیس سے ہے بات کی پچ نام پہ مرتے ہیں بہادر

مراثیِ انیسؔ کی تعداد کئی سو تک ہے جو نولکشور پریس کی پانچ جلدوں میں شائع ہو
ہیں، اکثر مرثیے دو تین سو بند تک پہنچتے ہیں ذیل میں صرف پہلے مرثیے سے انتخاب کرکے
چند ایسے مصرع لکھے جاتے ہیں۔ جن میں ضرب المثل ہونے کی اہلیت ہے۔ اگر مراثیِ انیس
کی پانچوں جلدوں سے اس قسم کے محاورے منتخب کیے جائیں تو ایک دلچسپ ڈکشنری مرتب
ہو جائے:۔

۱۔ اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

۲۔ دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

۳۔ انساں ہوں کلیجہ مرا پتھر نہیں بابا

۴۔ عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے

۵۔ دنیا میں گذر جاتی ہے انسان کی ہر طور

۶۔ جب اٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

۷۔ (شعر) کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گل کونسا کھلتا ہے کہ مرجھا نہیں جاتا!

دو کسان

(جری احمد سید حبا ایم اے)

(۱)

دونوں جھونپڑے ایک پہاڑی کے نیچے تھے۔ ندی بھی پاس تھی جہاں مویشی پانی پینے آتے تھے۔ ان جھونپڑوں کے رہنے والے دو کسان آس پاس کی اوسر بنجر زمین پر سخت محنت مشقت کرتے اپنی روزی پیدا کرتے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے۔ دونوں کے گھروں میں چار چار بچے تھے، صبح سے شام تک، جھونپڑوں کے سامنے مٹی میں کھیلا کرتے، دو سب سے بڑے، چھ چھ برس کے اور دو سب سے چھوٹے، پندرہ پندرہ مہینے کے تھے، دونوں کسانوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ بسے تھے اور پھر زچے خانے بھی تقریباً ایک وقت میں رچے تھے

یہ بچے مٹی میں ایسے لت پت رہتے کہ مائیں بھی مشکل ہی سے اپنے اپنے بچوں کو پہچان پائیں، اور دونوں کسان تو ہمیشہ ہی غلطی کرتے، ان کے ذہنوں میں آٹھوں نام گڈ مڈ ہو گئے تھے، ایک کو پکارنا ہوتا تو دو چار نام ضرور زبان پر آجاتے پھر کہیں اصلی نام یاد آتا۔

ندی کی راہ سے آنے میں پہلا جھونپڑا توآش کا پڑتا اس کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا، دوسرا ولانیں کا، اس کے ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔

ان کی پرورش والدین پر گراں تھی۔ آلو اور ترکاریوں کا شوربہ ان کی کل غذا تھی۔ اور تازی ہوا اور بس، کھانا بھی صرف تین وقت میسر آتا، سات بجے صبح، دن چڑھے دوپہر میں، اور پھر چھ بجے شام کو وقت آتا مائیں اپنے جھینگی پوتوں کو کھلانے پلانے کے لیے جمع کرتیں جیسے کوئی ننھے ننھے چوزوں وچگا لے کے لیے جمع کرتا ہے، کھانے کی میز پچاس برس پرانی کثرت استعمال سے خوب چکنی چمکدار ہو گئی تھی، سب لا کر اسی پر بٹھا دیئے جاتے۔ سب سے بڑا ایک کونے پر پھر اس سے چھوٹا۔ پھر اس سے

چھوٹا، آخر میں سب سے ننھا، اس کا منہ مشکل سے میز تک پہونچتا ان کے سامنے ایک کونڈلیپ رکھ دی جاتی جس میں ترکاریوں، بھاجیوں، پیاز، آلو وغیرہ کا شوربہ ہوتا اور اس میں روٹی بھیگی ہوتی سب کے سب اس پر جھک پڑتے یہاں تک کہ خوب آسودہ ہو جاتے، سب سے چھوٹے کو ماں خود کھلاتی جاتی۔ ہر اتوار کو ترکاری بھاجی اور پیاز کے ساتھ تھوڑا گوشت بھی شامل کر لیا جاتا، باپ اس دن دیر تک میز پر بیٹھا مزے لے لے کر کھاتا رہتا اور کہتا جاتا، "مجھے یہی ملتا رہے تو بھی میں خوش ہوں!"

اگست کا مہینہ تھا اور شام کا وقت ایک ٹم ٹم جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی، ایک کم عمر مادام کے ہاتھ میں اس کی لگام تھی، ساتھ بیٹھے موسیو سے کہنے لگی۔ "ہاہا ہنری۔ دیکھو تو! یہ بچے کیسے پیارے لگ رہے ہیں مٹی میں لت پت! ایں؟" ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اس کا عادی ہو چکا تھا کہ جہاں کہیں بچے نظر پڑے اور وہ شفقت و محبت سے بیتاب ہو گئیں۔ اس سے اس کے دل کو رنج بھی پہونچتا اور طبیعت کو ٹھیس بھی لگتی۔

مادام رکی نہیں، "میں ان کو پیار کر کے رہوں گی، کاش ان میں سے ایک میرا ہوتا، وہ سب سے چھوٹا، ننھا پیارا سا!"

یہ کہہ، ٹم ٹم سے کود دوڑ بچوں کے پاس پہونچ گئی، سب سے چھوٹے ننھے تواش کو گود میں لے لیا، اس کے خاک دھول میں اٹے ننگے ننگے چہرہ اور گھونگر والے بالوں کو جوش محبت میں پیار کرنے لگی۔ بچہ کو یہ لپٹانا، وہ پیار کرنا ایک مصیبت معلوم ہو رہی تھی جب وہ اس کی گرفت سے چھوٹنے کی کوشش کرتا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے منہ کو ہٹاتا تو وہ اور بھی پیار کرنے لگتی، خوب پیار کر کے وہ ٹم ٹم میں بیٹھی اور چلی گئی۔

اگلے ہفتہ وہ پھر آئی، زمین پر بیٹھ گئی ننھے تواش کو گود میں اٹھا لیا، خوب کیک اور مٹھائیاں کھلائیں۔ دوسرے بچوں کو بھی بانٹیں، دیر تک ان کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتی رہی اس کا

شوہر صبر و سکون کے ساتھ ٹم ٹم میں منتظر بیٹھا رہا۔

وہ پھر آئی، ان کے والدین سے بھی ملاقات کی اب اس نے اپنا معمول بنا لیا، روز آتی جیبوں میں مٹھائیاں اور پیسے بھر لاتی بچوں کے ساتھ کھیلتی، مٹھائیاں کھلاتی پیسے بانٹتی اور چلی جاتی۔"

(۲)

اس کا نام مادام ڈہو بیر تھا۔

ایک صبح آئی، ساتھ میں اس کا شوہر موسیو ڈہو بیر بھی ٹم ٹم سے اتر آیا بچوں کی طرف رخ بھی نہیں کیا، دونوں سیدھے جھونپڑے کے اندر چلے گئے

تواسش میاں بیوی اندر ہی تھے جلانے کے لئے لکڑی چیر رہے تھے، ان کو آتا دیکھ کر متعجب کھڑے ہو گئے، جلدی سے ان کے پاس کرسیاں لا کر رکھیں اور انتظار کرنے لگے کہ کیا بات ہے۔

مادام نے گفتگو شروع کی، اس کی آواز کانپ رہی تھی، لفظ ٹکڑے ہو ہو کر نکل رہے تھے۔ اس نے کہا "میں آپ لوگوں سے ایک بات کہنے آئی ہوں، میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ..... کیا جی چاہتا ہے کہ اٹھائے جاؤں اپنے ساتھ لے جاؤں تمہارے . کو..... تمہارے ننھے پیارے کو"

تواسش میاں بیوی حیرت زدہ، دم بخود کھڑے رہے۔ ان کے منہ سے ایک بول بھی نہ پھوٹ سکا۔

مادام نے ایک سانس بھری اور پھر کہنے لگی "ہمارے کوئی اولاد نہیں، ہم بالکل اکیلے ہیں، میں ہوں اور یہ میرا شوہر اور کوئی نہیں، ہم اس تمہارے ننھے کو گود لے لیں گے ....اگر تمہاری مرضی ہو تو!"

کسان کی بیوی کی اب سمجھ میں آیا "آپ شارلو کو ہم سے لے جانا چاہتی ہیں؟ آہ! یہ

کیسے ممکن ہے! ہرگز نہیں، یہ نہیں ہو سکتا!

اب موسیو دہو بیر بیچ میں بولے "دیکھو بات سمجھ لو۔ میری بیوی نے بات کو اچھی طرح
نہیں کیا۔ ہم تمھارے شارلو کو گود لینا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر وہ تم کو دیکھنے، تم سے ملنے بھی آئے گا،
بڑا ہو کر، اگر وہ اس لائق ہوا اور یقینی ہوگا تو ہم اسے اپنا وارث بنائیں گے، اگر خوش نصیبی سے
ہمارے اولاد ہوگئی تو اس کے ساتھ برابر کا حقدار ہوگا لیکن اگر خدا نخواستہ، نالائق نکل گیا تو ہم
اس کے نام بیس ہزار فرانک لکھ دیں گے یہی نہیں۔ ہمیں تمھارا بھی خیال ہے تم کو بھی ہم سو فرانک
ماہوار دیں گے اور تمام عمر دیتے رہیں گے، سمجھیں آپ!"

عورت غصہ سے آگ ہو گئی۔

تم چاہتے ہو میں شارلو کو تمھارے ہاتھ بیچ دوں۔ آہ میرے اللہ! یہ ماں سے کہنے کی
بات ہے! نہیں ہرگز نہیں! یہ پاپ ہے پاپ!"

کسان سوچ بچار میں خاموش کھڑا تھا، اب تو وہ بھی سر ہلانے لگا۔ ہاں، ٹھیک کہتی ہے!"

دل شکستہ و مایوس مادام کے آنسو نکلنے لگے۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھا سسکیاں
بھرنے لگی، کہنا چاہا مگر رونے سے آواز بندھی بندھی سی ہو گئی جیسی ضدی بچے کی، جس کی ضدیں
ہمیشہ پوری ہوتی ہوں اور اب بات ٹوٹ رہی ہو۔ "وہ نہ مانیں گے ہنری وہ نہ مانیں گے"۔

دونوں نے ایک آخری کوشش کی۔ "لیکن میری بہن ذرا اپنے بچے کے مستقبل کا
بھی تو خیال کرو، اس کی آرام و آسائش، اس کی ......"

یہ سن کر کسان کی بیوی آپے سے باہر ہو گئی۔ خوب خیال کر لیا، خوب سوچ سمجھ لیا، بس
تم لوگ چلے جاؤ، آئندہ اپنی صورت یہاں نہ دکھانا۔ خدا ہی سمجھے، یہ میرے بچے کو لے جانا چاہیں
اور میں لے جانے دوں! ایسے بچے کو ......!"

باہر آنے پر مادام کو خیال آیا چھوٹے بچے تو دو ہیں۔ اسی رونے کی حالت میں کہنے لگی
"لیکن دوسرا ننھا تو تمھارا نہیں ہے؟" اس کے لہجے سے بچے کی سی ضد اور ہٹ ٹپک رہی تھی۔ اب

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بچپن ہی سے اس کی اٹھان بگڑگئی ہو جیسے وہ صرف اپنی ہی راہ چلنا جانتی ہو۔

تواسشس بولا "نہیں وہ ہمارے پڑوسی کا بچہ ہے تمہارا جی چاہے تو ان کے پاس جاؤ وہ اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا، اس کی بیوی جوش غضب میں اب بھی بڑبڑا رہی تھی

(۳)

ولائیں میاں بیوی کھانے کی میز پر بیٹھے مزے مزے سے توس کھا رہے تھے بیچ میں مکھن کی پلیٹ رکھی تھی چھری پر مکھن لگا لگا کر توسوں کو ہلکا ہلکا کر چنتے جاتے۔

مادام دہوبیر نے اپنا سوال پیش کیا، لیکن پہلے کی طرح ڈھیلا سا نہ مارا بلکہ کم اختصار سے اور زیادہ موثر لہجہ وطرز ادا اختیار کیا۔

پہلے تو دونوں میاں بیوی نے انکار میں سر ہلا دیئے لیکن جب سنا کہ ان کو بھی سو فرانک ماہوار ملیں گے تو ذرا سوچ میں پڑ گئے ایک دوسرے کی طرف شش وپنج کی حالت میں دیکھنے لگے، ان کے پہلے ارادہ میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ لیکن تذبذب کی الجھن میں دیر تک کچھ نہ کہہ سکے۔ بیوی نے اس خاموشی کو توڑا "کہو صاحب تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس نے نہایت ہی سنجیدہ وفیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "میرا خیال ہے کہ یہ بات اس طرح ٹھکرائی نہیں جا سکتی"

مادام جواب کے انتظار میں بے چینی وبیتابی سے کانپ رہی تھی آسرا بندھتے ہی بچہ کی آرام وآسائش، اس کے مستقبل کے بن جانے کا ذکر کرنے لگی اور کہا کہ "آگے چل کر جب روپیہ پیسہ ہوگا تو وہ تمہاری بھی مدد کر سکے گا"

کسان نے پوچھا "یہ بارہ سو فرانک سالانہ کے گا۔ رہ کا وعدہ ایک قانونی گواہ کے سامنے ہوگا؟"

موسیو دہوبیر بولے "ہاں ہاں کیوں نہیں کل ہی"

کسان کی بیوی اب تک غوطہ میں پڑی ہوئی تھی بولی "لیکن سو فرانک ماہوار تو کافی نہیں،

تھوڑے دن میں وہ بڑا ہو جائے گا، ہمارے ساتھ ساتھ کام کرنے لگے گا۔ اتنے میں ہم اپنے بچے کو نہیں دے سکتے! ہاں اگر ایک سو بیس فرانک ہوتے!

مادام بالکل بے صبر ہو رہی تھی۔ اس نے اس کو بھی فوراً منظور کر لیا۔ بچے کو وہ فوراً ہی بیجانا چاہتی تھی، سو فرانک بخشش کے طور پر اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ موسیو دہو بیر نے مسودہ تیار کیا۔ میئر اور ایک پڑوسی بلا لئے، دونوں گواہ ہو گئے۔

نوجوان مادام خوشی سے پھول رہی تھی۔ بچہ کو لے کر عجیب عجیب آوازیں نکالتی بھاگی جیسے بچہ کو کوئی کھلونا مل جائے جس پر وہ عرصہ سے حسرت بھری نگاہیں جائے ہوئے ہو۔

تواش میاں بیوی چپ چاپ کھڑے ان کو جاتے دیکھتے رہے۔ وہ شاید اب پچھتا رہے تھے کہ انھوں نے انکار کیوں کیا۔

(۴)

ننھا ژین دلائیں اس طرح رخصت ہو گیا۔ اس کے ماں باپ ہر ماہ موسیو دہو بیر کے وکیل سے روپیہ لینے جاتے، لیکن وہ اپنے پڑوسیوں سے سخت نالاں تھے۔ تواش کی بیوی نے انھیں خوب خوب رسوا کیا تھا ہر جگہ کہتی پھرتی "کیسی بے غیرتی ہے یہ! اپنا لڑکا بیچ دیا، خدا بچائے، کیسے ذلیل ہیں یہ لوگ!"

کبھی ننھے شارلو کو ٹھاٹھ باٹھ سے لیکر نکلتی کھلاتی جاتی اور کہتی جاتی "دیکھا تو نے میں نے تجھے نہیں بیچا! میں اپنے ننھے پیارے کو نوج بیچوں۔ میں اپنے بچے نہیں بیچا کرتی۔ کبھی نہیں، میں غریب سہی، لیکن اپنے بچے تو نہیں بیچ ڈالتی۔

سال بہ سال روز یہی ہوتا رہا۔ زور زور سے دلائیں ماں باپ پر آوازے کسے جاتے کہ ان کے کان تک پہونچیں۔ تواش ماں باپ نے یقین کر لیا کہ گرد و نواح میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں کیونکہ میں نے شارلو کو نہیں بیچا۔ لوگ اس کی باتیں کرتے۔ کہتے۔ یہ ٹھیک ہے دل ضرور چاہا ہوگا، دل کس کا نہیں چاہ جاتا، لیکن اس نے وہی کیا جو ایک ماں کو کرنا چاہئے تھا۔ شاباش

سہے اس کو!"

لوگ اس کو مثال کی طرح پیش کرتے کہ ماں ہو تو ایسی ہو۔ شارلو اب اٹھارہ برس کا ہوگیا تھا اس کے دل و دماغ میں بھی ساری عمر یہ بات بیٹھی رہی اور یہی سمجھتا تھا کہ میں بھی سب سے بہتر ہوں کیوں کہ میری ماں نے مجھے بیچ نہیں دیا۔

دلامیں اپنے گذارے پر آرام و آسائش سے بسر اوقات کرتے۔ مگر تواش غریب کے غریب ہی رہے یہی وجہ تھی کہ ان کا گھر بھر ان سے جلتا اور ان پر غصہ اتارا کرتا تھا۔

دلائیں کا سب سے بڑا لڑکا فوجی تعلیم کے لئے چلا گیا، دوسرا مرگیا، شارلو تواش اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹانے، ماں باپ کی خدمت کرنے اور اپنی بہنوں کی پرورش کرنے کے لئے گھر پر ہی رہتا۔

(۵)

اب شارلو کو بی اکیس سال کا تھا۔

ایک صبح ایک خوبصورت خوش وضع ٹم ٹم جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی۔ ایک نوجوان اس سے اترا، ساتھ میں ایک بوڑھی مادام کو بھی ہاتھ کا سہارا دے کر اتارا۔ نوجوان کی وضع قطع رئیسانہ تھی جیب سے سونے کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ مادام کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو چکے تھے،

"وہ ہے وہ، میرے بچے! وہ دوسرا گھر!" بوڑھی مادام بولیں۔

اور وہ دلامیں کے جھونپڑے میں بے تکلفی سے گھس گیا، جیسے کہ وہ یہاں سے بخوبی واقف ہو بوڑھی ماں بیٹھی اپنے ایپرن (پیش بند) دھو رہی تھی۔ بڈھا ضعیف باپ آتش دان کے پاس لیٹا سو رہا تھا۔ دونوں کی نظر اچانک اوپر اٹھی، نوجوان بیتابانہ کہنے لگا "میری ماں آداب عرض، میرے ابا آداب عرض!" بوڑھے ماں باپ ایک دم سے چونک پڑے، ماں کے ہاتھ سے صابون گر گیا۔ "ارے تو ہے میرے ژین! ارے تو ہے، تو ہی ہے!" نوجوان اپنی ماں کو لپٹائے ہوئے برابر کہہ رہا تھا، میری اماں، میری اماں سلام سلام آداب آداب میری اماں"

بوڑھا باپ تن بدن سے کانپ رہا تھا لیکن حسب عادت سنجیدگی و متانت میں بل نہ آیا۔ "تو میرے ڑین تم واپس آگئے" گویا ابھی گذشتہ ادہی زین کو رخصت کیا تھا۔

خوشی سے وہ پھول رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر تنگ معلوم ہونے لگا۔ جی چاہا کہ ڑین کو باہر لیجائیں کہ پاس پڑوس میں لوگ اسے دیکھیں، فوراً ہی قصبہ کے میئر و پادری اور اسکول ماسٹر کی ملنے روانہ تیار ہونے اسے جاتے دیکھا

شام کو کھانے پر باپ سے کہنے لگا "تم نے یہ انتہائی حماقت کی کہ وہ ڑین کو نے گئے اور میں یونہی رہ گیا۔ باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس طرح بھینٹ چڑھ جانا قطعی برا نہیں "تو اس نے جھنجھلا کر کہا "کیا تم ہم کو جلانے اور گالیاں دینے پر تلے ہوئے ہو؟ اس بات پر کہ ہم نے تم کو اپنے سے جدا نہ کیا"

بیٹے نے نہایت بے دردی سے جواب دیا "ہاں میں تمہیں گالیاں ہی دے رہا ہوں تم لوگ بالکل گدھے ہو تمہارے ایسے ہی ماں باپ ہوتے ہیں جنکی اولاد کی ہمیشہ بلتے کٹتی ہے میں تم کو چھوڑتا ہوں تم لوگ اسی لائق ہو۔"

سیدھی سادی نیک بخت ماں اپنی شوربے کی پلیٹ سامنے رکھے رو رہی تھی حلق میں اترتا ہوا شوربہ بھی لوٹ آیا "پال پوس کر بڑا کرنے سے کیا حاصل۔"

بیٹے نے درشتی سے جواب دیا "میرا یہاں رہنا... کاش میں پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا، میں نے ابھی ڑین دلائیں کو دیکھا تو میرا خون کھول گیا، میں نے دل میں کہا یہ ہے جو آج میں ہوتا!"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہی بہتر ہے کہ میں اب ایک گھڑی نہ ٹھہروں، میں صبح سے شام تک تم کو گالیاں ہی دیتا رہوں گا تمہاری زندگی تم پر بار ہو جائے گی ... تم جانتے ہو میں تم کو قطعی معاف نہیں کر سکتا؟"

بوڑھے ماں باپ روتے روتے بے دم ہو رہے تھے۔

"نہیں یہ خیال ہی میرے لئے ناقابل برداشت ہے، جہاں رہوں گا دور روٹی کما کھاؤں گا۔"

اس نے دروازہ کھولا۔ باتیں کرنے کی آوازیں آئیں، دلائیں۔ ماں باپ اپنے بچے کے د
آنے پر خوشیاں منا رہے تھے۔

تارا والدین کی طرف مڑا، زمین پر زور سے پیر پٹخا، کم بخت کہیں کے۔ بدنصیب!!
رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

(پاسبان)

چند افسانوں کی کتابیں

واردات: منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے تیرہ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں جو افسانوں کی شکل میں منشی صاحب آنجہانی نے پیش کی ہیں۔ کاغذ طباعت اعلیٰ تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد عہ

زادِ راہ: از منشی پریم چند آنجہانی۔ یہ وہ افسانے ہیں جو منشی پریم چند نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھے تھے۔ زادِ راہ منشی جی کے فنی کمالات کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ قیمت مجلد عہ

چغتائی کے افسانے: ملک کے مشہور مزاحیہ نگار مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ادبی شاہکار۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں افسانے اور دوسرے میں فکاہات و مزاحیات۔ مزاحیہ ڈرامے طنزیات اور انشائیات درج ہیں۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ مکمل ستے

چاند کا گناہ: از راجہ مہدی خاں۔ اس میں کل ۳۵ افسانے ہیں۔ دنیا کے نقادانِ ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے ہیں جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ۲۲۵ صفحات مجلد عہ

پتھر سے ہیرا: محبت کی ایک نگاہ ایک انسان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور خونخوار وحشی درندوں کو کس آسانی سے رام کر سکتی ہے۔ یہ سچا افسانہ بتائے گا کہ دنیائے انسانی میں ایک عورت کی سچی ہمدردی اور محبت سے بھری گفتگو کیا کچھ جادو کر سکتی ہے۔ یہ قصہ یقین دلائے گا کہ بچوں کی صحیح تربیت کا طریقہ کیا ہے۔ ایسا دلچسپ اور دلاویز کہ ختم کیے بغیر نہ چھوٹے گا۔ یہ ادبی رنگینیوں کا بھی بس بھرا ہے۔ اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے قلم کا ایک اچھا نمونہ ہے قیمت صرف ۱۴ر

مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ دہلی

غزل

(حضرت فراق گورکھپوری)

اف تری پرسشِ کرم اف تری مہربانیاں
بڑھتی ہی جا رہی ہیں اب عشق کی بدگمانیاں

حسن کے اعتدال سے ملتی ہیں سب کی سرحدیں
اپنے حدود ہی میں ہیں بحر کی بیکرانیاں

زخم نہاں کا رنگ ہے عشق کے ہر نشاط میں
نشترِ نازِ حسن کی مٹ نہ سکیں نشانیاں

پوچھ نہ کس طرح اڑا رنگ سکوتِ سرمدی
آج سوالِ عشق پر حسن کی بے زبانیاں!

موج کو موج جانیے سطح پہ ہو کہ تہ نشیں
"عشق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں

رنگ بہارِ زندگی خون کے آنسوؤں سے ہے
حسن کی گلفشانیاں عشق کی شادمانیاں!"

رازِ نشاطِ بیکراں ایک جہاں سے کہہ گئیں
دردِ حیات کی طرح اٹھتی ہوئی جوانیاں

دیکھ یہ ربطِ حسن و عشق آگے کو گل کھلائیں کیا
کچھ مجھے بدگمانیاں کچھ تجھے بدگمانیاں

میرے سکوت پر نہ جا بدلا ہوا جہان دیکھ
آہ و فغاں سے کب ہوئیں عشق کی ترجمانیاں

عکس سا پڑکے رہ گیا دل پہ تری نگاہ کا
یاد سی آکے رہ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں

رازِ حیات کہہ گئے عشق کے چند غم شناس
درسِ حیات دے گئیں حسن کی شادمانیاں

ابرِ سیاہ میں فراق برق چمک کے رہ گئی
آج تو یاد آگئیں حسن کی مہربانیاں

آئینۂ امروز

(شایق ہندو صاحب)

معنیٔ حسن سے محروم ہیں اقوام ابھی
ہے نظر محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

حسن صورت ہے فقط مطمحِ اربابِ نظر
کوئی سمجھا ہی نہیں معنیٔ اصنام ابھی

ور کیونکر نہ ہوں رندوں سے مقاماتِ سرور
سنگِ مائل ہے نشانِ قدح و جام ابھی

ار فرما ہے درخشندہ فلزات کی حرص
گندم پختہ سے بہتر ہے زرِ خام ابھی

یکھئے کیسے اٹھے روئے حقیقت سے نقاب
عقل دراک پہ ہے پردۂ اوہام ابھی

رہی ہے یہ جفا پیشگیٔ خرس و عقاب
اہل یورپ میں ہے ہیجان دد و دام ابھی

الحقیقت یہ ہے تاراجگیٔ چین کا راز
خون جاپان میں ہے گرمیٔ بہرام ابھی

کا حال گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
اور ہونے کو ہے کیا موردِ الزام ابھی

ں پریشاں نہ ہو شیرازۂ ناموسِ چمن
نفسِ بادِ سحرگاہ ہے نمام ابھی

ایسا آسان نہیں عرفانِ تمدن ہندو
کچھ ریاض اور کرے مجلسِ اقوام ابھی

رفتارِ عالم

جرمنی نے ۱۰ مئی سنہ ۴۰ء کو ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کر دیا۔ ہمیں خیال تھا کہ لڑائی کے مسائل پر بیس برس تک غور کرنے کے اور فن جنگ میں طرح طرح کی نئی ایجادیں کرنے کے بعد انگلستان اور فرانس سے لڑنے کے لئے کوئی نیا محاذ تجویز کیا جائے گا۔ لیکن جرمنی نے اس مرتبہ وہی کیا جو کہ اگست سنہ ۱۴ء میں کیا تھا سوا اس کے کہ اس مرتبہ بلجیم کے ساتھ ایک اور چھوٹے غیر جانبدار ملک ہالینڈ پر بھی تباہی آئی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ انسان بہت کچھ ترقی کرنے کے بعد بھی عادت کا سہارا لئے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ اس وقت کا میدان جنگ بڑا تاریخی میدان جنگ ہے جب سے فرانس اور جرمنی کا مقابلہ شروع ہوا ہے خواہ جرمنی کا نام مقدس رومی سلطنت ہو یا جیسا کہ اس وقت "تیسری سلطنت" ان دونوں کا مقابلہ اسی میدان میں ہوتا رہا۔ چونکہ ان دونوں کے مقابلہ میں انگلستان بھی اب فرانس کی طرف سے شریک ہے، میدان اور فوجی نقل و حرکت کی منزلِ مقصود میں کچھ تبدیلی ہو جانا چاہیئے تھی۔ لیکن بظاہر وہی سنہ ۱۴ء کی کہانی سنائی جا رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب اسے ٹینک اور ہوائی جہاز سنا رہے ہیں۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بات کو غلط سمجھے ہوں۔ جرمنی کا مقصد پیرس پر قبضہ کرنا نہ ہو اور وہ اس گمان میں نہ ہو کہ فرانسیسی دار السلطنت پر قبضہ کرنے سے جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اتحادیوں کے وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بھی اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جرمن سپہ سالار کیا چاہتے ہیں۔ انھیں اس بات سے اور بھی الجھن ہوتی ہے کہ جرمن جس طریقے پر لڑ رہے وہ بھی بہت نرالا ہے اور اسی وجہ سے ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہو رہا ہے۔

۱۰ مئی سنہ ۴۰ء کو جرمن فوجوں نے ایک ہی وقت میں ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کی سرحد کو پار کیا اور برابر آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ہالینڈ فتح ہو گیا۔ ۱۴ مئی سنہ ۴۰ء کو ان کا جو محاذ تھا اس کا مقام معلوم کرنے کے لئے نقشہ کو دیکھئے اور مون مدی (Montmedy) سے جہاں پر فرانس کی بکی ماژنیو لائن ختم

ہوتی ہے شمال کی طرف ایک لکیر ہیگ تک کھینچ دیجئے آپ دیکھیں گے کہ جنوب مغربی ہالینڈ میں دریائے
رائن نے جو جزیرے بنا دئے ہیں۔ وہ لکیر کے باہر ہیں۔ ہالینڈ میں جرمنی کا آخری فوجی مقصد یہ تھا کہ جزیرے
بھی فتح کر لئے جائیں اسی کے ساتھ اینٹ درپ برسلز اور شارل روا پر جرمن فوجیں بڑھیں اور ۱۸، ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء
کو یہ تینوں شہر فتح ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں جرمن فوجیں موس ندی کے شمال مغرب میں شہر سیدان کے
سامنے ماژینو لائن کے اس حصے کو جو پچھلے سال دسمبر ۱۹۳۹ء میں تیار ہوا تھا اور کچھ بہت زیادہ مضبوط نہیں
ہے پار کیا اور اس طرف تیزی کے ساتھ پھیل پھیل کر بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ حصہ جو ان کے محاذ کی لکیر
میں ایک ذرا سا ابھار تھا قریب ۵۰ میل لمبا اور ۴۰ میل گہرا ہو گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جرمن قریب ۴۰ میل
فرانس کے اندر بڑھ گئے تھے۔ اس محاذ کا آپ اندازہ کرنا چاہیں تو موس ندی سے لاؤں، لافیر، سینٹ کوئنٹن
اور لاکتو سے ہوتی ہوئی شمال کی طرف جو لکیر نقشے میں جا رہی ہے اس کو دیکھ لیجئے۔ ۲۰ مئی تک بڑا سوال یہ
تھا کہ جرمن فوجیں اب کدھر کو جائیں گی۔ وہ دریائے اوآز اور دریائے آئن کی وادیوں سے بڑھ کر پیرس
کی طرف جا سکتی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ فرانس کے اندر آگے نہ بڑھیں بلکہ سینٹ کوئنٹن سے بندرگاہ
کیلے تک اپنا نیا محاذ بنائیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس محاذ پر جرمنی نے اپنی ساری پونجی لگا دی ہے۔ اس کی کامیابی کے
لئے ضروری ہے وہ اپنا مقصد جلد سے جلد حاصل کر لے لیکن مقابلہ سخت ہے اگرچہ اس کی لشکرکشی کا مقصد
اتحادیوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہے اور جس طرح کہ چاہئے وہ اس کا توڑ نہیں کر سکے ہیں

۲۰ مئی ۱۹۴۰ء تک جو بیانات شائع ہوئے ان سے یہ خیال ہوتا تھا کہ فرانسیسی محاذ پر ٹینکوں اور
ہوائی جہازوں کی ایسی ریل پیل ہے کہ جرمن خود اپنا مقصد بھول جائیں اور ان کی فوج کے بہت سے
حصے گھر جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ برطانیہ کے ہوائی جہاز اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن متفرق طور
پر خاصا نقصان پہنچا رہے ہیں اگر ان کی نظر میں کوئی خاص مقصد ہوتا اور وہ اسے حاصل کرنے پر اس
طرح مامور کر دئے جاتے جیسے کہ جرمن ہوائی جہاز تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ جرمن فوجوں کو روک نہ لیتے
لیکن ۲۰ مئی تک صورت یہ تھی کہ جرمن ہوائی جہاز ٹینکوں اور پیدل فوج کے ساتھ استعمال کئے جا رہے تھے

اور جرمن سپہ سالاروں کو بظاہر اس کی پرواہ تھی کہ خاص مقصد حاصل کرنے میں ان کا کتنا نقصان ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اتحادیوں کی ہوائی طاقت صرف دشمن کے پٹرول کے ذخیروں میں آگ لگانے اور جگہ جگہ پر سڑکوں پلوں اور ریل کی پٹریوں کو اڑانے میں کام میں لائی جا رہی تھی۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ۲۰ مئی تک جرمن لشکر کشی کا خاص مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا ممکن ہے جرمن سپہ سالار یہ چاہتے ہوں کہ فرانسیسیوں کے دل میں پیرس اور انگریزوں کے دل میں کیلے کو بچانے کا خیال ڈال دیں اور اس طرح اس اتحاد عمل کو ختم کر دیں جو دراصل جرمنی کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے لیکن یہ بہت موٹی سی بات ہے۔ جو اتحادیوں کے سپہ سالار ضرور سمجھ گئے ہوں گے اور اس چال کا وہ مناسب جواب ضرور دیں گے۔ ۲۰ مئی سنہ تک بلجیم میں انگریزی فوجیں پیچھے کی طرف ہٹ رہی تھیں اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی جگہ پر مورچہ بندی کر کے جرمن فوجوں کو روکا جائے گا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ مورچہ بندی ماژینولائن کے اس حصہ میں کی جائے گی جو بلجیم کی سرحد کے ساتھ ساتھ سمندر تک جاتا ہے یا اس کے آگے یا پیچھے ۲۲ مئی کو جو خبریں آئیں وہ بہت ہی دہشت انگیز تھیں فرانس کے وزیر اعظم کی زبانی معلوم ہوا کہ دریائے میوز کی وادی میں یعنی جہاں پر جرمن فوجیں پہلے اندر گھسی تھیں فرانسیسی فوج منتشر تھی اور وہ پسپا ہوتے وقت پلوں کو توڑنا بھول گئی۔ اس طرح جرمن فوجوں کے لئے آگے بڑھنا بہت آسان ہو گیا۔ اور وہ جنگ کے اس نئے طریقے کو پوری طرح برت سکیں جس پر ان کا بھروسا ہے۔ نیا طریقہ یہ ہے کہ پہلے نیچے نیچے ٹینک اور اوپر ہوائی جہاز آگے بڑھتے ہیں اور ان کے پیچھے مسلح موٹروں پر سپاہی بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ ان مقاموں پر قبضہ کر لیں جہاں سے دشمن ہٹا دئے گئے ہوں۔ جرمن فوج اس قسم کے حملے اندھا دھند کرتی رہی کہیں پر اسے روک لیا گیا کہیں وہ فرانسیسی محاذ کو توڑ کر نکل گئی۔ جہاں وہ نکل گئی وہاں وہ بے دھڑک آگے بڑھتی رہی اور اس کی پرواہ نہ کی کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ دریائے آئن پر فرانسیسیوں نے جرمن حملے کو روک لیا ہے لیکن اس کے شمال مغرب یعنی دریائے اوآز کی وادی میں وہ اسے نہیں روک سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن آمیاں اور شاید آبے ول تک بڑھ گئے ہیں۔ یہ حملہ آور فوج کے الگ حصے ہیں۔ انہیں

سمجھئے دریائے آئن سے شمالی سمندر تک جو وسیع علاقہ ہے اس میں دوڑا دیا گیا ہے کہ جو کچھ کر سکو کر
ان حملہ آوروں میں سے بعض موٹر سائکلوں پر سوار ہیں بعض مسلح لاریوں پر بعض ٹینکوں پر کہیں کہیں
یہ حملہ آور ہوائی جہاز سے ٹپکا دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تمام علاقہ میں ایک طوفان برپا ہے
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس پر جرمنی کا قبضہ ہے، اس لئے کہ جرمن فوجیں اپنے حملہ آور گروہوں سے
بہت پیچھے ہیں، لیکن اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ اسی وقت ہو سکے گا اور یہاں جرمن فوجوں کا مقابلہ
اسی وقت کیا جا سکے گا جب حملہ آوروں کے گروہ چن چن کر ختم کر دیے جائیں۔

جنگ کے اس انوکھے طریقے نے سپہ سالاروں کو پریشان کر دیا ہے، اس لئے کہ جنگ کا
کوئی محاذ جم کر مقابلہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اخباروں کے نامہ نگار بھی بہت پریشان ہیں، اس
لئے کہ وہ صحیح حالات معلوم نہیں کر سکتے لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ پچھلی جنگ
کی طرح اس مرتبہ فوجیں خندق کھود کر بیٹھ نہ پائیں گی۔ لڑائی ہر طرف ہر طرح کی ہوگی اور بے پناہ ہوگی

جس وقت سے کہ جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کیا۔ اٹلی کا انداز جو پہلے بھی دوستانہ نہیں تھا۔ بدتر
ہو گیا۔ بحر روم میں انگریزی بیڑا پہلے ہی بھیجدیا گیا تھا۔ اور مصر فلسطین اور شام میں انگریزی اور فرانسیسی
فوجیں اس تعداد میں اور اتنے سامان کے ساتھ موجود ہیں کہ اٹلی کا ادھر کوئی کارروائی کرنا بڑی حماقت
ہوگی۔ اٹلی کا مقام اور قدرتی ساخت دیکھتے ہوئے کوئی عقل مندی کی بات نہ ہوگی اگر وہ فرانس اور برطانیہ
کی ہوائی اور بحری طاقت کا مقابلہ کرے۔ اس لئے کہ اس پر ہر جگہ اور ہر طرف سے حملہ کیا جا سکتا
ہے۔ اور اگرچہ اسے اپنے ہوائی جہازوں پر بڑا ناز ہے ہمیں یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ
اپنے ساحل کو اور ساحل کے قریب کے شہروں کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ
اور فرانس کی اس وقت کی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر ان سے کچھ سودا کرنا چاہتا ہے یعنی جرمنی کا ساتھ
چھوڑنے کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اتحادی اٹلی والوں کی خصلت سے خوب
واقف ہیں اور وہ اس وقت ہرگز کوئی سودا نہ کریں گے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو خاص فکر اس کی ہے اگر بحر روم میں لڑائی چھڑ گئی تو ترک کیا کریں گے؟

ترکوں کا اتحادیوں سے معاہدہ ہے۔ لیکن اس معاہدہ کی ایک یہ شرط ہے کہ ترکوں سے روسیوں
کے خلاف لڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔ اٹلی اور روس کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ ہو تو ہو بظاہر
روس پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ اگر اٹلی بحر روم میں کسی فریق سے لڑائی چھیڑے تو روس
اٹلی کی مدد کو پہنچے گا۔ جرمنی جب تک اپنے مغربی محاذ پر مصروف ہے وہ بحر روم میں اٹلی کی سیاست
کو کچھ زیادہ سہارا نہیں دے سکتا۔ اس لئے اگر اس وقت اٹلی لڑے گا تو وہ تن تنہا لڑے گا اور اس
صورت میں ترک اپنی مصلحت سے لڑائی میں شریک بھی ہوئے تو ان کے لئے کوئی خاص خطرہ نہیں ہے

روس کے متعلق خبر آئی تھی کہ وہ جرمنی کی کامیابیوں سے چوکنا ہو گیا ہے اور کوئی تعجب نہ ہوگا
اگر وہ یورپ میں توازن قوت قائم رکھنے کے لئے اب جرمنی کا ساتھ چھوڑ دے لیکن ایسی خبریں پہلے
بھی آچکی ہیں۔ روس کے لئے بے شک یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ جرمنی جیسے بے چین اور اولوالعزم
ملک کا مغرب میں ناروے، ڈین مارک، ہالینڈ اور بلجیم پر اور مشرق میں آدھے پولینڈ پر قبضہ ہو جائے
شمال میں سویڈن اور جنوب میں بلقان کے ملکوں پر اس کی سیاست حاوی ہو جائے لیکن فی الحال
روس کے لئے جرمنی کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جرمنی نے اپنی تمام
کارروائیوں میں روس کو شریک کر رکھا ہے اور جرمنی کے سوا اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے
اگر وہ جرمنی کی مخالفت بھی کرنا چاہے تو زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ جرمنی کو جس خام مال کی
ضرورت ہے اسے پہنچانے میں بہانے کرے یا دیر لگائے لیکن یہ چال بھی آزادی کے ساتھ نہیں چل
جا سکتی۔ اس لئے کہ بہت سے بڑے کارخانوں اور پیٹرول کے بڑے کنوؤں پر جرمن انجینیر اور ماہر
مسلط ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ روسی حکومت کا کوئی ارادہ عمل میں آئے اور انھیں اس کی خبر نہ ہو۔
اتحادیوں کا پلہ بھاری کرنے کے لئے دراصل روس کی شرکت کچھ اتنی ضروری نہیں۔ جتنی کہ امریکہ
کی۔ امریکہ میں ایک بہت بڑی اور مضبوط پارٹی ہے جو اس پر تلی ہوئی ہے کہ امریکہ یورپ کے
سیاسی جھگڑوں سے علیحدہ رہے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے میں یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ امریکہ
یورپ کی لڑائیوں سے بچا رہتا ہے۔ اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ امریکہ کی تجارت کو بہت ترقی

ہوئی ہے اور تجارت بھی انہیں قوموں سے بڑھی ہے جو نقد قیمت دے سکتی ہیں، لیکن جب
سے جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کیا ہے، وہ امریکہ والوں کی نظروں میں بہت گر گیا ہے۔ اور کچھ
ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ وہ لوگ جو ہر حالت میں امریکہ کو یورپ کی سیاست سے علیحدہ نہیں
رکھنا چاہتے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت امریکہ کے علیحدہ رہنے سے صرف آزادی اور جمہوریت
کے اصولوں کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ امریکہ کی تجارت بھی نقصان اٹھا رہی ہے
امریکہ کو جنگ میں شریک کرنے کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں ہے لیکن سیاست اور تجارت
میں ذرا سی بات بہت بڑھ جایا کرتی ہے۔

انگلستان
بحر شمالی

بین الاقوامی سیاست

دُنیائے ادب

قومی زبان — ہندستانی، اردو یا ہندی

مندرجہ بالا عنوان سے اپریل سنہ ۴۰ء کے ماڈرن ریویو میں پروفیسر مرلی دھر ایم۔اے کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ سرخی دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک موقر رسالے میں اور بظاہر ایک موقر اہل قلم نے اس سلسلے میں یقیناً کچھ مفید اور کارآمد خیالات کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ لیکن مضمون پڑھ کر بے حد مایوسی ہوئی۔ مضمون نگار نے سب سے پہلے تو رسم الخط کا مسئلہ چھیڑا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک سارے ملک میں ایک رسم الخط رائج نہ ہو جائے، کوئی قومی زبان بنانے یا پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ زبان اور رسم الخط میں کچھ ایسا مقناطیسی تعلق ہے کہ ایک مخصوص رسم الخط کو قائم رکھ کر صرف اسی زبان کو استعمال کیا جا سکتا ہے جو زمانہ نے اس کے ساتھ وابستہ کر دی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہندوستان میں آج کل جتنی زبانیں رائج ہیں ان میں اردو سے زیادہ لچک کسی اور میں نہیں۔ نئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت اردو میں کتنی زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس کی مختصر سی زندگی کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اب سے سو برس پہلے کی رجب علی بیگ کی شاعرانہ زبان اس زمانہ کے لئے موزوں تھی۔ سرسید کے زمانہ کو ایک سیدھی سادی زبان کی ضرورت تھی، جو عام فہم بھی ہو اور جس میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ ساتھ بدگمان اور گم کردہ راہ مسلمانوں کو قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ جو آسان بھی ہو اور مدلل بھی، ادبی بھی اور کاروباری بھی۔ اردو ہی میں یہ صلاحیت تھی کہ زمانہ کی پسند اور ضرورت کو دیکھ کر اس نے وہ بوجھل اور پر تکلف لباس اتار پھینکا اور اس کی جگہ بالکل سادہ اور بے تکلف لباس زیب تن کر لیا اور اس کے باوجود بھی اس کی جامہ زیبی ملاحظہ ہو کہ اس نئے لباس میں بھی اس کی پھبن کم ہونے کی جگہ زیادہ ہو گئی۔ جس نے دیکھا وہ فریفتہ ہوا، جس نے سنا وجد کیا۔ اب ایسی زبان کے متعلق یہ کہنا کہ رسم الخط کی پابندی کی وجہ سے اس میں زمانہ کی ضرورت کے

مطابق تبدیلی یا ترقی کی گنجائش نہیں، محض نادانی اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اردو شاعری اور ادب سے مضمون نگار کو کتنا مس اور تعلق ہے۔ اس کا اندازہ خود ان کی کہی ہوئی باتوں کو سن کر کیجئے۔ مضمون کے درمیانی حصہ میں لکھا ہے:

"ادبی دنیا میں اردو کا کیا کارنامہ ہے اور تعلیمی دنیا میں اس نے کیا اضافہ کیا ہے؟ اس میں شاعر اتنے ہیں جتنے کہکشاں میں تارے۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی چمک نہیں۔ اور جس میں تھوڑی بہت چمک ہے وہ ہم تک اس لئے نہیں پہنچتی کہ ایک مشکل زبان ہمارے اور ان کے درمیان حائل ہے اس نے تعلیم کو ترقی دینے کی جگہ اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ ..... غزلوں اور دوسری بعض فضول اصناف سخن کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ اس کی عشقیہ شاعری میں کچھ شیرینی ہے، لیکن یہ ہمارے سامنے کوئی بلند چیز پیش نہیں کرتی۔ اس کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں، وہ امید کا کوئی پیغام ہم تک نہیں پہنچاتی۔ یہ ہمارے دلوں میں ملک کی محبت اور قربانی کا جذبہ نہیں پیدا کرتی فطرت یا زندگی سے اسے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ اس میں کوئی رزمیہ چیز نہیں، اس نے اب تک ڈرامہ نہیں پیدا کیا۔

"فطرتاً اردو میں ترقی کرنے یا مفید چیزیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لئے اپنے خیالات ہندوستان کی سرزمین سے نہیں لیتی۔"

ہمیں ان میں سے کسی بات پر ذرا بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر یہ خیالات کسی ایسے پرچے میں نکلتے جو ادبی ایمانداری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہم ان سب باتوں کو سن کر خاموش ہو جاتے اگر یہ خیالات کسی ایسے شخص نے پیش کئے ہوتے جسے آسانی سے بے بہرہ کہا جا سکتا۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ادبی ذمہ داری محسوس کرنے والے ایسی باتوں پر قلم ہی کیوں اٹھاتے ہیں جن کا انہیں علم نہیں۔ اردو میں حیات اور امید کا کوئی پیغام ہے یا نہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اقبال کا ہی مطالعہ کافی ہے۔ وہ ہماری روح کو کیا ابدی پیغام دیتا ہے، وہ ہماری زندگی کو کس طرح بلندی کی طرف مائل کرتا ہے، وہ ہمیں ملک اور قوم کی

محبوب کا سبق کس طرح پڑھاتا ہے۔ اس کی شاعری نے زندگی کو کیا سمجھی ہے اور مردہ دلوں کو کس طرح زندگی سے قریب لاتی ہے اس کا اندازہ صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو ان چیزوں کو صرف نکتہ چینی کے خیال سے نہیں بلکہ ایک صحیح طالب علم کی طرح پڑھے۔ ہمارے موجودہ شاعروں اور نثاروں میں ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں ایسے ہیں جن کی شاعری کا سرچشمہ حیات انسانی کی کشمکش اور ہندوستانی زندگی کی رومانی، سیاسی، سماجی کیفیتیں اور حالتیں ہیں۔ ضرورت تو صرف جستجو کرنے والی نظر کی ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر جوش ملیح آبادی، احسان دانش حفیظ جالندھری، ساغر، روش، اندر جیت، قیس، حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ کے کلام اور نثر لکھنے والوں میں منشی پریم چند، سدرشن، ڈاکٹر اعظم، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، کرشن چندر ایم اے، اختر انصاری، اختر رائے پوری کے افسانے اور ناول اردو کے اتھاہ خزانے میں سے صرف تھوڑے سے ایسے نمونے ہیں جن میں قدم قدم زندگی اور اسکی تمام کیفیات آئینہ کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ نہ دیکھ سکنا چیزوں کے نہ ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

اور آگے چل کر مضمون نگار نے لکھا ہے: "کچھ عرصہ سے اردو نظم و نثر پر بیرونی اثرات اس قدر غالب آگئے ہیں کہ ابھی فارسی اور تھوڑی بہت عربی جانے بغیر ان کا سمجھنا غیر ممکن ہے۔"

اس قسم کی کوئی بات کہنے کا مطلب بھی بیگانگی کے سوا کچھ نہیں اس لئے کہ ہمارے موجودہ نثار عام طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائیں۔

مضمون میں اور آگے چلکر مضمون نگار نے ہندی کو الفاظ کا ایک بے معنی اور بے اثر ذخیرہ کہکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہو سکتی ہے نہ ہندی اور نہ ہندوستانی سوال یہ ہے کہ پھر کیا کوئی آسمانی زبان آکر اس جھگڑے کو چکائیگی

کچھ ادبی خبریں: ہندی۔ حال ہی میں "موجودہ ہندی ادب" کے عنوان سے انگریزی میں ڈاکٹر اندر ناتھ مدن کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے موجودہ ہندی ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے

سندھی: سندھ گورنمنٹ نے حال ہی میں ایک تعلیمی بورڈ بنایا ہے جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ سندھی زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کروائے۔ اس کے علاوہ ادب کی ایک تاریخ اور بچوں کے لئے درسی کتابیں تیار کرنے کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

(و۔ع)

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

آزادی کی نظمیں، مرتبہ سبط حسن صاحب، حلقۂ ادب، مال روڈ، لکھنؤ۔ قیمت عہ

ہندوستان کے موجودہ رنگ کا یہ تقاضا تھا کہ اس قسم کی نظمیں اور ادب یکجا ہو جائے جو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ یہ تقاضا ضرورت کی حد تک پہونچ گیا تھا چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایما پر نئے ادب والوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور جلد از جلد ختم بھی کر دیا۔ شروع میں رفیع احمد صاحب قدوائی کا مختصر تعارف ہے جس میں موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی ضرورتوں کے محسوس کرنے کا نام ہے۔ انھی ضرورتوں کا احساس جب سے شدت پکڑ گیا ہے شعر و ادب میں اس کا اظہار ہوتے لگا ہے۔

اردو شاعری میں یہ احساس غدر کے زمانے سے شروع ہوا اور مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا۔ کہیں نالے رہے کہیں فریاد کہیں محض شکوہ و شکایت، کہیں، محض گداگری۔ موجودہ دور کے آزادی کے تخیل میں جرأت رندانہ بھی شامل ہے۔ کتاب میں ہر دور کے نمونے تاریخی تسلسل کیساتھ دئے ہیں کتاب اس لحاظ سے بھی خوب ہے کہ ادب و زندگی کے رشتہ کو واضح کرتی ہے۔

غدر کے زمانہ میں جو محکومی، مظلومی اور پابندی کا احساس ہو چلا تھا وہ تقریباً اس دور کے ہر مشہور شاعر کے کلام میں نکالا جا سکتا ہے۔ غالب، ظفر، مومن، (باستثنائے ذوق) ہر ایک کے کلام میں کچھ نہ کچھ اس کا رنگ موجود ہے۔ غالب کا ایک قطعہ مرتب صاحب نے بھی دیا ہے۔ جس میں ایک نجی خط میں انگریزوں کے خلاف شکوہ و شکایت ہے۔ مومن میں مذہبیت زیادہ تھی اس لئے وہ اکثر دیشتر جہاد کرنے پر نظر آتے ہیں

پلا مجکو ساقی شراب طہور کہ اعضا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں — دمِ تیغ سے قتل کا فر کروں
پلے تشنہ کامی سبو در سبو — پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

اور یہ گردن کش کون تھے ان کا حال فارسی کے قصیدہ میں سن لیجئے۔

ایں عیسویاں بلب رسانند — جانِ من و جانِ آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی — فارغ ز فغانِ آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست — اے فتنہ نشانِ آفرینش

ظفر کے یہاں یہی چیز عبرت و نالہ کے مضامین میں بندھی ہے ان میں زیادہ صاف کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے — شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے
جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں — کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجر یاں تھے

کتاب چونکہ بہت عجلت میں ترتیب دی گئی ہے جیسا کہ مرتب خود اعتراف کرتے ہیں اس لئے زیادہ توجہ نہ دی جا سکی مگر پھر بھی کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے خوب ہے۔ مختصر اور جامع ورنہ ایسے تو یہ مضمون ہی ایسا ہے کہ ریسرچ کے ذریعہ اس کو مکمل کیا جائے۔

محامد الخلفاء۔ مرتبہ حافظ اخلاق احمد صدیقی و سجاد حسین صدیقی اکبرآبادی چھوٹی تقطیع تقریباً ۱۸۴ صفحات کتابت و طباعت عمدہ۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ قیمت ۸/ مجلد ۱۲/ - اس میں نظماً و نثراً خلفاء اربعہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ زبان اچھی ہے۔ اور عوام کے لئے دلچسپ ہے۔ روایات کے انتخابات بھی خوب ہیں آخر میں بعض علما مثلاً مولوی احمد سعید صاحب دہلوی اور پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی وغیرہ کی تقریظیں درج کی گئی ہیں۔

رسالہ جات

سہیل (گیا) خاص نمبر۔ بڑے اہتمام اور آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ اچھے اچھے مضامین، افسانے اور غزلیں جمع کی ہیں۔ جس میں خاص کر طلسم ہوش ربا، فردوسی و اسدی مسلمانوں کے زمانہ

ہیں ہندوستان کا نظام تعلیم اچھے مقالے ہیں۔ ایک خاص نقص اشتہارات کا ہے اور یہ صرف سہیل ہی میں نہیں بلکہ اردو کے اکثر بلندپایہ رسالوں اور اخباروں میں پایا جاتا ہے دہ فحش اشتہارات ہیں۔ نہیں معلوم اردو صحافت اس سے کب پاک ہو سکے گی

نیرنگ خیال (سالنامہ) پرانی آب و تاب سے نکلا ہے لیکن اکثر مضامین اس کے لئے پہلے کی طرح خاص کر نہیں لکھے گئے ہیں مگر انتخاب اچھا ہے۔ تصاویر دلچسپ ہیں۔ اشتہاروں میں وہی بدمذاقی یہاں بھی ہے جو سہیل میں ہے۔ قیمت عہ

نظام ادب:۔ طلبائے نظام کالج حیدرآباد دکن کا بہت شائستہ پرچہ ہے۔ بہت اچھے اچھے مضامین ہیں مثلاً دلی کی بیگمات، ڈاک کے ٹکٹوں کا ذخیرہ، ہندوستانی تہذیب پر اسلامی حکومت کا اثر، ہندوستان کی صنعتی ترقی کے ذرائع۔ جامعات و مسئلہ بے روزگاری، قنطائیت مسئلہ ناخواندگی اور ہندوستان وغیرہ خصوصاً بہت مفید اور بہت خوب مضامین ہیں، کتابت و طباعت بہت اچھی ہے قیمت عہ فی پرچہ ششماہی نکلتا ہے

میل ملاپ:۔ بانکی پور پٹنہ کی تھیاسوفیکل سوسائٹی نے ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ پیدا کرنے کے خیال سے یہ رسالہ نومبر ۱۹۳۱ء سے نکالنا شروع کیا ہے رسالہ کا نصف حصہ اردو میں ہوتا ہے نصف ہندی میں۔ خیال اور جذبہ دونوں نہایت خوب ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ بالکل بے تعصب ہے مضامین ایسے رکھے جاتے ہیں جو میل ملاپ سے خیال کو ابھاریں۔ اگر زبان بھی جو دونوں حصوں میں استعمال ہوتی ہے ایک ہوتی تو خوب ہوتا۔ ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے قیمت سالانہ عاہر

ہمارا مستقبل:۔ مسلم لیگ نقطہ نظر کا ماہوار رسالہ ہے۔ لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے مضامین بہت اچھے ہیں۔ خدا کرے جاری رہے۔ قیمت سالانہ ے ر

جدید اردو:۔ کلکتہ سے نکلتا ہے۔ ماہواری رسالہ ہے۔ مشرقی ہندوستان سے جتنے رسالے نکلتے ہیں ان میں یہ خوب ہے۔ خدا اسے ترقی دے۔ قیمت سالانہ عاہر

تعلیم بالغان اور خطبہ جمعہ

(سید مہدی حسن صاحب)

آج کل تعلیم بالغان کا بہت زور ہے اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمدردان قوم کو اپنی قوم کی تعلیم کا خیال آیا اور خیال کے ساتھ خوش قسمتی سے اس پر عمل بھی شروع ہوا۔ ہندوستان میں جہاں تعلیم اس قدر کم ہے اس قسم کی اصلاح نہایت خوش آئند مستقبل کی امید و توقع دلاتی ہے۔ خدا کرے یہ ذوق شوق اسی زور و شور کے ساتھ آئندہ بھی باقی رہے۔

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ نادار ہونے کی وجہ سے ان کو بہت کم ایسے مواقع تھے اور ہیں جن سے وہ اپنے کو تعلیم یافتہ بنا سکیں۔ گذشتہ میں تو ہر نئی تعلیم کی طرف مسلمانوں میں ایسی بےحسی رہی کہ دوسری قومیں ان سے آگے بڑھ گئیں اور ان کے آنکھوں پر سے پردے ہی نہیں اُٹھے۔ اب جب کہ ان میں کچھ کچھ بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں موقع ہے کہ ان کی اس بیداری یا نیم بیداری سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو اس راستے پر گامزن کیا جائے جو ان کے لئے مفید ہے۔

تعلیم بالغان کا مقصد ایک تو ناخواندہ کو خواندہ بنانا ہے دوسرے خواندہ کو تعلیم یافتہ۔ تعلیم کے ضمن میں مختلف قسم کی معلومات آتی ہیں اور ساتھ ہی بہتر شائستگی اور بہتر اخلاق کی ہدایات اور اسباق۔ مسلمانوں کے عوام کو اخلاق و شائستگی میں بھی درس دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ان کے معلومات میں اضافہ کرانا بھی ہر ہمدرد مسلمان کا فرض ہو سکتا ہے۔

جہاں تک خطبہ جمعہ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر موقعہ اور جگہ عوام مسلمانوں کی تعلیم و تلقین کے لئے نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ان کو خطبہ میں ایک لمبا چوڑا وعظ سنا دیا جائے بلکہ یہ خطبۂ تعلیم اتنا ہی مختصر ہو جتنا کہ خطبہ عموماً ہوا کرتا ہے تاکہ بہت سے کاروبا

مسلمانوں کا کام حرج نہ ہو۔

رہا یہ امر کہ کیا باتیں بیان کی جائیں اور سمجھائی جائیں۔ میری رائے میں وہ سب کچھ ہوں لیکن سیاسی نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو کسی پارٹی کا پروپگنڈا یا کسی پارٹی کی طرف سے نہ ہوں کیونکہ اس طرح سے مسجد میں بدامنی پھیل جائے گی اور اس صورت سے تعلیم کا مقصد ہرگز ہرگز حل نہیں ہوگا اول کوشش تو یہی کی جائے کہ مسلمانوں کو بہتر اخلاق اور بہتر شائستگی کی تعلیم دی جائے۔ ان کی بری باتوں اور بری عادتوں کی طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ انھیں چھوڑیں مثلاً جوا کھیلنا، فحش گالیاں بکنا جو عوام جاہل مسلمانوں میں عام ہے وغیرہ وغیرہ اور ساتھ ہی انھیں اپنی خودی کی پرورش اور جوش وشجاعت کی مزید تلقین، اقتصادی پختگی کی تعلیم اور ہدایات، قوم وجماعت کی خاطر جان ومال سے امداد دینے کا وطیرہ، ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ اب پل بنا، چاہ بنا، مسجد وتالاب بنا، پر اپنا روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو اب گورنمنٹ کا فرض ہے بلکہ اپنی قوم کے لئے تعلیم گاہیں مسافر خانے، تبلیغی انجمنیں وغیرہ بنانے کا کام ثواب کا کام اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے کا کام ہو۔

ایک بڑی دشواری جو ابھی تک اس قسم کی تعلیم دینے میں صدیوں سے اب تک حارج رہی ہے وہ خطبے کا عربی زبان میں ہونا ہے۔ پہلے تو اسی نقص کو دور کرنا چاہئے۔ درحقیقت یہ ایک نقص نہیں ہے اس صورت سے کہ اس سے کم از کم مسلمانوں میں اپنی چیزوں سے جذبہ عقیدت تو قائم رہتا ہے اور وہ اگر آگے نہیں بڑھتے تو پیچھے بھی نہیں ہٹتے۔ لیکن یہ نقص ان معنوں میں ضرور ہے کہ اس سے مسلمان آگے نہیں بڑھ پاتے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے عربی زبان متبرک یقینی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جمعہ کے خطبے بھی اسی زبان میں ہوں۔ جمعہ کے خطبے دراصل جاہل یا نیم تعلیم یافتہ یا کم سمجھ مسلمانوں کو تعلیم دینے اور ان کو اچھی بری بات بتلانے کے لئے ہوا کرتے تھے تاکہ وہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی باتوں یعنی صحیح راستوں پر چل کر دنیا کی قوموں میں ممتاز ہو سکیں لیکن ہندوستان میں یہی خطبے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے کسی فائدے کے نہیں رہے۔ ہم محض رٹا خطبوں کو سن لیتے ہیں خواہ وہ جمعہ

کے ہوں یا عیدین کے۔ اور دل کو یہ تسلی دے کر اُٹھتے ہیں کہ ہم نے خطبہ سُن لیا ثواب مل گیا کافی ہے۔ حالانکہ یہ خطبے تو عرب میں اور عربی زبان میں دنیاوی فائدوں اور دنیا میں صحیح راستہ صراط مستقیم کی غرض و غایت سے سنائے جاتے تھے۔ نیز روحانی فائدہ بھی اگر مدنظر ہو تو اس صورت میں بھی نہیں ان کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ کیا معلوم ہو گا کہ ہم کو کیا روحانی فائدہ ہوا۔ بغیر سمجھے تو محض ایک دل کو دھوکا دینا ہوتا ہے کہ ہم سمجھ گئے اور ہم کو فائدہ اور ثواب حاصل ہو گیا۔ غرضکہ بڑی سخت اور اشد ترین ضرورت ہے کہ اول تو ہم اپنے خطبوں کو جلد از جلد اُردو میں منتقل کر دیں تاکہ ہماری قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور مسلمان تو بہت جلد دوسری قوموں کے مقابلے میں ترقی کر سکتے ہیں۔ اگر دوسری قومیں اپنی تعلیم کی وجہ سے ہم سے پچیس یا تیس برس آگے بڑھ گئی ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم تو بہت جلد دوسروں کے برابر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جلدی سے کام ختم کر دینے اور دوسروں کے دوش بدوش آجانے کا مفید ترین طریقہ یہی ہے کہ اپنے جمعے کے خطبوں کو بغیر اور کچھ وقت کھوئے ہوئے اپنی زبان میں کرنا شروع کر دیں اور ان میں وہ باتیں بیان کریں جن سے مسلمانوں کا فائدہ دینی اور دنیوی دونوں ہوں۔ ساتھ ہی ان کی تعلیم بھی بڑھے اور ہر قسم کا شعور بھی، سیاسی، ملّی، اقتصادی، اخلاقی وغیرہ جیسا میں نے اوپر ذکر کیا۔

مجھے ڈر ہے کہ شاید اس قسم کی اصلاح میں علماء اور وہ خطیب حضرات اعتراض کریں جو مسجدوں میں خطبے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اول الذکر تو اس وجہ سے کریں گے کہ اُن کی عربی دانی بیکار جائے گی اور محض آیتیں پڑھ کر جو عوام الناس پر رعب جما لیا کرتے تھے اور اپنی قدر و منزلت ان کی نگاہوں میں بڑھا لیا کرتے تھے وہ بند ہو جائے گی۔ وقار کو جاتے ہوئے دیکھنا آسان کام نہیں ہوا کرتا۔ وقار میں زندگی ہے۔ زندگی بغیر وقار لطف نہیں دیتی خواہ وہ وقار ذاتی اغراض کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو یا ذاتی مالی فائدوں کے خیال سے۔ میں ان حضرات کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ یہاں قوم کی بہتری، بہبودی، فنا و بقا کا سوال ہے۔ اگر اُن کا ذاتی وقار قوم کی خاطر جاتا رہے تو اُنھیں افسوس نہ کرنا چاہیئے بلکہ خوش ہونا چاہیئے کہ اُنھوں

نے قوم کی خاطر ایثار کیا۔ نیز ان کی عربی دانی کا وقار محض جمعہ کا خطبہ نہ پڑھنے سے چلا نہیں جائے گا۔ وہ اور دوسری صورتوں سے باقی رہے گا جیسا کہ عموماً رہتا ہے۔ موخرالذکر یعنی ملازم امام بھی اس اصلاحی اسکیم پر اعتراض کریں گے اس لئے کہ ان کی تنخواہ اور روزی کا سوال بیچ میں آجاتا ہے۔ اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ فی الحال مسجدوں میں وہ امام تو قائم رکھے جائیں جو پہلے سے ملازم ہیں اور روز کی نمازوں کی امامت کرتے ہیں لیکن جمعہ کا خطبہ وہ نہ پڑھیں۔

جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے کون سے اور کس قسم کے حضرات رکھے جائیں اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اول الذکر قسم کے علماء یعنی جو عربی جانتے ہیں وہ رکھے جائیں لیکن شرط یہی ہو کہ وہ اردو میں اپنے خطبات دیں ساتھ ہی ان میں یہ بھی صلاحیت ہو کہ خطابت کا مادہ ہو اور تعلیم دے سکنے کے قابل ہوں ہر قسم کے مسائل پر ان کی نگاہ ہو اور ہر قسم کے معلومات کا انھیں علم۔

مجھے امید ہے کہ اگر مسلمانوں نے جلد از جلد میری اس تجویز پر غور کر کے عمل کرنا شروع کر دیا تو چند ہی سال میں آپ دیکھیں گے کہ آپ کے مسلمان عوام اور مسلمان بچے بھی عہد حاضر و تہذیب حاضر کی تمام معلومات سے باخبر، دین و دنیا کی باتوں سے آگاہ، خود اعتمادی کے وصف سے مزین تمام اقوام عالم کے ساتھ دوش بدوش بلکہ سب میں مزین اور ممتاز نظر آئیں گے محض عمل کی دیر ہے۔ کاش میری یہ تجویز مسلمانوں کے دلوں کو لگے۔

شذرات

حسب وعدہ ہم اس شمارے سے مسلمانوں کا تہذیب و تمدن کیا ہے کے مباحثے کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس میں ہر نقطۂ خیال رکھنے والے مسلمانوں کو شرکت کی دعوت ہے وہ اپنے دلائل سے پبلک کو روشناس ہونے کا موقعہ دیں۔ ہم بہت خوش ہوں گے اگر ہندوستانی مسلمانوں کی سب جماعتیں اپنے اپنے خیالات کا اس موضوع پر اظہار کریں گی۔ اس شمارہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔ ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے نیز انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون جامعہ کی ایک گذشتہ اشاعت میں نکل چکا ہے لیکن مضمون نگار صاحب کی اجازت سے ہم اُسے بجنسہ دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔

ہم نے ایک دوسرے عنوان کا بھی اعلان کیا تھا یعنی اپنی اصلاح کے عنوان سے ایسی تعمیری اسکیموں کا سوچنا جو مسلمانوں کے لئے مفید ہوں اس سلسلے میں ہمیں پہلا مضمون مہدی حسن صاحب کا موصول ہوا ہے۔ موصوف نے خطبۂ جمعہ کے ذریعے بانوں کی ناواقفیت دور کرنے کا حل بتایا ہے خیال بہت اچھا ہے اس پر واقعی مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے خطبہ اردو میں ہونے کی مہدی صاحب نے مضمون کے آخر میں تلقین کی ہے ساتھ ہی یہ خوف بھی ظاہر کیا ہے مبادا علما، حضرات اپنے وقار غائب ہو جانے کے خیال سے اس تلقین کی مخالفت کریں۔ ہمارے خیال میں اس معاملے میں وقار کا سوال بالکل درمیان میں نہیں آتا۔ اصل میں خطبۂ جمعہ کا مسئلہ عرصہ سے مختلف فیہ ہے۔ علمائے اہل حدیث اور اکثر روشن خیال علما اردو خطبے کے حامی ہیں لیکن علماً ایک طبقہ عربی خطبہ پر مصر ہے۔

ہمارے خیال میں ان بزرگوں کو بھی اس مسئلہ پر دوبارہ غور و تفتیش کی نظر ڈالنا چاہیے کہ وقت کا اقتضا یہی ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز راں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ، جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس اسلامی
(وزن ۵۵۸،۹ ٹن)
بھی شامل ہے

گذشتہ موسم حج میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے
مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں، نیز پورٹ لوئی اور
ماریشس تک مسافر اور بار برداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں۔ تفصیلات کیلئے
خط و کتابت کیجئے۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد

(۱) سنہ ۱۹۲۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے زیر ادارت ملک امیر عالم خاں اعوان ہزاروی (جامعی) شایع ہوتا ہے۔

(۲) آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔

(۳) صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔

(۴) سرحد میں اصطلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا ہمیشہ ارگن رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد، افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں کے لیے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

چندہ رعایتی سالانہ للعہ

" اشتہاری عہ

المشتہر

منیجر "ترجمان سرحد" پشاور

گذارشِ احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار شدہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۳۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں لکھیں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوش بو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضایع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوتی ہو

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہمارے اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

المشتہر منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطرخا بلڈنگ لکھنؤ

چند دینی کتابیں

علم حدیث مولانا اسلم جیراج پوری کی ایک نہایت پرمغز موثر اور مفید کتاب جس میں علم حدیث پر نہایت دلنشیں انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ روایت حدیث، کتابت حدیث، وضع حدیث، تنقید حدیث، اصول حدیث، دلائل حدیث اور رتبہ حدیث کے عنوان کے ماتحت حدیث کی صحیح اور حقیقی حیثیت پر نہایت کامیابی کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اس سے اچھی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ قیمت ۱۲/

جنت کا گہنا ایک نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم نظم ہے جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ نظم کسی خاص فرقہ یا مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہر شریف گھرانے کا فرض ہے کہ وہ اس نصیحت آموز ٹریکٹ کو منگا کر اپنی بچیوں کو پڑھائے اور حکمت و دانائی کی باتوں سے ان کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔ ۱۰/ کے ٹکٹ بھیج کر دو کاپیاں طلب کیجئے۔

حضرت محمد رسول اللہ آنحضرت صلعم نے دنیا سے غلامی کی رسم دور کرنے کے لئے کتنا بڑا جہاد کیا۔ یہ ساری حقیقت اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو گی۔ غلامی کے انسداد کے لئے اہل مغرب نے پیغمبر اسلام کی تقلید میں جو کام کیا ہے اس کی داستان بھی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۳/

ل احسن مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ان کی فرقہ بندی ہے۔ قرآن مبین قرآن مجید کی آیات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اصولی طور پر فرقہ بندی کا مخالف ہے۔ ہمیں صرف مسلم کہلانا چاہئے۔ باقی تمام نام شیعہ، سنی، اہل قرآن، اہل حدیث وغیرہ بدعتیں ہیں جن کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو نقصان عظیم پہنچ رہا ہے۔

کا پتہ **مینجر دفتر امت مسلمہ امرتسر**

مطبوعاتِ امیریہ

دیوانِ ثاقب:- یہ دیوان مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی غزلیں، قطعات تاریخ اور دیگر نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مقدمات اور تبصرے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر خود فن شاعری کے متعلق کافی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ہم نے مخصوص اہتمام سے اسے طبع کرایا ہے۔ کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا ہے۔ طباعت نفیس ہے۔ تصاویر بھی ہیں۔ حجم ۳۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ے رعلاوہ محصول ڈاک:

انیس اخلاق:- میر انیس مرحوم کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ جس میں ان کی تقریباً ۳۰۰ رباعیاں مختصر مقدمہ کے ساتھ ہیں۔ یہ رباعیاں سید محمد عباس رضوی ایم اے رکن امیریہ دار التصنیف و تالیفات نے مرتب کی ہیں اور نہایت عمدہ کاغذ پر پاکٹ سائز پر طبع کرائی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر علاوہ محصولڈاک

گیس کا دفاع:- آج کل یورپ کی فضا کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایک عالمگیری جنگ کا شروع ہو جانا یقینی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جنگ کے شعلوں سے ہندوستان محفوظ رہے گا۔ یہاں حکومت نے رعایا کے لئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا ہے۔ اہل ملک کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ لوگ اس کی مدد سے خطرہ کے وقت اپنی اور دوسروں کی تھوڑی بہت حفاظت کر سکیں۔ قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک

مفتاح البیان:- حصہ اول و دوم مولفہ عمدۃ الواعظین زبدۃ الذاکرین ابو البیان مولانا سید کبر مہدی صاحب حلیم بروبی مولف جواہر البیان وغیرہ

فن ذاکری اور روضہ خوانی پر عجیب کتاب

قیمت ہر حصہ عہ

دفتر امیریہ دار التصنیف و تالیفات محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنو

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقے میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا ہے اسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانب داری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب شیخ عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد (دکن)

سے دریافت کیجئے قیمت سالانہ صر فی پرچہ ۸ر

ادب لطیف کا
افسانہ نمبر

اردو رسائل میں یہ فخر صرف ادب لطیف ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اردو کے افسانوی معیار کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اب لٹریچر کا یہ شعبہ یورپ کے افسانوی لٹریچر سے بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے۔ اب تک ادب لطیف کے جتنے افسانہ نمبر شائع ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔ مگر یہ افسانہ نمبر جو مئی سنہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے اردو کیا مغربی زبانوں کے افسانہ نمبروں کے لئے بھی ایک چیلنج ہوگا۔

انتہائی دلچسپ افسانے   معلومات سے لبریز

وجد آفریں نظمیں

ہر مقالے کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی معلومات میں ایک معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے ہر افسانے کے مطالعہ کے بعد آپ کہیں گے کہ آج تک ایسا افسانہ نظروں سے نہیں گذرا۔ منظوم افسانہ دیکھ کر آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ "اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ بہترین چیز ہے" یہ عدیم النظیر نمبر مئی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔

سالنامہ کے علاوہ مستقل خریداروں کو یہ نمبر مفت دیا جائے گا

قیمت ۱۲؍ سالانہ چندہ للعہ علاوہ محصولڈاک

مکتبہ اردو لاہور

نوائے وقت

طلباء سے خاص رعایت

* "نوائے وقت" ہر پندرہ روز کے بعد لاہور سے خواجہ شبیر حسن اور حمید نظامی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس اخبار کا اجرا اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے عمل میں لایا گیا ہے۔ اس اخبار کا مقصد تجارت نہیں بلکہ پنجاب میں اردو کی تبلیغ و اشاعت ہے۔

اردو زبان کے بہترین ادبا مثلاً خواجہ غلام السیدین، میاں بشیر احمد، علامہ کیفی، پروفیسر حمید احمد خاں، سندباد جہازی، ڈاکٹر باقر، پروفیسر فیض، مسٹر کرشن چندر، حضرت حفیظ ہوشیارپوری، جناب میراجی، حضرت اختر شیرانی اس کے مستقل مضمون نگاروں میں شامل ہیں۔ تازہ ترین پرچہ میں خواجہ غلام السیدین، میاں بشیر احمد، ڈاکٹر باقر، پروفیسر فیض، حضرت میراجی، راجہ فاروق علی خاں کے مضامین نظم و نثر ملاحظہ فرمائیے

چندہ سالانہ پانچ روپئے

نمونہ کے لئے ۱ر کے ٹکٹ بھیجئے مفت نہیں بھیجا جائے گا

طلباء سے چندہ عمر بذریعہ منی آرڈر

(نوٹ، صرف پانچسو طلباء کو یہ رعایت دی جائے گی۔ بعد میں طلباء سے پورا چندہ وصول کیا جائے گا۔

مینیجر اخبار نوائے وقت لاہور

اقبال اکیڈمی لاہور کا پہلا شاہکار

یادِ اقبال حصہ اول

ہندوستان بھر کے معتدد شعراء نے ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی رحلت پر جس گہرے تاثر اور احساس کے ساتھ اظہار عقیدت مندی کیا ہے اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان تو درکنار دنیا بھر کی کسی شخصیت کے متعلق اتنی کثرت سے مرثیے نہیں لکھے گئے۔ عوام تو عوام خاص بھی اس کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ اگر ان نظموں کو یکجا کیا جائے تو اس کی کتنی مجلدات ہو سکتی ہیں۔

اقبال اکیڈمی لاہور جس کا مقصد اقبالؒ کی حیات افروز پیغام کی نشر و اشاعت ہے اس کے کارپردازوں نے سب سے پہلے ماہ نامہ

پیغام حق

جاری کیا جو ایک سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اب مہینوں کی تلاش و جستجو اور عرق ریزی کے بعد یہ مجموعہ تیار کیا ہے جس کا پہلا حصہ اقبالی ذوق رکھنے والے اصحاب کے دلوں کو گرمانے کے لئے شائع ہو چکا ہے۔

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

مذہب وسیاست کا آئینہ

زمزم

اسلام کا داعی، ملت اسلامیہ کا خادم، آزادی کا علم(بردار)
اور پایہ صحافت کا اعلیٰ نمونہ ۔

ہر جماعت کے اچھے کاموں کی تحسین اور غلط روی پر بے(باک)
بن کر نکتہ چینی کرتا ہے ۔

عربی اخبارات کی اہم خبریں ہندوستان میں سب سے پہلے شائع کرتا ہے
گفتار کی تلخی، ذاتی مناقشات اور انفرادی جھگڑوں سے پرہیز کرتا ہے
ہر مسئلہ پر پرمغز مقالات، پختہ خیالات اور لطیف نکات پیش کرتا ہے۔
اس کا مسلسل مطالعہ آپ کو دین کا پرجوش حامی، اسلام کا سپاہی
سیاست کا مبصر اور فہم و فراست کا مالک بنا دے گا۔

ہفتہ میں دو بار ٹھیک وقت پر شائع ہوتا ہے

شرح چندہ اخبار

سالانہ [illegible]
ششماہی [illegible]
سہ ماہی [illegible]

برما کے لئے

سالانہ [illegible]
ششماہی [illegible]

آج ہی پتہ ذیل پر ایک کارڈ لکھ کر نمونہ مفت طلب کیجئے

منیجر اخبار زمزم بیرون موری دروازہ لاہور

بچوں کی دنیا

نہایت پابندی کے ساتھ ملتان شہر (پنجاب) سے نکل رہا ہے۔ یہ ہفت روزہ رسالہ بچوں میں علمی
مذاق کے ساتھ ساتھ شوق عمل پیدا کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی اور تاریخی مضامین، دلچسپ کہانیاں
اہم نظمیں مفید معلومات اور لطیفوں کے علاوہ ہفتہ بھر کی چیدہ چیدہ خبریں درج ہوتی ہیں۔
محکمہ ہائے پنجاب اور سندھ کی طرف سے باقاعدہ منظور شدہ ہے۔ رسالہ کی زبان نے(حد)
طرز بیان دلکش، لکھائی چھپائی پسندیدہ، سرورق خوشنما اور قیمت سالانہ صرف پانچ روپیہ ششماہی [illegible]

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ بچوں کی دنیا ملتان شہر (پنجاب)

اتحاد بین المذاہب کا واحد ماہانہ رسالہ

میل ملاپ

منظور شدہ از محکمہ تعلیمات گورنمنٹ بہار

یہ رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ ؍ کو ٹھیک وقت پر نصف اردو اور نصف ہندی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ مضامین اردو اور ہندی کے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اس کے دو ایڈیٹر ہیں ایک مسلمان ایک ہندو۔

ملک میں فساد اور جھگڑے پھیلنے کے بہت سے ذرائع پیدا ہو گئے ہیں لیکن جھگڑنے والوں میں سمجھداری اور رواداری پیدا کرنے کے لئے اس وقت تک بے لوث اور ہر مذہب و قوم کا ہمدرد کوئی رسالہ یا اخبار نہیں شائع ہوتا ہے۔ اس لئے بہار تھیاسوفیکل فیڈریشن پٹنہ نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے کر "میل ملاپ" کا اجرا کرنا طے کر لیا ہے۔ اس کا مقصد ہندو مسلمان، شیعہ سنی، مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور کسان، امیر و غریب اور ہر آپس میں جھگڑنے والی جماعت اور ریاست و رعایا میں میل و ملاپ اور خوشگوار رشتہ پیدا کرنا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی تحریک پر میل ملاپ کلب اور کانفرنس وغیرہ کی بنیاد شروع ہو چکی ہے۔

میل ملاپ میں علوم روحانی، جدید روحانی تحقیقات، روحانی طاقت بڑھانے کے اصول، روحانی طاقت سے بیماریوں کو اچھا کرنا، مرنے کے بعد کے واقعات اور اس دنیا کی زندگی کے صحیح واقعات درج کئے جاتے ہیں جسے ہر شخص بذات خود طاقت پیدا کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ روحانی علوم کے سلسلہ میں جو سوالات موصول ہوتے ہیں اس کا تشفی بخش جواب بھی تفصیل سے دیا جاتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف دو روپئے

منیجر تھیاسوفیکل ہڈکوارٹر بلڈنگ، بانکی پور، پٹنہ (بہار)

رسالہ پیام اتحاد لاہور

جو صحیح معنوں میں علمبردار اتحاد، فرقہ پرستی کا دشمن، قوم کا سچا خادم، اشاعت تعلیم کا حامی اور اصلاح و تنظیم کا خواہاں ہے۔ ملک کے لیڈروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ پیام اتحاد ہی ہندوستان کی مختلف اقوام میں رشتہ اتحاد اور یکجہتی کی سپرٹ پھونکنے والا واحد پرچہ ہے اس لئے اس کی خریداری قبول کرنا ملک کی سچی خدمت کرنا ہے۔

چند دنوں کے لئے اس کے چندہ میں بھاری تخفیف کی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھانا آپ کا کام ہے۔

منیجر پیام اتحاد لاہور

سادات قریش کا اصلاحی ماہنامہ

القریش

جو کہ ۱۰ سال سے قومی اور ملی خدمات انجام دے رہا ہے۔ تذکرہ برادری کے علاوہ تنقیدات کے تحت سیاسی و نیم سیاسی حالات حاضرہ پر دلنشیں طریق پر مدلل و مبرہن بحث کی جاتی ہے۔ اخلاق سوز افسانوں کے بجائے سنة القرآن اور تذکرۃ العارفین مخصوص اور مؤثر انداز میں بالالتزام شائع ہوتے ہیں۔ [illegible] سبق آموز حقائق شائع ہوتے ہیں علاوہ ازیں [illegible] [illegible] طباعت و کتابت [illegible]

[illegible]

سلسلۂ اشاعت

بسر پرستی جمیعت مسلم نوجوانان سکندرآباد

(زیرِ نگرانی)

مولوی محمد حسام الدین صاحب غوری

صدر جمیعت مسلم نوجوانان سکندرآباد

آج ہم جس انحطاط کے دور سے گذر رہے ہیں اس کی اصل وجہ نوجوان کی ذہنی پستی ہے ہمارے نوجوان جن سے قوم کی قسمت وابستہ ہے اجداد کی تاریخ شجاعت و روا داری اور جذبۂ عمل کو فراموش کر کے اپنے وجود کے حقیقی مقصد کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ اس بزدلی اور پستی کا واحد علاج یہی ہو سکتا کہ مسلم نوجوان تعلیمات اسلام اور ناموران اسلام کے ان کارناموں سے واقف ہو جائیں جن سے قوموں کی قسمت پلٹ گئی تھی اور ملکوں کی تاریخ میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر۔

جمیعت مسلم نوجوانان کی سرپرستی میں اسلامی مہینوں کی مناسبت کے لحاظ سے مخصوص عنوانوں پر مستند و دلچسپ رسائل شائع کئے جاتے ہیں۔ جن میں ہندوستان کے مشہور و مقتدر علماء کے بصیرت افروز مضامین و قائدین عظام کے بیداری پیدا کرنے والے پیامات درج ہوتے ہیں اس سلسلہ کے حسب ذیل شمارے شائع ہو چکے ہیں

اسلام اور قربانی

جس میں فلسفۂ قربانی پر مولانا احسن صاحب گیلانی شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ دکن کا بصیرت افروز مضمون [illegible] صاحب [illegible] نوجوانان جنہ کے نام شامل ہے۔

محرم کی تجلیاں

جس میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عدیم المثال قربانی پر نہایت [illegible] [illegible]

[illegible] شمارہ صرف دو آنے کے ارسال فرما کر طلب کیجئے

[illegible] سلسلۂ اشاعت نمبر ۶۶۳ کباڑی گوڑہ سکندرآباد (دکن)

مسلم یونیورسٹی گزٹ

مسلمانوں کے مرکزی قومی درس گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ارگن ہے۔ ہندوستان بھر کے ممتاز تعلیم یافتہ طبقوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ آپ بھی اس کے خریدار بن کر اس معتدد برادری میں شامل ہو جائیے اور اس میں اشتہار دے کر اپنی قومی درس گاہ کی مدد کیجئے۔ گزٹ کی تمام آمدنی مسلم یونیورسٹی میں جاتی ہے ہر انگریزی ماہ کی یکم و پندرہ کو شائع ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف دو روپئے

نرخنامہ اجرت اشتہارات و دیگر تفصیلات کیلئے تحریر فرمائیے

المشتہر منیجر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ یو پی

رفیق باغباں

کاشتکاری اور باغبانی کے فن میں یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس کا مضمون جمیل ماحول ہیچ جنت تیار ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی نہایت درجہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہوتا ہے۔ اس کے بلند پایہ مضامین بیکار نوجوانوں کو باکار بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ زمیندار اور کاشتکار دونوں کی فنی خدمت اس کا خاص شعار ہے۔ قیمت بہت کم یعنی صرف ۵ روپیہ سالانہ۔ یہ رسالہ [illegible] کی تبلیغ کے سہولت پر نہایت آب و تاب کے ساتھ اردو زبان میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اس بے بہا رسالہ کو حاصل کرنے کے لئے بہت جلدی کیجئے تاکہ دیہات کی نحوست بھی فوراً ہی دور ہو جائے۔ یہ رسالہ اپنے مضامین کی بہتری کے باعث تمام حکومتوں کا منظور شدہ ہے۔

منیجر رسالہ رفیق باغباں [illegible] نرسری سہارنپور

ندوۃ المصنفین کی دو اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت:- غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے اب تک کسی زبان میں اس درجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لئے جن حربوں سے کام لیا ہے ان میں سلیوری کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے جدید ترقی یافتہ ملکوں میں اسلامی تبلیغ کے لئے بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے بلکہ مذہبی قہر و غلبہ کے سبب ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ بھی اس سے اثر پذیر ہیں "غلامی" جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں دلچسپ مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت، طباعت، کاغذ اس قدر اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے قیمت مجلد سے۔ غیر مجلد ۲

اسلام کا اقتصادی نظام:- اس کتاب میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح نظام قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ اگر آپ اسلام کی اقتصادی دستور کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات قیمت مجلد ۳ غیر مجلد ۲ کتابت طباعت اعلیٰ اور ولائتی کاغذ۔

مینجر ندوۃ المصنفین قرول باغ

نئی دہلی

چند اچھی کتابیں

یادگار نسیم — یعنی منشی دیا شنکر نسیم کی مشہور و معروف مثنوی گلزار نسیم مع انتخاب دیوان نسیم مع حواشی و تبصرہ کلام مرتبہ مولوی اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی۔ آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ایم اے ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ تحریر فرماتے ہیں۔

یادگار نسیم جو مولوی اصغر صاحب نے تصحیح کے بعد شائع کی ہے مشہور و معروف شاعر نسیم کی مثنوی جسے انہوں نے مصلحتاً نامناسب اشعار کو حذف کرنے کے بعد شائع کیا ہے۔ غزلیات میں سے جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے وہ شاعر موصوف کی بہترین غزلیں ہیں .... حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے ... اس کتاب کا مقدمہ بذات خود ایک عالمانہ تصنیف ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس کتاب کی قدر کما حقہ ہوگی اور یہ اس کے شایان شان ہے۔ طباعت دیدہ زیب، خوشنما جلد، قیمت عہ ر

الف بے کا کھلونا — یہ پیاری کتاب ننھے منے بچوں کے لئے ہے کھیل ہی کھیل میں وہ حروف تہجی سے آشنا ہو جاتے ہیں ہر حرف کیلئے ایک رنگین تصویر اور ایک شعر ہے۔ زبر زیر اور پیش وغیرہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی رنگین اور بہت صاف۔ ۲۴ عکسی تصویریں۔ اگر آپ کے یہاں کئی بچے ہوں تو متعدد نسخے طلب فرمائیے ورنہ آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ قیمت ۸ر

انوکھی کہانیاں — یہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے گیارہ نصیحت آموز کہانیاں درج ہیں۔ زبان بہت آسان ممکن نہیں کہ کوئی بچہ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہے خوبصورت کتاب ہے بچے اس کو دیکھتے ہی مچل جاتے ہیں۔ سرورق پر تین رنگ کی تصویر ہے۔ قیمت ۴ر

مفید ایجادات کی کہانیاں — یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب اردو میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی ہے اور مفید معلومات کے لئے اس قابل ہے کہ ہر شخص کے مطالعہ میں رہے۔ بلحاظ کتابت و طباعت اور سرورق بہت اچھا نفیس ہے۔ اس قدر اچھے اہتمام سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں [illegible] قیمت [illegible]

[illegible]

انجمن ترقی اُردو ہند دہلی کی چند مطبوعات

نصرتی

مرتبہ

گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر ملا نصرتی ملک الشعرا بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔ تالیف لطیف ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علمی تحقیق اور تفحص کا بہترین کارنامہ ہے۔ نصرتی قدیم دکنی استاد کامل گذرا ہے۔ رندی اور بزمی قسم کی شاعری میں کمال رکھتا تھا۔ گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ سکندری۔ دیوان قصائد و غزلیات اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ جن میں علی نامہ اور تاریخ سکندری کو عادل شاہیوں کے تاریخ کے بہترین ماخذوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

نصرتی کی زبان چونکہ قدیم دکنی ہے اس لئے اب ان تصانیف کا سمجھنا محال ہوگیا ہے لیکن اسے محنت اور شوق تحقیقات کی کرامات سمجھنا چاہیئے کہ فاضل مولف نے اس متروک زبان کے تمام ادق الفاظ کے معنی دریافت کرلیے۔ کتاب میں مختلف اصناف کلام کے جو نمونے نقل کئے ہیں ان کے نیچے اشعار کا مطلب صاف اردو میں تحریر فرمادیا ہے۔

تاریخ اور قدیم زمانے کی تحقیقات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے

حجم ساڑھے تین سو صفحات، قیمت مجلد عہ غیر مجلد ے ر

المشتہر

منیجر انجمن ترقی اردو ہند دہلی

تعلیمِ رحمت یا میلادِ شریف (از خواجہ محمد شفیع دہلوی)

یہ بہت مختصر مگر نہایت مختصر رسالہ ہے جس میں ان عورتوں کو مذہبی تعلیم دی گئی ہے جو ۔۔۔ سے ۔۔۔ علم ہیں ۔ اس میں آں حضرت کے پہلے تجارت، پہلی انجمن، سنگِ اسود نصب کرنے کا واقعہ، غارِ حرا، نزولِ وحی، ذکرِ معراج اور خطبہ وغیرہ کا مفصل ذکر ہے ۔ قیمت ۴ر

نئی پود :

ڈاکٹر ازہر قدوائی کے ۱۰ افسانوں کا مجموعہ ۔ یہ افسانے انسانی بہبودی کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں ۔ کسان، مزدور، قلی اور مہتروں کے لئے اور پیام ہیں ان لوگوں کے لئے جو انقلاب اور بغاوت چاہتے ہیں ۔ قیمت ۸ر

گناہ

(از خواجہ محمد شفیع دہلوی)

انسان غلطی اور بھول سے بنا ہے لیکن ایک غلطی کیا رنگ لاتی ہے ۔ ایک گناہ کیا فتنہ اٹھاتا ہے ۔ نشیا سے کا لڑکھڑاتا ہوا قدم اس کو کس غارِ ذلت میں لیجا تا ہے ۔ شیطان کا لاسہ کیا رنگ لاتا ہے ۔ راہِ راست سے بھٹکا کر کہاں کہاں ٹھوکریں کھلواتا ہے ۔ باپ اپنی جان سے جاتا ہے ۔ اس کے گناہ کی پاداش بیٹے کو بھگتنی پڑتی ہے ۔ ہمنے دو ( ) یوں اس بھٹکے ہوئے مسافر لوکیوں کر ڈگر پر لگائی ہے ۔ اس قلمہ میں مصنف نے یہ سب باتیں کچھ ایسے خوشنما پیرائے میں دکھائی ہیں کہ کتاب ایک دفعہ ہاتھ میں اٹھا لیتی شروع کی پھر ختم کئے بغیر نہیں چھوٹتی ۔ زبان خوشنما، بندش چست، ترکیبیں درست اشعار موزوں، گیت افسوں ۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دہلی لاہور لکھنؤ بمبئی

دی ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال — عالیجناب ہز ہائینس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپیہ

جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ روپیہ

ادا شدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچپن ہزار نوسو پانچ روپیہ

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، رسل و رسائل، موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کے ؍ ؍ معاوضے ضمانت اور عام حادثات کے متعلق ہر قسم کے بیمہ کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن) اور احمدآباد

دی ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس آغا خاں صاحب — عالیجناب ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپیہ

جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ روپیہ

ادا شدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچپن ہزار نوسو پانچ روپیہ

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، رسل و رسائل، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کے معاوضے، ضمانت اور عام حادثات کے متعلق ہر قسم کے بیمہ کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدر آباد (دکن)، اور احمد آباد